اکتوبر 2023

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

قیمت 180 روپے

معراج رسول

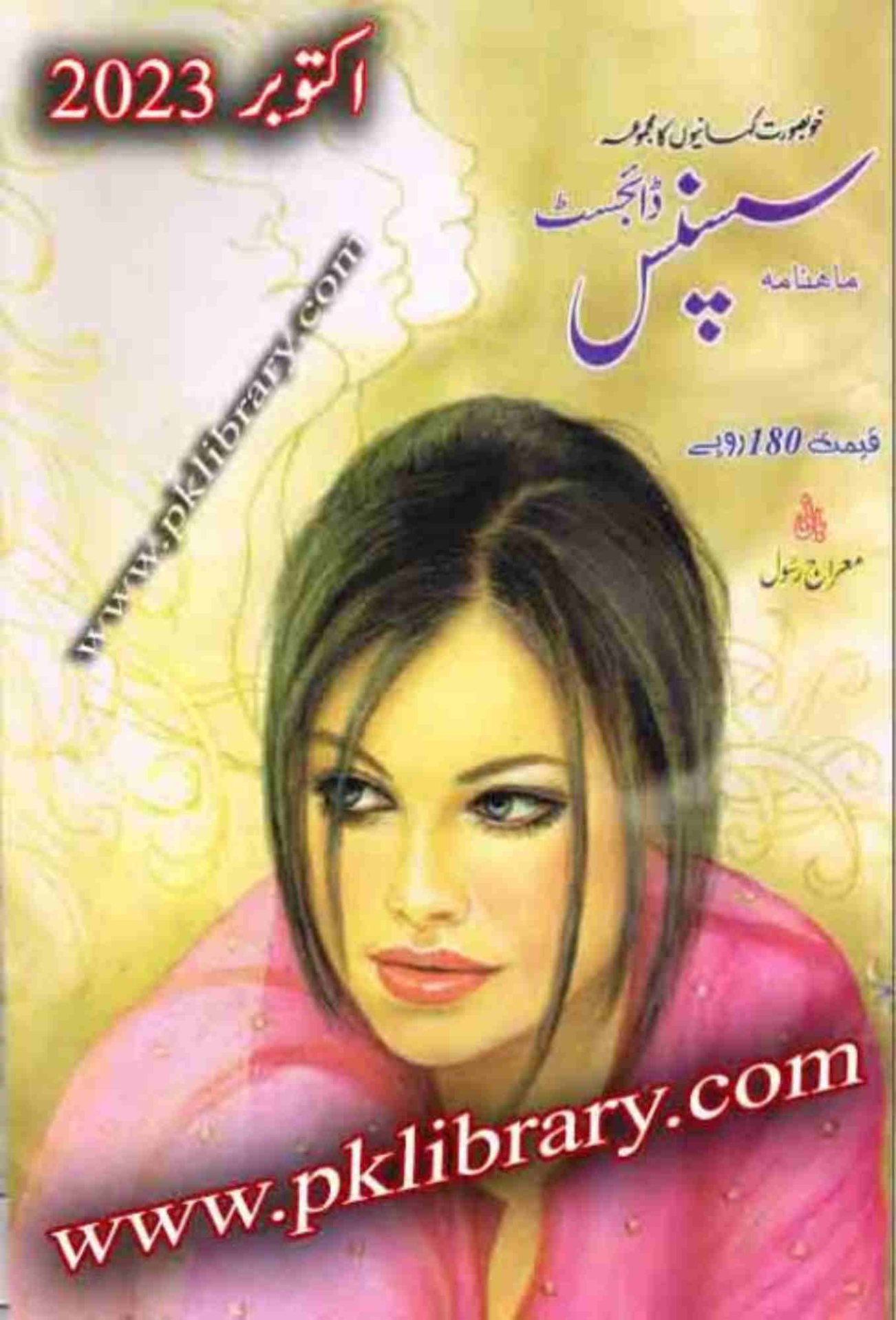

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

سسپنس ڈائجسٹ
CPNE
MEMBER APNS

انشائیہ 07
جون ایلیا
منافقوں اور منافقوں کے درمیان سانس لینے والے بہروپیوں کا انداز

آپ کے خط 08
مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

شعلہ شب گیر 12
ایم آر راجپوت
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

بے ایمان 37
عبق بخاری
بے ایمان رستے کو ایمانداری سے بدلنے والے مجرم کی کتھا

شہ زور 44
اسما قادری
اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

تشنہ لب 67
آصفہ ضیا احمد
دو جمع دو پانچ کرنے والے عیار مجرم کا الٹا حساب

اندھیر نگری 78
مرزا امجد بیگ
کمزور انسانوں کی بے چارگی سے کھیلنے والے سفاک مجرم کا انجام

سود و زیاں 99
زویا صفوان
اپنوں کی محبت میں اپنی زندگی لٹانے والی ایک مخلص مگر قلاش دوشیزہ کا احوال

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
یمنیٰ احمد
نائب مدیر
اطہر حسین

مارکیٹنگ و سرکولیشن منیجر
محمد شہزاد خان
0333-2256789

www.pklibrary.com

جیسے کو تیسا — 105

عاطر شاہین

"جیسے کو تیسا" کی عملی اور سبق آموز تفسیر

محفلِ شعر و سخن — 112

قارئین

آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

سوا سیر — 115

علی امجد

ہلکے پھلکے انداز میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو آشکار کرتی تحریر

جنگ باز — 118

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

احساسِ جرم — 141

خالد شیخ طاہری

رشتوں کے بیچ محبت اور نفرت کی حدود مقرر کرنے والے ایک بے بس انسان کی روداد

پس مردن — 151

شاہ زین رضوان

ظلم کا شکار ہونے والی ماں کا دل گداز اور پر سوز ماجرا

ابوعثمان جیری — 167

[illegible] اکبر

ایک نیک فطرت اور برگزیدہ انسان کی زندگی کے حالات

شاکا — 177

نازیہ کامران کاشف

سترھویں صدی کی اندھیری راتوں سے جنم لینے والی ایک لرزہ خیز داستان

آخری شام سے پہلے — 196

طاہر جاوید مغل

کبھی جس کے صحرا میں کبھی ہجر کے کانٹوں میں دھنک رنگ موسموں کو تلاش کرنے والے دیوانوں کی داستان

کترنیں — **

ادارہ

دنیا بھر کے ادھر ادھر لطیفے چٹکلے اقتباسات مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

www.pklibrary.com

جون ایلیا

بنیادی مسئلہ

جس ملک کی تہتر فیصدی یا غالباً اس سے بھی کچھ زیادہ آبادی کے پاس رہنے کو گھر، پہننے کو کپڑا اور کھانے کو روٹی نہ ہو، کیا اس ملک کے چند افراد کو تمام عیاشیوں کا حق دیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں نہ کسی بحث کی گنجائش ہے اور نہ کسی سیاسی نظریے یا سماجی فلسفے کا حوالہ دینے کی ضرورت، یہ تو ایک بالکل صاف اور سادہ سی بات ہے۔ اس ملک کو آزاد کرانے میں قوم کے ہر طبقے نے حصہ لیا تھا۔ پاکستان پوری قوم کی قربانیوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اسے بھی چھوڑیے، اس بات کا جواب دیجیے کہ وہ کون سی منطق اور کون سا نظامِ اخلاق ہے جس کے پیشِ نظر چند بے ضمیر، موقع پرست اور قابو یافتہ افراد نے پوری قوم کو لوٹنے اور کھسوٹنے کا حق پالیا ہے اور سماج میں ان..... تباہ کن اور ہلاکت آفریں رجحانات کو فروغ دینے کی اجازت حاصل کرلی ہے جن کی موجودگی میں ایک شریف، صحت مند اور باضمیر سماج کے قیام کا تصور دیوانے کے خواب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

یہ دور پاکستان کی زندگی کا بڑا نازک دور ہے۔ اگر اس دور میں سماج کی منفی قدروں کو استحکام حاصل ہوگیا تو یہ ملک نفسیاتی، اخلاقی، تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے دوالیا ہوکر رہ جائے گا اور پھر اس کا ازالہ کسی طرح بھی ممکن نہ ہوسکے گا لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ قوم کے بااثر طبقے نے ان زہرناک اور ہلاکت خیز قدروں کو سماجی زندگی میں بنیادی حیثیت دے دی ہے۔ یہاں تک کہ اب ان قدروں کو حوالے کے طور پر پیش کیا جانے لگا ہے۔ چنانچہ آج پاکستان میں امیر اور غریب جیسے شرمناک الفاظ گفتگو میں بار بار استعمال کیے جاتے ہیں اور گویا اخلاقی اور سماجی طور پر اس بات کو تسلیم کرلیا گیا ہے کہ پاکستان میں دو قومیں آباد ہیں، ایک غریب اور ایک امیر۔ ایک کرسی نشین اور ایک خیمہ بردار۔ وہ قوم جو زندگی کا کوئی اعلیٰ تصور نہ رکھتی ہو، جو شرمناک جہالت اور المناک غربت میں مبتلا ہو، اس کے حق میں بااثر طبقے کا یہ اندازِ نظر اور طرزِ عمل نفسیاتی طور پر جس قدر مہلک ثابت ہوگا، اس کا تصور مشکل نہیں۔ آج ہمارے ملک میں امیر سے امیر ترین بننے کی جو دوڑ ہو رہی ہے، اس نے پوری قوم کے دماغ کو ماؤف اور ذہن کو خراب کردیا ہے، جو لوگ ملک کی ذہنی تعمیر و ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں، جنہیں اس قوم کے مستقبل سے ذرا بھی ہمدردی ہے انہیں اس صورتِ حال کے خلاف سخت احتجاج کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں اہلِ قلم کا فرض ہے کہ وہ اعلیٰ سماجی تصورات اور اقدار کو فروغ دینے کی کوشش کریں لیکن وہ تو اپنا یہ فرض پہلے ہی سے انجام دے رہے ہیں۔ قوم میں یہی تو ایک طبقہ ہے جس نے اپنے فرائض کو کبھی فراموش نہیں کیا، جس نے اس ملک میں آج تک صرف فرائض کی زندگی گزاری ہے۔

کسی اعلیٰ تصورِ حیات اور سماجی نصب العین کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی لہٰذا اس سلسلے میں قوم کے ذمے دار افراد کو سب سے پہلے جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ افلاس اور جہالت کے خلاف ایک ہمہ گیر اور طاقتور مہم شروع کی جائے کیونکہ ہم اس وقت معاشی پستی، سماجی زبوں حالی اور تعلیمی پسماندگی کی جس منزل میں ہیں، وہاں کوئی اعلیٰ تصورِ حیات اور کوئی بلند نصب العین ہمارے درد کا درماں نہیں بن سکتا۔ تعمیر و ترقی کا سفر اسی وقت شروع ہوسکتا ہے جب ہم موجودہ منزل سے کافی دور نکل جائیں، یہ ہے وہ بنیادی مسئلہ جس پر ہمارے اربابِ اقتدار کو سوچنا اور عمل کرنا ہے۔ ورنہ [illegible] آئندہ باتیں کرتے رہنا ایک دلچسپ مشغلہ سہی لیکن ایک ہوشمندانہ اور نتیجہ خیز طریق کار ہرگز نہیں۔ قوم کو شاندار کوٹھیوں اور قیمتی کاروں کی کوئی ضرورت نہیں، اسے اسکولوں، کالجوں، تربیت گاہوں، شفاخانوں، لہلہاتے کھیتوں اور کارخانوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس انداز میں سوچنا ہے۔ سوچنا ہی نہیں، عمل کرنا ہے کہ ان مسئلوں کے سامنے باقی تمام مسئلے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

www.pklibrary.com

آپ کے خط

عزیزانِ من..... السلام علیکم!

اکتوبر 2023ء کا سسپنس آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ گزشتہ دنوں اقتدار اور سیاست کی بساط پر بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سابقہ وزیر اعظم کی جگہ نئے نگراں وزیر اعظم کی آمد..... اور نئی پالیسیوں پر عملدرآمد..... جن میں سرفہرست چینی اور ڈالر کی اسمگلنگ روکنے کے لیے ایف آئی اے کو اختیارات کی تفویض ہے اور ان سب سے ہٹ کر عوام پر جو بجلی کے بلوں کا بم گرایا جارہا ہے اس کے سدباب کے لیے تو شاید پاکستان میں کسی کے پاس بھی کوئی حل نہیں ہے کیونکہ..... کے الیکٹرک کی من مانیاں اور ذمے داران کی نادانیاں مل کر عوام کی زندگی کو مشکل سے مشکل ترین کرتی جارہی ہیں اور دنیا تماشا دیکھ رہی ہے۔ خدارا کچھ تو خیال کریں..... مہنگائی کے ہاتھوں آزمائشوں میں مبتلا قوم اب خودکشی کرنے پر مجبور ہورہی ہے..... کم عمر بچے بھوک پیاس اور افلاس کے ہاتھوں روٹی کی چوری میں بڑی بڑی سزائیں کاٹ رہے ہیں؟ جن ہاتھوں میں قلم اور کتابیں ہونی چاہئیں ان ہاتھوں میں ہتھکڑی کا زیور..... اُف..... ظلم کی انتہا تو دیکھیے کہ اس پر بھی صاحبِ اقتدار طبقہ آئی ایم ایف کے گن اور اپنی نام نہاد مشکلات کا رونا رونے میں مصروف ہے اور جو عیش و عشرت انہیں میسر ہے ان پر خوب صورت پردہ ڈال کر خود کو بے قصور اور معصوم ثابت کررہے ہیں جہاں دودھ، چینی، آٹا اور دیگر اشیائے خورونوش عوام کی دسترس سے دور ہوتی جارہی ہیں تو وہاں بجلی کے بھاری بھرکم بلوں کا بوجھ قوم کیسے برداشت کرسکتی ہے..... مسیحاؤں کے ہاتھوں میں زہر اور چہروں پر بکھرا اطمینان چیخ چیخ کر بتاتا ہے کہ انہیں لوگوں کے دکھ درد اور مشکلات کا کوئی احساس نہیں ہے..... اس بے بس قوم کے پاس کوئی درد کا درمان نہیں۔ ہر جانب جبر اور قہر کے پہرے ہیں۔ جانے کب اس ملک کے حالات میں خوشگواریت آئے گی۔ اللہ پاک اس ارضِ وطن کو ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے اور حساس دل اور مخلص حکمران دے۔ الٰہی آمین۔ اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب۔

✽ شہر ملتان سے جنید علی کا طویل سندیسہ۔ ''ہیڈ کی سائڈ میبل پر الائچی اور دارچینی کی خوشبو سے مہکتی چائے کے مگ کے ساتھ ہی سسپنس کا تازہ شمارہ رکھا ہوا تھا (واہ واہ..... کیا بات ہے جناب)۔ سرورق حسبِ معمول سسپنس کے مزاج کے عین مطابق ہے اور ساتھ فہرست میں اس بار بھی جانے پہچانے نام ہیں جو اپنے تحریری فن میں ماہر ہیں۔ خطوط کی محفل مختصر مگر ہر دلعزیز ہے۔ صفِ اول میں شامل بہترین خط میں ناہید یوسف اپنی غیر حاضری کا مداوا کررہی ہیں۔ محمد آذین رضوان جن کا منفرد نام ان کا تبصرے ہی کی طرح شاندار ہے، شریکِ محفل ہیں مگر اگلی بار بھی آمد یقینی ہو اور یہ ذرا سا آگے ساحلِ سمندر کی دلکش ہواؤں کے شہر کراچی سے روبینہ اشعر بھی ایک معلوماتی گفتگو کے سنگ حاضر ہیں جو سسپنس کی تبصراتی دنیا میں جانا پہچانا نام ہیں تو سیتا شاہ اور سید محی الدین غیر حاضر ہیں جو اگلی بار حاضر ہونے چاہئیں۔ ''جون ایلیا'' کیا آپ اپنی منفرد، مثبت و تعمیری اور پرفکر و برجستہ مستقل گفتگو کا اختتام کررہے ہیں؟ اس بار بھی آپ کے خیالات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہم سب تو ایک ہی تھے، چاہے ہماری زبانیں، رنگ، نسل، انداز و اطوار الگ الگ ہوں مگر اب ہم ایک کیوں نہیں۔ ہم کیوں تعصب کی فضا میں جی رہے ہیں جس کے منفی نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ہم کیوں اپنی زبان پر فخر نہیں کرتے اور ہم نے کیوں غیروں کی تہذیب کے ساتھ ان کی زبان کا خول خود پر چڑھایا ہوا ہے جو ہمیں ہمارے اصل سے دور کررہا ہے۔ اس بار مستقل طویل سلسلوں پر بات پہلے کی جاتی ہے جو شمارے کے مختلف حصوں میں ہر ماہ اپنی روانی اور دلچسپی کے ساتھ ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں یعنی ''شہ زور'' جس میں سسپنس کے فاسٹ فوڈ ٹائپ ہیرو معاذ کا کردار نئی نسل کے نوجوانوں کے لیے بہادری کی ایک مثال ہے جو ہر قسط میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ باذل نے اس قسط میں بھی ناک میں دم کر کے رکھا ہوا تھا جس کا انجام اگر بھیا کبھی نہ ہوا تو مصنفہ سے ناراضگی بنتی ہے۔ میڈم ایکس اور عرفان بھی شیطان کی فرمانبرداری احسن انداز میں کرتے ہیں، ویسے ہی جیسے ''جنگ باز'' میں یہ ہمارے سسپنس کے دیسی ہیرو کے دشمن یعنی رانگا، کالی لہر اور دیگر ہیں۔ ہاں ''جنگ باز'' یہ قسط بھی کتنے خطرناک موڑ پر ختم ہوئی کہ دیسی ہیرو سہراب اور اس کا ساتھی، رانگا بابا اور میڈم نجمی کے ٹھکانے تک پہنچ گئے۔ اب ذرا سی غلطی پھر سے کسی بڑے نقصان کی وجہ بن سکتی ہے۔ گرانڈیل قصائی بھی سہراب کے شکنجے میں آگیا اور اس کی وجہ سے سہراب کے لیے راستے ہموار ہوئے اور اب دشمنوں تک پہنچ گیا ہے۔ راحیلہ اور فوزیہ لگتا ہے اب جلد بازیاب ہوجائیں گی۔ طاہر جاوید کی یہ قسط پڑھ کر لگتا ہے شاہنواز کی زندگی کی آخری شام جلد ہونے والی ہے۔ صالح کی حرکتیں ہر قسط میں مزید خراب ہوتی جارہی ہیں۔ اس قسط میں وقار کے دھوکا دینے پر وہ اتنا پاگل ہورہا ہے جیسے کتنا سچا تھا اپنی پھپھو کی بیٹی کے لیے۔ اگر اتنا ہی ناکام عاشق بننا ہوتا تو یہ حرکتیں نہ کرتا۔ کوئی سچی محبت نہیں، بس اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے اور اس کا اختتام بھی سنگین ہی ہونا چاہیے کہ دونوں باپ بیٹے کا بُرا انجام ہی پڑھنا چاہتے ہیں۔ ''شاکا'' کی موجودہ قسط میں جیکال

www.pklibrary.com

موت کے منہ سے باہر آیا تو وہیں فریڈ نے بھی اپنے اصل رنگ دکھانے شروع کر دیے۔ یعنی جوشوا کی ایجاد کا حصہ بنا۔ جوشوا نے واقعی بہت خطرناک کام کیا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ تباہی لے کر آئے گا مگر امید ہے کہ اس پر قابو بھی پالیا جائے گا۔ بیچارے ریزو، جن کی شادی ایک عفریت سے ہوئی یعنی لورین، جس نے بعد میں اپنا اثر دکھایا۔ مجھے ایسی تحقیقات پر مبنی معلوماتی تحریریں بے حد پسند ہیں۔ اس ناول کے بعد بھی نازیہ کامران سسپنس کے لیے کوئی طویل تحریر دیں مگر صفحات زیادہ ہوں۔ ناہید سلطانہ اختر کافی گیپ کے بعد مختصر سی تحریر کے ساتھ آئیں جس میں ایک بچی کے احساسات کی ترجمانی کی گئی جو اپنے خونی رشتوں کی محبت اور توجہ چاہتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ''روٹی کا چکر'' ہی ہے جو بہت سی چیزوں کی آڑ بن جاتا ہے مگر انسان کو ہر کام توازن سے ہی کرنا چاہیے۔ ایک مختصر مگر پُر اثر کہانی تھی۔ شاہد لطیف کی تحریر ''مکان اور مکین'' ایک اچھی اور معیاری تحریر تھی جو بہت پُر اسرار تھی اور اختتام ایک شخص کی موت کی صورت میں ہوا جو مہم جوئی اور خود کو صحیح ثابت کرنے کے چکر میں گھر میں گیا۔ ڈائجسٹ میں ہر ماہ مختلف موضوعات پر مبنی تحریریں ہوتی ہیں۔ یہ اچھا طریقہ کار ہے۔ جیسے گزشتہ ماہ بھی خوفناک تحریر تھی اور اس بار بھی۔ شاہ سنان کی ''ظاہر و باطن'' کا موضوع بہت اہمیت کا حامل تھا۔ اکثر انسان اپنے مطلب کو پورا کرنے کے لیے خود کو بہت ذہین سمجھ کر اتنی چالاکی سے کھیل کھیلتا ہے، مگر منافقت کے سبب آخر میں ہاتھ کچھ نہیں آتا جیسے ایلی کے ساتھ ہوا، جس نے ..... مسٹر و مسز فرنانڈس کے ساتھ دھوکا دہی کی اور آخر میں پکڑی گئی اور خالی ہاتھ رہی۔ مسٹر فرنانڈس کو بھی چاہیے تھا اپنی اولاد کی تربیت میں اس قدر سختی سے کام نہ لیتے جو بڑھاپے میں پہنچ کر زیادتی ہوگئی اور اولاد کی بھی غلطی تھی کہ جیسے بھی تھے تو ماں باپ کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ انسان کا ضمیر تو اسے ملامت نہ کرے۔ عائشہ تیر جو عمدگی سے ترجمہ زاد تحریریں پیش کرتی ہیں، اب ہمیں پڑھنے کی عادت ہوگئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ کہانی کتنی الجھی ہوئی کیوں نہ ہو، بہ آسانی سمجھ آجاتی ہے۔ ترجمہ کرنا بھی ایک فن ہی ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ مدہوشی میں ہوشیاری سے کھیلنے والے کھلاڑی کا یہ احوال کہانی ''بے نیاز'' میں اچھے سے لکھا گیا تھا جس کی ڈسکرپشن بھی بہتر تھی۔ کینڈی کا کردار آخر تک پراسرار سا تھا۔ اب وقت آتا ہے سسپنس کے کورٹ کچہری میں جانے کا، جہاں لوگ اپنی فریادیں ہمارے اور آپ سب کے پسندیدہ مرزا امجد بیگ یا صفدر حیات صاحب جن کے پاس لاتے ہیں۔ یہ اپنے پیشے میں ایمانداری سے جرم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ ''آوازِ حق'' زیر مطالعہ تحریر میں عادل نے اپنی زوجہ کی بہن کے لیے اچھا فیصلہ کیا جو شکیلہ کو پسند نہیں آیا، جس کی وجہ سے عادل کو نقصان پہنچانے کے چکر میں ایک چور مارا گیا۔ جب یہ کہانی صفدر حیات صاحب کی ہے تو آخر میں حسام بٹ کیوں لکھا ہوا تھا، یہ ضرور بتایئے گا۔ اس ماہ یوم دفاع کی مناسبت سے عیوق بخاری کی تحریر بہت ہی پسند آئی جو نہ صرف درس و تدریس کے شعبے بلکہ شاگردوں کے لیے بھی بہت اصلاحی تھی، جس میں ایک استاد کا مثبت انداز اور اپنے شعبے سے متعلق بے مثال کارکردگی کو دکھایا گیا، جو اساتذہ کے لیے مثال ہے اور ساتھ طالب علموں کے لیے بھی کہ وہ اپنے استادوں کا احترام کریں۔ ساتھ آزادی سے متعلق یادیں اور اصلاحی سوچ کی منتقلی قابلِ داد تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس تحریر کو ہر طالب علم کو پڑھنا چاہیے۔ ویسے ایک بات ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں اب بھی کہ ڈائجسٹ خراب کرتے ہیں، وہ ذرا یہ کہانی پڑھیں اور انہیں پتا چلے کہ رسائل خراب نہیں کرتے۔ یہ تو اصلاح کرتے ہیں، مثبت و تعمیری سوچ عطا کرتے ہیں، ہماری لسانی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں اور اردو کو فروغ دیتے ہیں۔ ضیاء تسنیم بلگرامی کی دوسری اور آخری قسط کا اختتام المیہ تھا۔ راجا دلیپ کا مرنا ہی بہتر تھا۔ سید محمد نے شروع میں مسلمانوں کے لیے بہت سی خدمات سرانجام دیں مگر پھر مہدویت کا دعویٰ کیا اور اپنی انا پرستی کی وجہ سے اللہ بہتر جانتا ہے اس حال میں دنیا سے گئے۔ آئیں اب ذرا تاریخ کے سنہری پنوں کو کھولتے ہیں جس میں اس ماہ بھی ایک دلکش داستان موجود ہے یعنی ''انتر انتر داستان'' جسے اے آر راجپوت نے عرق ریزی سے قلم بند کیا اور تمام واقعات اور منظر کشی اعلیٰ تھی۔ شہزادی سورن لتا (فاطمہ) اور فریدی کی کہانی زیادہ پسند آئی۔ سکندر اور چندرا کا ملن نہیں ہوسکا کہ شہزادی چندرا نے اپنے باپ اور بہن شہزادی سرسوتی کے لیے قربانی دی تو وہیں چترسین کا کردار بطور ولن بھی خوب تھا۔ ایک بات سمجھ نہیں آئی، ذرا وضاحت کریں کہ سکندر ایک مذہبی نوجوان تھا تو وہ شہزادی چندرا سے ان کے دھرم کے مطابق کیسے شادی کر رہا تھا جبکہ ایسا ممکن نہیں۔ راجپوت صاحب بالکل الیاس سیتاپوری والے انداز میں پوری تیاری کے ساتھ تاریخی تحریریں لکھتے ہیں۔ ''محفل شعر و سخن'' میں چند کے علاوہ تمام کی کاوشیں اچھی رہیں۔''

✠ روبینہ اشعر کا تبصرہ کراچی سے۔ ''ستمبر 2023ء کا شمارہ تھوڑا لیٹ ملا۔ اس میں سارا قصور ہماری سستی کا ہی تھا کیونکہ مارکیٹ کافی دن بعد جانا ہوا تھا۔ بک اسٹال پر سسپنس پر نظر پڑتے ہی فوراً خرید لیا۔ ٹائٹل پر گلابی کپڑے پہنے سیدھی سادی، صحت مند حسینہ، کھوجتی ہوئی نگاہ کے ساتھ براجمان تھی۔ فہرست پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے جون ایلیا کے انشائیے پر پہنچے جہاں وہ اپنے ہمزاد کو اپنی خواہشات بتا رہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ نئی نسل کے مقتدر سیاست دان نئی توانائی، نئے حوصلے اور نئے ولولے کے ساتھ اپنی صف بندی کریں، ایسی صف بندی جو اس ملک کے تمام محروم عوام کے لیے زندگی خیز اور دل انگیز امیدوں کا جاں پرور سرمایہ قرار پائے۔ اللہ پاک ان کی یہ خواہش جلد از جلد پوری کرے۔ اس ملک کو واقعی نئے جذبے اور نئے حوصلے کی ضرورت ہے۔ خطوط کی

www.pklibrary.com

محفل میں ایڈیٹر تعلیمی اداروں میں منشیات کے استعمال اور تعلیمی اداروں کی لوٹ کھسوٹ، ان کی تباہی و بربادی کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ پڑھ کر دل پر بوجھ سا پڑ گیا۔ ناہید یوسف کافی عرصے بعد محفل میں نظر آئیں اور آتے ہی کرسیِ صدارت پر براجمان ہو گئیں۔ تبصرہ بھی خوب کیا۔ محمد آذین رضوان بھی کافی عرصے بعد نظر آئے۔ بھئی ہر ماہ کی حاضری یقینی بنائیں۔ جنید علی کا تفصیلی تبصرہ حسبِ معمول شاندار تھا۔ ملک وحید مختصر تبصرے کے ساتھ حاضر رہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے نازیہ کامران کا شف کی تحریر ''شاکا'' کا پانچواں حصہ پڑھا۔ ہر قسط پہلے سے بڑھ کر ہے، عفریت انسانی روپ میں انسانوں کے درمیان موجود ہیں۔ بدکال کا دروازہ کھولنے والی لورین ہی تھی جو اپنے اصل روپ میں آ گئی۔ جوشوا کی تیار کردہ ویکسین کی تباہیاں اپنے عروج پر ہیں۔ نازیہ جی کی گرفت کہانی اور اس کے پلاٹ پر بہت مضبوط ہے اور تحریر پڑھنے والے کو اپنے سحر میں مبتلا کیے رکھتی ہے۔ آخر میں (باقی آئندہ) دیکھ کر سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ تاریخی کہانی میں اے آر راجپوت کی تحریر ''انتر انتر داستان'' میں مغل حکمران ظہیر الدین بابر کے دور کے واقعات پڑھنے کو ملے۔ شیر شاہ کے بارے میں مفید معلومات ملیں۔ عیوق بخاری کی تحریر ''قیمتی متاع'' اچھی رہی۔ وطن کے حصول میں دی گئی قربانیوں کو سر اکرم نے اپنے شاگردوں پر بہت اچھے طریقے سے اجاگر کیا۔ عائشہ نصیر کی تحریر ''بے نیاز'' بھی خوب رہی۔ ملک صفدر حیات کی تحریر ''آوازِ حق'' ہمیشہ کی طرح سسپنس اور ایکشن سے بھرپور رہی۔ ملک صفدر حیات کی کڑی تفتیش کے باعث فضلو کے قاتل کیفر کردار کو پہنچے۔ ناہید سلطانہ اختر کی ''روٹی کا چکر'' مختصر مگر پُرتاثیر تحریر تھی۔ اپنے خاندان کی خوشیوں اور آسائشوں کے لیے پردیس جانے والوں کا المیہ پڑھنے کو ملا۔ واقعی روٹی کا چکر بہت ظالم چکر ہے۔ کبھی ہمارے چاہنے والوں کو ہم سے دور لے جاتا ہے اور کبھی ہم خود اپنے چاہنے والوں کو جدائی کا دکھ دے کر ان سے دور نکل آتے ہیں۔ شاہ سنان کی ''ظاہر و باطن'' پسند آئی۔ مسٹر اور مسز فرنانڈس اپنے بچوں کی بے وفائی کے باعث تنہائی کی زندگی گزار رہے تھے مگر جائداد کے لالچی بیٹوں نے اپنے بچوں کو ان کے پاس بھیجا اور ایلی نے بظاہر اچھا بن کر انہیں بیوقوف بنانے کی کوشش کی لیکن فرنانڈس نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا اور ایلی کا باطن سب پر واضح کر دیا۔ ایلی اپنے دوغلے کردار کے باعث جائداد سے محروم رہی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''جنگ باز'' بھی اپنے ایکشن اور سسپنس کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کالا لہر والوں کی شعبدہ بازیاں بھی اپنے عروج پر ہیں۔ شاہد لطیف کی تحریر ''مکان اور مکین'' میں اسرار بھرے گھر کی پُراسرار راتوں کی داستان نے کھڑے کر دینے والی روداد پڑھنے کو ملی۔ اچھی تحریر تھی۔ ضیاء تسنیم بلگرامی کی تحریر ''سید محمد مہدی جونپوری'' کا دوسرا اور آخری حصہ بھی خوب رہا۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کی تحریر ''آخری شام سے پہلے'' کا تیسرا حصہ بھی زبردست رہا۔ پابندیوں سے باغی صالح کی نافرمانیاں اپنے عروج پر ہیں۔ وکی کی اصلیت آہستہ آہستہ صالح پر واضح ہو رہی ہے۔ صالح اور آفرین کی جدائی میں وکی کا کردار کھل کر صالح پر آشکار ہو گیا۔ آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ محفل شعر و سخن بھی خوب سجی رہی۔ مجموعی طور پر ماہ ستمبر کا رسالہ بہترین رہا۔''

✻ سید محی الدین اشفاق کی خوشی فتح پور، لیہ سے۔ ''ڈائجسٹ کی انتظامیہ، خطوط کی محفل کے ساتھیوں اور قابلِ قدر لکھاریوں کو یہ اطلاع بڑی خوشی سے دی جاتی ہے کہ اس بار ہمارا محبوب رسالہ بغیر انتظار کی سولی پر لٹکائے 27 اگست کو مل گیا جو کہ بہت بڑی کامیابی لگ رہی ہے۔ یعنی ہم رسالہ جلدی پڑھنے میں، حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آپ سے اپیل ہے کہ ہمارے حق میں یہ دعا کریں کہ شمارہ ہر ماہ اسی طرح جلدی مل جایا کرے، آمین۔ اور ساتھ ہی دل سے یہ بھی دعا کریں کہ ہماری نوجوان نسل مطالعے کی شوقین بن جائے۔ یقین کریں جو نوجوان کتاب پڑھتے ہیں ان کی ذہنی نشوونما بہت بہتر ہوتی ہے لفاظی بڑھتی ہے اور بُرے بھلے کی پہچان ہوتی ہے۔ کچھ وقت اس شوق کی نذر کریں تو کئی برائیوں سے بچا جا سکتا ہے۔ کھیل اور مطالعہ دونوں کسی بھی قوم کی نوجوان نسل کے لیے بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ میدان اور کتاب، دونوں کو چھوڑ کر صرف موبائل کی اسکرین پر نظر جما لینے سے ہم نے صرف نقصان اٹھایا ہے۔ کتاب کا مطالعہ شخصیت میں نکھار اور کردار سازی میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اگر سولہ، سترہ یا اٹھارہ سال کے لڑکے لڑکیاں منشیات، قتل، ڈاکے، جرائم اور دیگر معاشرتی برائیوں کے متعلق کہانیاں پڑھیں، ان کے آخر میں بُرے لوگوں اور بُرائی کا انجام دیکھیں تو یقینی بات ہے وہ برائیوں سے باز رہیں گے اور اسی طرح مزاح اور دیگر ہلکے پھلکے موضوعات کی تحریریں زندگی میں مسکراہٹ اور دلچسپی کا باعث بن کر کسی منفی دلچسپی سے روکے رکھیں گی۔ یہ والدین، اساتذہ اور میڈیا کی ذمے داری ہے کہ بار بار کتاب کی اہمیت، تحریروں کی خوبصورتی و دلچسپی پر بات کریں اور بچوں کو جاسوسی، طنز و مزاح، تاریخ، سائنس، سیاست، معاشرتی رویوں پر مبنی تحاریر پڑھنے پر راغب کریں۔ اسکول و کالجز میں پرنسپل بچوں کو یہ کہہ کر مطالعے کی عادت ڈال سکتے ہیں کہ جو طالبِ علم لائبریری میں اپنا فارغ وقت گزارتے ہوئے کہانیاں پڑھے گا اسے اضافی نمبر دیے جائیں گے اور زیادہ کتب کا مطالعہ کرنے والوں کو انعام دیا جائے گا۔ اگر ہم تھوڑا عرصہ ہی یہ کر لیں تو بڑی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ بس چند ماہ یا زیادہ سے زیادہ سال ڈیڑھ سال ایسا کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد تو مطالعے کی لگن ''لت'' خود ہی بچوں کو لائبریریوں میں لے جائے گی۔ اللہ کرے کوئی میری اس بات پر غور کرے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی جانب۔ سب سے پہلے ناہید سلطانہ اختر کی

www.pklibrary.com

''روٹی کا چکر'' پڑھی۔ واقعی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ نہ جانے کب تک معصوم دل اسی طرح بے کل ہوتے رہیں گے۔ اس کے بعد عیوق بخاری کی ''قیمتی متاع'' پڑھی۔ پاکستان کی بنیاد رکھنے والے محسنوں کا تذکرہ آنکھیں بھگو گیا اور واقعی جی چاہا کہ کاش وہ سامنے صرف ایک بار آ جائیں تو انہیں سیلیوٹ کریں۔ سر اکرم کا کردار بہت متاثر کن رہا۔ استاد اگر سکھانے پر آ جائے تو شاگرد ضرور بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ بہت عمدہ کہانی تھی۔ شاہد لطیف کی ''مکان اور مکین'' میں تفہیم کی موت نے دکھی اور خوفزدہ کیا۔ پراسرار تحریروں کی یہ خصوصیت ہے کہ تھوڑا بہت سہی، ڈراتی ضرور ہیں۔ شاہ سنان کی ''ظاہر و باطن'' میں چالاک ایلی کے ساتھ وہی ہوا جو ایسے لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ گلوریا اور فرنانڈس نے بڑے اچھے انداز میں ایلی کی چال کا جواب دیا۔ ''شاکا'' کو نازیہ کامران کا شف بہت شاندار طریقے سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ عائشہ نصیر، اسما قادری کی تحاریر بھی اچھی تھیں، ویل ڈن۔ وطن اور اہلِ وطن کے لیے خوشیوں کی دعا کے ساتھ والسلام۔''

✠ سیتا شاہ، ڈیرہ غازی خان سے خط لکھ رہی ہیں۔ ''ماہ ستمبر کا شمارہ اگست کی آخری تاریخوں میں ہی مل گیا تھا مگر جہاں سب مطالعے کے شوقین ہوں، وہاں رسالہ پڑھنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جس کسی کے ہاتھ میں سسپنس لگ جاتا ہے، وہ یوں باقی سب سے لاتعلق ہو جاتا ہے کہ یاد کروانا پڑتا ہے کہ ''کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا'' (ہاہاہا)۔ انشائیہ پڑھ کر خطوط کی محفل میں پہنچے۔ ناہید یوسف اچھے حکمران ملنے کی دعا کر رہی تھیں۔ ناہید جی، آمین مگر بدقسمتی سے ہمیں ایسے حکمران ملے ہیں جو عوام کا آج قربان کر کے اپنا (حکمرانوں کا) کل بنا رہے ہیں۔ حکمرانوں کو فکر ہے تو بس اپنی کرسی کی۔ جنید علی نے طویل اور بہترین تبصرے کے ساتھ انٹری دی۔ ٹھیک کہا آپ نے، نئی نسل کو تو جدید ٹیکنالوجی نے لفظ کتب بینی کا مطلب تک نہیں سمجھنے دیا۔ شکر ہے ہمیں اپنے بچپن میں سسپنس، جاسوسی پڑھنے کو ملے۔ انہی کے مطالعے کی وجہ سے ہم اردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے (تلفظ) میں اچھے ہیں۔ روبینہ اشعر..... میں دعا کروں گی کہ کراچی کے جن علاقوں میں بارش نہیں ہوئی، وہ سوکھے نہ رہیں اور جہاں ''زیادہ بارش کی وجہ سے زیادہ پانی ہے'' وہاں کا پانی نکال کر عوام کو ریلیف دیا جائے۔ تبصرہ اچھا تھا۔ ملک وحید اور آذین رضوان کے تبصرے اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ''روٹی کا چکر'' پڑھی۔ مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ شاہ سنان کی ''ظاہر و باطن'' بہت پسند آئی۔ ایلی نے اچھا ہونے کا ڈراما کیا اور اپنے ساتھ بُرا کروا لیا۔ عیوق بخاری کی ''قیمتی متاع'' دل کو چھو گئی۔ وطن عزیز کے قیام کے لیے قربانیاں دینے والے ہمیشہ دلوں میں زندہ رہیں گے۔ ''شاکا'' تحریر نازیہ کامران کا شف، ایک ایک سطر میں دلچسپی سموئے ہوئے ہے۔ بہت مضبوط گرفت ہے رائٹر صاحبہ کی کہانی پر، ویلڈن۔ ''مکان اور مکین'' اچھی تحریر تھی۔ اچھی اس لیے کہ پراسرار بنانے کے چکر میں زیادہ دہشت نہیں پھیلائی گئی ورنہ میں تو نہ پڑھ سکتی۔ ''بے نیاز'' تحریر عائشہ نصیر، قدرے الجھی ہوئی لگی اور کچھ بے ترتیب بھی۔ شاید یہ صرف میرا ہی خیال ہو مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ اگر ترجمہ کر کے تحریر لکھی ہو تو اسے ہو بہو (ترجمہ) کرنے کے بجائے اپنے الفاظ میں ڈھال لیا جائے تو دلچسپی کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے اور تحریر کو سمجھنے میں مشکل نہیں ہوتی۔ ''شہ زور'' زبردست رہی اور کہانی دلچسپی قائم رکھے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے۔ ''جنگ باز'' تھوڑی سست روی کا شکار لگی۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ سسپنس و جاسوسی ڈائجسٹ اور ان کی پوری ٹیم کے لیے دعا گو۔''

✠ ملک وحید کا مختصر نامہ کراچی سے۔ ''ستمبر 2023ء کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ بک اسٹال پر سسپنس کا ٹائٹل دور سے ہی نظر آ گیا، فوراً خرید لیا۔ جون ایلیا کا انشائیہ حسبِ معمول پُرمغز تھا۔ خطوط کی محفل میں ناہید یوسف، محمد آذین رضوان، جنید علی، روبینہ اشعر کی حاضری بھرپور رہی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اے آر راجپوت کی تاریخی کہانی ''انتر انتر داستان'' پڑھی اور تاریخ سے آگاہی حاصل ہوئی۔ نازیہ کامران کا شف کی تحریر ''شاکا'' کا پانچواں حصہ بھی خوب رہا۔ عفریتوں اور جوشوا کی تیار کردہ ویکسین کی تباہی اپنے عروج پر ہے۔ عائشہ نصیر کی کہانی ''بے نیاز'' بھی زبردست تھی۔ عیوق بخاری کی ''قیمتی متاع'' شاندار تحریر تھی جس میں وطنِ عزیز کے حصول میں دی گئی قربانیوں کو اجاگر کیا گیا۔ ملک صفدر حیات کی تحریر ''آوازِ حق'' سسپنس اور ایکشن سے بھرپور رہی اور آخر میں مجرم کیفر کردار کو پہنچے۔ شاہ سنان کی ''ظاہر و باطن'' بھی خوب رہی، لالچ کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کی مختصر تحریر ''روٹی کا چکر'' اچھی رہی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''جنگ باز'' بھی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ شاہد لطیف کی تحریر ''مکان اور مکین'' کچھ خاص نہیں لگی۔ ضیاء تسنیم بلگرامی کی تحریر ''سید محمد مہدی جونپوری'' کا دوسرا اور آخری حصہ بھی اچھا تھا۔ طاہر جاوید مغل کی تحریر ''آخری شام سے پہلے'' کا تیسرا حصہ بہترین تھا۔ محفل شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب بہترین تھا۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

ریحانہ عطاء اللہ، ملتان۔ حمیرا اقبال، کوٹری۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ مہتاب احمد، حیدر آباد۔ صبا سحر، کراچی۔ رانا محمد ارشد، فیصل آباد۔ ناصر محمود، پھالیہ۔ طاہر مجاہد، میانوالی۔ رانا مجھا۔ میاں ارشاد احمد، قادر آباد۔

www.pklibrary.com

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

شعلہ شب گیر

اے آر راجپوت

محبت... نہ حال دیکھتی ہے نہ ماضی، نہ مستقبل... اسے تو ہر دور میں بس اپنی من مانی کرنے کی عادت ہے... جب چاہے، اور جس دل میں چاہے گھر کر جائے اور اہلِ دل کو بے گھر کرکے در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کردے... جانے خدا نے اس میں کیا سحر رکھا ہے جو نظر نہیں آتا... اس کے باوجود قید کرلیتا ہے... یہ اگرچہ ماضی کے اوراق کا جادو ہے مگر جب جب اسے پڑھا جائے گا، پڑھنے والا بھی بے خود ہوجائے گا... دل پر اثر کرنے والے ایسے کرداروں کی قربانیاں جو اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے جینے کی کوشش کرتے رہے، دوسروں کی آگ میں خود کو جلاتے رہے... یہ ایسی کردار تھے جو خود کو تاریخ میں امر کرگئے... اختیارات کی جنگ ہمیشہ قوموں کے فسادات کو ہوا دیتی ہے اور انگریز دشمن نے تو ہمیشہ سے اپنا الگ رنگ جمایا ہے جسے اتارنے کے لیے مسلمانوں کے اتحاد نے ہمیشہ دل گداز کہانی رقم کی ہے۔

www.pklibrary.com

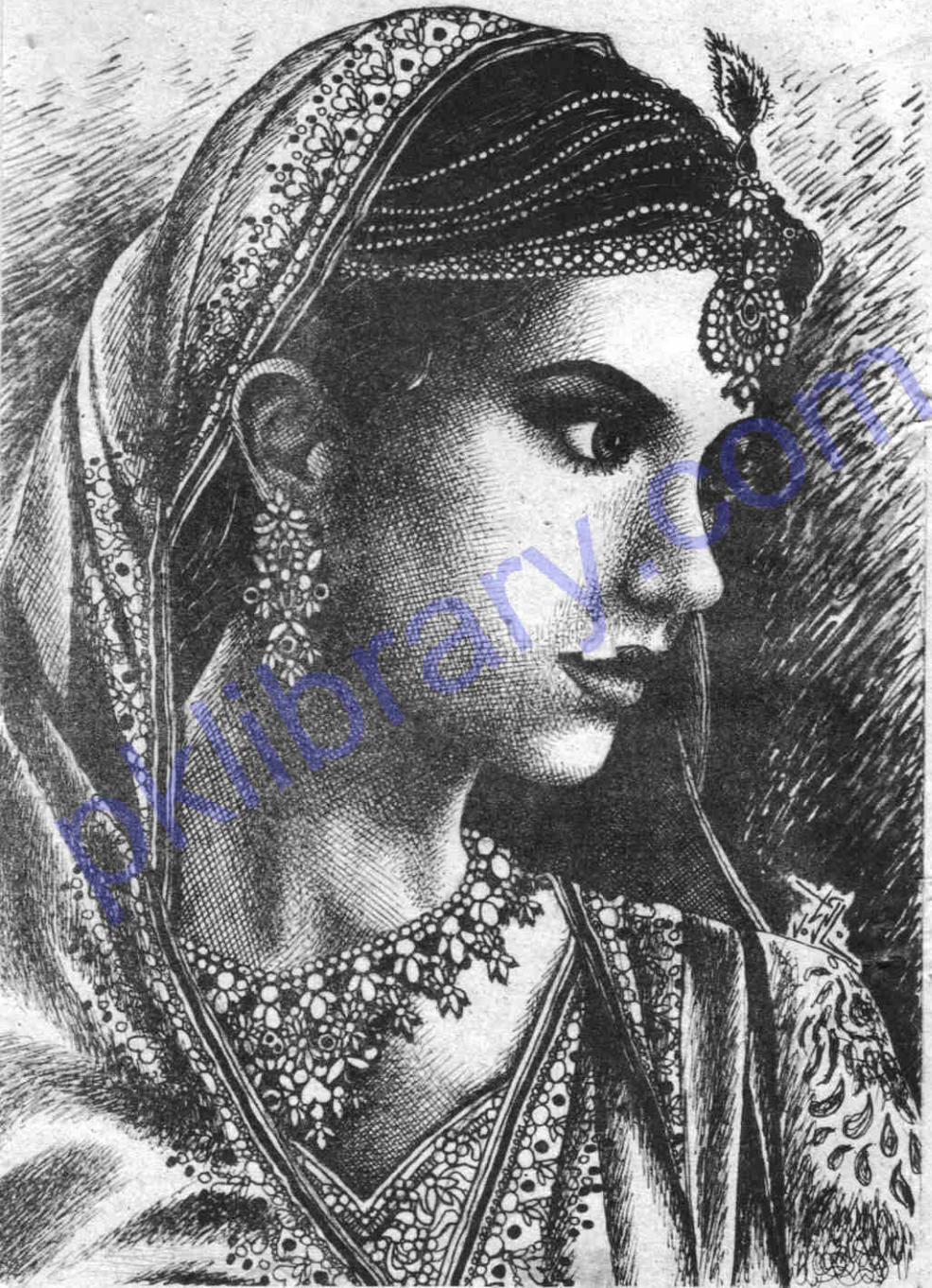

pklibrary.com

www.pklibrary.com

اس نے نظر بھر کر سامنے دیکھا، گھوڑے کے ایال سہلائے پھر ایڑ لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ شہر پناہ میں داخل ہو چکا تھا۔ شام کی نوبت بجی اور برج کے اندر رکھی ہوئی روشن چوکی کی آواز نے اس بات کا اعلان کیا کہ گومتی کے کنارے سے اٹھتی ہوئی شام کی دھندلاہٹیں فضا میں پھیل چکی ہیں۔ مسجدوں میں اذان ہوئی اور اکبری دروازے سے جلو خانے تک دکانوں پر قندیلیں روشن ہوتی گئیں اور اسی بھیڑ بھاڑ میں شوکت مرزا اپنے گھوڑے سے اتر کر سرائے کی طرف چلا گیا۔

مارچ 17 18ء کی یہ شام شوکت مرزا کے لیے کئی اعتبار سے بہت اہم تھی۔ وہ اس ہنگامہ خیز ماحول میں سر جھکائے چلا جا رہا تھا لیکن اس کی نظروں میں جو حیرت تھی اور جس استعجاب سے وہ دکانوں کی طرف دیکھ رہا تھا، اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اجنبی ہے۔

رحیم خاں کی سرائے میں پہنچتے ہی اس نے بھٹیارن کے ہاتھ پر ایک اشرفی رکھی۔ گھوڑا باندھ دیا گیا اور شوکت مرزا کمرے کے سامنے بچھی ہوئی مسہری پر بیٹھ گیا۔ بھٹیارن نے پانی لا کر رکھا اور شوکت مرزا نے منہ ہاتھ دھویا۔ اتنی دیر میں اس کا بستر لگا دیا گیا اور پیچوان لا کر رکھ دیا گیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' شوکت مرزا نے پوچھا۔

''کنیز کو نورن کہتے ہیں۔ بندی ہمیشہ سے آپ جیسے رئیسوں کی خدمت گزار رہی ہے۔''

شوکت مرزا نے غور سے نورن کی طرف دیکھا۔ پچیس برس کی نورن اپنی عمر کے اعتبار سے کمسن معلوم ہوتی تھی۔ ہلکی سانولی رنگت، بال کالے اور آنکھوں میں کاجل تھا۔

''تم بتا سکتی ہو کہ نواب حشمت جنگ سے ملاقات ہو سکے گی؟''

نورن نے چونک کر ایک بار سر سے پیر تک شوکت مرزا کو دیکھا پھر عجیب سے انداز میں بولی۔

''حضور نو وارد معلوم ہوتے ہیں؟''

''ہاں، تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟''

''اے حضور! خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔'' نورن مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تار باجا اور راگ بوجھا۔ بھلا آج کے دن کوئی نواب حشمت جنگ کو پوچھے اور اجنبی نہ معلوم ہو؟''

''کیوں..... بھلا نواب صاحب میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟''

''بندی کیا جانے۔ البتہ پچھلی جمعرات کو جب درگاہ پر علم چڑھانے گئی تھی تو سنا تھا کہ نواب صاحب قبلہ کو فرنگیوں نے قید کر لیا ہے۔ شاہ زمن (غازی الدین حیدر کو عوام وخواص ''شاہ زمن'' کے لقب سے یاد کرتے تھے) نے بہت کوشش کی مگر کچھ ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔''

شوکت مرزا نے کان کھڑے کر لیے۔ جس بات کا دھڑکا تھا وہ سامنے آ گئی۔ وہ جب ٹونک سے چلا تھا تو اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہاں آ کر نواب حشمت جنگ کی گرفتاری کی خبر ملے گی۔ وہ ٹونک سے منزلوں پر منزلیں مارتا ہوا لکھنؤ صرف اس امید پر پہنچا تھا کہ امیر خاں کا خط نواب حشمت جنگ کے حوالے کرنے کے بعد اپنی ذمے داریوں سے سبکدوش ہو جائے گا مگر یہاں حالات ہی بدلے ہوئے تھے اس لیے شوکت مرزا نے بات کاٹ دی اور بڑی خوبصورتی سے موضوع بدل دیا۔ کمرے میں خاموشی دیکھ کر نورن بھی تھوڑی دیر بعد اٹھ گئی اور وہ سو گیا۔

☆☆☆

رومی دروازے پر آدھی رات کو نوبت بجی اور یہی وہ وقت تھا جب شوکت مرزا کی آنکھ کھل گئی۔ ایک خوفناک چہرے والا آدمی اس کی مسہری کے قریب کھڑا تھا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف جھک رہا تھا۔

اک برق کی سی سرعت کے ساتھ شوکت مرزا نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں پھنسا کر جھٹکا دیا اور پھر اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی پیش قبض نکال کر نوک نرخرے پر جما دی۔

''کون ہو تم؟'' شوکت مرزا نے سخت مگر دبے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اجنبی نے ڈھاٹا باندھ رکھا تھا جس سے چہرہ چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے اشارے سے شوکت مرزا سے منت کی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ شوکت مرزا نے پیش قبض ہٹا لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اب وہ بڑے دھیان سے اجنبی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بہت دور ایک مسافر کا پلنگ تھا اور سرائے میں سناٹا۔ شمعیں گل کر دی گئی تھیں اور نصف رات کے پہر میں نکلتے ہوئے چاند کی ہلکی روشنی میں اجنبی، شوکت مرزا کو پہچاننے کی سعی کرنے لگا۔

تب ہی اس نے کہا۔ ''تم شوکت مرزا ہو؟''

''ہاں۔'' شوکت مرزا نے حیرت سے کہا۔

''امیر خاں کا پیغام حشمت جنگ کے پاس لے کر آئے ہو؟'' شوکت مرزا نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

www.pklibrary.com

"حشمت جنگ کو پہچانتے ہو؟"

"ہاں..... مگر تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

جواب میں یکا یک اجنبی نے ڈھاٹا کھول دیا۔ اس کی ڈاڑھی بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھی، چہرہ ملگجا تھا اور آنکھوں میں لپکتی شعلگی اور وحشت میں ایک برق تپاں فروزاں تھی جس سبب شوکت مرزا اس چہرے کو لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

نواب حشمت جنگ اس کے لیے کبھی اجنبی نہیں ہوسکتے تھے۔ وہ فوراً نواب صاحب کی تعظیم کے لیے جھکا اور آداب بجالایا۔

حشمت جنگ نے ایک سرد سی ہنکاری بھری اور کہنے لگے۔

"گردشِ فلک نے مجھے کسی عزت واحترام کے قابل نہیں رکھا۔ بیٹے! میری ساری املاک ضبط ہوچکی ہے۔ قسمت برگشتہ ہے۔ میں آج قید خانے سے نکل تو بھاگا ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ لکھنؤ کے در و دیوار میرے خون کے پیاسے ہیں اور فرنگی کتے میری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

شوکت مرزا نے بڑے درد سے نواب صاحب کی مختصر سی داستان سنی۔ فوراً اس کا ہاتھ جیب میں گیا۔ اس نے مہر بند لفافہ نکالا اور مہر توڑ کر ادب سے امیر خاں کا خط نواب صاحب کے ہاتھوں میں دے دیا اور کہنے لگا۔

"خان بہادر نے یہ پیغام آپ تک بھیجا تھا۔"

"وہ شاخ جل گئی عزیزم! جس پر ہم نشیمن بنانے جارہے تھے۔" حشمت جنگ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "میں نے امیر خاں کے پاس جو قاصد بھیجا تھا، اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کا جواب اس طرح بھیجیں کہ آج کے دن مجھ کو مل جائے لیکن اس سے پہلے ہی نمک حراموں نے ریذیڈنٹ کے کان بھرنے شروع کردیے اور میں موردِ عتاب ہوگیا۔ مجھے فکر تھی کہ امیر خاں نے تم کو ہی بھیجا ہوگا اور تم کسی مصیبت میں پھنس گئے تو پھر مجھے بڑی ندامت ہوگی۔"

"یہ جناب کا کرم ہے لیکن آپ کو میرا اتنا خیال کیوں ہے؟"

"اب تمہیں کیا بتاؤں کہ مجھے تمہارا خیال کیوں ہے؟" حشمت جنگ اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے۔ "بہرحال، مجھے شام سے تمہاری فکر تھی۔ عشا کی نماز کے وقت میں قید خانے سے نکل سکا اور تب ہی سے تمہارا پتا لگاتے لگاتے یہاں تک پہنچا۔ یہاں بھی تمہیں پہچاننے میں کچھ زحمت ہورہی تھی۔"

"میں اپنی بدتمیزی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" شوکت مرزا نے دست بستہ ہوکر کہا۔

"تمہیں شرمندہ ہونے کی مطلق ضرورت نہیں بیٹے! اتنے دن کی قید نے میرے ہی حواس مختل کردیے تھے کہ میں چوروں کی طرح تمہیں پہچاننے کی کوشش کررہا تھا۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" شوکت مرزا نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے اشرفیوں کی وہ تھیلی دے دو جو تم میرے لیے لائے ہو۔"

شوکت مرزا نے اسی وقت تکیے کے اندر سے ایک چھوٹی سی تھیلی نکال کر حشمت جنگ کی طرف بڑھادی۔

"میں ٹونک جارہا ہوں۔ میں نے اپنے دوستوں کو بھی خط لکھا ہے۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو فرنگیوں کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔ اچھا خدا حافظ!" کہتے ہوئے حشمت جنگ کھڑے ہوگئے۔ وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش بھی کررہے تھے۔

"خیریت تو ہے، آپ کی آنکھوں میں آنسو؟" شوکت مرزا نے گھبرا کر پوچھ لیا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ میرے بچے کس حال میں ہیں۔ اگر کسی صورت میں تم میری مدد کرسکو تو میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا۔"

شوکت مرزا کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ جسے وہ حشمت جنگ کا احسان سمجھتا تھا، اسے حشمت جنگ اپنے اوپر احسان سمجھ رہے تھے۔ اس نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا کہ اگر میری جان بھی حضور کے کام آسکے تو انکار نہیں۔"

"تو پھر یہ لو۔" کہتے ہوئے حشمت جنگ نے اپنے بازو سے اکا (ایک تعویذ) اتار کر شوکت مرزا کے حوالے کیا اور اسے مکان کا پتا سمجھا دیا۔

☆☆☆

شوکت مرزا بڑی رازداری کے ساتھ حشمت جنگ کے بتائے ہوئے مکان تک پہنچا اور پھر اس نے جیب سے اکا نکال کر داؤد نامی شخص کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"گزشتہ رات قبلہ نواب صاحب نے مجھے یہ نشانی مرحمت فرمائی تھی اور حکم دیا تھا کہ میں آپ سے ملوں۔"

داؤد نے اکا ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا۔ تب ہی اس کے چہرے پر اچانک خوف و ہراس کے جذبات نمایاں ہوگئے پھر اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا نواب صاحب رہا ہوگئے؟"

"جی ہاں۔" شوکت مرزا نے کہا۔ "چونکہ آپ ان

www.pklibrary.com

کے معتمدِ خاص ہیں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ رات ہی وہ قید خانے سے نکل بھاگے ہیں اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں ان کے اہل و عیال کو ان تک پہنچا دوں۔"

"بہتر ہے۔" داؤد نے سوچنے کے سے انداز میں کہا۔ "تھوڑی دیر زحمت فرمائیں۔ اس کے بعد میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

داؤد یہ کہنے کے بعد لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے واپس ہوا اور دالان میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور یہ بات ان لوگوں سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکی جو وہاں موجود تھے۔

"قبلہ! کچھ متفکر ہیں؟"

"کوئی بات نہیں خان صاحب!" داؤد نے ٹالتے ہوئے کہا۔ "کچھ ایسی خانگی الجھنیں سامنے آ گئی ہیں جن کا تذکرہ مناسب نہیں ہے۔"

بیٹھے ہوئے لوگ بھی اس طرح چپ تھے جیسے انہوں نے یہ گفتگو سنی ہی نہ ہو البتہ شوکت مرزا نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ ایک ایک کر کے کھسکتے جا رہے ہیں۔ جب سبھی لوگ چلے گئے تو داؤد نے کہا۔

"بداخلاقی معاف کیجیے گا۔ میں اتنا بدحواس ہو گیا تھا کہ آپ سے کھانے کے لیے بھی نہ پوچھ سکا۔ بہرکیف، آپ کھانا کھا لیں، تھوڑی دیر آرام بھی فرما لیں پھر چلیں گے۔"

"نہیں جناب! مناسب یہی ہے کہ آپ اسی وقت مجھے نواب صاحب کے اہل و عیال تک پہنچا دیں۔"

جواب میں داؤد مسکرایا۔ اس نے تالی بجائی۔ ایک بلم بردار حاضر ہوا۔

"پالکی حاضر کی جائے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم لوگ پیادہ چلیں۔" شوکت مرزا نے کہا۔ داؤد نے اس طرح چونک کر شوکت مرزا کو دیکھا جیسے وہ آدمی نہیں، صحرائی جانور ہو پھر قدرے کبیدگی سے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ رازداری کی وجہ سے ایسا فرما رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"پھر اطمینان رکھیے، آپ پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔"

پالکی آئی، دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ کہاروں نے بسم اللہ کہہ کر پالکی اٹھائی اور دایاں، بایاں کہتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

"نواب بڈھن صاحب کے یہاں چلو۔" داؤد نے حکم دیا۔

پالکی شہر کی سڑکوں سے گزرتی ہوئی گلیوں میں داخل ہو رہی تھی پھر تھوڑی ہی دیر میں ایک مکان کے سامنے روک دی گئی۔ شوکت مرزا اور داؤد اترے۔ داؤد نے دروازہ کھٹکھٹایا، ایک لونڈی باہر نکلی اور دروازے کی اوٹ سے بولی۔

"کسے پوچھ رہے ہیں آپ؟"

"بھئی قبلہ صاحب اگر ہوں تو ان سے کہہ دو کہ داؤد آیا ہے۔"

لونڈی الٹے پاؤں واپس گئی۔ چند لمحوں کے بعد صدر دروازے کی بغل کے اندر کے کمرے کے دروازے کھلے اور آواز آئی۔

"یہاں تشریف رکھیں، قبلہ صاحب ابھی تشریف لا رہے ہیں۔"

شوکت مرزا اور داؤد دونوں بیٹھ گئے۔

سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا، وسط میں گاؤ تکیہ رکھا تھا، سامنے اگالدان تھے، مخمل کی ہری چھت گیری لگی تھی۔ اتنے میں بڈھن صاحب اندر داخل ہوئے۔ داؤد اور شوکت مرزا تعظیم میں کھڑے ہو گئے۔

"بسم اللہ..... جناب ادھر تشریف لائیے۔" نواب بڈھن صاحب نے شوکت مرزا اور داؤد سے ادھر اشارہ کیا جدھر گاؤ تکیہ رکھا تھا۔

"نہیں، قبلہ آپ۔"

نواب بڈھن نے جھک کر تسلیم کی اور جا کر بیٹھ گئے۔

"کیا بتاؤں قبلہ! ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ اب عزیزوں کی صورت کو بھی نظر لگ گئی ہے۔" نواب بڈھن صاحب بولے۔ "لحن داؤدی کے لیے کان ترستے ہیں۔"

"لاجواب باتوں کا بھی کہیں جواب ہوتا ہے؟" داؤد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "حضور کے سامنے نطق بھی گونگا ہو جاتا ہے۔ خیر، یہ تو فرمائیے میاں بہادر کا کیا حال ہے؟"

"خدا کا شکر ہے۔ ادھر تو چشم بددور، بہت اچھی صحت ہے۔ مقویات کے بعض نسخے میاں بہادر کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے ورنہ بھائی اس کی کمزوری دیکھ کر تو رونا آتا تھا۔"

"نصیب دشمناں، کیا خدانخواستہ طبیعت خراب تھی برخوردار کی؟" شوکت مرزا نے گھبرا کر سوال کیا۔

"ضعف و اختلاج ہر وقت پروں میں چونچ ڈالے پڑا رہتا تھا۔"

"جی..... کیا فرمایا آپ نے؟" شوکت مرزا نے چونک کر پوچھا۔ "پروں میں چونچ ڈالے..... آپ کسی میاں بہادر کا ذکر فرما رہے تھے۔"

www.pklibrary.com

''جی ہاں، انہی کا تو ذکر ہے۔'' نواب بڈھن صاحب معصومیت سے بولے۔

''اچھا..... تو یہاں کے بہادروں کے بھی پر نکل آئے۔'' شوکت مرزا نے معصومیت سے کہا اور اس پر نواب بڈھن اور داؤد نے فرمائشی قہقہہ لگا کر داد دی۔

شوکت مرزا حیرت سے ان دونوں کا منہ تک رہا تھا کہ یکا یک داؤد نے سنجیدگی سے کہا۔

''قبلہ نواب صاحب! شوکت مرزا سے میں زیادہ واقف نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ آپ بیاکا لے کر آئے ہیں۔''

کہتے ہوئے داؤد نے اکا نکال کر نواب بڈھن صاحب کو دیا۔ نواب بڈھن نے پہلے اکا پر نظر ڈالی پھر شوکت مرزا کو غور سے دیکھا پھر بے اختیار اٹھ کر شوکت مرزا سے لپٹ گئے اور بولے۔

''جلدی بتاؤ، وہ کہاں ہے..... خیریت سے ہے نا..... تم نے اسے کہاں دیکھا..... کس حال میں دیکھا؟''

شدتِ جذبات تلے ان کی آواز کانپ رہی تھی اور آنکھوں سے بے تحاشا آنسو گر رہے تھے۔ داؤد بھی آبدیدہ ہو گیا۔

''نواب صاحب بخیر ہیں۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ان کے بچوں کو ان تک پہنچا دوں۔''

''تم ٹھہرے کہاں ہو؟''

''رحیم خاں کی سرائے میں۔''

''واللہ! یہ نہیں ہو سکتا۔'' نواب بڈھن صاحب جوش میں آ کر بولے۔ ''غضب خدا کا۔ میرے بھائی کا فرستادہ اور سرائے میں ٹھہرے؟ میاں ابھی میں زندہ ہوں۔ فوراً اپنا اسباب کل لے کر یہاں آ جاؤ۔''

شوکت مرزا جب سرائے پہنچا تو نورن نے اس طرح استقبال کیا جیسے وہ بڑی دیر سے اس کا انتظار کر رہی ہو۔ اسی لہجے میں اور ذرا شوخی سے بولی۔

''حضور تو دن میں چاند کی طرح ڈوب گئے۔ خیر، صبح کا بھولا شام کو آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔''

''میں ابھی جا رہا ہوں نورن!'' شوکت مرزا نے کہا۔

''کہاں؟ کب تک واپس آیئے گا؟''

''بھئی میں ٹونک جا رہا ہوں۔''

''ارے، اتنی جلدی؟'' نورن کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ اس نے مایوس لہجے میں آگے کہا۔ ''کیا مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہے؟''

''نہیں، نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ سچ پوچھو تو جس محبت کا برتاؤ تم نے کیا، اسے میں زندگی بھر نہ بھلا سکوں گا۔''

''سچ.....؟'' نورن نے کہا اور اچانک خاموش ہو گئی۔ نگاہیں جھکی رہیں۔ وہ دوپٹے کے آنچل کو اپنی مخروطی انگلی سے مروڑ رہی تھی۔

''اچھا بھئی مجھے اجازت دو۔ تمہارے اور بھی مسافر ہیں، انہیں دیکھو۔''

''حضور! اپنی سرا میں ایک ہی مسافر آیا تھا۔ وہ بھی لوٹ کر لے گیا۔ سچ کہا ہے کسی نے..... پردیسی اور پنچھی کسی کے میت نہیں ہوتے۔'' پھر ایک لحظہ ٹھہر کر دوبارہ بولی۔

''اتنا تو بتا دیجیے کہ اب میں آپ کو کب دیکھ سکوں گی۔ آنکھوں کو انتظار رہے گا۔''

''اچھا نورن! اگر زندگی نے مہلت دی تو ایک بار ضرور ملوں گا۔'' یہ کہہ کر شوکت مرزا اچھل کر گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ اسے ایڑ دی اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو اڑتی ہوئی گرد میں نورن کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

وہ اسی طرح کھڑی تھی۔ اس کی نگاہوں میں شدید حیرت تھی، کسک تھی۔ ایک ایسی کسک جو کچھ کھو دینے کے بعد اور کچھ پانے کی موہوم تمنا کا نتیجہ ہوا کرتی ہے لیکن شوکت مرزا اس کے جذبات سے بے خبر نواب بڈھن صاحب کے یہاں جا رہا تھا جہاں دردانہ تھی۔

☆☆☆

دردانہ..... اس کے خوابوں اور اس کی آرزوؤں کی ملکہ تھی۔ دونوں یارانِ دیرینہ کا سامنا ہوا۔ تبسم کی بجلیاں ہونٹوں پر لہرائیں، نگاہوں کی قندیلیں مل کر اور درخشاں ہوئیں، ارادے بندھے، دلِ بے قرار کو سکون نصیب ہوا۔ اگرچہ پردے کا ایک تیر سا درمیان میں حائل رہا اور دل کی کسک بڑھاتا رہا، آرزو کو جلا بخشتا رہا اور تڑپتی بے چینیوں کو سواکرتا رہا۔

حقیقت یہی تھی کہ دردانہ کا تعلق ایک خالص نوابی گھرانے سے تھا اور شوکت مرزا ایک عام سپاہی۔ جانے کب اور کیسے وہ دونوں پردے کے پیچھے ہی پیچھے ایک دوسرے کے عشق باپردہ میں گرفتار ہو گئے تھے اور کئی بار شوکت مرزا نے کوشش کی کہ وہ دردانہ کا پورا چہرۂ مہتاب دیکھ ڈالے مگر اقدارِ اہلِ خانہ آڑے آتی رہی۔

شوکت مرزا نے بارہا پورا چہرہ دیدار کرانے کی درخواست عاجزانہ کی تھی مگر شرم اور لاج کا بہانہ کر دیا جاتا۔ ایسے میں کبھی کبھی شوکت مرزا کو لگتا جیسے اسے کم مائیگی کا احساس ہونے لگا ہو۔ بھلا یہ کیسی محبت تھی کہ دیدارِ رخ ہی نہ ہو محبوب کا اور بہانہ خاندانی اقدار اور نجابت کا کیا جائے؟ وہ

www.pklibrary.com

کبھی جھلا بھی جاتا۔

اس کے بعد دوسرے ہی دن شوکت مرزا، دردانہ اور اس کی ماں کو لے کر چل پڑا۔ نواب بڈھن نے ایک ارابے (بیل گاڑی، چھکڑا) کا انتظام کر دیا تھا جس پر دردانہ اور اس کی ماں سوار تھیں۔ تھوڑا سامان اسی پر رکھ دیا گیا اور شوکت مرزا گھوڑے پر سوار، ارابے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ یہ مختصر سا قافلہ ٹونک کی طرف جا رہا تھا۔ شوکت مرزا راستے کے خطرات سے ناواقف نہ تھا اس لیے اس نے یہ اہتمام کیا تھا کہ سفر دن میں کیا جائے اور رات کسی آبادی میں بسر کی جائے۔

کسی قافلے کے ساتھ چلنے کے بجائے شوکت مرزا نے تنہا سفر اختیار کرنے میں مصلحت جانی تھی۔ اس لیے کہ قافلے عام طور پر لٹا کرتے تھے اور لوٹنے والوں سے شوکت مرزا بے خبر بھی نہ تھا۔ زمانہ ایسا تھا، جب ہندوستان کی شیرازہ بندی بکھر چکی تھی۔ دہلی کی بادشاہت دھیرے دھیرے قلعے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اودھ بظاہر خوش نصیب تھا۔ یہاں کے نواب پر لارڈ ہیسٹنگز کی نظر عنایت تھی لیکن لوگ یہ جانتے تھے کہ یہ عنایت بے سبب نہیں ہے بلکہ مرحوم سعادت علی خاں کے حسنِ انتظام سے جو بے پناہ دولت نوابین اودھ کے خزانے میں اکٹھی ہو گئی تھی کمپنی بہادر اسے حاصل کرنا چاہتی تھی اور اودھ کے نواب بھی یہ جانتے تھے لیکن آپس کے اختلافات نے انہیں جکڑ رکھا تھا۔ حالانکہ وہ چاہتے تو اس وقت موقع سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس لیے کہ وسط ہند میں ایک نئی طاقت بڑی تیزی سے ابھر رہی تھی۔ یہ پنڈاری تھے۔

لارڈ ولزلی نے 1800ء میں امدادی صلح کے جس تصور کو عملی جامہ پہنایا تھا، اس کے نتیجے میں ہندوستانی راجاؤں اور نوابوں کی بہت بڑی فوج بیکار ہو چلی تھی۔ یہ بیکار لوگ سیاسی شعور تو نہیں رکھتے تھے لیکن انہیں اس کا احساس ضرور تھا کہ فرنگیوں نے صرف ان کی روزی پر لات نہیں ماری ہے بلکہ وہ ہندوستان کی فوجی طاقت کی ریڑھ کی ہڈی کو توڑ دینا چاہتے ہیں اور اس لیے ان کی گوریلا بغاوت عجیب وغریب ڈھنگ سے ابھری تھی۔ وہ لوٹ مار بھی کرتے تھے، قتل بھی کرتے تھے لیکن ان کا نشانہ عوام نہیں تھے بلکہ وہ لوگ تھے جو کمپنی بہادر کے حلیف یا وفادار تھے اور شوکت مرزا بھی پنڈاریوں کے گروہ کا ایک سربرآوردہ رکن تھا۔

شام ہو چلی تھی۔ افق پر نارنجی رنگ کی شعاعیں دھیرے دھیرے کم ہوتی جا رہی تھیں۔ ہلکا سا دھندلکا میدانوں پر پھیلتا جا رہا تھا۔ شوکت مرزا نے ارابے کے قریب گھوڑا لاتے ہوئے کہا۔

''شام ہو رہی ہے اور دور تک کسی آبادی کا پتا بھی نہیں چلتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟''

''ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں۔'' دردانہ آہستہ سے بولی۔

''آپ کو اس جنگل میں ڈر نہیں لگے گا؟'' شوکت مرزا نے مسکرا کر پوچھا۔

دردانہ نے ارابے کے تختے پر اپنی کہنیاں ٹکا دیں اور ہتھیلی پر رخسار رکھ کر ہلکے سے پردہ ہٹا کر جھانکا۔ شوکت مرزا بالکل ساتھ ہی ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی نظریں دردانہ پر پڑیں۔ وہ بے چین ہو گیا۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' شوکت مرزا نے آہستہ سے پوچھا۔

دردانہ نے نگاہیں جھکا لیں لیکن شوکت مرزا سے کچھ نہیں بولی۔ شوکت مرزا کا ذہن بھی دوسری طرف منتقل ہو گیا۔ وہ اب گاڑی بان سے باتیں کر رہا تھا۔ شام اب شب نو دمیدہ میں بدلنے لگی تھی اور سناٹے میں صدائے جرس (بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز) دور دور تک گونج رہی تھی۔ سامنے ایک شکستہ عمارت کا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ شوکت مرزا نے گاڑی بان سے مشورہ کیا اور اسی جگہ ارابہ ٹھہرا دیا گیا۔

''رات یہیں بسر کریں گے۔'' شوکت مرزا نے کہا۔

یوں دردانہ اور اس کی ماں اتر گئیں۔ مومی شمعیں روشن کی گئیں اور یوں گویا شکستہ حال عمارت کے نصیب جاگ اٹھے لیکن شوکت مرزا کے لیے ایک بات بہت حیرت انگیز ثابت ہوئی۔ پرانے طرز کی یہ حویلی نما عمارت جو صدیوں سے ویران پڑی رہی ہوگی، اپنے اندر ایسے آثار نہیں رکھتی تھی جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ یہاں برسوں تک انسانی قدم نہیں آئے ہوں گے۔

جس وسیع حجرے میں یہ لوگ مقیم تھے، وہاں نہ تو جالے تھے اور نہ چمگادڑیں اور نہ چڑیوں کے گھونسلے۔ کھڑونچے پر کہیں کہیں کبوتروں کی بیٹ تھی اور طاقوں میں مومی شمعوں کے ٹکڑے۔ آگ روشن کی گئی۔ دردانہ اور اس کی ماں نے مل کر کھانا تیار کیا۔ شوکت مرزا باہر بیٹھ کر گاڑی بان سے اس ویران حویلی کی تاریخ سنتا رہا۔ اتنے میں دردانہ کی ماں نے آواز دی۔ شوکت مرزا دروازے پر آ کر ٹھہر گیا۔

''آپ لوگوں نے بڑی زحمت کی۔'' اس نے کہا۔

www.pklibrary.com

احادیثِ نبویؐ کا پہلا مجموعہ

عہدِ نبویؐ میں اخبار و سیر اور احکام و سُنن کا تحریری سرمایہ جمع ہونا شروع ہو چکا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے ایک خطبہ دیا تھا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ ابو شاہؓ ایک یمنی صحابی کی درخواست پر آپؐ نے یہ خطبہ لکھ کر اُن کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطینِ عالم کے نام جو خطوط روانہ کیے وہ لکھے ہوتے تھے (ساٹھ ستر سال قبل) آپؐ کا وہ خط جو مقوقس شاہِ مصر کے نام بھیجا گیا تھا۔ ایک عیسائی گرجے کی کسی کتاب کی جلد میں لگا ہوا ملا ہے۔ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ بعینہٖ وہی نامہ ہے جو آپؐ نے لکھوایا تھا۔ یہ پُرانے عربی خط میں ہے۔ اس کی بعینہٖ وہی عبارت ہے اور مُہر میں نام کے وہی الفاظ اور صورتِ تحریر ہے جس طرح (صدیوں پہلے کی بیان کردہ) حدیثوں میں بیان آیا ہے۔ یہ اسلامی روایات کی صداقت کی کتنی بڑی دلیل ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے سوا مجھ سے زیادہ کسی کو زیادہ حدیث یاد نہیں۔ اور مجھ سے زیادہ اُن کے پاس حدیثوں کا سرمایہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آنحضرتؐ سے جو کچھ سُنتے، اس کو لکھ لیتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔ ابوداؤد اور مسند ابن حنبل میں ہے کہ کہ بعض لوگوں نے عبداللہ بن عمروؓ سے کہا:

"آنحضرتؐ کبھی غصّے کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوش رہتے ہیں اور تم سب کچھ لکھ لیتے ہو!" عبداللہ بن عمروؓ نے اس بات پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرتؐ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے دہنِ مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا۔ "تم لکھ لیا کرو۔ اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے۔" عبداللہ بن عمروؓ نے اپنے اس مجموعے کا نام "صادقہ" رکھا تھا۔ کہا کرتے تھے کہ مجھے اپنی زندگی کی آرزو صرف دو چیزوں نے پیدا کر دی ہے جن میں ایک یہ صادقہ ہے اور صادقہ وہ صحیفہ ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھا ہے۔

ماخوذ از خطبات مدارس، مصنفہ سید سلیمان ندوی

"یہ تو عورتوں کا کام ہے بیٹا!" دردانہ کی ماں نے آہستہ سے کہا۔ "بہو بیٹیوں کو چولہے کے پاس بیٹھنا اسی لیے سکھایا جاتا ہے کہ نہ معلوم کب کیسا وقت آن پڑے۔"

ان کی آواز میں افسردگی تھی۔ شوکت مرزا خاموشی سے بیٹھ گیا اور آفتابے میں ہاتھ دھونے لگا۔ دردانہ اور اس کی ماں کے لیے سچ مچ یہ بڑا بُرا وقت تھا۔ وہ بڑے گھر کی عورتیں تھیں جن کے سامنے ہر وقت باندیوں اور کنیزوں کے پرے کے پرے کھڑے رہتے تھے۔ وہ ہل کر پانی پینا نہیں جانتی تھیں اور آج وہ اس ویران شکستہ حال حویلی میں اینٹوں کے چولہے پر کھانا پکا رہی تھیں۔

بہرکیف، کھانا ختم کرنے کے بعد بھی شوکت مرزا بیٹھا رہا۔ دونوں ماں بیٹی نے بھی کھانا کھایا اور اس کے بعد دردانہ کی ماں نے چینی کی پیالی میں تھوڑی سی افیم گھولی اور مصری کی ڈلی کے ساتھ بڑے مزے سے اس کی چسکی لینے لگیں۔

دردانہ کا نقاب تو بہت پہلے ہی ہٹ چکا تھا اور یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب وہ پردہ نہیں کرے گی مگر وہ اب تک شوکت مرزا کی طرف پشت کیے بیٹھی تھی۔ دردانہ کی ماں نے بستر بچھا لیا اور تکیہ لگا کر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ پینک آ رہی تھی۔

"آپ بستر بچھا لیجیے۔" شوکت مرزا نے کہا۔

"اور آپ کہاں سوئیں گے؟"

"میری فکر نہ کیجیے۔" شوکت مرزا نے کہا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ اتنی بیزاری پر یہ خاطر اچھی نہیں لگتی۔"

"نوج..... بھلا کوئی آپ سے بیزار کیوں ہونے لگے؟"

"جی ہاں، بڑی لگاوٹ کا اظہار ہے یہ۔ اتنی دیر سے بیٹھا ہوں، آپ سے اتنا نہ ہو سکا کہ....."

"ہمیں شرم آتی ہے۔"

"یہ نہیں کہتیں کہ آپ مجھے غیر سمجھتی ہیں۔" کہتے ہوئے شوکت مرزا اٹھا مگر ابھی بھڑاس نہ نکلی تھی، آگے بولا۔ "اچھی بات ہے۔ آپ نواب حشمت جنگ کی صاحبزادی ہیں۔ بڑی آدمی ٹھہریں اور میں غریب سپاہی۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

اچانک دردانہ کے مڑنے کی وجہ سے اس کا جملہ ناتمام رہ گیا۔ وہ دردانہ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ آج ایک عرصے بعد ہی تو وہ محبوب کا یہ پورا چہرہ تصویر اپسرا کی صورت دیکھ رہا تھا۔ ایسی تصویر جسے اگر مصور بنانا چاہتا تو کسی شاعر سے تخیل کی نزاکت مانگ کر لاتا اور اگر کوئی شاعر

www.pklibrary.com

کہا۔ ''رہ گیا مشغلہ..... تو یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کے نام کی رٹ..... خدا کے نام کے بعد۔''

''کیوں مجھ پردیسی کو بے وقوف بنا رہی ہو۔''

ایک خادم نے اصطبل میں لے جا کر گھوڑا باندھ دیا۔ شوکت مرزا اوپر آیا اور نواب حشمت جنگ سے باتیں کرنے لگا۔ اوپری چھت پر اس کا بستر لگا دیا گیا تھا۔ پھولوں کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ سرہانے بیلے اور گلاب کے تازہ پھول رکھے ہوئے تھے۔ شوکت مرزا نے شبنمی کے پردے گرا دیے اور آنکھیں بند کر لیں مگر نیند کوسوں دور تھی۔ وہ کروٹ بدلتا رہا، رات ڈھلتی رہی۔

اچانک وہ چونک پڑا۔ ہلکی روشنی میں اسے ایک سایہ دکھائی دیا۔ پردہ اٹھا کر اس نے پوچھا۔ ''کون.....؟''

جواب میں ہلکی سی آہٹ ہوئی اور پھر وہ سایہ ایک مکمل صورت میں اس کے سامنے آ گیا۔ یہ روزلین تھی۔ پردہ اٹھا کر وہ بے تکلفی سے مسہری پر بیٹھ گئی اور پھر پردہ گرا کر بولی۔

''تم مجھے دیکھ کر متعجب ہوئے ہو گے؟''

''یقیناً..... مگر تم اس طرح کیوں آئی ہو؟''

''یہ نہ پوچھو۔'' روزلین نے بڑے رومانٹک انداز میں کہا۔ ''میرے دل کی دھڑکنیں البتہ جواب دے سکتی ہیں اور میری نگاہیں.....''

''میں اس طرح کی سستی جذباتی باتیں سننے کا عادی نہیں۔'' شوکت مرزا نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تم اب جاؤ۔''

''کیا تم اتنے بے وقوف انسان ہو کہ حسن کا احترام بھی کرنا نہیں جانتے؟''

''کیا تم اپنے آپ کو حسین سمجھتی ہو؟ اگر ایسا ہے تو بیوقوف میں نہیں، تم ہو۔ تمہیں دیکھ کر تو مجھے بریگیڈیئر ہارڈی مین کی بلی یاد آ جاتی ہے۔''

''شوکت ڈارلنگ!'' روزلین نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔'' وہ شوکت مرزا کے نزدیک آ گئی اور اس کے منہ سے نکلتی ہوئی بھاپ شوکت مرزا کے چہرے پر پڑی۔ اسے یقین ہو گیا کہ روزلین نے شراب پی رکھی ہے۔

''تم نشے میں ہو؟''

''ہاں، میں نے تھوڑی شیمپین پی ہے۔''

''شراب تمہیں ملی کہاں سے؟''

''میں اپنے ساتھ دو بوتلیں چرا لائی تھی۔'' روزلین اور نزدیک کھسک آئی۔

''تم اب چلی جاؤ۔'' شوکت مرزا نے نرمی سے کہا۔

''تم کیوں میرا دل توڑ رہے ہو؟'' روزلین نے کہا اور بے ساختہ شوکت مرزا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ شوکت مرزا جھلا کر ہٹا اور اس نے روزلین کو دھکیلتے ہوئے کہا۔

''تم جاؤ..... ورنہ میں تمہیں اٹھا کر پھینک دوں گا۔''

روزلین کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے سے جھلاہٹ نمایاں تھی۔ وہ شوکت مرزا کو گھور رہی تھی۔ ''تم مجھ سے محبت نہیں کرو گے؟''

''جبری محبت کا اصول میں آج تمہاری زبان سے پہلی بار ہی سن رہا ہوں۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' روزلین نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تم مجھ سے محبت کرتے ہو مگر چونکہ تم نواب حشمت جنگ کی لڑکی سے وابستہ ہو، اس لیے میری طرف توجہ نہیں دیتے مگر ایک بات یاد رکھو کہ تم ڈرڈ انہ کو بھی نہیں حاصل کر سکو گے۔''

''تم اس وقت شکست خوردگی اور محرومی کا شکار ہو۔''

''جو کچھ بھی ہو۔'' روزلین چیخ کر بولی۔ ''میں اپنی بے عزتی کا انتقام لوں گی۔'' شوکت مرزا کا جواب سننے سے پہلے ہی وہ پیر پٹختے ہوئے باہر چلی گئی۔

شوکت مرزا خاموش لیٹ گیا مگر اسے ڈک یاد آ گیا اور ڈک کا نام ذہن میں آتے ہی اسے وہ تمام باتیں یاد آ گئیں جو اس کے اور ڈک کے درمیان ہوئی تھیں۔ اس نے ڈک سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے دردانہ کا پتا دے گا۔

اب دردانہ لکھنؤ جا رہی تھی۔ اگر وہ اسے لکھنؤ جانے سے روک دے گا تب بھی اس کا اندیشہ تھا کہ ڈک یہاں کا پتا معلوم کر لے گا اور پھر ایسے افراتفری کے دور میں یہاں حملہ آور ہو کر دردانہ کو حاصل کرنا مشکل نہ ہو گا۔ یہی بات لکھنؤ کے لیے بھی کہی جا سکتی تھی مگر جن کے ہاتھوں میں اتنا اقتدار بھی نہیں رہ گیا تھا کہ جتنا نواب سعادت علی خاں اور آصف الدولہ کے پاس تھا لیکن اس کے باوجود انگریز ان سے دبتے تھے۔ اس لیے کہ نواب سعادت علی خاں کے جمع کیے ہوئے خزانے پر ان کی نظریں تھیں۔

نیپال سے لڑائی شروع ہو گئی تھی اور یہ خبریں آ رہی تھیں کہ کمپنی بہادر کی فوجیں ترائی میں شکست کھا رہی ہیں۔ اودھ کی عملداری نیپال کی سرحد سے ملی تھی۔ اس لیے وہ کسی قیمت پر غازی الدین حیدر کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

شوکت مرزا نے فیصلہ کیا کہ اسے لکھنؤ جانا ہے۔ صبح کو روزلین اسے نہیں دکھائی دی۔ دردانہ ملی لیکن کچھ افسردہ سی۔ شوکت کا ماتھا ٹھنکا۔ جیسے ہی نواب حشمت جنگ ہٹے اور اسے موقع ملا، اس نے چنبیلی سے پوچھا۔

www.pklibrary.com

اسے اپنے شعر کے قالب میں ڈھالنا چاہتا تو کسی بت تراش سے اس کی نفاست اور اس کی آب وتاب کے لیے درخواست کرتا۔

''اللہ! آپ تو اس طرح گھور رہے ہیں کہ جی ہولنے لگے۔''

''نہیں تو، میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ بنانے والے نے جب اس شاہکار کو بنایا ہوگا تو کیا وہ اس قدر فرصت میں ہوگا۔''

''ماشاء اللہ، شاعر بھی معلوم ہوتے ہیں آپ۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ استاد آتش کی چنگاریاں منہ سے پھول بن کر جھڑ رہی ہیں۔''

''ایسا نہ کیجیے۔ استاد بہت دل جلے ہیں۔ اگر ان تک یہ بات پہنچ گئی تو جلا کر راکھ کردیں گے۔ آتش جو ٹھہرے۔''

یکایک ویران حویلی قدموں کی کھڑکھڑاہٹ سے گونجنے لگی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں آرہی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا جیسے پانچ چھ آدمی حویلی کے اندر داخل ہورہے ہیں۔ شوکت مرزا نے دردانہ کے چہرے پر خوف کی تھرتھراہٹ دیکھی۔ اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''گھبراؤ نہیں، میں ابھی دیکھتا ہوں۔''

اس نے قرابین بھری اور باہر نکلا۔ حجرے کے دروازے پر اسے چار پانچ انگریز دکھائی دیے۔ ہاتھوں میں بندوق لیے اسی حجرے کی طرف آرہے تھے۔

''ادھر نہ آیئے جناب! اس حجرے میں خواتین ہیں۔'' شوکت مرزا نے شستہ انگریزی میں کہا۔

انگریزوں نے حیرت سے شوکت مرزا کو سر سے پیر تک دیکھا پھر ان میں سے ایک آگے بڑھ کر بولا۔ ''تم کون ہو؟''

''خدا کا ایک معمولی بندہ۔ میرا نام شوکت علی ہے اور میں راجپوتانے کا جاگیردار ہوں۔''

''ہم تو اس حجرے میں جائیں گے۔'' ان میں سے ایک بولا۔

شوکت مرزا نے اتنی دیر میں اندازہ لگالیا تھا کہ یہ سب نشے میں بدمست ہیں۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور زبان میں لکنت بھی تھی۔

اتنے میں ان کے چار پانچ ساتھی اور آگئے۔ ان ہی کے بیچ میں دو ہندوستانی عورتیں بھی تھیں جنہیں دیکھتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ ان بدنصیبوں کو زبردستی اٹھالائے ہوں گے۔ ان کے چہرے زرد تھے، لباس جابجا پھٹ گیا تھا، چہرے سے غربت اور افلاس نمایاں تھے۔

''اس عمارت میں یہی ایک حجرہ ہے پیٹرسن!'' ایک نے دوسرے سے کہا۔

''شوکت مرزا! تم اپنی خواتین کو اس حجرے سے نکال لے جاؤ۔ ہم وہاں عیش کریں گے۔''

''یہ ناممکن ہے۔''

''کیا.....؟'' پیٹرسن نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''تم شاید پاگل ہوگئے ہو، کالے کتے! تم ہمیں جواب دیتے ہو۔''

پیٹرسن کی بات پوری ہونے سے پہلے شوکت مرزا کا گھونسا اس کی کنپٹی پر پڑا اور وہ لہرا کر گر پڑا۔

''گندے..... ذلیل..... بدمعاش.....'' کئی آوازیں ابھریں اور پھر وہ سب شوکت مرزا پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے مقابلے میں شوکت مرزا کو قرابین اٹھانے کی فرصت نہیں ملی اور وہ اپنی بندوقوں کو غصے اور جوش میں بھول گئے۔

انہوں نے بندوقوں کو پھینکا اور شوکت مرزا سے لپٹ گئے۔ گھونسے بازی بھی بہت جلد بند ہوگئی۔ شوکت مرزا نے دو انگریزوں کی گردن پکڑ کر ایسے داؤ مارے کہ وہ دھڑام سے اوندھے منہ زمین پر گر گئے مگر وہ کئی آدمی تھے۔ وہ شوکت مرزا کے ہاتھوں سے لپٹ گئے اور اس کو بے بس کردیا۔ شوکت مرزا غصے میں پاگل ہورہا تھا۔ اس نے ان کی گرفت سے نکلنے کی زوردار جدوجہد کی۔ ہانپتے ہوئے نتھنوں سے شراب کی جو بو نکل رہی تھی، اس سے شوکت مرزا کو اس قدر کراہت کا احساس ہوا کہ اس کا سر چکرانے لگا۔ شوکت مرزا کی نظریں ان عورتوں پر پڑیں جو سہمی ہوئی کھڑی تھیں اور اس کا چہرہ قرمزی ہوگیا تھا۔ خون کھول رہا تھا۔

ڈک اسے خاموش دیکھ کر اس کے قریب گیا اور کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''ہم سے ضد کرنا بیکار تھا۔ تم لوگ بہت جلد باز ہوتے ہو۔ اگر میں نہ ہوتا تو پیٹرسن نے تمہیں بکری بنا دیا ہوتا۔ خیر، آؤ تمہارے حجرے میں چلیں۔''

''وہاں جانے سے پہلے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔''

''بکواس۔'' ڈک نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''جب ہم تمہیں قتل ہی نہیں کریں گے تو تمہاری لاش کہاں سے آئے گی؟''

اس نے کوشش کی کہ انگریز کا راستہ روک سکے مگر اس کے ہاتھ جکڑے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں انگریز، عورتوں سمیت شوکت مرزا کو گھسیٹتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔

دردانہ بوکھلا گئی۔ اس نے جلدی سے چہرے پر نقاب ڈال لی۔ اس کی ماں پینک سے اٹھ کر بیٹھ گئی مگر اسے

www.pklibrary.com

جمائیاں آرہی تھیں اور نیند کے ساتھ نشے کا اثر اتنا شدید تھا کہ وہ پھر لیٹ گئی۔

ڈک نے اندر داخل ہوتے ہی دردانہ کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ اس نے بے اختیار ایک قہقہہ لگایا اور آگے بڑھ کر دردانہ کی نقاب کھینچ کر پھینک دی۔

''میں تمہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا واسطہ دیتا ہوں، ایسی حرکتیں نہ کرنا جس سے تمہاری قوم کی عزت وناموس پر بٹا لگے۔ خواتین کا ادب کرنا سیکھو۔'' شوکت مرزا نے کہا۔

''تمہیں تو پادری ہونا چاہیے تھا میرے دوست!'' ڈک نے کہا اور پھر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے زبردستی دردانہ کے بازو تھام کر اس کا رخ ڈک کی طرف کر دیا۔

دردانہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تیر رہے تھے، چہرہ زرد ہو گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی بے ہوش ہوا چاہتی ہو۔

''مشرق کی پراسرار ساحرہ!'' ڈک نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اگر نپولین دیکھتا تو جوزی فائلین کو بھول جاتا اور اسے ڈیزائری کی یاد بھی نہ آتی اور اگر میرے ملک میں ہوتیں تو لوگ تم کو میری کوئن آف اسکاٹ کہتے۔''

دردانہ وحشت زدہ ہرنی کی طرح ان سب لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ تو نہ سمجھ سکی کہ ڈک کیا کہہ رہا ہے البتہ اس نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ ڈک ہی ان لوگوں کا سرغنہ ہے۔ اس نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''صاحبان عالی شان! ہم پر رحم کیجیے۔''

ڈک سمجھ تو گیا لیکن ہندوستانی زبان بولنے میں اسے زحمت ہوتی تھی۔ اس نے شوکت مرزا سے کہا۔ ''اس لڑکی سے کہہ دو کہ ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ یہ ہماری ملکہ بنے گی..... سرڈکسن کی بہو۔''

وہی دونوں عورتیں جو انگریزوں کے ساتھ تھیں، اس سارے تماشے کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں شوکت مرزا سے ہمدردی تھی۔ ڈر اور خوف کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ بے بس تھیں کیونکہ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تھا۔ وہ پیچھے سے گھوم کر ڈک کے قریب آئیں اور بڑی تیزی سے ڈک کے سر پر... دو ہتھڑ رسید کر دیے۔

ڈک چندھیا گیا۔ وہ ابھی سنبھالا لے کر اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک عجیب سا شور اس وسیع حجرے میں گونجنے لگا اور کسی نے چیخ کر کہا۔

''ڈک.....! بھاگو..... پنڈاری آگئے۔''

ان الفاظ میں کچھ ایسی تاثیر تھی جس نے ڈک کو یہ سوچنے کا بھی موقع نہ دیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ تیزی سے اٹھا اور بے تحاشا بھاگا۔ حجرے میں جو لوگ داخل ہو رہے تھے، ان کے چہرے ڈھاٹے سے چھپے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے تھے۔

وہ آندھی اور طوفان کی طرح ڈک کے ساتھیوں پر پل پڑے لیکن ڈک اور اس کے ساتھی اس بے تحاشا طریقے پر بھاگے کہ کسی مقابلے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا۔ یہ دوسری بات تھی کہ ان کے دو ساتھی جان سے مار دیے تھے۔

ذرا ہی دیر بعد جب ہنگامہ فرو ہوا تو دردانہ نے دیکھا کہ وہ کچھ دوسرے اجنبیوں میں گھری ہوئی ہے۔ اس کی نگاہوں نے شوکت مرزا کو تلاش کیا لیکن وہ اس جگہ موجود نہیں تھا البتہ وہ دونوں عورتیں جنہیں اس نے انگریزوں کے ساتھ دیکھا تھا، ابھی تک موجود تھیں۔ پنڈاریوں میں سے ایک نے بڑھ کر دردانہ سے نرم لہجے میں پوچھا۔

''لڑکی! کون ہے تو..... کہاں جا رہی ہے، کہاں سے آرہی ہے اور یہ فرنگی یہاں کیوں تھے؟''

دردانہ کے کچھ بولنے سے پہلے وہ دونوں عورتیں اپنی اپنی کہانی سنانے لگیں کہ ان کو کس طرح صاحبان عالی شان زبردستی پکڑ کر یہاں بے آبرو کرنے کے لیے لائے تھے پھر انہوں نے شوکت مرزا کے بارے میں پنڈاریوں کو بتایا۔

انہوں نے درد کے ساتھ ان لڑکیوں کی کہانی سنی۔ ایک نے بڑھ کر ان کے ہاتھ کھولے اور اپنی اپنی چادریں اتار کر ان کے نیم برہنہ جسم ڈھانک دیے پھر ایک نے جو ان کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا، نرمی سے کہا۔

''ماتا جی! گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہیں تمہارے گھر تک پہنچا دیں گے۔'' پھر وہی آدمی دردانہ کی طرف مڑا۔

''سچ بتاؤ، تم کون ہو اور جو تمہارے ساتھ تھا، وہ کون تھا؟'' اس کے لہجے میں اب درشتی عود کر آئی تھی۔

''میں نواب حشمت جنگ کی لڑکی ہوں۔ ہمیں شوکت مرزا اپنے ساتھ لے کر ٹونک جا رہے ہیں۔''

ان الفاظ میں جادو کی تاثیر تھی۔ ان بھوں نے بیک وقت احتراماً اپنے سر جھکائے اور ان کے سرغنہ نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''افسوس! آج ان ظالم فرنگیوں کی وجہ سے وہ شہزادیاں بے پردگی پر مجبور ہو رہی ہیں جن کا آنچل تک کسی

www.pklibrary.com

غیر نے نہیں دیکھا تھا۔"

پھر وہ سب بڑی تیزی سے حجرے سے باہر نکل گئے اور دروازے پر کھڑے ہو کر انہوں نے باہم مشورہ کیا۔ شوکت مرزا کو فرنگیوں سے نجات دلانے کا سوال سامنے آچکا تھا۔

"ابھی یہ ناممکن ہے۔" ان کے سرغنہ نے آہستہ سے کہا۔ "وہ لوگ راج پور گئے ہوں گے۔ وہاں تلنگوں کی پوری پلٹن موجود ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ پلٹ کر ادھر آئیں۔"

"حشمت جنگ کے خاندان کی حفاظت بہت ضروری ہے۔" ایک بوڑھے پنڈاری نے فوراً کہا۔ اس رائے سے سب نے اتفاق کیا۔

☆☆☆

پو پھٹ رہی تھی۔ راج پور کی گڑھی کی پرچھائیاں دور سے دھندلی نظر آرہی تھیں۔ شوکت مرزا کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور اس کو ڈک نے سنبھال رکھا تھا۔

"راج پور آگیا ہے۔" ڈک نے ہنس کر کہا۔

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" شوکت مرزا نے جھنجلا کر پوچھا۔ وہ سارے راستے دروازہ کے خیال سے پریشان ہوتا رہا تھا۔

"یہاں پہنچ کر لوگوں کا دماغ ٹھیک ہوجاتا ہے۔" ڈک نے مسکرا کر کہا۔ "اور وہ سوالات کا جواب دینے لگتے ہیں۔"

گڑھی سے کافی فاصلے پر مسلح پہریدار ملے۔ انہوں نے للکارا اور ڈک کے ساتھیوں نے جواب میں پکار کر کہا۔ "ہم دوست ہیں۔ ایک پنڈاری کو گرفتار کر لائے ہیں۔"

شوکت مرزا نے تلخی سے ہنس کر ڈک کو مخاطب کیا۔ "کیا مسخرہ پن ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ پنڈاری گرفتار نہیں ہوتے؟ دشمن صرف ان کی لاشوں کو ہاتھ لگا سکتا ہے۔"

"میں پنڈاریوں کی وحشیانہ بہادری کی قدر کرتا ہوں۔" ڈک نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "مگر پہلی مرتبہ یہ اصول ٹوٹ گیا۔ اب دیکھنا ہے کہ پنڈاری کتنے بہادر ہوتے ہیں۔"

گڑھی کے پھاٹک میں داخل ہو کر شوکت مرزا نے حیرت کا احساس کیا۔ وسیع صحن اور دالانوں میں پہیہ دار گاڑیوں پر چلنے والی بے شمار ہلکی توپیں رکھی تھیں۔ یوں راج پور کی گڑھی ایک زبردست فوجی مرکز کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

ڈک اور پیٹرسن نے شوکت مرزا کو سپاہیوں کے سپرد کیا اور حفاظت کی خاص تاکید کی۔ "اسے بھی دوسرے پنڈاریوں کے ساتھ بند کردو۔" ڈک نے شوکت مرزا کو سنانے کے لیے بلند آواز میں کہا۔ "شاید دوسروں کا حال دیکھ کر اسے پہلے ہی سے کچھ سمجھ آجائے۔"

سپاہیوں نے شوکت مرزا کے پیر کھول دیے اور اسے گھسیٹ کر دالان میں لے گئے۔ دالان کے کونے میں تہ خانے کا آہنی دروازہ تھا جس پر پہریدار سنگین تانے کھڑے تھے۔

"ایک شکار اور پھنسا۔" ایک پہریدار نے ہنس کر کہا۔ دروازہ کھلا اور شوکت مرزا کو سپاہیوں نے اندر دھکیل دیا۔

پتھر کے زینوں پر اس کے پیر پھسلے۔ ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ پایا اور لڑھک کر نیچے جا گرا۔ مگر وہ قہقہوں نے اس کے گرنے پر مسرت کا اظہار کیا۔ شوکت مرزا نے دانت بھینچ لیے۔ گرنے سے پیشانی پر زخم آیا تھا۔ چوٹ سے سر چکرا گیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھا اور پھر تیزی سے آگے بڑھا۔ زینے کے بعد ایک سرنگ نما راستہ تھا۔ آگے چل کر ایک بڑا حجرہ ملا۔ اس میں دس پندرہ آدمی تھے۔ شوکت مرزا کی آمد پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"تم کون ہو بھائی؟" ایک آدمی نے پوچھا۔

شوکت مرزا ان کو دیکھتا رہ گیا۔ ان سب کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ غافل سو رہے ہیں۔ ان سب کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور خون کے سیاہ دھبوں سے داغدار تھے۔ جگہ جگہ کپڑا بدن کے زخموں سے چپک رہا تھا لیکن ان کے چہروں پر غم و غصے کی تمام شکنیں اپنے حال سے بے خبر تھیں۔ وہ بالکل بے بس تھے۔ راج پور کی گڑھی میں زبان کھلوانے کے جو طریقے برتے جاتے تھے ان کی وجہ سے ہاتھ پیر کی ہڈیوں کا ٹوٹ جانا معمولی بات تھی۔

شوکت مرزا کو گڑھی کے صحن میں ڈک اور پیٹرسن کھڑے نظر آئے۔ وہ چند انگریزوں سے باتیں کر رہے تھے جو فوجی لباس میں تھے۔ ڈک، شوکت مرزا کو دیکھ کر مسکرایا۔

"کہو، تم نے دیکھ لیا پنڈاریوں کا حشر؟" وہ آہستہ سے شوکت مرزا کے پاس آکر بولا۔

"تم بزدل اور..... اور ذلیل ہو۔" شوکت مرزا گرج اٹھا۔ پیٹرسن جو اسے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا، لپک کر بڑھا۔ اس نے شوکت مرزا کے منہ پر تھپڑ مارا۔

"الگ ہٹو پیٹرسن!" ڈک نے ناخوشگوار لہجے میں اسے حکم دیا۔ "میں پسند نہیں کرتا۔ اس شخص کا فیصلہ بریگیڈیئر جنرل کو کرنا ہے۔"

تحیر کے آثار شوکت مرزا کے چہرے پر ابھرے۔

"ہارڈی مین بہت سخت آدمی ہیں۔" ڈک نے

www.pklibrary.com

شوکت مرزا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اور وہ پنڈاریوں کے خفیہ جنگی منصوبے معلوم کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری طرح کوئی بڑا پنڈاری سرداران کی خوب مدد کرسکتا ہے۔''

نیلی آنکھوں میں بے رحمی کی چمک تھی۔ وہ شوکت مرزا کے چہرے پر.... ردعمل تلاشنے لگا۔ ڈک کے لبوں پر زہریلا تبسم رقصاں تھا۔ شوکت مرزا پر اچانک اضطراب طاری ہوگیا۔ اس کی تمنا تھی کہ اس کے پر نکل آتے اور وہ اُڑ کر ٹونک پہنچ جاتا جہاں پنڈاریوں کے سب سے بڑے راہنما نواب امیر خاں کے پاس حشمت جنگ پناہ گیر تھے اور ان کو بتا سکتا کہ بریگیڈیئر جنرل ہارڈی مین کی کمان میں کمپنی بہادر حملے کرنے والی ہے۔

وہ یہی سوچتا رہا اور دو سپاہی اسے گھسیٹ کر آگے لے گئے۔ کئی دالانوں سے گزر کر وہ ایک حجرے میں پہنچا۔ یہاں فرش پر قالین بچھے تھے۔ بے حد سرخ رنگت اور نیلی آنکھوں کا ایک تنومند آدمی فوجی لباس پہنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ قالین پر میز لگی تھی اور اس پر راجپوتانے کا نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ اس پر جگہ جگہ جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔

بریگیڈیئر جنرل ہارڈی مین نے اسے دیکھا۔ ''تم انگریزی جانتے ہو؟'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ''کیپٹن ڈک نے بتایا ہے کہ تم پنڈاریوں کے ایک بڑے سردار ہو اور تم نے دیکھ لیا کہ ہم نے تمہارے ساتھیوں سے کیا سلوک کیا؟''

شوکت مرزا نے ہونٹ دانتوں میں دبالیا۔ وہ بے ساختہ کوئی سخت بات کہنے جارہا تھا مگر پھر رک گیا۔

''سنو نوجوان! کمپنی بہادر بڑی طاقتور ہے۔'' ہارڈی مین نے شوکت مرزا کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اور کمپنی بہادر کو انعام دینا بھی آتا ہے۔ تمہارے راجاؤں اور نوابوں کی طرح نہیں..... لیکن پھر بھی کمپنی بہادر کی خدمت کرنے والے جاگیریں اور زمینداریاں حاصل کرسکتے ہیں۔'' وہ رکا۔ شوکت مرزا خاموش رہا۔ ہارڈی آگے بولا۔

''تم احمق ہو اور ناتجربہ کار بھی۔ کوڑوں کی مار کھانے اور مرجانے سے کیا فائدہ؟''

تلخ تبسم شوکت مرزا کے ہونٹوں پر نمودار ہوا۔ اس نے ہارڈی مین کی نظروں میں نظریں ڈال کر کہا۔ ''یہ بتایئے کہ اگر کمپنی بہادر سے غداری کرنے کا معاوضہ سونے، چاندی کی تھیلیوں کی شکل میں آپ کو پیش کیا جائے تو کیا آپ اسے قبول کرلیں گے یا اسے ٹھکرادیں گے؟''

ہارڈی مین بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا۔ ''انگریز غداری نہیں کرتا۔'' وہ سنجیدہ ہوا۔ ''مگر تمہارے ملک میں یہ بات بُری نہیں سمجھی جاتی کہ ایک شخص اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوستوں کو تباہ کردے یا غیروں سے مل جائے۔''

شوکت مرزا تلملا گیا۔ ہارڈی مین کے لہجے میں حقارت کے اتنے نشتر تھے کہ شوکت مرزا کی روح چیخ اٹھی۔

''کمپنی بہادر کو صرف میر جعفر اور میر صادق یاد رہ گئے ہیں۔'' بالآخر اس نے دانت پیس کر کہا۔ ''وہ سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی تلواروں کو کیوں بھول گئی؟ ان تلواروں نے تاریخ کے صفحات پر اپنا نام شہادت کے پاکیزہ خون سے لکھا ہے۔ پنڈاریوں کو تاریخ کے یہ صفحے یاد ہیں۔ وہ جان دے سکتے ہیں مگر غداری نہیں کرسکتے۔''

بریگیڈیئر جنرل ہارڈی مین کے چہرے پر درشتی اور سختی آگئی۔ اس نے اشارے سے حکم دیا کہ شوکت مرزا کو باہر لے جایا جائے۔ وہ پھر نقشے کو دیکھنے لگا۔

گڑھی کے صحن میں دھوپ پھیل چکی تھی۔ قیدیوں کی قطار کھڑی تھی اور شوکت مرزا کو کوڑوں کی سزا دینے کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ ڈک اور پیٹرسن کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کررہے تھے۔

''شاید اس سزا کے بعد یہ پنڈاریوں کے بارے میں کچھ بتانے پر راضی ہوجائے۔'' ڈک نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''بہرحال، یہ پنڈاریوں کا سردار معلوم ہوتا ہے۔ معمولی آدمی نہیں ہے۔''

دو سپاہی بڑھے اور انہوں نے شوکت مرزا کے انگرکھے کو پھاڑ کر جسم سے الگ کردیا۔ اس کا اوپری بدن برہنہ ہوگیا۔ پیٹرسن نے مسرت کے عالم میں وہ کوڑا اٹھالیا جو پانی کے ایک برتن میں پڑا ہوا بھیگ رہا تھا۔ شوکت مرزا نے دانت پیس رکھے تھے۔

جب پہلی بار کوڑا ہوا میں سنسنا کر شڑاپ سے اس کی پیٹھ پر گرا تو شوکت مرزا کا سارا بدن ہل گیا۔ درد و اذیت نے اسے بیتاب کردیا مگر اس نے اپنے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلنے دی۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے پہلے سارے پنڈاریوں نے ہر عذاب کو چپ چاپ برداشت کیا ہے۔

کوڑے برس رہے تھے، شوکت مرزا کے چہرے سے پسینا ٹپک ٹپک کر زمین پر گر رہا تھا۔ برداشت اور تکلیف کی کشمکش سے اس کا چہرہ قرمزی رنگت اختیار کرگیا پھر اس پر زردی چھا گئی۔ ہر ضرب پر اس کا جسم مذبوحی حرکت کررہا تھا۔ پیٹھ کی کھال ادھڑ گئی اور تازیانوں کی ضرب

www.pklibrary.com

گوشت کے چیتھڑے اڑانے لگی۔ خون کے چھینٹے کوڑے سے اتر کر آس پاس گرے۔

شوکت مرزا پر رفتہ رفتہ بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ پیٹرسن نے ہانپتے ہوئے کوڑا ہاتھ سے پھینک دیا۔ ڈک نے قیدیوں کو دیکھا جو خاموش کھڑے تھے۔ وہ کوڑوں کی مار کھا چکے تھے۔ شوکت مرزا کی بازیابی نے ان پر خوف کا کوئی اثر نہیں ڈالا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑے رہے۔

''تم نے یہ تماشا دیکھا؟'' ڈک نے قیدیوں سے کہا۔ ''یہ آخری تماشا تھا۔ دو دن کے بعد جب اس بدمعاش کے زخم کچھ ٹھیک ہو جائیں گے تو پھر تم سب کو پھانسی دے دی جائے گی۔'' کہتے ہوئے اس نے اشارہ کیا اور سپاہیوں نے شوکت مرزا کے بے ہوش جسم کو توپ کے پہیے سے کھول کر الگ کر دیا پھر اسے قیدیوں کے ساتھ اٹھا کر تہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔

شوکت مرزا کو ہوش آیا تو وہ تہ خانے میں تھا۔ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ اس نے پے در پے کئی مٹی کے پیالے بھر کر پانی پیا۔ ہوش کچھ ٹھکانے آئے تو زخموں کی تکلیف بڑھنے لگی۔

''نوجوان! تم نے بہت بہادری سے کام لیا۔'' ایک پستہ قد مرہٹے پنڈاری نے پاس آ کر آہستہ سے تعریف کی۔

''یہ مصیبت تو سب نے برداشت کی ہے۔''

''ہاں، آخری مصیبت باقی ہے۔'' مرہٹے نے سر ہلا کر کہا۔ ''لیکن وہ اتنی تکلیف دہ نہیں ہوگی بلکہ ساری مصیبتوں کا خاتمہ کر دے گی۔''

''کیا وہ ہم کو مارنے والے ہیں؟'' شوکت مرزا نے کراہ کر بدن سیدھا کیا اور خوامخواہ مسکرایا۔

''پھانسیاں دینے کو کہتے ہیں۔'' مرہٹے نے منہ بنا کر کہا۔ ''موت سے کیا ڈرنا؟ مگر بھگوان کرے تلوار یا بندوق سے موت آئے۔ چوروں، ڈاکوؤں کی طرح پھانسی پانا مجھے پسند نہیں۔''

شوکت مرزا چپ ہو گیا۔ وہ بے حد کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ پیٹھ کا پورا حصہ کچے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ تکلیف کی وجہ سے اسے بخار آ گیا تھا۔ ہاتھ، پیر اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ نیم بے ہوشی یا غفلت کے عالم میں طرح طرح کے بھیانک واقعات دیکھتا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔

ان چلتی پھرتی تصویروں میں بار بار دردانہ کا کندنی چہرہ ابھر رہا تھا۔ شرم سے جھکی ہوئی سیاہ آنکھوں کی خوابیدہ سی چمک، ہونٹوں کی شاداب سرخی اور خدوخال کی دلفریبیوں نے شوکت مرزا کو حرارت و اذیت کے عالم میں مسرت اور سکون کے چند لمحے دیے۔ وہ دردانہ کو دیکھتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔ تب ہی اچانک یہ تصویریں دھندلا گئیں اور وہ سوچنے لگا کہ دردانہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہوگی؟ وہ نہ جانے اس کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی؟ اسے اپنے وعدے کا خیال آیا۔ اس نے حشمت جنگ سے کہا تھا کہ وہ دردانہ اور اس کی ماں کو ٹونک پہنچا دے گا اور اس وعدے کو پورا کرنے میں وہ ناکام ہو چکا تھا۔ یہ کسک اسے بے چین کیے دے رہی تھی۔

پنڈاریوں نے اسے تسلی دی کہ دردانہ کو بہ خیریت ٹونک پہنچا دیا جائے گا۔ اطمینان تو شوکت مرزا کو بھی تھا لیکن اس کے دل میں عجیب سی مایوسی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اب وہ دردانہ کو کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ تہ خانے کے اندھیاروں میں وہ آتے ہی موت کا تصور کرنے لگا تھا اور پھانسی کے پھندے کے خیال نے اس کو بے حد مایوس و غمگین کر دیا تھا۔

جیسے تیسے دو دن گزر گئے۔ شوکت مرزا بے حد کمزور ہو گیا تھا اور ایک کروٹ پڑا رہتا تھا۔ اچانک تہ خانے کے دروازے پر رات کے وقت ڈک نمودار ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک تلنگا تھا جس کے ہاتھ میں ایک خوان تھا۔ ڈک نے پہریداروں سے ایک مشعل لی اور اندر اتر آیا۔ اس نے مشعل اٹھا کر شوکت مرزا کے زرد چہرے کو دیکھا اور تلنگے کو اشارہ کیا۔ اس نے خوان آہستہ سے رکھ کر شوکت مرزا کو جگایا تو وہ اٹھ بیٹھا۔

''میرے دوست! یہ شوربا پی لو۔'' ڈک نے کہا۔

شوکت مرزا نے مشعل کی روشنی سے نظریں ہٹا کر انکار میں سر ہلایا۔ وہ ڈک کی صورت سے کراہت محسوس کر رہا تھا۔

''بھائی! یہ میں نے پکایا تھا۔'' ڈک کے اشارے پر تلنگے نے شوکت مرزا سے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں مسلمان ہوں۔ مرغ میں نے ذبح کیا تھا۔ صاحب جانتے تھے کہ.....''

''تمہارے مسلمان ہونے پر مجھے افسوس ہے۔'' شوکت مرزا نے نفرت سے جواب دیا۔

ڈک کے لبوں پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔ وہ شوکت مرزا کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''میں دشمن سہی لیکن بیکار تکلیف کیوں اٹھا رہے ہو؟ تم شوربا پی لو، کچھ طاقت آئے تو میں چند ضروری باتیں کروں تم سے۔'' .... کہتے ہوئے ڈک نے مرغ کے شوربے کا پیالا اٹھایا اور

www.pklibrary.com

زبردستی شوکت مرزا کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ مسلسل فاقے کے بعد شوربے کی روغن آلود مہک نے شوکت مرزا کے تامل کو توڑ دیا اور اس نے غٹاغٹ پیالہ خالی کر دیا۔

''میں چند خاص باتیں کرنے آیا ہوں۔'' ڈک نے شگفتگی سے کہا۔ ''یہاں کوئی اور شخص تو انگریزی سمجھنے والا ہے نہیں۔''

شوکت مرزا نے نفی میں سر ہلایا۔

''بہت خوب۔ میں صاف گوئی سے کام لوں گا۔'' ڈک نے متانت سے کہنا شروع کیا۔ ''دیکھو، تم موت کے بہت قریب ہو اور ابھی تمہاری عمر اس قابل نہیں ہے کہ زندگی کے خاتمے کا ماتم کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم زندگی کی قدر کرو۔''

''غداری کرنے پر میں.....''

شوکت مرزا کی بات ڈک نے مضطربانہ انداز میں کاٹ دی۔ ''میں اس نوعیت کی کوئی بات نہیں کروں گا۔'' اس نے بے چینی سے کہا۔ ''پنڈاریوں سے مجھے کوئی ذاتی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو اس لڑکی کی بات کرنا چاہتا ہوں جو تمہارے ساتھ تھی۔''

اس کی بات پر شوکت مرزا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''خفا نہ ہو۔ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' ڈک نے شوکت مرزا کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر درد بھرے لہجے میں کہا۔ ''ساری مقدس اور آسمانی چیزوں کی قسم، مجھے اس سے الفت ہے اور میں اس کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔''

ڈک کے الفاظ میں اتنا جوش تھا کہ شوکت مرزا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا پھر بھی اس نے سوال کیا۔

''لیکن جناب! مذہب اور نسل کے امتیازات کا کیا ہوگا؟ کوئی شریف ہندوستانی لڑکی.....''

''مجھے اپنے اوپر بھروسا ہے۔'' ڈک نے مسکرا کر کہا۔ ''تم نے ہماری زبان کا مشہور محاورہ سنا ہوگا..... ''جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے''..... ضرورت پڑی تو میں مذہب بدل سکتا ہوں، تمہاری جان بچا سکتا ہوں، تم کو رہا کر سکتا ہوں۔''

شوکت مرزا کا دل دھڑکنے لگا۔ تہ خانے کی تاریکی میں رہائی کا نام سن کر ہی دل کو مسرت ہو رہی تھی۔

''شرط صرف ایک ہے۔'' ڈک نے اس کو گھور کر کہا۔ ''تم قسم کھا کر وعدہ کر لو کہ مجھے اس لڑکی کا پتا بتا دو گے۔''

''تم مجھ پر اعتبار کر لو گے؟''

''کیوں نہیں، ہندوستان کے شریف سپاہی جھوٹ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

عیدالضحیٰ کے نمکین لمحات

جولائی 2023ء کے شمارے کی سوغات

اولین صفحات

محبت باعث راحت ہے باعث آزار نہیں.....
جرم و سزا کے گرد گھومتی عداوت و محبت کی دلچسپ داستان **ایچ اقبال** کے قلم سے

شعلہ زن

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستان حیات.....
روبینہ رشید کے قلم کی جادوگری

دہر

دنیا مجبور کرتی ہے کہ ان پر قہر بن کر ٹوٹ پڑو..... ایک ایسے ہی نوجوان کی کوچہ گردی..... زندگی اس کے لیے خالی کشکول کے مانند تھی..... **حسام بٹ** کے قلم سے نئی سلسلے وار کہانی۔

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

کالے اور گوری چمڑی کے درمیان نفرت کی دیوار اب بھی کھڑی ہے۔ دو رنگ دار طاقت ور حریفوں کا فیصلہ کن مقابلہ

دوسرا رنگ

دولت و طاقت کا نشہ انسانیت سے دور کر کے سفاکیت کے قریب کر دیتا ہے۔ سیاست کے بازار میں تنہا کھڑی عورت کا ماجرا.....

چٹی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

www.pklibrary.com

نہیں بولتے۔" ڈک نے ہنس کر کہا۔ "تم لوگ جھوٹ بول کر کوڑوں کی مار سے بچ سکتے تھے مگر کسی نے جھوٹ نہیں بولا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"یہ چاہتا ہوں کہ اس لڑکی کا پتا مجھے دے دو۔ وہ کون ہے، اس کے ماں باپ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟"

شوکت مرزا نے ڈک کو سب کچھ بتا دیا۔ صرف یہ نہیں بتایا تھا کہ حشمت جنگ قید سے نکل کر بھاگے ہیں اور ٹونک میں ہیں۔ ڈک سنتا رہا اور غور کرتا رہا۔

"میں صرف اپنی رہائی نہیں چاہتا۔" شوکت مرزا نے آخر میں کہا۔

"پھر.....؟" ڈک نے چونک کر کہا۔

شوکت مرزا نے اسے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "یہ میرے ساتھی ہیں۔ ان کو موت کے منہ میں چھوڑ کر اپنی گردن بچانا بزدلی ہوگی۔ ان کی جان بھی بچاؤ گے؟" اس نے پوچھا۔

ڈک سوچنے لگا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر اس نے کہا۔ "اچھا یہ بھی ہو جائے گا۔" وہ اٹھ کر بولا۔ "میں بریگیڈیئر جنرل ہارڈی مین سے یہ بہانہ کر دوں گا کہ تم نے ان سب کو دھوکے میں رکھا ہے۔ تم ان سب کے رہا ہونے پر ان کے سردار رہو گے اور ہمارے لیے مخبری کا فرض انجام دو گے۔"

وہ چلا گیا۔ شوکت مرزا نے سر جھکا لیا۔ قید خانے میں جو لوگ تھے، وہ آنکھیں بند کیے لیٹے تھے اور سوچ رہے تھے کہ شوکت مرزا اور اس انگریز کے درمیان یہ کیا بات چیت ہو رہی تھی؟ انہوں نے شوکت مرزا سے پوچھا۔

"یہ بدمعاش فرنگی کیا کہہ رہا تھا؟"

"ہم لوگوں کو رہائی کی پیشکش کر رہا تھا۔" شوکت مرزا نے درد بھری آواز میں جواب دیا۔

پستہ قد مرہٹے نے زمین پر تھوک دیا۔

"ہم غداری نہیں کریں گے جی۔" وہ چڑچڑے لہجے میں بولا۔ "تم نے اس کے منہ پر تھپڑ کیوں نہیں مارا؟"

شوکت مرزا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "غداری نہیں کی جائے گی دوستو!" اس نے سرد ہمکاری بھرتے ہوئے کہا۔ "اس فرنگی نے میری زندگی بھر کے سرمائے اور عمر بھر کی خوشیوں کے معاوضے میں ہم سب کو آزاد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

اور پھر شوکت مرزا کے آنسو بے قابو ہو کر چہرے پر چمکنے لگے۔

☆☆☆

اندیشناک اور وسوسہ انگیز رات کسی بھاری سل کی طرح دھیرے دھیرے سرک رہی تھی اور اس تلے کتنے ہی خواب کچلے جا رہے تھے، کتنی ہی آرزوؤں کی کونپلیں مسلی جا رہی تھیں۔ یوں دم بخود سی رات اپنے پچھلے پہر تک کھسک آئی۔ ڈک واپس آ گیا۔ تہ خانے کے دروازے کو کھول کر ڈک اندر آیا اور بولا۔

"میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔"

اس نوید نو بہار نے جیسے خزاں رسیدہ دلوں میں خوشی کی لہر دوڑا دی لیکن شوکت مرزا غمزدہ تھا۔

پستہ قد مرہٹے نے سب کو اپنے ساتھ لیا۔ اس کا گاؤں قریب ہی تھا۔ وہ رات کو چپکے سے وہاں پہنچے۔ معذور پنڈاریوں کو مرہٹے نے اپنے گھر ٹھہرایا اور باقی لوگ اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے۔

ہفتہ بھر میں شوکت مرزا کے زخم بالکل ٹھیک ہو گئے۔ گاؤں کے جراح نے نیم کا مرہم لگایا تھا اور دوسرے پنڈاریوں کی ہڈیاں جوڑ دی تھیں۔ ان کی روزانہ مالش ہوتی تھی اور وہ بھی روبہ صحت تھے۔

☆☆☆

دردانہ اور اس کی ماں کے لیے یہ چند دن پریشانی کے تھے۔ پنڈاریوں کے جس گروہ نے ان کو ٹونک پہنچایا، وہ اجنبی تھا۔ شروع میں تو ان پر بھروسا بھی نہیں ہوتا تھا۔ بہرکیف، ٹونک کی حدود میں آ کر پنڈاریوں نے رخصت طلب کی۔ نواب امیر خاں کے سپاہی سرحدوں پر مقرر تھے۔

حشمت جنگ کا نام سن کر انہوں نے دردانہ اور اس کی ماں کو بڑے احترام سے ایک زمیندار کی حویلی میں ٹھہرایا اور ٹونک خبر بھیج دی گئی۔ دوسرے روز حشمت جنگ گھوڑے پر سوار وارد ہوئے۔ جب وہ حویلی میں آئے تو دردانہ ان کو دیکھ کر بیتاب ہو گئی۔ اس کی ماں بھی رو رہی تھی۔ حشمت جنگ نے دردانہ کو لپٹا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم لوگوں کی صورت دیکھی۔" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور دردانہ لپٹ کر سسکیاں بھرتی رہی۔

حشمت جنگ نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ "شوکت کہاں ہے؟"

ان کی بیوی نے سارا قصہ گوش گزار کر دیا۔ دردانہ نے سر جھکا رکھا تھا اور اس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ حشمت جنگ نے تمام واقعات سنے تو بت بن گئے اور سوچتے رہے۔ وہ شوکت مرزا کو بہت چاہتے تھے اور اب

www.pklibrary.com

اس کے خیال نے ان کو اسی طرح مضطرب کیا جیسے ان کی اولاد لاپتا ہوگئی ہو۔

''یہ بہت بُرا ہوا۔'' وہ ہاتھ مل کر بولے۔ ''فرنگیوں کے پھندے میں اس کو پھنسانے کی ذمے داری سر پہ سر میری ہے۔ اگر میں نے تم لوگوں کو لانے کا کام اسے نہ سونپا ہوتا تو.....''

اچانک وہ جملہ ختم کیے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کہاں چلے؟'' دردانہ کی ماں نے گھبرا کر پوچھا۔

''بیگم! ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ شوکت مرزا کو قید فرنگ سے رہا کرائے بغیر مجھے چین نہیں ملے گا۔''

''ہم لوگوں کو کس پر چھوڑ رہے ہیں آپ؟'' دردانہ کی ماں نے فریاد کی اور ان کا دامن تھام لیا۔

حشمت جنگ نے جھٹکا دے کر دامن چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''بیوقوفی کی باتیں نہ کرو بیگم! امیر خاں کی سرحدوں میں تم بالکل محفوظ ہو۔ تم یہیں رہو گی۔''

ان کی آواز میں استقلال کی جھلک تھی۔ خدا حافظ کہہ کر وہ باہر آئے اور جس زمیندار کی حویلی تھی، اس سے کچھ دیر تک مشورہ کرتے رہے۔ اس نے کہا۔

''نواب صاحب سے مشورہ فرمایئے تو بہتر ہے۔ ممکن ہے کہ وہ فرنگیوں کو لکھ کر شوکت مرزا کو رہا کرالیں۔''

وہ ٹونک پہنچ کر امیر خاں سے ملے۔ ''اجازت دو کہ شوکت مرزا کو بچانے کے لیے میں نواب چیتو سے امداد لوں اور فرنگیوں پر چھاپا مار دوں۔'' انہوں نے امیر خاں کو اپنے ارادوں سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''بسم اللہ، خدا کامیاب کرے۔''

''اگر میں مارا گیا تو بیوی بچے تمہارے سپرد ہیں۔''

''برادرم! تمہارے بچے میرے جگر کا ٹکڑا ہیں۔'' نواب امیر خاں نے سادگی سے کہا۔ ''مگر چیتو تمہارے کیا کام آسکتا ہے؟ وہ شعلہ مزاج اور جذباتی آدمی ہے اور اب وہ بیچارہ نواب بھی کہاں رہا۔ سردار کہہ سکتے ہیں اسے۔''

''ہندوستان کو ایسے دیوانوں کی ضرورت ہے دوست! دیوانگی کے کرشمے ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ اب اس کی نوابی کی نہیں، سرداری کی ہی ضرورت ہے۔''

نواب امیر خاں نے کچھ نہیں کہا۔ انگریزوں سے صلح کرنے پر مجبور ہو کر وہ بڑی ایمانداری سے صلح کی شرائط پوری کر رہے تھے مگر حشمت جنگ جیسے دوستوں کو پناہ دینے اور ان کی امداد کرنے سے نواب امیر خاں کا ہاتھ کبھی نہیں رکا تھا اور حشمت جنگ بھی یہ جانتے تھے کہ امیر خاں کا خلوص لازوال ہے لیکن خود حشمت جنگ کو ٹونک کے علاقوں کو مرکز بنا کر فرنگیوں پر حملہ کرنے میں تکلف تھا۔ انگریزوں کو اس سے بہانہ مل سکتا تھا اور وہ ٹونک پر دھاوا بول سکتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ چیتو سے امداد لینا چاہتے تھے۔

چیتو..... پنڈاریوں کا سب سے بڑا راہنما تھا اور اس نے فرنگیوں سے صلح نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ کسی زمانے میں جب جوان تھا تو دکن کی پہاڑیوں میں انگریزوں سے ٹکرا چکا تھا۔ وہ سلطان ٹیپو کی فوج کا ایک سپاہی بھی رہا تھا اور اب تک اسے دکن کا وہ شیر دل فرمانروا یاد تھا جس نے گیدڑوں کی طرح سو سال زندہ رہنا پسند نہیں کیا بلکہ شیر کی طرح چند دن کی زندگی پسند کی اور 1799ء میں شمشیر بدست لڑتا ہوا شہید ہوگیا۔

فرنگیوں سے نفرت کا سبق اس نے سلطان شہید سے سیکھا تھا اور وہ اب تک بڑے پیار سے ''ٹیپو صاحب'' کی بہادری اور غیرت کا ذکر کرتا تھا۔ میسور کی فوج میں اس نے جو کچھ دیکھا تھا اس کی وجہ سے اس میں کامیاب سپہ سالاری کی تمام صلاحیتیں تھیں۔

چیتو کے ''نواب'' بننے کی داستان بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ سندھیا شاہی پنڈاریوں میں ہیرن اور بورن دو نامور سردار تھے جنہیں ناگپور کے مرہٹہ راجا نے تباہ و برباد کیا۔ ہیرن کے دو بیٹوں دوست محمد خاں اور واصل محمد خاں نے اپنے باپ کے پراگندہ ساتھیوں کو پھر اکٹھا کیا اور مالوہ کے جنگلوں میں اپنا شکار ڈھونڈنے لگے۔ بورن کے پنڈاریوں کی سرداری کا جھنڈا میاں چیتو نے سنبھالا جو میو قوم کا جاٹ تھا مگر اپنی لیاقت، بہادری اور سپہ گیری سے سردار بن گیا۔ اس کا جتھا اتنا زبردست اور طاقتور تھا کہ 1805ء کی لڑائی میں مہاراجا دولت راؤ سندھیا نے کمپنی سرکار کے خلاف چیتو کی مدد حاصل کی پھر اسے خلعتِ فاخرہ دی، ایک جاگیر بخشی، نواب کا لقب دیا اور زری پٹی کے علم عطا کیے جو مرہٹوں میں اعلیٰ اختیار اور افتخار کا نشان سمجھے جاتے تھے۔ یوں چیتو نے مہاراجا سندھیا کا دیا ہوا لقب اپنی مہر پر کندہ کرایا اور ''نواب چیتو'' بن کر نمار کی جاگیر پر حکومت کرنے لگا۔ جغرافیائی اعتبار سے نمار، پنڈاریوں کا ایک محفوظ ترین دارالقرار تھا جو بندھیا چل کے دو پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا اور جس کے چاروں طرف وسیع اور گھنے جنگلات کا خطرناک حصار قائم تھا۔ لہٰذا حشمت جنگ کو یقین تھا کہ چیتو ان کی مدد کرے گا۔

وہ چیتو سے کئی بار مل چکے تھے۔ چند دن پہلے ہی وہ ٹونک آیا تھا اور اس نے نواب امیر خاں سے ملاقات کر کے

www.pklibrary.com

ان پر زور دیا تھا کہ وہ فرنگیوں سے صلح نہ کریں۔

چیتو نے کہا تھا۔ ''ان سے صلح کا کیا سوال.....؟ یہ ہمارے دشمن رہیں گے۔ آج یہ صلح کے معاہدے پر دستخط کر رہے ہیں، کل تلوار کی نوک سے صلح کے معاہدے کو پھاڑ دیں گے۔ فرنگیوں نے کسی سے دوستی نہیں کی، دغابازی ضرور کی ہے۔''

چیتو جو کہتا تھا، اس پر عمل بھی کرتا تھا۔ لارڈ ہیٹنگز نے چند پنڈاریوں کے بڑے بڑے سرداروں کو دوستی اور اخلاص کے پیمان باندھ کر میدانِ جنگ سے ہٹا دیا تھا۔ صرف واصل محمد خاں اور شیر دباتی تھے۔ واصل محمد خاں نے خودکشی کر لی تھی کیونکہ ایک راجا کی دغابازی سے وہ انگریزی فوج کے گھیرے میں آ گیا تھا۔ اب لے دے کر چیتو باقی تھا جو دکن کی پہاڑیوں، مالوے کے جنگلوں اور راجپوتانے کے ریگزاروں میں اپنی تلوار کی خون آشامیوں سے فرنگیوں کا ناک میں دم کیے ہوئے تھا۔ وہ فرنگیوں سے صلح کرنے پر تیار نہیں تھا۔

حشمت جنگ ٹونک کی حدود سے نکلے۔ تیس چالیس وفادار ساتھ تھے۔ چیتو ٹونک کی سرحد سے دس کوس دور ڈیرا ڈالے پڑا تھا۔ سندھیا کے علاقے میں راج پور کی گڑھی میں انگریزی لشکر کے جمع ہونے کی خبریں اسے مل چکی تھیں۔ وہ گڑھی پر حملہ کر کے توپ خانہ چھین لینے کی فکر میں تھا کیونکہ اسے اپنی اس کمزوری کا احساس تھا۔

برق سرعت کی طرح دھاوے مارنے والے سرفروش پنڈاریوں کے ڈیروں میں بندوقیں بھی بہت کم تھیں۔ صرف گھوڑے تھے، تلواریں تھیں۔ توپوں کا کیا سوال تھا۔

☆☆☆

نواب حشمت جنگ، چیتو کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ چیتو کے تندرست جسم کی ایک ایک بوٹی کانپ رہی تھی، آنکھیں غصے سے سرخ تھیں۔ غصے کا سبب اس سپاہی کا بیان تھا جو راج پور سے رہا کیا گیا تھا۔ اس کا جسم برہنہ تھا اور اس پر کوڑوں کے نشان تھے۔

''ہمارا کھانا بند کر دیا گیا۔ ہمارے ہاتھوں میں کیلیں ٹھونکی گئیں اور صاحبان عالی شان نے ہماری کھال ادھیڑ کر رکھ دی۔'' سپاہی نے اپنی اسیری کی روداد بیان کرتے ہوئے کہا۔

''خدا کی قسم! اس کا بدلہ لیا جائے گا۔ میرے بچے! ہم انہیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔'' چیتو نے غصے سے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ ہمارے گاؤں میں گھس گئے۔ شراب کے نشے میں دھت بدمست گورے..... انہوں نے ہمارے نہتے لوگوں کو مار کر انہیں قتل کیا اور اس کے بعد وہ ہماری عورتوں کو اٹھا کر لے گئے۔''

''بس۔'' چیتو دہاڑا۔ اس کی آواز اتنی خوفناک تھی کہ تمام خیموں میں بیٹھے ہوئے لوگ دہل گئے۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور آنکھیں ابلی پڑتی تھیں۔

''میں آج ہی حملہ کروں گا اور ایک گاؤں کے بدلے ان کی دس کوٹھیاں تباہ کر دوں گا۔''

''مگر امیر خاں اور کریم خاں سے مشورہ تو کر لیجیے۔'' حشمت جنگ نے کہا۔

''نواب صاحب! میں اجڈ آدمی ہوں، خاندانی اور موروثی نواب نہیں۔ میری خواب گاہ میدانِ جنگ کی سرزمین اور میری نیند توپ کے اگلتے ہوئے انگاروں میں ہے۔ میں صرف تلوار کی زبان سمجھتا ہوں، ادب اور فلسفہ نہیں جانتا مگر آپ لوگ نواب ابن نواب ہیں اس لیے آپ لوگوں کے سامنے مصلحت ہے۔ نواب صاحبان اپنا فائدہ بھی سوچتے ہیں اس لیے اب چیتو کسی کا انتظار نہیں کرے گا۔ اگر آپ میرا ساتھ دینا چاہیں تو بسم اللہ..... ورنہ اللہ حافظ۔ خیمے کا پردہ ہٹایئے اور تشریف لے جایئے..... اور کمپنی بہادر سے جاگیر یا پنشن پر معاملہ کر لیجیے۔''

چیتو مسند سے کودا اور تیزی سے خیمے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ ایک بار پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ نواب حشمت جنگ نے اس کے شانے پر ہلکی سی تھپکی دی اور بولے۔

''میں تم سے پیچھے نہیں ہوں، تمہارے ساتھ ہوں۔''

چیتو نے بڑی گرمجوشی سے نواب حشمت جنگ کا ہاتھ دبایا اور باہر نکل گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آندھی اور طوفان کی طرح اس سرزمین سے خیمے غائب ہو گئے، چھولداریاں اونٹ گاڑیوں پر بار کر دی گئیں اور جتنے مویشی ساتھ تھے، انہیں اور سامان کو لے کر کچھ لوگ اسی جنگل سے ملحق ایک گاؤں میں چلے گئے اور بقیہ لوگ گھوڑوں پر بیٹھ گئے۔

جیسے ہی شام کا دھندلکا جنگلوں میں پھیلنے لگا اور میدانوں میں سائے دراز ہو گئے، اسی وقت چیتو اور نواب حشمت جنگ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ راج گڑھی کے قریب پہنچ گئے۔ چیتو نے سو سو آدمیوں کی پچاس ٹکڑیاں بنائیں۔ ان کو یہ حکم تھا کہ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد حملہ کریں گے۔ نواب حشمت جنگ کے ہمراہ چیتو خود سب سے آگے بڑھا۔

www.pklibrary.com

راج گڑھی میں بڑی چہل پہل تھی۔ چاروں طرف قہقہے لگ رہے تھے۔ ایک کمرے میں ڈک اور پیٹرسن بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ بریگیڈیئر ہارڈی مین سونے کی تیاری کررہا تھا لیکن پہریدار جاگ رہے تھے۔ چار سو سترہ گورے تھے اور تقریباً پانچ ہزار تلنگوں کی فوج موجود تھی۔ گوروں کے ساتھ ان کی میمیں اور لڑکیاں بھی تھیں۔ ان میں سے بعض ایسی تھیں جو حال ہی میں انگلینڈ سے آئی تھیں اور صاحب لوگوں کا دل بہلا رہی تھیں۔

اچانک ایک طرف سے ہلکا سا شور سنائی دیا اور بگل بجنے لگے۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ حملہ کردیا گیا۔ جلدی جلدی اسلحہ خانے سے صاحب لوگوں نے اسلحہ لیے۔ عورتیں مطمئن تھیں کہ حملہ آور ان تک نہ پہنچ سکیں گے اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو اکٹھا تو کرلیا لیکن اس خیال سے کہ لڑائی کا تماشا دیکھیں گے۔ مشعلیں بلند کردی گئیں اور گڑھی کی فصیل پر رکھی ہوئی توپوں میں گولہ انداز گولے چڑھانے لگے لیکن اس سے پہلے ہی چیتو کے سو آدمیوں کا ایک دستہ فصیل پر پہنچ چکا تھا اور توپوں کا منہ بند کرنے سے پہلے ایک پورے دستے کو اپنی جانوں کی قربانی دینی پڑی لیکن دوسرے دستے نے توپوں کو قبضے میں کرلیا۔

تلنگے بددل بھی تھے اور ان کے دلوں میں دہشت بھی بیٹھ گئی تھی۔ پنڈاریوں نے غضب یہ کیا کہ انہیں ختم کرنے کے بجائے مشعلیں گرادیں تاکہ اندھیرے میں لوگ اپنی تنظیم قائم نہ کرسکیں اور پھر اس طرح ان کی صفوں میں گھس گئے کہ انہیں یہ تمیز کرنا مشکل ہوگیا کہ پنڈاریوں سے لڑ رہے ہیں یا اپنے آدمیوں سے۔

گورا پلٹن کی کمان ڈک کے ہاتھوں میں تھی۔ اس نے گولیوں کی ایک بوچھاڑ کی اور اسی وقت اسے ایک تلنگے جمعدار کی آواز سنائی دی۔

''صاحب! یہ کیا غضب کررہے ہیں۔ آپ تو ہم ہی کو ختم کررہے ہیں۔''

ڈک جھنجلا گیا۔ اندھیرے نے اور ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ ٹارچ کا اشارہ کرنے ہی والا تھا کہ بھگدڑ مچ گئی۔ تلنگے بے سروسامانی کے عالم میں پلٹ پڑے تھے اور بدحواسی سے بھاگ رہے تھے۔ بریگیڈیئر ہارڈی مین گڑھی کے اندر تھوڑی سی بلندی پر کھڑا تھا۔ اس نے جو یہ عالم دیکھا تو فوراً عورتوں کے ساتھ بھاگ جانے کا ارادہ کیا لیکن بیرکوں کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اسے عجیب طرح کی چیخیں سنائی دیں۔

اسے یہ معلوم تھا کہ پنڈاریوں کے پاس اسلحہ کم ہے۔ وہ اچھل کر اپنے مقابل کی گردن اس طرح پکڑ لیتے ہیں کہ اسلحہ چلانے کی نوبت ہی نہیں آتی اور پھر گلا گھونٹ کر مار ڈالتے ہیں۔ اس احساس سے اس کے قدم کانپ اٹھے۔ اس نے سیٹی بجائی اور گڑھی کے پچھلے دروازے سے نکلا اور گھوڑے پر بیٹھ کر ایڑ دی۔ ایک ہی لمحے بعد اسے یہ معلوم ہوا جیسے اس کے پیچھے بہت سے لوگ آرہے ہیں۔ اس نے پلٹ کر بندوق جھونک ماری لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ اس نے غلطی کی۔ اس لیے کہ تاروں کی مدھم روشنی میں اس نے یہ پہچان لیا تھا کہ آنے والے گورا پلٹن کے آفیسرز ہیں۔

چیتو اور نواب حشمت جنگ کے ساتھی ان ہی لوگوں کو تلاش کررہے تھے۔ انہیں افسوس تھا کہ شکار بچ کر نکل گیا۔ ان کے اپنے پانچ سو کے لگ بھگ آدمی مارے گئے تھے مگر انہوں نے تلنگوں کی ایک پوری پلٹن کا صفایا کردیا تھا۔

تاہم اس کا انہیں افسوس تھا کہ ان ہی کے ہاتھوں ان کے اپنے بھائیوں کا خون ہوا اور وہ صرف پچیس انگریزوں کو قتل کرسکے۔ مشعلیں ہاتھوں میں بلند کیے ہوئے اب وہ پوری گڑھی کا جائزہ لے رہے تھے اور سامان لالا کر ڈھیر کرتے جارہے تھے۔ تہ خانے کے زخمی قیدی رہا کردیے گئے تھے اور نواب حشمت جنگ ان سے شوکت مرزا کے بارے میں دریافت کررہا تھا۔

''ہم نہیں بتاسکتے کہ شوکت مرزا کہاں ہیں۔ بس ہم اتنا جانتے ہیں کہ گزشتہ دو روز قبل انہیں رہا کردیا گیا تھا۔''

''یہ سب کیسے ہوا؟'' حشمت جنگ نے پوچھا۔

''ہمیں اس بارے میں کچھ علم نہیں۔''

ادھر یہ باتیں ہورہی تھیں کہ ایک طرف سے شور ہوا۔ حشمت جنگ نے مڑ کر دیکھا۔ بہت سی انگریز عورتیں اور بچے کچھ سپاہیوں کے نرغے میں آرہے تھے۔ ان کے چہروں پر موت کی سی زردی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بے ہوش ہوکر گر پڑیں گی۔ ان میں سے کچھ چیخ رہی تھیں اور کچھ ہاتھ جوڑ کر اپنی زبان میں رحم کی درخواست کررہی تھیں۔

''انہیں قتل کردیا جائے۔'' چیتو نے گرج کر کہا۔

ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا۔ نواب حشمت جنگ کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ اتنے میں ایک سپاہی نے کہا۔

''ہم ان سے اپنی عورتوں کی بے عزتی کا انتقام لیں گے۔''

''بکواس۔'' چیتو جھلا کر بولا۔ ''یہ سب فساد کی جڑ ہیں اور جو کچھ تم سوچ رہے ہو وہ پاگل پن کی نشانی ہے اس لیے انہیں لے جاکر قتل کردو۔''

www.pklibrary.com

''مگر واللہ، میرے سامنے یہ قتل نہیں کی جاسکتیں۔''
نواب حشمت جنگ تلوار ٹیک کر کھڑے ہوگئے۔

''ٹھیک ہے بھائیو!'' چیتو نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ''انہیں یہاں مت قتل کرو۔ گڑھی کے پیچھے لے جا کر ان پر بھوکے کتے چھوڑ دو۔''

''یہ مناسب نہیں ہے قبلہ۔ مصلحت اندیشی کے خلاف ہے۔'' نواب حشمت جنگ بولے۔

''منع فرمانے کا ارادہ ہے کیا؟'' چیتو نے ہنس کر پوچھا مگر اس ہنسی میں زہر تھا جسے حشمت جنگ نے بھی محسوس کیا۔

''نہیں۔'' نواب حشمت جنگ نے گونجیلی سی آواز میں کہا۔ ''ہم انہیں، یرغمال رکھیں گے اور ان میں سے ہر فرد کے بدلے میں ایک لاکھ روپیہ وصول کریں گے۔ کمپنی سے صرف تلوار سے نہیں لڑنا ہے بلکہ چاندی کی گولیوں سے بھی لڑنا ہے اور وہی چیز ہمارے پاس نہیں ہے۔''

ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا۔ نواب حشمت جنگ جانتے تھے کہ پنڈاریوں کی کمزوری پیسا ہے۔ وہ ہر قیمت پر زیادہ سے زیادہ دولت اس لیے اکٹھا کرنا چاہتے ہیں کہ اسلحہ خرید سکیں اور خود کو مستحکم بنا سکیں۔

چیتو، نواب حشمت جنگ کی تجویز سنتے ہی مسکرایا اور پھر قہقہہ لگا کر بولا۔ ''عمدہ رائے ہے۔ اس طرح کافی روپیہ مل سکے گا اور ہمیں لوٹ مار کے بجائے لڑائی کی طرف توجہ کرنے میں آسانی ہوگی۔''

تمام لوگوں نے خوشی کے نعرے بلند کر کے اس تجویز پر رضامندی کا اظہار کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان لوگوں نے راج گڑھی کا سارا سامان اپنے قبضے میں کیا۔ عورتوں کو خچروں پر بٹھایا اور پھر گڑھی میں آگ لگا کر وہاں سے چل پڑے۔

راستے میں نواب حشمت جنگ نے چیتو سے کہا۔ ''میں کمپنی سے معاملات طے کروں گا اس لیے یہ عورتیں میرے ہی پاس رہیں گی۔''

''جو آپ مناسب سمجھیے۔'' چیتو نے کہا۔ ''اگر آپ چاہیں تو ان میں سے کسی ایک کے بدلے میں شوکت مرزا کا تبادلہ بھی کر سکتے ہیں۔''

نواب حشمت جنگ نے سر جھکا لیا۔ شوکت مرزا کا خیال آتے ہی وہ اداس ہوگئے۔ انہیں جو اطلاع ملی تھی اس کے مطابق شوکت مرزا کو راج گڑھی میں ہونا چاہیے تھا۔ اسے وہاں نہ پا کر انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کی رہائی کی خاطر حشمت جنگ نے چیتو کو راج گڑھی پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا تھا۔

اگرچہ یہ سن کر انہیں بڑی خوشی ہوئی تھی کہ شوکت مرزا اب قید میں نہیں ہے اور اسے رہا کر دیا گیا ہے لیکن انہیں اب بھی یہی فکر تھی کہ آخر شوکت مرزا کہاں گیا؟

وہ شوکت مرزا کے بارے میں سوچتے رہے اور صبح کا سورج نکلنے سے پہلے جب وہ اس زمیندار کی گڑھی پر پہنچے جہاں انہوں نے دردانہ اور اس کی ماں کو چھوڑا تھا تو اس وقت ان کے چہرے پر افسردگی تھی۔

☆☆☆

صبح کا وقت تھا۔ دردانہ سر ڈھانکے ہوئے نماز پڑھ رہی تھی۔ دردانہ کی ماں نماز سے فارغ ہو کر تلاوت میں مصروف تھیں۔ نواب حشمت جنگ داخل ہوئے تو ان کے ساتھ انگریز عورتوں اور بچوں کا قافلہ بھی تھا۔ دردانہ نے سلام پھیرا اور جانماز تہ کر کے چوکی سے اتری۔

ان لوگوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر حقارت کی لکیریں ابھر آئیں۔ فوراً ہی اس کی نظر نواب حشمت جنگ پر پڑی۔ اس نے جھک کر انہیں تسلیم کیا اور ان کے جسم پر لگے ہوئے اسلحے کو کھولنے لگی۔

''بیٹی!'' نواب حشمت جنگ نے دردانہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لوگ قیدی ہیں مگر خدا کسی پر بُرا وقت نہ ڈالے اس لیے انہیں قیدی نہ سمجھنا، مہمان سمجھنا۔''

''جی ابا حضور!'' دردانہ سر جھکا کر بولی پھر اس نے مڑ کر ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ ان میں سے تین ادھیڑ عمر کی عورتیں تھیں لیکن ان کے جسم تندرست تھے اور چہرے پر سرخی جھلک رہی تھی۔ دو جوان عورتیں تھیں اور ایک لڑکی تھی جو ابھی جوانی کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک کی گود میں بچہ تھا اور دو آٹھ، دس سال کے لڑکے تھے۔ دردانہ نے سرسری طور پر ان کا جائزہ لیا اور انہیں جا کر ایک حجرے میں بٹھا دیا۔

ناشتا سب نے کیا اور گفتگو اشاروں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اچانک ایک فرنگن نے دردانہ سے انگریزی میں اس کا نام پوچھا۔ ''نام'' اور ''نیم'' کی صوتی مناسبت سے دردانہ یہ سمجھ گئی کہ وہ اس کا نام پوچھ رہی ہے۔

''میرا نام دردانہ ہے۔''

''ڈیر ڈانہ!'' فرنگن نے سر ہلا کر دہرایا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' دردانہ نے بھی دریافت کیا۔

''روزلین!'' فرنگن نے بتایا۔

اشاروں ہی کی گفتگو میں ایک ہی دن کے اندر روزلین اور دردانہ میں کافی بے تکلفی ہوگئی البتہ یہ احساس دردانہ کو ضرور ہوتا تھا کہ روزلین کے ساتھ جو عورتیں ہیں، وہ

www.pklibrary.com

روزلین کی اس بے تکلفی کو پسند نہیں کرتیں اور آپس میں چاؤں چاؤں کرتی رہتی ہیں۔

دو دن بیت چلے تھے۔ نواب حشمت جنگ نے ہارڈی مین کے پاس پیغام بھجوایا تھا اور اپنے مطالبات اس تک پہنچوا دیے تھے۔ کوئی جواب ابھی تک موصول نہیں ہوا تھا لیکن حشمت جنگ کو زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ وہ اب تک شوکت مرزا ہی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

شوکت مرزا کے ذہن میں دردانہ کی یاد چٹکیاں لے رہی تھی۔ جراح کے علاج نے اس کے جسم کے زخموں کو تو اچھا کر دیا تھا مگر دل پر جو چرکا لگا تھا، اس کی تڑپ اسے بے چین کیے ہوئے تھی۔ اچھا ہوتے ہی وہ سیدھا نواب امیر خاں کے پاس ٹونک پہنچ گیا۔

امیر خاں نے اسے دیکھتے ہی گلے سے لگا لیا۔ ''عزیزم! میں تمہارے لیے بہت پریشان تھا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ تم واپس لوٹ آئے۔''

''عجیب واقعات پیش آئے۔'' شوکت مرزا نے نواب امیر خاں کو تمام حالات سناتے ہوئے کہا۔ ''میں قیدِ فرنگ سے چھوٹ کر آ گیا اور خدا کا شکر بجا لایا، اس لیے کہ ہر گھڑی یہ خوف دامن گیر تھا کہ فرنگی کہیں میری وجہ سے آپ کے بارے میں شبہات میں مبتلا نہ ہو جائیں۔''

''مجھے بھی یہی خطرہ لاحق تھا۔ میں نے مصلحتاً نواب حشمت جنگ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔''

''نواب صاحب قبلہ کہاں ہیں؟'' شوکت مرزا نے دریافت کیا۔

''راج پور سے دس میل کے فاصلے پر راجا ہر نام سنگھ کی ایک گڑھی ہے، وہیں مقیم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم ان سے جا کر مل لو۔''

''بہت اچھا جناب!'' شوکت مرزا سر جھکا کر بولا۔

''اور دیکھو..... وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اس لیے شام کو ہی آنا۔ دن بھر تم وہیں رہ سکتے ہو۔ گرمیاں شروع ہو گئی ہیں۔'' پھر انہوں نے کچھ دیر رک کر کہا۔ ''بھئی نسیان کی شکایت ایسی بُری ہو گئی ہے کہ ضروری باتیں حافظے سے غائب ہو جاتی ہیں۔ یہ خط نواب صاحب کو دے دینا۔ لکھنؤ سے ہرکارہ لا کر پہنچا گیا تھا۔'' کہتے ہوئے انہوں نے قلم دان سے ایک خط نکال کر شوکت مرزا کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

شوکت مرزا نے خط جیب میں رکھا اور اپنی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ رات بڑی بے چینی سے کٹی۔ نواب امیر خاں سے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ دردانہ خیریت سے پہنچ گئی ہے اور اس کا بھی یقین تھا کہ وہ اسے بھولی نہ ہو گی لیکن وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کا کیا کرتا جو اسے بار بار دردانہ کی یاد دلا رہی تھیں۔

چند پہر رات باقی تھی کہ شوکت مرزا نے گھوڑے پر زین کسوائی اور چل پڑا پھر جب راجا ہر نام سنگھ کی گڑھی دھوپ سے نہا اٹھی تو شوکت مرزا یہاں پہنچ گیا۔ اسے فوراً ہی اس حصے میں پہنچا دیا گیا جہاں نواب حشمت جنگ موجود تھے۔ نواب حشمت جنگ کے سامنے ایک نقشہ بچھا ہوا تھا۔ اس پر جا بجا سرخ دھبے نظر آ رہے تھے اور وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

شوکت مرزا نے مؤدبانہ جھک کر انہیں سلام کیا۔ حشمت جنگ اسے دیکھتے ہی چونک کر کھڑے ہو گئے اور اسے لپٹاتے ہوئے بولے۔ ''واللہ! آنکھوں کو یقین نہیں آتا کہ یہ عالمِ بیداری ہے یا عالمِ خواب۔ میں تو بہت مایوس ہو گیا تھا۔''

''کل شام کو ہی میں ٹونک پہنچا ہوں۔'' کہتے ہوئے شوکت مرزا نے تمام واقعات کی صراحت بیان کر دی اور آگے بولا۔ ''اور نواب صاحب کے حکم کے مطابق اس وقت حاضر ہو گیا۔''

''بڑا اچھا کیا تم نے۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی تھیں۔'' نواب حشمت جنگ نے کہا پھر وہ اسے راج پور گڑھی پر اپنے حملے کی تفصیل سنانے لگے۔ چیتو کی بہادری کا تذکرہ جب وہ کرتے تھے تو ان کی آنکھوں میں ایک طرح کی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ آگے بولے۔ ''ہم نے کثیر تعداد میں اسلحے پر قبضہ کر لیا ہے اور کئی انگریز عورتیں، بچے ہماری قید میں بھی ہیں جن کے عوض ہم انگریزوں سے کافی تاوان وصول کریں گے۔''

شوکت مرزا بڑے انہماک اور دلچسپی سے نواب صاحب کی پوری گفتگو سنتا رہا لیکن ذہن اب بھی دردانہ کی یاد میں بھٹک رہا تھا۔ نواب صاحب سے اس نے اس واقعے کو پوشیدہ رکھا تھا کہ ڈک نے اسے کس شرط پر رہا کیا ہے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک چلمن ہٹی اور دردانہ، روزلین کے ہمراہ اندر داخل ہوئی۔ نواب صاحب دیوان خانے کے اندرونی حصے میں تھے اور یہاں کوئی غیر نہیں آ سکتا تھا۔ دردانہ کو اس کا خیال بھی نہیں تھا کہ یہاں شوکت مرزا سے آمنا سامنا ہو جائے گا۔ وہ شوکت مرزا کو دیکھتے ہی مڑی مگر اسی وقت حشمت جنگ نے کہا۔

''آؤ بیٹی! کیسے آئیں؟ یہ تو اپنا شوکت ہے۔ اسی کے لیے تو میں پریشان تھا اور تم نے مزاج بھی نہیں پوچھا۔''

www.pklibrary.com

''دردانہ مجھ سے ناراض ہے۔'' شوکت مرزا نے کہا۔
''اب اس بدگمانی کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔'' دردانہ نے کہا۔
''اچھی بات ہے۔'' نواب حشمت جنگ نے مسکرا کر کہا۔ ''اب انہیں اپنی امی کے پاس لے جاؤ اور اس کے بعد ناشتے کا انتظام کرو اور یہ خیال رہے کہ آج پہلی بار یہ ہمارے گھر کھانا کھائیں گے۔'' پھر وہ شوکت مرزا سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے۔
''جاؤ بیٹا! تم ناشتے کے بعد آرام کرنا۔ مجھے زمیندار صاحب کے ساتھ ذرا کام سے جانا ہے۔ میں شام تک واپس آجاؤں گا۔''
شوکت مرزا تھوڑی دیر تک دردانہ کی ماں کے پاس بیٹھا رہا پھر نہا دھو کر انہی کے ساتھ اس نے ناشتا کیا۔ دوپہر نزدیک ہوئی تو دردانہ کی ماں نے اسے اجازت دی کہ وہ بغل والے حجرے میں جا کر آرام کرے۔
مسہری بڑے سلیقے سے بچھی ہوئی تھی۔ شوکت مرزا جا کر لیٹ گیا۔ ایک کنیز چنبیلی پنکھا جھلنے لگی اور پھر اس نے سرگوشیوں میں دردانہ کی بے قراریوں کے متعلق بتایا۔
''دردانہ اس وقت کہاں ہوگی؟''
''ابھی تو دروازے پر کھڑی جھانک رہی تھیں۔'' چنبیلی نے کہا۔
''ذرا دیکھ کر آؤ کہاں ہیں۔''
چنبیلی نے ایک حجرے کی طرف اشارہ کیا اور پھر زقند بھرتی ہوئی یہ جا، وہ جا۔
شوکت مرزا مسکرایا اور چنبیلی کے بتائے ہوئے حجرے کی طرف چلا گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ شوکت مرزا نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ دردانہ دروازے کی اوٹ سے لگی کھڑی تھی۔ وہ تھوڑا سا اور آگے بڑھا۔ دردانہ نے چاہا کہ جھپٹ کر نکل جائے مگر اسی وقت شوکت مرزا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مڑا اور دردانہ کا دوپٹا اس کے ہاتھ میں آگیا۔
''چھوٹی سرکار! خادم اس گستاخی کے لیے معافی چاہتا ہے۔'' شوکت مرزا نے دوپٹا کنارے سے چومتے ہوئے کہا۔
''منہ دیکھی باتیں کرنا کوئی آپ سے سیکھے۔'' دردانہ نے اپنا آنچل چھڑاتے ہوئے کہا۔
''تمہیں کیا خبر کہ ہم پر کیا گزری۔'' شوکت مرزا نے ایک ٹھنڈی ہمکاری بھرتے ہوئے کہا۔
''میں جا رہی ہوں۔ آپ نہ جانے کیسی باتیں کرتے ہیں۔'' دردانہ نے پلٹ کر جاتے ہوئے کہا۔
''ابھی نہ جاؤ دردانہ!'' شوکت مرزا نے بے اختیار اس کے دونوں بازو پکڑ لیے۔
''اللہ، چھوڑیئے نا..... کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔''
دردانہ کا جملہ ابھی پورا ہی ہوا تھا کہ آہٹ ہوئی۔ شوکت مرزا نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔
روزلین پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کی نگاہیں شوکت مرزا پر جمی ہوئی تھیں۔
''اوہ..... کتنا خوبصورت۔'' روزلین انگریزی میں بڑبڑائی۔
''یہ آپ کس کے بارے میں کہہ رہی ہیں؟'' شوکت مرزا نے انگریزی میں ہی سوال کیا۔
''کیا تم انگریزی جانتے ہو؟'' روزلین چونک پڑی اور حیرت سے بولی۔ ''جی ہاں، حیرت ہے کہ سننے کے بعد بھی آپ مجھ سے سوال کر رہی ہیں۔''
''کیا تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو؟'' روزلین نے دردانہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
''ان سوالات سے تمہارا کیا واسطہ؟'' اس نے سختی سے کہا۔
''تم مجھے جانتے ہو؟'' روزلین نے پوچھا۔
''نہیں۔''
''تم نے کرنل پیٹرسن کا نام سنا ہے؟''
''ہاں، میں نے ایک بار اس کی مرمت بھی کی تھی۔'' شوکت مرزا نے بے پروائی سے کہا۔
''میں پیٹرسن کی بہن ہوں اور شاید تم اس کے ایک دوست ڈک سے بھی واقف ہو گے؟''
''ہاں، اسے بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔''
''میں نے اسی لیے تم سے پوچھا تھا کہ تم اس لڑکی دردانہ سے محبت تو نہیں کرتے اور اگر کرتے ہو تو اس خیال کو بھول جاؤ۔''
''کیوں..... اور کس لیے؟''
''اس لیے کہ ڈک اس سے بے تحاشا محبت کرتا ہے۔ اس نے ہم لوگوں کو اس کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔''
''تو کیا تمہیں ڈک نے یہاں بھیجا ہے، تم جاسوسی کرنے آئی ہو؟'' شوکت مرزا نے سخت لہجے میں کہا۔
''نہیں، نہیں..... ایسا نہیں ہے۔'' روزلین نے سادگی سے کہا۔ ''ہم تو گرفتار ہو گئے تھے۔ سنا ہے نواب نے

www.pklibrary.com

ہمیں رہا کرنے کی شرط کچھ لاکھ روپے رکھی ہے؟''

ادھر دردانہ اکتا گئی تھی۔ اس نے باہر نکلنا چاہا لیکن شوکت مرزا نے اس سے اردو میں کہا۔

''تھوڑی دیر اور رک جاؤ۔''

''آپ ان سے باتیں کیجیے نا، میری کیا ضرورت ہے؟''

''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' شوکت مرزا بولا۔

''تب ہی اتنی لگاوٹ سے باتیں کر رہے تھے۔''

''بڑی بدگمان ہو۔ بھلا اس سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟'' شوکت مرزا نے کہا۔

اتنے میں چنبیلی دوڑتی ہوئی آئی اور ہانپتے ہوئے بولی۔ ''جناب عالی! نواب صاحب تشریف لا رہے ہیں۔''

دردانہ نے چاہا کہ تیزی سے نکل جائے لیکن شوکت مرزا نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح جاؤ گی تو ان کو خوامخواہ شک ہوگا۔ انہیں میں سمجھا دوں گا، تم بیٹھ جاؤ۔'' پھر اس نے چنبیلی سے کہا۔ ''قبلہ نواب صاحب سے کہہ دو کہ ہم لوگ یہاں ہیں۔''

چنبیلی نے حیرت سے شوکت مرزا کو دیکھا اور پھر چلی گئی۔

ذرا ہی دیر بعد نواب صاحب اس حجرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے حیرت سے دردانہ اور روزلین کی طرف دیکھا پھر شوکت مرزا سے بولے۔ ''عزیزم! تم یہاں کیسے؟''

''مجھے اس پر کچھ شبہ سا ہوا تو وہیں یہ خیال بھی آیا کہ یہ جاسوس ہے، اسی لیے اس سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔''

''بہت خوب!'' نواب صاحب نے کہا۔ ''آج ہی انگریزوں کا قاصد آیا ہے۔ انہوں نے ہماری مطلوبہ رقم کا صرف نصف دینے کا وعدہ کیا ہے۔ قاصد یہ بتا رہا تھا کہ یہ بہت معمولی عورتیں ہیں۔''

''یہ غلط ہے۔ اس کا نام روزلین ہے اور یہ کرنل پیٹرسن کی بہن ہے لیکن اتنا اندازہ ہے کہ یہ جاسوس نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے میاں! جیسا تم کہو۔ میں نے تو آج یہ طے کیا ہے کہ ان لوگوں کو نصف ہی رقم لے کر چھوڑ دوں۔ ہم لوگوں کے پاس روپیہ تو عنقا ہو گیا ہے۔''

''مناسب خیال ہے۔'' شوکت مرزا نے کہا۔

''آیئے، ذرا مجھے تخلیہ میں کچھ عرض کرنا ہے۔'' شوکت مرزا نے نواب حشمت جنگ سے کہا۔

نواب صاحب فوراً اٹھے اور دیوان خانے کے بیرونی حصے میں آ کر بیٹھ گئے۔ شوکت مرزا نے خط نکال کر ان کو دیتے ہوئے کہا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں، بھول گیا تھا۔ یہ خط نواب امیر خاں صاحب نے دیا تھا۔ کسی ہرکارے کی معرفت لکھنؤ سے یہ خط ان کے پاس آیا تھا۔''

حشمت جنگ نے بیتابی سے خط لیا اور کھول کر پڑھنے لگے۔ بہت طویل خط تھا۔ اس عرصے میں شوکت مرزا خاموش بیٹھا رہا۔ نواب صاحب کے چہرے پر خوشی کے آثار ابھر آئے۔ خط ختم کرتے ہی انہوں نے کہا۔

''نواب بڈھن صاحب کا خط ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حالات سازگار ہیں۔ آپ اپنے کسی معتمد کے ہمراہ بچوں کو روانہ کر دیں تاکہ آپ کی حویلی کی بازیابی ہو سکے..... مطلب سمجھے؟''

''جی ہاں۔''

''نواب صاحب قبلہ یہ چاہتے ہیں کہ لکھنؤ میں میرا کوئی قابلِ اعتماد آدمی پہنچ جائے اور میں ہر طرف سے مطمئن ہو کر راجپوتانہ کا علاقہ چھوڑ کر لکھنؤ کی طرف چیتو کو لے چلوں تاکہ انگریزوں پر بھرپور حملہ کیا جا سکے۔ بہرکیف، یہ سب راز کی باتیں ہیں اور ان کی صراحت وقت آنے پر خود بخود تمہیں معلوم ہو جائے گی۔ میں سردست اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ تم آج امیر خاں کے پاس چلے جاؤ۔ میں تمہیں خط دوں گا، وہ ان تک پہنچا دینا اور صحیح جواب لے کر آ جانا۔''

''جی، بہت بہتر۔''

اسی روز شام کو شوکت مرزا، نواب امیر خاں کے پاس حشمت جنگ کا پیغام لے کر پہنچ گیا اور امیر خاں سے اجازت لے کر وہ پھر واپس آ گیا۔

امیر خاں نے اس سے کہا تھا۔ ''شوکت مرزا! حشمت جنگ تمہیں لکھنؤ بھیجنا چاہتے ہیں اور تمہیں وہاں جانا ہے۔''

''ابھی تو ان کے عیال لکھنؤ سے آئے ہیں؟''

''ان کی کوئی مصلحت ہوگی جس کی بنا پر دوبارہ بھیجنا چاہتے ہوں گے۔'' امیر خاں نے کہا۔ ''تمہیں اس کا خیال رکھنا ہے کہ نواب حشمت جنگ تمہارے بزرگ ہیں۔ اگر تم کسی موقع پر ان کو میرے اوپر ترجیح دو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔''

شوکت مرزا نے کچھ اور پوچھنا چاہا مگر نواب امیر خاں نے کہا۔ ''وقت آنے پر تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ اب اسی وقت جاؤ۔''

شوکت مرزا گڑھی میں واپس آ گیا۔ دروازے ہی پر دردانہ کی کنیز چنبیلی نے اس کا استقبال کیا۔

''تمہاری چھوٹی سرکار کہاں ہیں اور کیا کر رہی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنے حجرے میں ہیں۔'' چنبیلی نے جواب میں

www.pklibrary.com

کہا۔ ''رہ گیا مشغلہ..... تو یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کے نام کی رٹ..... خدا کے نام کے بعد۔''

''کیوں مجھ پردیسی کو بے وقوف بنا رہی ہو۔''

ایک خادم نے اصطبل میں لے جا کر گھوڑا باندھ دیا۔ شوکت مرزا اوپر آیا اور نواب حشمت جنگ سے باتیں کرنے لگا۔ اوپری چھت پر اس کا بستر لگا دیا گیا تھا۔ پھولوں کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ سرہانے بیلے اور گلاب کے تازہ پھول رکھے ہوئے تھے۔ شوکت مرزا نے شبنمی کے پردے گرا دیے اور آنکھیں بند کر لیں مگر نیند کوسوں دور تھی۔ وہ کروٹ بدلتا رہا، رات ڈھلتی رہی۔

اچانک وہ چونک پڑا۔ ہلکی روشنی میں اسے ایک سایہ دکھائی دیا۔ پردہ اٹھا کر اس نے پوچھا۔ ''کون.....؟''

جواب میں ہلکی سی آہٹ ہوئی اور پھر وہ سایہ ایک مکمل صورت میں اس کے سامنے آ گیا۔ یہ روزلین تھی۔ پردہ اٹھا کر وہ بے تکلفی سے مسہری پر بیٹھ گئی اور پھر پردہ گرا کر بولی۔

''تم مجھے دیکھ کر متعجب ہوئے ہو گے؟''

''یقیناً..... مگر تم اس طرح کیوں آئی ہو؟''

''یہ نہ پوچھو۔'' روزلین نے بڑے رومانٹک انداز میں کہا۔ ''میرے دل کی دھڑکنیں البتہ جواب دے سکتی ہیں اور میری نگاہیں.....''

''میں اس طرح کی سستی جذباتی باتیں سننے کا عادی نہیں۔'' شوکت مرزا نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تم اب جاؤ۔''

''کیا تم اتنے بے وقوف انسان ہو کہ حسن کا احترام بھی کرنا نہیں جانتے؟''

''کیا تم اپنے آپ کو حسین سمجھتی ہو؟ اگر ایسا ہے تو بیوقوف میں نہیں، تم ہو۔ تمہیں دیکھ کر تو مجھے بریگیڈیئر ہارڈی مین کی بلی یاد آ جاتی ہے۔''

''شوکت ڈارلنگ!'' روزلین نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔'' وہ شوکت مرزا کے نزدیک آ گئی اور اس کے منہ سے نکلتی ہوئی بھاپ شوکت مرزا کے چہرے پر پڑی۔ اسے یقین ہو گیا کہ روزلین نے شراب پی رکھی ہے۔

''تم نشے میں ہو؟''

''ہاں، میں نے تھوڑی شیمپین پی ہے۔''

''شراب تمہیں ملی کہاں سے؟''

''میں اپنے ساتھ دو بوتلیں چرا لائی تھی۔'' روزلین اور نزدیک کھسک آئی۔

''تم اب چلی جاؤ۔'' شوکت مرزا نے نرمی سے کہا۔

''تم کیوں میرا دل توڑ رہے ہو؟'' روزلین نے کہا اور بے ساختہ شوکت مرزا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ شوکت مرزا جھلا کر ہٹا اور اس نے روزلین کو دھکیلتے ہوئے کہا۔

''تم جاؤ..... ورنہ میں تمہیں اٹھا کر پھینک دوں گا۔''

روزلین کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے سے جھلاہٹ نمایاں تھی۔ وہ شوکت مرزا کو گھور رہی تھی۔ ''تم مجھ سے محبت نہیں کرو گے؟''

''جبری محبت کا اصول میں آج تمہاری زبان سے پہلی بار ہی سن رہا ہوں۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' روزلین نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تم مجھ سے محبت کرتے ہو مگر چونکہ تم نواب حشمت جنگ کی لڑکی سے وابستہ ہو، اس لیے میری طرف توجہ نہیں دیتے مگر ایک بات یاد رکھو کہ تم ڈرڈ انہ کو بھی نہیں حاصل کر سکو گے۔''

''تم اس وقت شکست خوردگی اور محرومی کا شکار ہو۔''

''جو کچھ بھی ہو۔'' روزلین چیخ کر بولی۔ ''میں اپنی بے عزتی کا انتقام لوں گی۔'' شوکت مرزا کا جواب سننے سے پہلے ہی وہ پیر پٹختے ہوئے باہر چلی گئی۔

شوکت مرزا خاموش لیٹ گیا مگر اسے ڈک یاد آ گیا اور ڈک کا نام ذہن میں آتے ہی اسے وہ تمام باتیں یاد آ گئیں جو اس کے اور ڈک کے درمیان ہوئی تھیں۔ اس نے ڈک سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے دردانہ کا پتا دے گا۔

اب دردانہ لکھنؤ جا رہی تھی۔ اگر وہ اسے لکھنؤ جانے سے روک دے گا تب بھی اس کا اندیشہ تھا کہ ڈک یہاں کا پتا معلوم کر لے گا اور پھر ایسے افراتفری کے دور میں یہاں حملہ آور ہو کر دردانہ کو حاصل کرنا مشکل نہ ہو گا۔ یہی بات لکھنؤ کے لیے بھی کہی جا سکتی تھی مگر جن کے ہاتھوں میں اتنا اقتدار بھی نہیں رہ گیا تھا کہ جتنا نواب سعادت علی خاں اور آصف الدولہ کے پاس تھا لیکن اس کے باوجود انگریز ان سے دبتے تھے۔ اس لیے کہ نواب سعادت علی خاں کے جمع کیے ہوئے خزانے پر ان کی نظریں تھیں۔

نیپال سے لڑائی شروع ہو گئی تھی اور یہ خبریں آ رہی تھیں کہ کمپنی بہادر کی فوجیں ترائی میں شکست کھا رہی ہیں۔ اودھ کی عملداری نیپال کی سرحد سے ملی تھی۔ اس لیے وہ کسی قیمت پر غازی الدین حیدر کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

شوکت مرزا نے فیصلہ کیا کہ اسے لکھنؤ جانا ہے۔ صبح کو روزلین اسے نہیں دکھائی دی۔ دردانہ ملی لیکن کچھ افسردہ سی۔ شوکت کا ماتھا ٹھنکا۔ جیسے ہی نواب حشمت جنگ ہٹے اور اسے موقع ملا، اس نے چنبیلی سے پوچھا۔

www.pklibrary.com

''آج تمہاری چھوٹی سرکار کچھ ناراض معلوم ہوتی ہیں؟''

''مرد کی قوم سے خدا بچائے، بڑے ہرجائی ہوتے ہیں۔'' چنبیلی نے کہا۔ ''بھلا آپ کو چھوٹی سرکار سے کیا مطلب۔ آپ اس فرنگن سے ہی دل بہلایئے گا۔''

''تم جانتی ہو وہ کیوں آئی تھی؟''

''تہجد پڑھنے۔ قبلہ و کعبہ پیش امام رہے ہوں گے اور اس نے نمازِ محبت جناب کے پیچھے ادا کی ہوگی۔''

''کیوں جلی کٹی سنا رہی ہو؟''

''دل جلوں کا اور کام ہی کیا ہے۔'' چنبیلی نے کہا۔ ''آپ چاہتے ہیں کہ نشیمن جل جائے اور دھواں بھی نہ اٹھے۔''

''چنبیلی! کیوں کسی محبت کے مارے کو پریشان کرتی ہو؟ تمہیں اٹکھیلیاں سوجھی ہیں اور وہ بیزار بیٹھے ہیں۔''

اچانک ایک جانب سے دردانہ کی آواز سنائی دی۔

''بات تو سچ ہے چنبیلی!'' شوکت نے کہا۔ ''فرق صرف اتنا ہے کہ جس کی یاد میں سب کچھ بھول گیا، اس کا نام دردانہ ہے۔''

''سبحان اللہ! کافر ہو جو آپ جیسے مومن کی بات کا یقین کرے۔''

دردانہ کی آواز آئی۔ ''دردانہ ہی رات آپ سے پہروں باتیں کرتی رہی۔''

شوکت مرزا تیزی سے اٹھا اور اس حجرے کے دروازے تک آگیا جہاں دردانہ کھڑی تھی اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''خدا کے لیے محبت کو غلط فہمیوں کا شکار نہ بناؤ۔''

دردانہ نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ حجرے کے دروازے کی چلمن گرادی۔

☆☆☆

دوپہر ہو رہی تھی اور بارہ دری میں دھوپ بھر گئی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا اور اس سناٹے میں شوکت مرزا، دردانہ کے دل کی دھڑکنوں کی آواز سن رہا تھا۔

''تمہیں غلط فہمی ہے دردانہ! میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ روزلین میرے پاس آئی ضرور تھی، مجھ سے لگاوٹ کی باتیں کر رہی تھی اور جب میں نے اسے ٹوکا اور منہ نہ لگایا تو وہ بپھر کر اور مجھے دھمکا کر چلی گئی۔ مجھے غلط نہ سمجھو۔ اس دل میں تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔''

دردانہ چپ ہو رہی۔

شوکت مرزا سر سے پیر تک جھنجھنا گیا۔ دل سے ایک ایسی چنگاری نکلی جس نے اس کی امیدوں اور آرزوؤں کو جلا ڈالا۔ جس کی خاطر اس نے گزشتہ رات روزلین کو ٹھکرا دیا تھا، وہی آج اس سے اس قدر بیزار ہے کہ اس کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں..... پھر ایسی زندگی سے کیا فائدہ۔ جان دینا مردوں کا کام ہے۔ وہ تو اس پوری دنیا میں تنہا صرف دردانہ کے لیے جینا چاہتا ہے اور جب دردانہ ہی اسے بھول گئی تو پھر وہ جی کر کیا کرے گا۔

وہ تیزی سے مڑا لیکن چند ہی قدم بڑھا ہوگا کہ دردانہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ چونک گیا۔ اس نے دردانہ کی طرف ..... دیکھا۔ دردانہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''آپ تو بات ہی بات میں سچ مچ خفا ہو گئے۔'' دردانہ نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ روزلین سے میں نے پیار و محبت کی باتیں کی ہوں گی یا میں اس کی طرف مائل ہوا ہوں گا؟'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''نہ۔'' دردانہ نے شوخی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''پھر تم نے ایسی شرارت کیوں کی؟'' شوکت مرزا نے اس کے بازوؤں کو گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔

''اچھا چھوڑیئے مجھے، میں جا رہی ہوں۔''

''تھوڑی دیر بعد پائیں باغ میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

''میں وہاں نہیں آؤں گی۔''

''کیوں؟''

''تنہا آپ سے باتیں کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔''

''مجھ پر بھروسا نہیں؟''

''ارے دیکھیے..... وہ امی آرہی ہیں۔'' دردانہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ شوکت مرزا نے گھبرا کر پیچھے کی طرف دیکھا اور دردانہ تیزی سے نکلتی چلی گئی۔

جب شوکت مرزا، دردانہ کی ماں کے حجرے کے قریب سے گزرا تو اسے دردانہ کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ اپنی ماں سے باتیں کر رہی تھی۔

دن میں موقع نہ مل سکا البتہ شام کو چنبیلی کی معرفت یہ پیغام ملا کہ جب سب لوگ سو جائیں گے تو وہ کوٹھے پر آجائے گی۔ شوکت مرزا بے چینی سے رات کا انتظار کرنے لگا۔ چراغ جلتے ہی نواب حشمت جنگ بھی واپس آگئے۔ ان کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ شوکت مرزا کو دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔

''فرنگیوں کے قاصد نے آج ہماری شرطیں منظور کرتے ہوئے ہمیں روپے دے دیے اور اب ہمیں اپنا وعدہ پورا کرنا ہے۔''

www.pklibrary.com

''قاصد بن کر کون آیا ہے؟''

''ایک کرنل ڈک ہے۔ بڑا شریف معلوم ہوتا ہے۔''

حشمت جنگ نے کہا۔

''کہاں ہے؟'' شوکت مرزا نے بے ساختہ پوچھا۔

''پہاڑیوں کے اس پار۔'' حشمت جنگ نے کہا۔

''اس کے ساتھ سپاہیوں کا مختصر سا دستہ ہے۔ ہم نے اسے اپنے ٹھکانے کا پتا نہیں دیا ہے۔ طے یہ ہوا ہے کہ ہمارا ایک آدمی ان عورتوں کو پہاڑیوں پر پہنچا دے گا۔''

شوکت مرزا نے ایک لمحے کے اندر یہ فیصلہ کرلیا کہ اسے ڈک کے ارادے سے حشمت جنگ کو باخبر کردینا چاہیے۔ سر جھکا کر بولا۔ ''محترم! جب میں دردانہ اور امی حضور کے ساتھ آرہا تھا تو ڈک اور اس کے ساتھیوں ہی نے ہمارے اوپر حملہ کیا تھا۔ ڈک بدنظر، بدنگاہ، بدچلن ہے۔ میں اس بات کو صرف اشاروں ہی میں عرض کرسکتا ہوں۔ میری غیرت یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ میں صاف صاف کہوں۔''

حشمت جنگ کا چہرہ سرخ ہوگیا، بھویں تن گئیں۔ بے اختیار ان کا ہاتھ تلوار کی طرف بڑھا۔ انہوں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

''واللہ! میری زندگی میں یہ ناممکن ہے۔ میں اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ دوں گا۔''

''سانپ کو اس طرح مارنا چاہیے کہ لاٹھی نہ ٹوٹے۔''

شوکت مرزا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مصلحتِ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ حضور صبر اور ضبط سے کام لیں اور ان لوگوں کو میرے ہمراہ لکھنؤ روانہ کردیں لیکن اس کی اطلاع انگریز عورتوں کو بھی نہ ہونی چاہیے۔''

نواب حشمت جنگ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا۔ ''ٹھیک کہتے ہو۔ میں ان انگریز عورتوں کو رہا کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد تمہارے ساتھ بچوں کو لکھنؤ روانہ کردوں گا اور خود چیتو کے پاس چلا جاؤں گا۔ تم جاؤ اور خفیہ طور پر دردانہ اور بیگم سے کہہ دو۔ میں ادھر ان لوگوں کو بھجوانے کا انتظام کرتا ہوں۔''

شوکت مرزا لپک کر اندر گیا۔ دردانہ بکاؤلی کے ہاتھوں باہر کھانا بھجوا رہی تھی اور چنبیلی اس کے پاس کھڑی تھی۔

''ایک ذرا، آپ کچھ سننے کی زحمت کریں گی۔'' شوکت مرزا نے کہا۔ ''مجھے حضور نواب صاحب نے بھیجا ہے۔ ان کا حکم ہے کہ میں آپ سے تخلیہ میں کچھ عرض کروں۔''

دونوں بارہ دری میں آگئے۔ یہاں بالکل تنہائی تھی۔ شوکت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس نے دردانہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''اب کہو۔'' لیکن ساتھ ہی اس کے ہاتھ بھی کانپ گئے اور سارے جسم میں لذت آمیز تھرتھری دوڑ گئی۔ اس نے چاہا کہ بے اختیار دردانہ کو اپنے سے لپٹا لے مگر دردانہ جلدی سے ہٹ گئی۔

''محبت کو رسوا نہ کیجیے۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔'' شوکت منہ بنا کر بولا پھر کہنے لگا۔ ''نواب صاحب نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ آپ لوگ ابھی اور اسی وقت خفیہ طور پر لکھنؤ چلنے کی تیاری کرلیں۔''

''کیوں.....؟''

''آپ کو وہ انگریز تو یاد ہوگا جس نے اس ویران گڑھی میں ہم پر حملہ کیا تھا۔ اس کا نام ڈک ہے اور روزلین کو رہا کرانے کے لیے وہ یہاں آیا ہوا ہے۔''

''ہاں، پھر اس سے کیا بات بنی؟''

''چھوٹی سرکار شاید بھول گئیں کہ حضور حسین اور خوبصورت ہیں اور یہ حسن ایسا ہے کہ جس کی نظریں پڑتی ہیں، وہ دیوانہ ہوجاتا ہے۔ ڈک بیچارہ بھی نگاہِ ناز سے گھائل ہوگیا ہے اور حضور ہی کی خیرات مجھے اس طرح ملی کہ اس نے اس شرط پر مجھے قید خانے سے رہا کردیا کہ میں اسے آپ کا پتا بتادوں اور اب وہ یہاں آیا ہوا ہے یا کہ آپ کو..... جانے دیجیے۔ وہ بات نہیں کہوں گا کہ وہ کیا چاہتا ہے یا کیا کرے گا۔''

پل کے پل سفر کی تیاری مکمل ہوگئی اور جب روزلین اپنی ساتھی عورتوں کے ساتھ جا رہی تھی، اس وقت شوکت بھی اسے رخصت کرنے گیا تھا۔

''میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔'' روزلین نے انگلی اٹھا کر کہا اور گھوڑے پر سوار ہوگئی۔

شوکت اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور چند ہی لمحوں بعد وہ دردانہ، اس کی ماں اور چنبیلی کے ہمراہ نواب بڈھن مرزا کے پاس جا رہا تھا۔

(جاری ہے)

ماخذات

جنگِ آزادی۔ مسلم مجاہدین۔ برطانوی عہد، مولوی ذکاء اللہ۔ برطانوی عہد، ایڈیسن

www.pklibrary.com

سیاہ رنگ کی کار بڑی تیزی سے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیور بڑی مہارت سے مختلف موڑ کاٹ رہا تھا جبکہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا براڈ ایک کڑی آزمائش سے گزر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں خیالات کی بھرمار تھی۔ وہ سیٹ پر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ کئی بار اس نے شدت سے خواہش کی کہ گاڑی بری طرح خراب ہو جائے، اتنی کہ آگے بڑھنا ممکن ہی نہ رہے۔ کبھی سوچتا اسے اچانک کال آجائے کہ آج کا پروگرام کینسل کر دیا گیا ہے، واپس آجاؤ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا تھا اور

بے ایمان رستے کو ایمانداری سے بدلنے والے مجرم کی کتھا

بے ایمان

عتیق بخاری

کبھی کبھی برائی اپنے سحر میں اس طرح جکڑ لیتی ہے کہ پھر کوئی دوسرا رستہ دکھائی نہیں دیتا... خوبصورت اور مخلص رشتوں کی تمام تر توقعات مٹی کا ڈھیر ثابت ہو جاتی ہیں مگر... پھر ایک دن مٹی کے اسی ڈھیر کو کریدنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے تاکہ کوئی امید کی کرن ان بھٹکے ہوئے لوگوں کا سہارا بن جائے... بالکل اسی طرح وہ بھی محبت کو ٹھکرا کر جانے پر بضد تھا اور پھر اسی ممتا کی محض ایک آواز کو سن لینے کے لیے بے چین رہا کیونکہ ممتا کی ایک پکار میں ہی تو اس کی نجات تھی۔

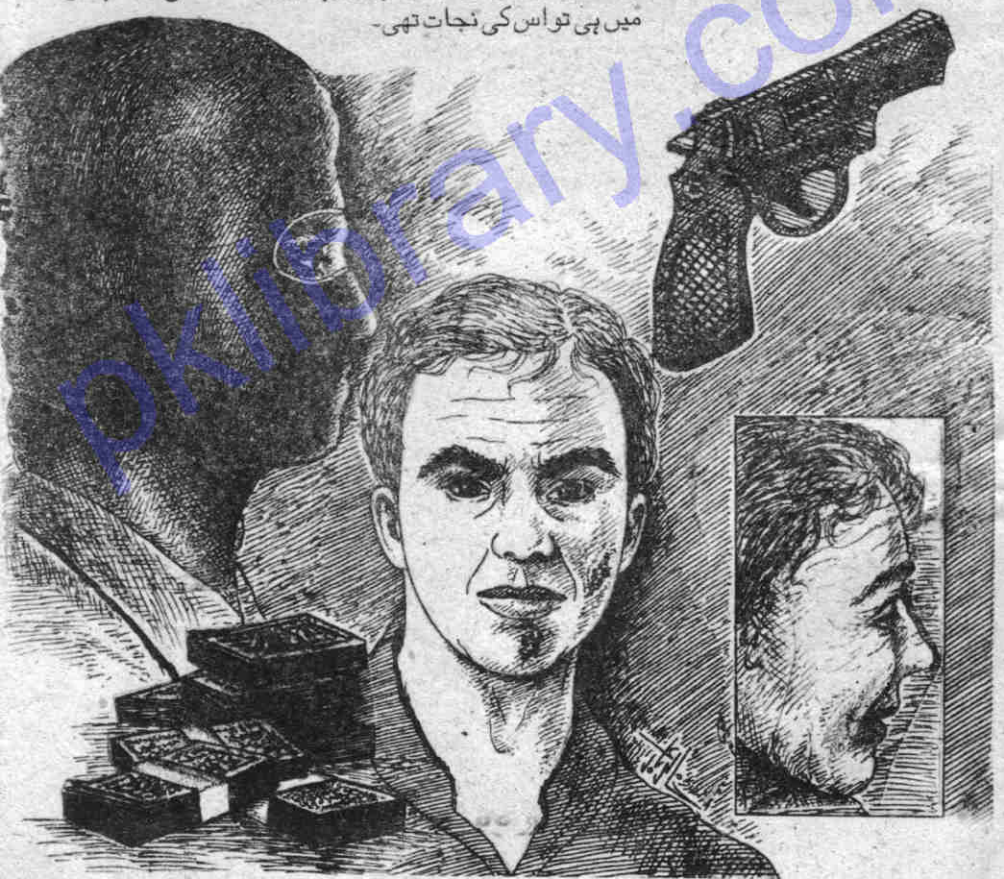

www.pklibrary.com

سفر تیزی سے کٹ رہا تھا۔ براڈ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے چٹخا رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس وقت اس کے اعصاب چٹخ رہے تھے۔

'کاش کسی اور کے ذمے یہ کام لگا دیا جاتا۔ آخر میں ہی کیوں اس کام کے لیے چنا گیا۔ اوہ گاڈ!' وہ کئی بار سوچ چکا تھا۔

''ہم پہنچ چکے ہیں۔'' ڈرائیونگ کرنے والے نے اس کے سوچنے کا سلسلہ توڑا۔ وہ چونک پڑا۔ گاڑی رک گئی تھی۔ اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے پانی کی بوتل اٹھائی اور کافی مقدار میں پانی پی لیا۔ وہ خود کو پُرسکون کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ رات خوب گہری ہو چکی تھی۔ موسم ابر آلود تھا۔ براڈ نے بادلِ ناخواستہ گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ماحول کا اندازہ لگایا۔

''تم جاؤ، میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔'' ڈرائیور اس سے مخاطب تھا۔ براڈ نے سر ہلایا اور جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھنے لگا۔ ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ دو گلیاں مڑنے کے بعد وہ اپنی مطلوبہ گلی میں پہنچ گیا۔ اس کا دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ اس کے قدم اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ یوں چل رہا تھا جیسے کوئی اسے دھکا دے کر آگے کو کر رہا ہو۔ وہ اب اس گیٹ کے سامنے کھڑا تھا جہاں اسے اپنا ضروری کام کرنا تھا۔ ہر حال میں کسی بھی بے ایمانی کے بغیر کیونکہ رالسٹن کو ادھورا کام پسند تھا نہ بے ایمانی۔

براڈ کا جسم ٹھنڈا سا پڑ رہا تھا۔ اسے اب مسز آرنلڈ کے گھر میں داخل ہونا تھا۔ وہ اپنی ہمت مجتمع کرنے کی کوشش میں تھا۔ بادل زور سے گرجے اور یکا یک تیز بارش شروع ہو گئی۔ براڈ بڑی مہارت سے گیٹ کا لاک کھول کر اندر داخل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

براڈ جرائم پیشہ گروہ کا اہم رکن تھا جو شہر بھر میں چوری کی وارداتیں کرتا تھا۔ براڈ کالج میں تھا کہ ان بُرے لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ دراصل اس کا ایک کلاس فیلو اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ محض ایڈونچر کے لیے وہ کلاس فیلو ایک بار براڈ کو اپنے ساتھ چوری کی ایک واردات میں ساتھ لے گیا اور اس انداز میں اثر ڈالا کہ براڈ بھی بُرائی کے رستے پر چل دیا۔ وہ اپنی پڑھائی سے لاتعلق رہنے لگا اور اپنے کلاس فیلو کے ساتھ مل کر چوریاں کرنے لگا۔ براڈ کی ماں کو اس وقت پتا چلا جب پولیس گھر تک پہنچی۔ ماں نے کچھ نہ کچھ کر کے براڈ کو بچا تو لیا لیکن اس نے ساتھ ہی واضح کر دیا کہ آئندہ وہ کبھی بھی اس کا ساتھ نہیں دے گی۔ اس نے براڈ کو خوب بُرا بھلا کہا۔

''میں اتنی اچھی جگہ پر اعلیٰ عہدے پر کام کرتی ہوں۔ تم نے میرا نام خراب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔'' ماں چیخی۔ شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے اکلوتے بیٹے کو کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی اور اپنی طرف سے اس کی بھرپور تربیت کی لیکن براڈ نے اسے سخت مایوس کیا اور چوری جیسے جرم میں ملوث ہو کر ماں کا نام ڈبو دیا۔

''ممی! میں ایسا بالکل بھی نہیں ہوں۔ دراصل میرا ایک کلاس فیلو دو چار بار حوالات جا چکا ہے۔ بس اس سے تھوڑی ہیلو ہائے کرنے کی بنیاد پر پولیس نے مجھے بھی مجرم سمجھ لیا۔'' براڈ نے سفید جھوٹ بولا۔

''مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے یا پولیس کو؟ تم جھوٹ بول کر بچ نہیں سکتے۔ بس فوراً یہ سب چھوڑو۔ آئندہ مجھے کوئی شکایت ملی تو گھر سے نکال دوں گی۔ پھر تم جانو، تمہارے آوارہ دوست جانیں اور پولیس جانے۔'' ماں نے سخت الفاظ میں کہا۔

براڈ سر جھکائے بیٹھا سنتا رہا۔ اس پر ماں کی نصیحت کا بالکل اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کا دل و دماغ بُرائی کی دلدل میں دھنسنے کو تیار تھے۔ ماں کی باتیں اسے چبھ رہی تھیں۔ اس کی خاموشی دیکھ کر ماں سمجھ رہی تھی کہ اس پر اثر ہو رہا ہے جب کہ براڈ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ جو اس کا دل چاہے گا، وہ کرے گا۔

☆☆☆

''یہ براڈ بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ تم اسے اپنے گروہ میں مستقل شامل ہونے کے لیے زور ڈالو۔'' رالسٹن نے جم سے جو براڈ کا دوست تھا، کہا۔

''یس باس! میں کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ وہ جلد ہمارے ساتھ آ ملے گا۔'' جم نے بڑے یقین سے کہا۔

''وہ سیدھا سادہ اور بہت ایماندار لگتا ہے۔ یعنی ہمارے ساتھ بھی ہیرا پھیری کرنے کا سوچے گا بھی نہیں۔ مجھے ایسے لڑکے ہی چاہئیں۔ تم کوشش جاری رکھو۔'' رالسٹن نے جم سے تحکمانہ انداز میں کہا۔ جم سر ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

''تو تم باز نہیں آ رہے؟'' براڈ کی ماں نے تفتیشی انداز میں سوال کیا۔

www.pklibrary.com

''ممی! آپ کو مجھ پر شک کیوں ہو رہا ہے جبکہ میں نے تو اب ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔'' براڈ نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ماں کا پارہ چڑھنے لگا۔

''تمہارا آنا جانا، اٹھنا بیٹھنا، ساری ہی سرگرمیاں مشکوک لگ رہی ہیں۔ مجھے شک نہیں، یقین ہے کہ تم نے اپنے آوارہ دوستوں اور اپنے کرتوتوں کو نہیں چھوڑا۔'' ماں نے غصیلے انداز میں کہا۔

''ممی! کیا چاہتی ہیں آپ؟'' براڈ نے فرش پر پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

''تم نے انہیں چھوڑ دیا ہے یا نہیں، اس کا جواب چاہیے مجھے۔'' ماں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''میں نے..... انہیں نہیں چھوڑا..... یہ میری لائف ہے۔ جو جی میں آئے گا، کروں گا۔ آپ مجھ پر روک ٹوک نہیں کر سکتیں۔ میری زندگی اس طرح زیادہ خوبصورت ہے۔'' براڈ چلا اٹھا۔ ماں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''براڈ! تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ میری اچھی جاب ہے، آبائی زمین سے معقول آمدنی ہوتی ہے۔ تمہیں خرچے کے لیے تمہاری مرضی کے مطابق رقم ملتی ہے تو پھر یہ چوری چکاری، چھینا جھپٹی، پولیس سے بھاگتے رہنا، یہ سب کیوں؟'' ماں نے خود کو سنبھال کر اسے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی لیکن براڈ اب سمجھنے سمجھانے کی حد سے نکل چکا تھا۔ اس نے ماں کی ایک نہ سنی۔

''تو پھر ٹھیک ہے، تم فوراً..... یعنی ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے دفعان ہو جاؤ۔ مجھے ایک مجرم کو اپنے گھر میں رکھنے اور پولیس کے چکروں میں پڑنے کا کوئی شوق نہیں۔'' ماں نے بڑی سرد مہری سے بادلِ ناخواستہ کہہ دیا۔ براڈ نے ایک بار بھی رکنے کی ضد یا درخواست نہیں کی۔ اپنا ضروری سامان بیگ میں رکھا اور گھر سے نکل آیا۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر ماں کی طرف نہیں دیکھا جس کے چہرے پر دکھ اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

☆☆☆

''مجھے بے ایمانی بالکل بھی برداشت نہیں۔'' بالکل بھی نہیں'' کا مطلب ہے، ہرگز ہرگز نہیں۔ میں اس معاملے میں بہت سخت ہوں۔ اگر میرے ساتھ میرا کوئی ممبر ہیرا پھیری کرے، میں اس کی حالت عبرتناک بنا دیتا ہوں۔ ایسی حالت کرتا ہوں کہ دیگر ممبران دیکھ کر ہی سبق حاصل کر لیتے ہیں۔'' رالسٹن بڑے سرد انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس کے گروہ مین باضابطہ اور مستقل شامل ہونے کے بعد براڈ کو اس کے پاس خصوصی ملاقات کے لیے لے جایا گیا۔

''جی، میں جانتا ہوں۔ جم نے آپ کا یہ اصول مجھے بہت پہلے بتا دیا تھا۔'' براڈ نے آہستگی سے کہا۔ رالسٹن کی گونج دار آواز کے سامنے اس سے یہ مشکل بولا گیا تھا۔

''میرے ساتھ کئی بار کئی لوگوں نے بے ایمانی کی۔ اس غلط فہمی میں کہ ان کے ساتھ کچھ نہیں ہوگا یا شاید مجھے پتا نہیں چلے گا لیکن میری آنکھوں سے کچھ بھی چھپا نہ رہا اور وہ سب عبرت انگیز انجام سے دوچار ہوئے۔ تمہیں بھی ایک دو واقعات سنا دیتا ہوں۔ تمہارے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔'' رالسٹن نے اتنے پتھریلے اور خوفناک انداز میں ''دلچسپی'' کہا کہ براڈ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ رالسٹن یقیناً ''باعثِ عبرت'' کو ''دلچسپی'' کا نام دے رہا تھا۔

''ایک بار ایک بے وقوف نے انعام کے لالچ میں پولیس کا مخبر بننے کی کوشش کی تھی۔ مجھے پتا چل گیا۔ میں نے اس کی زبان اور دونوں ہاتھ کٹوا کر پھنکوا دیا۔ نہ بے چارہ بول کر بتا سکتا ہے، نہ لکھ کر..... میں جانتا ہوں کہ اسے آئی کوڈ کے ذریعے بات نہیں کرنا آتی ورنہ میں اس کی آنکھیں بھی نکلوا دیتا۔ بیوقوف خود اپنا دشمن بن گیا اور زبان ہاتھوں سے محروم ہو کر عجیب سا بن گیا، ہاہاہا۔''

رالسٹن نے بھیانک واقعہ بیان کر کے بھیانک سا قہقہہ لگایا۔ براڈ کے ماتھے پر پسینا آ گیا لیکن اس نے خود کو فوراً ہی سنبھال لیا کیونکہ وہ یہاں اپنی مرضی اور خوشی سے آیا تھا اور اسے ان لوگوں کے ساتھ کام کرنا تھا۔

''ایک بار ایک نان سینس نے چوری کی ہوئی اشیا چوری میرے حوالے نہ کیں اور کچھ چیزیں اپنے پاس رکھ لیں۔ مجھے غصہ آ گیا کہ جب مال سب میں برابر تقسیم اور مجھے بطور لیڈر زیادہ حصہ دینے کا اصول ہے تو اس نے کیوں امانت میں خیانت کی..... پتا ہے میں نے کیا، کیا؟..... میں نے کم چیزیں دینے پر اس کے کچھ پارٹس آف باڈی کم کر دیے..... زیادہ نہیں، بس ہاتھ کی دو اور پاؤں کی تین انگلیاں کاٹ دیں اور ایک گردہ نکال کر فروخت کر کے اپنا نقصان پورا کر لیا..... کیسا؟'' اس نے بڑے آرام سے اپنے ظلم کی کہانی سنائی اور آخر میں براڈ سے گویا داد چاہی۔ براڈ کا حلق خشک ہونے لگا۔ وہ بہت خوفناک اور ظالم گینگ کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

''باس! مجھے خود ایمانداری سے کام کرنا پسند ہے۔

www.pklibrary.com

میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ مخلص ہو کر رہوں گا۔ آپ سے کچھ چھپاؤں گا نہ کسی کو اپنے گینگ کے بارے میں کچھ بتاؤں گا۔'' براڈ نے رالسٹن کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

رالسٹن کا چہرہ بھی اس کے اصولوں اور سزاؤں کی طرح خوفناک تھا۔ سرخ کھردرا چہرہ، غیر معمولی سرخ آنکھیں، ٹھوڑی اور بائیں گال پر زخموں کے گہرے نشان اور نوک دار سی بڑی سی ناک..... اس پر اس کی کھردری آواز۔ کافی خوفناک شخص تھا رالسٹن۔

''چند فراڈ لوگوں کو سزائیں دینے کے بعد میں نے ایک حل سوچا ہے اس مسئلے کا..... میں اب ہر گینگ ممبر سے ایمانداری کے ساتھ کام کرنے کا حلف ایک اور ہی انداز میں لیتا ہوں جس کے بعد کوئی بھی بے ایمانی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آج تم بھی وہ حلف اٹھاؤ گے۔'' رالسٹن نے ایک نئی بات بتائی تو براڈ چونک سا گیا۔

''حلف..... اور ہی انداز؟'' براڈ نے دل میں سوچا۔

''تم خود اپنے ساتھ، اپنی ذات کے ساتھ حلف اٹھاؤ گے کہ میں کسی بھی واردات کے دوران یا بعد میں کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کروں گا، کوئی بھی ایسا لفظ نہیں بولوں گا جو میرے کام میں بے ایمانی کہلائے..... یعنی اب جو کچھ تم کرو گے، وہ تمہارا کام ہوگا۔ تم میرے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں کرو گے۔ بس اپنے آپ کے ساتھ قسم کھالو کہ ایمانداری کے ساتھ ہر واردات مکمل کرو گے اور اپنی ہر واردات کو، اپنی ذات کو بے ایمانی سے بچائے رکھو گے۔'' رالسٹن نے حلف کی تفصیل بتائی۔ براڈ نے فوراً قسم کھاتے ہوئے اس سے وعدہ کیا کہ وہ کبھی بھی اپنی ذات کے ساتھ بددیانتی، خیانت، ہیرا پھیری کرنے کا مرتکب نہیں ہوگا۔

☆☆☆

براڈ کی ممی نے کئی ہفتے بیٹے کا انتظار کیا کہ شاید وہ شرمندہ ہو کر، پچھتا کر لوٹ آئے لیکن اس کا انتظار ختم نہ ہو سکا۔ براڈ واپس نہ آیا۔

''میں پاگل ہوں جو اس کی واپسی کی امید لگائے بیٹھی ہوں۔ اس روز اس کے جانے اور جانے سے پہلے بولنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اب کہیں اور زیادہ خوش رہنے والا ہے۔'' ماں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

☆☆☆

براڈ اپنی معصوم شکل اور بظاہر اچھے اطوار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی کامیاب وارداتیں کر چکا تھا۔ برائی کی زندگی اسے اچھی اور ایڈونچر سے بھرپور لگنے لگی تھی۔ دوسروں سے ان کی دولت چوری سے حاصل کر کے اس پر عیش کرنا اس کے لیے دلچسپ تجربہ ثابت ہوا تھا۔ وہ برائی کی دلدل میں دھنستا جا رہا تھا، وہ بھی اپنی مرضی سے۔

'وقت پر کالج، وقت پر بریک فاسٹ، لنچ..... ممی کے سخت اصولوں کے مطابق شب و روز گزارنا کتنا بورنگ تھا۔' وہ اکثر سوچتا۔

☆☆☆

''تم، جم اور چند دوسرے لڑکے کچھ روز چھپ کر رہو۔ پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ میں نے ٹھکانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ تمہیں میرے اگلے حکم تک وہیں رہنا ہوگا۔'' رالسٹن نے حکم سنایا۔ وہ سب ''یس'' کہتے ہوئے رالسٹن کے کمرے سے باہر نکل آئے اور اس وین میں بیٹھ گئے جو انہیں خفیہ ٹھکانے پر لے جانے والی تھی۔

آدھے سے زیادہ فاصلہ تو آسانی سے کٹ گیا لیکن پھر اچانک ہی پولیس کی گاڑیاں نمودار ہوئیں اور ان کی وین کا تعاقب شروع ہو گیا۔ غالباً پولیس کو ان کے روٹ کی خبر مل گئی تھی اور وہ گھات لگائے بیٹھے تھے۔ ڈرائیو کرنے والے نے اسپیڈ بڑھانا شروع کر دی۔ پیچھے سے پولیس گاڑیوں کے سائرن بج رہے تھے۔ بڑی کوشش کے باوجود وہ اپنی اور پولیس کی گاڑیوں کے درمیان فاصلہ نہ بڑھا پائے تو ان میں سے دو لڑکوں نے پولیس پر فائر کھول دیا۔ جواباً پولیس کی جانب سے فائرنگ ہوئی۔ ان کی وین کے ٹائر پنکچر کر دیے گئے۔ سب نے گھبرا کر چھلانگیں لگاتے ہوئے گاڑی کو چھوڑا اور چھپنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگے۔

براڈ کو پہلی بار ایڈونچر کے بجائے خوف محسوس ہوا۔ اس نے سڑک کے کنارے بڑے سے درخت کے پیچھے خود کو چھپا لیا۔ فائرنگ جاری تھی۔ براڈ کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھی کن درختوں کے پیچھے یا کہاں چھپے ہیں یا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس نے خوف کے مارے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ جب فائرنگ تھمی تو اس نے ڈرتے ڈرتے بڑی احتیاط سے درخت کی اوٹ سے جھانکا۔ سڑک کا منظر دیکھتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس کے ساتھیوں کی خون میں لت پت لاشیں اس کے سامنے تھیں۔ اسے اس گینگ میں لانے والے جم سمیت سب مردہ پڑے تھے۔ اس کا پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا اور اس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ان سب کی لاشوں کو دیکھ رہا تھا جو ابھی چند منٹ پہلے پولیس کو چکما دے کر محفوظ ٹھکانے پر جانے کی خوشی منا رہے تھے اور آئندہ وارداتوں کی پلاننگ کر رہے تھے۔ پولیس کو

www.pklibrary.com

چکما دینا ان کی غلط فہمی تھی اور پولیس کی گاڑی پر فائرنگ کرنا سنگین غلطی جس کا خمیازہ وہ بھگت چکے تھے۔

اچانک براڈ کو احساس ہوا کہ وین میں سے چھلانگ لگا کر جان بچانے والوں میں سے صرف وہ واحد شخص تھا جو زندہ بچ پایا تھا، باقی سب کے سب مر چکے تھے۔ براڈ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے آہستہ آہستہ خود کو زمین پر تقریباً گرا لیا۔ سڑک کلیئر ہونے کے بعد اسے نہیں معلوم کہ وہ کیسے اٹھا، کیسے رالسٹن سے رابطہ کیا اور کیسے اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ وہ کئی دن ڈرا رہا۔ اسے سوتے جاگتے وہ لاشیں نظر آتیں جو اس کے ساتھیوں کی تھیں۔ اس نے اپنے خوف کو اندر ہی اندر چھپائے رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ رالسٹن یا کوئی اور اس کی کیفیت سے آگاہ ہو۔

'کیا جرائم کی دنیا میں آجانے والے ہر شخص کا یہی انجام ہوتا ہے؟' دہل کر اس نے کئی بار سوچا تھا۔

☆☆☆

مسز آرنلڈ کو اپنی فرینڈ کی بیٹی کی شادی میں جانا تھا۔ بہت بڑی تقریب تھی۔ بہت امیر اور اعلیٰ لوگ مدعو تھے۔ مسز آرنلڈ نے اسی مناسبت سے تیار ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ تقریب سے دو دن پہلے اپنی خاندانی قیمتی اور خوبصورت جیولری لاکر سے نکلوا لائیں اور بڑے عام سے انداز میں، بے فکری سے اسے اپنے سونے والے کمرے کی الماری میں رکھ دیا۔

'کون سا کسی چور کو معلوم ہے کہ میں شادی میں شرکت کے لیے جیولری گھر میں رکھ رہی ہوں۔' بڑی بے فکری سے انہوں نے سوچا تھا۔

☆☆☆

'اچھی بھلی شریفانہ زندگی سے میں نے بُری زندگی میں قدم رکھ لیا۔ ہر قدم پر پکڑے جانے کا خطرہ، ہر پل موت کا خوف۔' اپنی ممی کے اصولوں پر بنی ہوئی بورنگ لائف اسے یاد آنے لگی تھی حالانکہ جم اسے اس دلدل میں لایا تھا، اس کے باوجود وہ اکثر براڈ کو یاد آنے لگا۔

'وہ جیسا بھی تھا، میرا دوست تھا۔ کیسے پل بھر میں ختم ہو گیا۔' وہ ٹھنڈی آہیں بھرتا۔

''کتنا اچھا ہو کہ پولیس مجھے پکڑ لے اور پھر ممی میری اس مصیبت سے جان چھڑوا دیں اور میں پھر اپنی پرانی زندگی کی جانب لوٹ جاؤں۔'' اس نے شدت سے خواہش کی۔

'کاش بے ایمانی نہ کرنے کا حلف نہ اٹھایا ہوتا۔ مجھے حلف توڑنے پر رالسٹن کی سزا کا کوئی خوف نہیں لیکن میں ایک اصول پسند انسان ہوں۔ کبھی بھی اپنی ذات کے لیے بنائے گئے اپنے ہی اصول کو نہیں توڑ سکتا۔ میں کبھی بھی کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا جس سے ایمانداری پر ضرب پڑے۔' آنکھیں بند کیے ہوئے اس نے سوچا تو یکدم اسے گھٹن سی محسوس ہوئی کہ کیا پھر ساری زندگی مجرمانہ سرگرمیوں میں پولیس کے خوف میں گزرے گی؟

'میں پولیس کو مخبری کروں یا نہ کروں، مجھے یقین ہے وہ مجھ تک ضرور ایک دن پہنچ جائے گی پھر میں کوئی بھی مزاحمت کیے بغیر گرفتاری دے دوں گا۔' ایک امید دلا کر اس نے خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی لیکن پہلی بار چھ سات لاشیں اپنے سامنے دیکھنے کے بعد محسوس ہونے والے شدید اعصابی دھچکے نے اس کی یہ کوشش ناکام کر دی۔

☆☆☆

''ہمارے آدمیوں نے ان چند لوگوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کی ہیں جنہیں اب ہم نے لوٹنا ہے۔

عادت

فرینک کو ہر معاملے کا خوشگوار پہلو دیکھنے کی عادت تھی۔ بُری سے بُری خبر سن کر بھی وہ یہی کہتا۔ ''معاملہ اس سے بھی بدتر ہو سکتا تھا۔''

دوستوں نے اس کی عادت چھڑانے کے لیے ایک بدترین سچویشن گھڑ کر اسے سنانے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے روز گولف کورس میں کھیل کے دوران ایک دوست نے کہا۔

''فرینک! تم نے ٹام کے بارے میں سنا؟ کل رات وہ گھر گیا تو اس نے اپنی بیوی کو کسی شخص کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا۔ اس نے دونوں کو گولی ماردی اور پھر اپنی کنپٹی پر بھی پستول رکھ کر خودکشی کر لی۔''

''اوہ! بڑا افسوس ہوا یہ سن کر۔'' فرینک نے سر ہلایا پھر حسبِ عادت بولا۔ ''لیکن معاملہ اس سے بدتر بھی ہو سکتا تھا۔''

''اس سے بدتر بھلا کس طرح ہو سکتا تھا؟'' دوست نے حیرت سے پوچھا۔

''اگر یہ واقعہ پرسوں رات پیش آتا تو اس وقت میں اس دنیا میں نہ ہوتا۔'' فرینک نے جواب دیا۔

(مرسلہ: نازیہ خان، کوئٹہ)

www.pklibrary.com

تمہارے ذمے یہ گھر ہے۔ اس میں ایک عورت اکیلی رہتی ہے۔ اس نے دو روز قبل قیمتی جیولری اپنے گھر میں لاکر رکھی ہے۔ تم وہاں جاؤ گے اور اس جیولری کے علاوہ مزید چیزیں بھی حاصل کرو گے کیونکہ ظاہر ہے قیمتی جیولری رکھنے والی کے پاس اور بھی بہت کچھ ہوگا۔ اکیلی ہے، خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ڈینی تمہارے ساتھ ہوگا۔ یہ گاڑی اسٹارٹ رکھے گا۔ مجھے یقین ہے تم پہلے کی طرح یہ واردات بھی کامیابی سے کرلو گے۔'' رالسٹن ایک پرچی تھماتے ہوئے براڈ سے مخاطب تھا۔ اس پرچی پر اس کے ہی گھر کا ایڈریس تھا جسے آج براڈ نے لوٹنے جانا تھا۔ براڈ نے پرچی تھامی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر مسز آرنلڈ کچھ دیر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی رہیں۔ کچھ سیاسی خبریں دیکھتے ہوئے انہوں نے بور ہو کر چینل بدلا اور انٹرٹینمنٹ شو دیکھنے لگیں لیکن جلد ہی انہیں نیند آنے لگی۔ بیڈ پر لیٹتے ہی وہ سو گئیں۔ دراصل آج کافی مصروف دن گزارا تھا اس لیے خوب تھکن تھی۔ انہوں نے لائٹ بھی آف نہ کی کیونکہ اس کی ہمت ہی نہ تھی۔

براڈ نے جیکٹ کی جیب سے نقاب نکالا اور چہرے پر پہن لیا۔ وہ گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کچھ عرصے سے گھبراہٹ، اداسی نے اس کا گھیراؤ کیا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح بے ایمانی کیے بغیر قانون کے ہتھے چڑھ جائے لیکن ایسا ہو نہیں پا رہا تھا اور آج اسے ایک اور کٹھن امتحان کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جس نے اس کے اعصاب شل کر دیے تھے۔ اسے مسز آرنلڈ کے گھر چوری کرنے بھیجا گیا تھا۔ مسز آرنلڈ..... یعنی براڈ کی اپنی ماں.....

براڈ آرنلڈ اپنے ہی گھر میں..... اپنی ہی ماں کی جیولری چوری کرنے آیا تھا..... اور اسے یہ کام ایمانداری سے سرانجام دینا تھا۔

وہ گھر کے کونے کونے کو جانتا تھا۔ سیف کا کوڈ، الماری کے خانے، کتنی رقم کہاں پڑی ہوتی ہے..... اسے سب معلوم تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ممی جب بھی کسی تقریب کے لیے جیولری لاتی ہیں تو اسے سامنے الماری کے خانے میں رکھ لیتی ہیں۔ کبھی اسے چھپا کر نہیں رکھا۔

عجیب کیفیت اور جذباتی کشمکش میں مبتلا وہ ممی کے سونے کے کمرے میں پہنچ گیا۔ باہر بہت تیز بارش ہو رہی تھی اور آرنلڈ کا جسم پسینے میں یوں شرابور تھا جیسے باہر والی بارش اس پر برس رہی ہو۔

''مجھے چوری کر لینی چاہیے۔'' کانپتے جسم کو اس نے سیف کی جانب زبردستی دھکیلا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا نقاب نوچ کر پھینکے اور ماں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

''میں جلدی سے کام نمٹا کر چلا جاتا ہوں۔ جلدی کرنا ہوگی۔ اگر..... اگر کچھ دیر اور رکا تو یقیناً پاگل ہو جاؤں گا۔'' خود سے براڈ نے بڑی اہم بات کی۔

'یہ رالسٹن کو معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں، میرا خاندانی پس منظر یا گھر کہاں ہے جو مجھے یہاں بھیج دیا؟ کہیں مجھے جان بوجھ کر تو نہیں بھیجا گیا؟ نہیں نہیں..... رالسٹن کو واقعی پتا نہیں کہ میں یہاں رہتا تھا اور یہ میری ممی کی رہائش گاہ ہے۔ بس اتفاقاً میں اس کڑی آزمائش میں پڑ گیا۔' الماری کے سامنے کھڑا وہ کئی باتیں سوچے جا رہا تھا۔ اس نے کئی بار ماں کی جانب دیکھا جو آرام سے سو رہی تھی۔

'کیا کوئی کھٹکا کروں کہ ممی کی آنکھ کھل جائے اور وہ لٹنے سے اور میں لوٹنے سے بچ جاؤں۔' اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

'نہیں..... ہرگز نہیں..... یہ تو بے ایمانی ہے میری اپنے کام کے ساتھ۔' اس نے خیال فوراً ہی رد کر دیا۔ اس نے چند منٹ سوچا اور کوئی بھی راہ نہ پا کر الماری سے جیولری اور پیسے نکال لیے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ دل غم سے بھر رہا تھا کہ کیسے ممی کو نقصان کا معلوم ہونے پر شاک لگے گا..... اور اگر یہ بھی پتا چل جائے کہ یہ براڈ کا کام ہے تو.....؟ اپنے گھر کا نقصان کتنا دکھ دے رہا ہے۔ جن گھروں کو میں نے لوٹا ہے، وہ اسی طرح اذیت میں مبتلا ہوتے ہوں گے۔ براڈ بری طرح پچھتا رہا تھا۔

چیزوں کو ایک چھوٹے سے بیگ میں ڈال کر وہ بیڈ کی جانب بڑھا جہاں اس کی ماں سو رہی تھی۔ وہ چند سیکنڈ ماں کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مسز آرنلڈ کے بہت قریب تھا۔ کافی عرصے بعد انتہائی نامناسب وقت میں ماں کی شکل دیکھنے کو ملی تھی۔ اس نے ماں کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور باہر جانے کے لیے مڑنا ہی چاہا تھا کہ اچانک اس کے دماغ میں بجلی کا کوندا لپکا اور اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''ممی.....! کیسی ہو تم؟''

یہ جملہ اس نے بہ آوازِ بلند کہا۔ مسز آرنلڈ نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلتے ہی ان کی نظر سامنے کھڑے نقاب پوش پر پڑی جس کی آواز انہیں سوتے میں بھی مانوس لگی تھی۔ وہ خوفزدہ ہو گئیں اور پہلا خیال یہی آیا کہ ان کے علاقے کا کوئی آوارہ لڑکا سامنے کھڑا ہے، اسی

www.pklibrary.com

لیے آواز سنی سنی سی محسوس ہوتی ہے۔

''کون..... کون ہو..... تم..... کیا کرنے آئے ہو؟''

مسز آرنلڈ اٹھ بیٹھیں اور گھبرائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ان کی نظر نقاب پوش کے ہاتھوں پر پڑ چکی تھی جس میں چھوٹا سا بیگ تھا۔ کئی خدشات ان کے دل میں پیدا ہوئے۔ نقاب پوش خاموش کھڑا تھا۔ مسز آرنلڈ نے دوبارہ پوچھا۔

''تم بول کیوں نہیں رہے، کیا چاہتے ہو؟'' نقاب پوش کا کوئی بھی غلط اقدام نہ دیکھ کر وہ سنبھل گئی تھیں۔ نقاب پوش بدستور خاموش تھا۔ مسز آرنلڈ نے ذرا غور کیا تو نقاب کے اندر سے جانی پہچانی آنکھیں انہیں نظر آئیں۔ وہ بُری طرح چونکیں۔ ماں نے بیٹے کو پہچان لیا تھا۔ براڈ کے ماں کا حال پوچھنے سے لے کر مسز آرنلڈ کے اس کو پہچان جانے تک بس چند ہی لمحے لگے تھے۔ مسز آرنلڈ ایک جھٹکے سے انھیں اور نقاب کھینچ کر اتار دیا۔ سامنے ان کا اپنا بیٹا کھڑا تھا۔ انہیں سمجھنے میں بالکل دیر نہیں لگی کہ براڈ اپنے ہی گھر میں چوری کر چکا ہے۔

''ذلیل انسان! تم اتنا گر جاؤ گے، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔'' ایک زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے وہ چلّائیں۔ انہوں نے مزید تھپڑ بھی مارے، گریبان سے پکڑ کر جھٹکے دیے۔ جب بیگ چھین کر اسے الٹا کر اپنی رقم اور جیولری دیکھی تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بغیر کوئی وقت ضائع کیے مسز آرنلڈ نے پولیس کو فون کر دیا۔ وہ ایک مجرم کو فوری قانون کی گرفت میں دیکھنا چاہتی تھیں۔ براڈ ان کا بیٹا ہے، یہ تو وہ عرصہ پہلے بھول گئی تھیں۔

براڈ نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ ڈینی نے پولیس وین کے سائرن سن کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن مشکوک گاڑی اور حرکات کی وجہ سے دھر لیا گیا۔

''نان سینس..... گھٹیا..... اپنے ہی گھر میں، اپنی ہی ماں کی جیولری چوری کرنے آیا تھا۔ لعنت ہے اس پر۔'' مسز آرنلڈ گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھی۔

☆☆☆

''ممی! پلیز..... کچھ کریں میرے لیے..... میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں کسی سڑک پر، رستے پر پولیس کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے خوف آنے لگا ہے اس بھیانک زندگی سے..... میں..... میں واپس اپنی دنیا میں آنا چاہتا ہوں..... اس کے لیے آپ ہیلپ کریں..... ممی! یقین کریں میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' جونہی مسز آرنلڈ بیٹے سے ملنے جیل گئیں، براڈ نے بلک بلک کر روتے ہوئے التجا کرنا شروع کر دی۔

''اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم دوبارہ غلط رستے پر نہیں جاؤ گے؟'' ماں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ اس کی تو دلی خواہش تھی کہ بیٹا اچھی زندگی کو پھر سے اپنا لے۔

''ممی! میں..... میں قسم اٹھاتا ہوں کہ کبھی کوئی غلطی نہیں دہراؤں گا۔ بس مجھے یہاں سے نکالیں پلیز۔'' وہ گڑگڑا رہا تھا۔ مسز آرنلڈ کو براڈ کے لفظوں اور آنسوؤں میں سچائی نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

ڈینی بہت کمزور اعصاب کا ثابت ہوا۔ بہت جلد سب کچھ اگل دیا اور تقریباً سارا گینگ پکڑا گیا۔ مسز آرنلڈ خوش تھیں کہ اپنے بیٹے کو قانون کے حوالے کرنے کا اتنا فائدہ ہوا کہ پورا علاقہ سکون میں آ گیا۔ مسز آرنلڈ کی پولیس کو کی جانے والی کال کے نتیجے میں براڈ کو تو پولیس نے پکڑا ہی تھا۔ ڈینی بھی گرفت میں آ گیا جس نے تمام ساتھی مجرموں کے بارے میں معلومات دے دیں۔

☆☆☆

اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا براڈ آرنلڈ شہر کی رونق دیکھ رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ روشنیاں آنکھوں کو بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ براڈ کو تو یہ روشنیاں معمول سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھیں کیونکہ وہ ہر پرابلم سے آزاد ہو کر ''آرنلڈ ہاؤس'' میں آ چکا تھا۔ پچھلے کچھ ماہ اس نے بہت اذیت میں گزارے تھے۔ دلدل سے باہر نکلنے کے لیے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن بے سود رہے۔ پھر وہ رات آئی جب اسے اپنے ہی گھر میں چوری کرنے آنا پڑا..... پھر وہ گرفتار ہوا..... ڈینی اور باقی گینگ بھی پکڑا گیا اور..... سب سے اہم بات..... اس نے بے ایمانی بھی نہیں کی تھی۔ اس نے تو بس ماں کا حال چال پوچھا تھا..... براڈ بہت مطمئن تھا۔ اچھی زندگی دوبارہ مل گئی اور کوئی بے ایمانی بھی نہیں ہوئی۔ اس نے کسی کو اطلاع نہیں دی..... حلف نہیں توڑا..... کوئی مخبری نہیں کی..... سگی ماں کے سامنے نقاب تک نہیں اتارا بس..... ممی کا حال پوچھا تھا اور یہ تو ہر ذی شعور جانتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی قانون کی کسی بھی کتاب میں ماں کا حال پوچھنا کسی بھی طرح بے ایمانی کے زمرے میں نہیں آتا۔ براڈ آرنلڈ کے چہرے پر اطمینان اور ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ تھی۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

قسط: 44

شہر زوال آمیز

اسماء قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگ جوالمیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

www.pklibrary.com

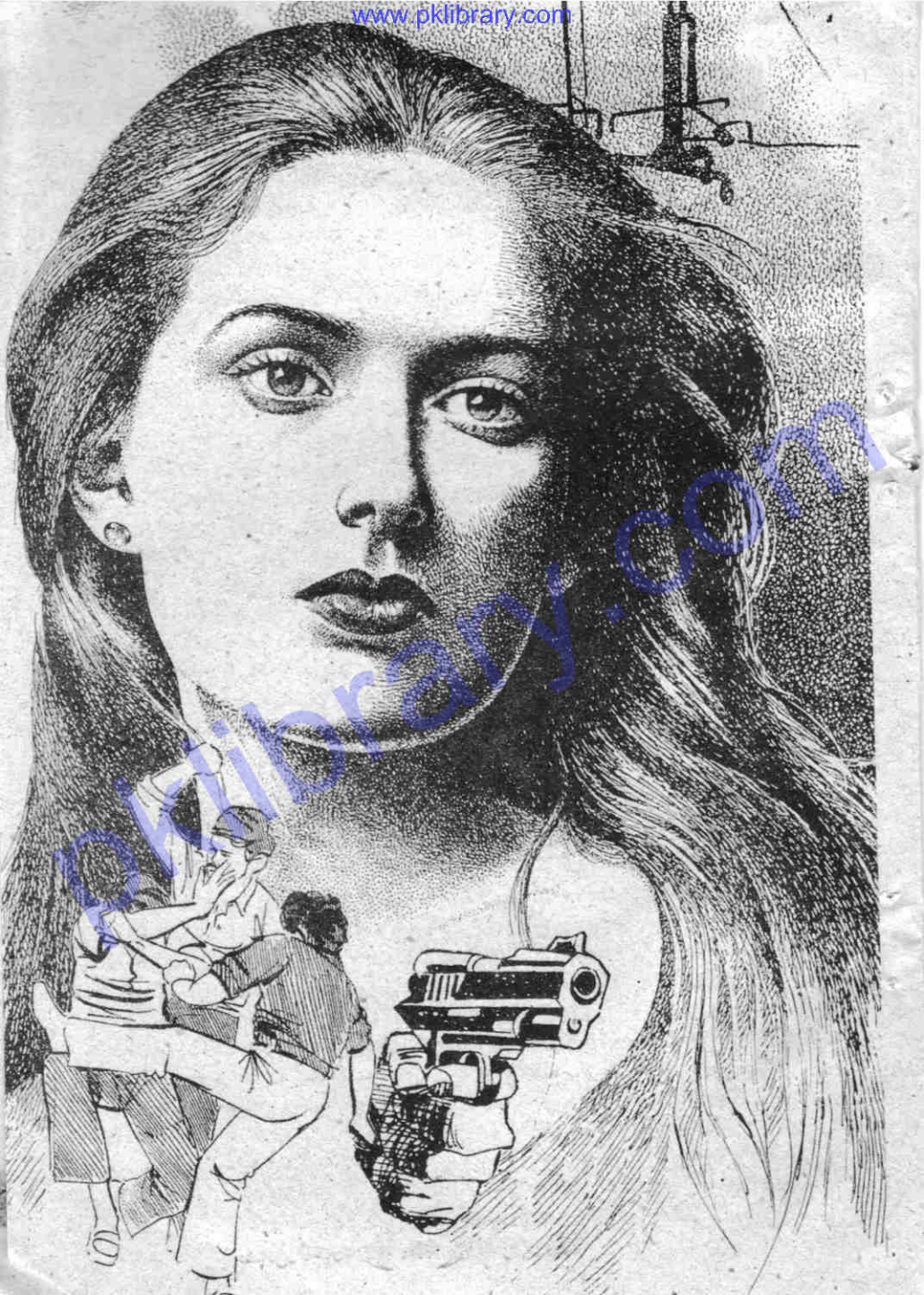

pklibrary.com

www.pklibrary.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہوجانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بُری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کر رہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہوجاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہوجاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیفو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن کجل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہوجاتا ہے۔ ادھر بشریٰ دبئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے بار بی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہوجاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، کجل اور سرمد انڈیا روانہ ہوجاتے ہیں۔ ائرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشریٰ اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مار اماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہوجاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہوجاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لیے جاتے

www.pklibrary.com

ہیں اور ''را'' کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشریٰ باذل کو مارنے کی کوشش میں خودنشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے جمل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علینہ پاکستان میں ثوبیہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ثوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے جمل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ''را'' کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کرلیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہوجاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کردیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ، دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کرلیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدرآباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کردیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرکے انہیں رہا کرالیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جارو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ''را'' کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جارو اور معاذ، جمل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کرکے کہیں لے جارہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آجاتا ہے۔ ان سب کو چینی بھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ جمل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک ویدو دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آجاتا ہے اور حامد کو اغوا کروالیتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہوجاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈر گراؤنڈ کردیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کردیتا ہے اور کافی مار ماری ہوتی ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کیا گیا تھا۔ وہ لارا نامی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کرواتا ہے اور مومی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کرکے وہاں قبضہ کرلیتا ہے۔ مومی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مار ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا بتاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کردیا جاتا ہے ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کرکے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر مومی اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں مومی مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آجاتی ہے۔ معاذ اور وکی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ مومی کی تدفین ہوجاتی ہے۔ وکی، نیلی کو قبرستان لے کر جاتا ہے تاہم وہاں کچھ لوگ حملہ کردیتے ہیں لیکن لالہ کے آدمی انہیں بچا لیتے ہیں۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشریٰ قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے اور وہ اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ بشریٰ اپنی دوست کے ساتھ جارہی ہوتی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کرلیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیرخواہ اسے میڈم ایکس کے شکنجے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاب کرلیتے ہیں۔ زن ہوا سے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرنل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشریٰ کو لے کر انڈر گراؤنڈ ہوجاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل سیمی کے گھر کارروائی کرتا ہے۔ تھوڑی دھینگا مشتی کے بعد وکی اسے قابو کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

www.pklibrary.com

باذل تک پہنچنے کے لیے وکی نے سیمی نامی لڑکی کے بنگلے پر کارروائی کی جو باذل کی منظورِ نظر تھی۔ وکی نے سیمی کو قابو کرلیا تھا۔ سیمی کی ملازمہ نے وکی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم جو چاہو کرو لیکن بے بی کو چھوڑ دو۔''

فیضی نے گویا شکست تسلیم کرلی۔

''صرف اتنا کافی نہیں ہوگا محترمہ! تمھیں اپنی مالکن کے لیے کچھ قربانی مزید دینا پڑے گی۔'' وکی نے مطالبہ کیا۔

''یہ میری ملازمہ نہیں، بڑی بہن ہے۔'' یکدم ہی سیمی نے اسے ٹوکا۔

''واقعی؟'' وکی حیران ہوا۔ سیمی اور فیضی میں کچھ بھی مشترک نہیں تھا۔ جتنی سیمی نرم و نازک تھی، فیضی اتنی ہی سخت جان اور بھاری تن و توش کی مالک تھی۔ نین نقش کا بھی ایسا ہی کچھ حساب کتاب تھا۔ فیضی اگرچہ بدصورت نہیں تھی لیکن سیمی والی بات بھی نہیں تھی۔

''یہ میری ماں کے پہلے شوہر سے ہے۔ میں اپنی ماں جیسی ہوں اور یہ اپنے باپ جیسی۔'' سیمی نے اس کی الجھن دور کردی۔

''لیکن لوگ تو اسے تمہاری ملازمہ ہی سمجھتے ہیں۔''

''میں نے کبھی کسی سے ایسا نہیں کہا لیکن چونکہ فیضی نے سارا گھر سنبھال رکھا ہے تو لوگ خود ہی یہ بات فرض کرلیتے ہیں۔ فیضی کسی کے سامنے تردید نہیں کرتی لیکن اگر کوئی میرے سامنے اسے ملازمہ کہے تو میں حقیقت ضرور بتاتی ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔'' وکی نے مختصر تبصرہ کیا۔

''میں تو چاہتی ہوں کہ گھر کے کام کاج کے لیے کوئی ملازمہ رکھ لی جائے لیکن فیضی نہیں مانتی۔'' سیمی نے بات کو مزید آگے بڑھایا۔

''ملازمہ رکھنے کا مطلب ہوتا ہے اپنے راز کسی اور کے حوالے کرنا۔ میں اچھی طرح گھر سنبھال بھی سکتی ہوں اور گھر کی حفاظت بھی کرسکتی ہوں تو خوامخواہ کی بچ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔'' فیضی نے بھی مسکراتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔ مسکرانے سے اس کے چہرے کے کرخت تاثرات پر فرق پڑا تھا اور سیمی کے لیے ممتا کی جھلک دکھائی دی تھی۔ ان دونوں بہنوں کی یقیناً کوئی کہانی تھی جسے سننے کی فی الحال اس کے پاس فرصت نہیں تھی چنانچہ موضوع بدل کر پوچھا۔

''باذل کی بھجوائی گاڑی کب تک یہاں پہنچے گی؟''

''بس آتی ہی ہوگی۔'' سیمی نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔

''میں نے ہمیشہ اسے اس شخص سے دور رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ بہت خبیث آدمی ہے۔ میری نازک کلی سی بہن کا وہ حال کردیتا ہے کہ دو دن تک بستر سے اٹھ نہیں پاتی۔'' فیضی کے چہرے پر باذل کے لیے ناگواری تھی۔

''اسے انکار کرنا خود کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ ویسے بھی وہ اتنا ہاتھ کھول کر نوازتا ہے کہ ہر چیز کی تلافی ہوجاتی ہے۔'' سیمی کا جواب ایسے پکے کاروباری کا سا تھا جو ہر صورت کاروبار میں منافع کو ہی اوپر رکھتا ہے۔

''تم اپنی تیاری کو فائنل کرو۔ میں اور فیضی اتنی دیر میں باہر کا چکر لگا کر آتے ہیں۔'' وکی نے وقت کو سرکتا دیکھ کر ان کی گفتگو میں دخل دیا اور سیمی سے بولا۔ اس کا میک اپ تو ٹھیک تھا لیکن ہیئر اسٹائل خراب ہوگیا تھا۔

''باہر کہاں لے جارہے ہو فیضی کو؟'' وہ ذرا تشویش میں مبتلا ہوئی۔

''یہیں گھر کے آس پاس رہیں گے ہم۔ گاڑی آنے پر تم روانہ ہوجانا۔''

''مگر.....'' سیمی نے کوئی اعتراض کرنا چاہا۔

''اگر مگر کچھ نہیں۔ میں نے وعدہ کرلیا ہے کہ تم لوگوں کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا تو یقین کرلو کہ ایسا ہی ہوگا لیکن یاد رکھنا کہ ایسا اسی صورت میں ہوگا کہ تم مجھے نقصان پہنچانے کی غلطی نہ کرو۔ ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے نکلتے ہی تم باذل کا نمبر ملا کر اسے میرے بارے میں بتادو۔''

''میں اسے نہیں بتاؤں گی۔ ویسے بھی میرے پاس اس کا فون نمبر نہیں ہے۔ اس نے خود مجھے کال نہیں کی تھی۔ اس کے ایک آدمی میرو نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔'' سیمی نے جلدی سے جواب دیا۔

''بس تو پھر ہم جاتے ہیں۔ تم اپنا کام نمٹالو۔'' اس نے سیمی کے گرد لپٹا بازو ہٹالیا لیکن فوراً ہی اس کے ہاتھ میں گن دکھائی دینے لگی۔ اس گن کی جھلک نے ان دونوں کے دل سے مزاحمت کی رہی سہی خواہش بھی ختم کرڈالی۔ سیمی چپ چاپ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی جبکہ فیضی نے اس کے اشارے پر باہر کا رخ کیا۔

''تم کچھ بھی کرو، خیال رکھنا کہ ہاتھیوں کی لڑائی میں ہم بیچارے سیدھے سادے اپنا کام دھندا کرنے والے نہ پس جائیں۔ ہماری تو کسی سے دشمنی ہے نہ دوستی۔ ہم تو اس دکاندار کی طرح ہیں جو ہر دام دینے والے کو سودا بیچ دیتا ہے۔ گاہک کہاں سے آیا ہے اور کون ہے، اس سے ہمیں مطلب نہیں ہوتا۔'' وہ لوگ کچن کے راستے ہی باہر نکلے تھے اور اس دوران فیضی نے اپنا راگ الاپنا شروع کردیا تھا۔

www.pklibrary.com

اس کی اس بے وقت کی راگنی نے وکی کو پوری طرح سمجھا دیا کہ دونوں بہنوں کی اصلیت کیا ہے۔

''یہ ادھر دیوار کے ساتھ کیا پڑا ہے؟'' جو کچھ اس نے کہا، اس پر تبصرہ کیے بغیر وہ اچانک ہی بولا تو فیضی نے جلدی سے گردن گھما کر اس کے اشارے کی سمت دیکھا۔ بس یہی ایک لمحہ وکی کے لیے کافی تھا۔ اس کا گن والا ہاتھ بلند ہوا اور دستے کی زوردار ضرب سے فیضی بری طرح تیورا کر گرنے لگی۔ وکی نے گرنے سے پہلے ہی اسے سنبھال کر آرام سے زمین پر لٹا دیا۔ اس وقت وہ گھر کے عقبی حصے میں تھے اور فیضی اس عمارت اور چار دیواری کے درمیان موجود چوڑی گلی جیسی جگہ پر آرام سے سما گئی تھی۔ اس کی نبض اور سانسوں کی رفتار سے یہ اندازہ لگا لینے کے بعد کہ وہ کم از کم بھی ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی، وہ جس طرح دیوار پھلانگ کر اندر آیا تھا، اسی طرح باہر چلا گیا۔ اس کی موٹر سائیکل اپنی جگہ موجود تھی۔ اسے اسٹارٹ کیے بغیر یونہی چلاتے ہوئے وہ عقب سے گھوم کر بنگلے کے پہلو میں آیا اور ایسی پوزیشن پر کھڑا ہو گیا کہ وہ خود تو مین گیٹ پر آنے والے کسی فرد یا گاڑی کو دیکھ سکے لیکن کسی کی اس پر نظر نہ پڑے۔ یہیں کھڑے کھڑے اس نے واٹس میسج کے ذریعے لالہ کو اب تک کی صورت حال کی خبر دینے کے ساتھ تاکید کی کہ بندوں کو الرٹ رکھے تاکہ جیسے ہی وہ باذل کے ٹھکانے پر پہنچ کر لوکیشن بھیجے، وہ لوگ اس کی مدد کے لیے آسکیں۔

ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوا تھا کہ ایک سرخ شیراڈ آتی دکھائی دی اور حسب توقع سیمی کے بنگلے کے گیٹ پر رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے گاڑی سے اتر کر گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اندر سے شاید سیمی نے جواب دیا۔ وہ سر ہلاتا ہوا گاڑی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ذرا دیر میں سیمی باہر آئی اور گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یقیناً وہ فیضی کو تلاش کر رہی تھی۔ اپنی اس کوشش میں ناکام ہونے پر اس کے چہرے پر مایوسی دکھائی دی لیکن خیر گزری کہ اس نے اپنی زبان بند رکھی اور چپ چاپ گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ ڈرائیور نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھنے کے بعد خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ اس کے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے ساتھ ساتھ وکی نے بھی اپنی بائیک کو کک لگائی اور جیسے ہی گاڑی تھوڑی سی آگے گئی، اس کے پیچھے چل پڑا۔ یہ کم سے کم بھی پون گھنٹے کا سفر تھا جس میں خود کو ڈرائیور کی نظروں سے بچائے رکھنے کے لیے اسے بہت احتیاط کرنا پڑی تھی۔

تعاقب کا یہ سلسلہ شہر کے آخری سرے پر ایک ایسی بستی میں جا کر رکا جہاں زیادہ تر غیر مقامی افراد آباد تھے۔ بستی میں زیادہ تر مکانات چھوٹے اور ایک منزلہ تھے اور چند ہی دو یا سہ منزلہ مکانات دکھائی دے رہے تھے۔ ان مکانات کو بناتے ہوئے کسی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا تھا جس کے باعث گلیاں ٹیڑھی میڑھی تھیں اور ان کی حالت سے مکینوں کے طرز زندگی کا بھی اندازہ ہو رہا تھا۔

اِدھر اُدھر اڑتی پلاسٹک کی تھیلیاں، کچرے کے ڈھیر اور ابلتے گٹر صاف بتا رہے تھے کہ ان کی زندگیوں میں صحت و صفائی کے کسی اصول کا عمل دخل نہیں تھا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو شاید اس سب کے ساتھ گلیوں میں کھیلتے ننگ دھڑنگ بچے بھی دکھائی دے جاتے لیکن اس وقت ذرا سناٹا سا تھا اور ایک چائے کے ڈھابے اور گنی چنی کھلی دکانوں کے سوا کاروبار زندگی رکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ روشنی بھی بہت کم تھی۔ اسٹریٹ لائٹس کا تو کچھ اتا پتا ہی نہیں تھا۔ بس کچھ مکانوں کے باہر روشن بلب اور کھلے ڈھابے اور دکانوں کی روشنیوں نے اندھیرے کو ماحول پر مکمل طور پر حاوی ہونے سے روک رکھا تھا۔

سیمی کو لے جانے والی گاڑی ایک سہ منزلہ مکان کے سامنے جا کر رکی اور ڈرائیور نے زور سے ہارن بجایا تو فوراً ہی مکان کا دروازہ کھل گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی سے نکل کر پچھلا دروازہ کھولا۔

''یہ تم مجھے کس جگہ لے آئے ہو؟'' سیمی کی آواز کافی بلند تھی اس لیے کچھ فاصلے پر موجود وکی تک بھی پہنچ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ سیمی تھوڑی سی پریشان ہے۔ ہائی سوسائٹی میں متحرک وہ رنگین تتلی جو اب تک رنگ و نور کی دنیا سے لطف اندوز ہوتی رہی تھی اور اپنے قدردانوں کے ساتھ بڑی بڑی کوٹھیوں یا پرتعیش ہوٹلوں میں قیام کرتی رہی تھی، یقیناً اس ماحول میں آ کر پریشان ہو گئی تھی۔

''مجھے آپ کو جہاں پہنچانے کا حکم ملا تھا، وہیں لے کر آیا ہوں بی بی!'' ڈرائیور نے اکھڑ سے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''تمہارا مطلب ہے باذل یہاں موجود ہے؟'' وہ بے یقین سی تھی۔

''کون کہاں ہے، مجھے نہیں معلوم۔ مجھے بس آپ کو یہاں لانے کا حکم ملا تھا۔'' اس کا لہجہ اب بھی پہلے جیسا تھا۔

''آئی ڈونٹ بلیو اٹ کہ باذل مجھے ایسی جگہ بلوا سکتا ہے۔'' سیمی اب بھی گاڑی سے نیچے اترتے ہوئے ہچکچا رہی

www.pklibrary.com

تھی۔ اسی وقت وکی نے مکان کے کھلے دروازے سے ایک دراز قد اور مضبوط جسم کے آدمی کو باہر آتے دیکھا۔ آدمی کے بال دراز تھے اور اس وقت ایک پونی ٹیل کی شکل میں جکڑے ہوئے تھے۔

''میرو تم.....؟'' وہ آدمی ڈرائیور کے برابر میں جا کر کھڑا ہوا تو یسی نے اسے پہچان کر حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں میں، اب تو تمہیں یقین آجانا چاہیے کہ تم غلط جگہ پر نہیں آئی ہو۔''

''ہاں، لیکن میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس بار وہ گاڑی سے نیچے اتر آئی اور بولتی ہوئی میرو کے ساتھ مکان کے کھلے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہوگیا۔ ایک اندھیرے کونے میں دبکے وکی کے وجود میں اس گفتگو نے سنسنی سی پھیلا دی تھی۔

''میں باذل کے قریب پہنچ چکا ہوں۔'' اس نے پیغام کے ساتھ ساتھ لالہ کو لوکیشن بھی بھجوائی۔

''اصغر اپنے آدمیوں کے ساتھ وہیں آرہا ہے۔ میرو کے موبائل کی لوکیشن بھی اسی علاقے میں نکلی ہے۔'' لالہ کا جواب اس کے لیے تسلی بخش تھا۔ شاید موبائل کمپنی کے بندے نے میرو کا نمبر ٹریس کر کے لوکیشن بھیجنے میں سستی سے کام لیا تھا اسی لیے اصغر کی روانگی میں تاخیر ہوگئی تھی لیکن یہ اچھی بات تھی کہ وہ اسی طرف آرہا تھا۔ ایک ایسی جگہ جہاں باذل اپنے آدمیوں کی نامعلوم تعداد کے ساتھ موجود تھا، اس کا اکیلے کوئی قدم اٹھانا ممکن نہیں تھا۔

اسے انتظار کرتے ابھی مشکل سے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اردگرد سرگرمی سی محسوس ہوئی۔ آنے والے تین گاڑیوں میں آئے تھے اور سیاہ و چست لباسوں میں تاریکی کا حصہ بنے بہت خاموشی سے گلی میں پھیلتے جا رہے تھے۔ ان کے قدم اتنے بے آواز تھے کہ گلی میں طاری سناٹا جوں کا توں قائم تھا اور یہاں سے کافی فاصلے پر موجود کھلے چائے کے ڈھابے پر بجتے گانے کی آواز ہنوز سنائی دے رہی تھی۔ فاصلے کی وجہ سے گانے کے بول سمجھ نہیں آرہے تھے لیکن لے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ اگر دن کا وقت ہوتا اور یہاں آوازیں ہوتیں تو یہ لے کبھی محسوس نہیں ہوتی۔

گلی میں جتنے لوگ موجود تھے، اس حساب سے تو اس وقت بھی یہ لے سنائی نہیں دینی چاہیے تھی لیکن آنے والوں کی منظم اور نپی تلی حرکات نے سناٹے کو ٹوٹنے ہی نہیں دیا تھا۔ وکی جو پہلے لمحے پر انہیں اپنے ساتھی سمجھ کر اپنی کمین گاہ سے نکلنے لگا تھا، ایک بار پھر واپس دبک گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے کام کرنے کے انداز سے واقف تھا اس لیے جان گیا تھا کہ آنے والے اجنبی ہیں۔ ایسے اجنبی جن کا ٹارگٹ وہی تھا۔ اس نے فوری طور پر کوئی ایکشن لینے کے بجائے خاموشی سے صورتِ حال کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا اور چپکے سے اصغر کو چند ہدایات بھیج دیں۔

☆☆☆

''کسی غلطی کی گنجائش نہیں۔''

''نہیں ہوگی میڈم! آپ بالکل بے فکر رہیں۔''

''کیسے بے فکر رہوں؟ ہر روز مجھے زک پر زک پہنچ رہی ہے۔ برسوں کا بنایا سیٹ اپ بگڑنے لگا ہے اور تم کہتے ہو بے فکر رہوں۔'' وہ جو مضطرب سی کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی، تسلی دینے والے پر الٹ پڑی۔

''وہ کل کا لڑکا معاذ جسے میں نے ہر طرح سے بے بس کر دیا تھا، آئے دن مجھے کوئی نئی چوٹ دے جاتا ہے۔ اب تک میں خود کو یہ تسلی دیتی تھی کہ جو کچھ ہوا، میری نظروں سے دور کہیں کسی اور جگہ ہوا اور اس ہونے میں دوسروں کی نااہلی شامل ہے لیکن اس بار.....'' اس نے زور سے اپنی مٹھیاں بھینچیں۔

''اس بار تو وہ براہِ راست مجھے دھوکا دے کر نکل گیا اور تم نے دیکھا کہ کس طریقے سے نکلا کہ ہمارا سارا انتظام دھرے کا دھرا رہ گیا۔'' وہ تاؤ پر تاؤ کھا رہی تھی۔

''وہ اس کام میں تنہا نہیں تھا میڈم! اسے کوئی بہت طاقتور سپورٹ حاصل تھی۔ اس کو فرار کروانے کے لیے جو ڈرون استعمال کیا گیا، اس کی تو پاکستان میں موجودگی کی ہی ہمارے پاس کوئی اطلاع نہیں۔ یہ کوئی اور طاقت ہے جو اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ آپ دیکھیں کہ کمال تو یہ ہوا ہے کہ اس پوری سڑک پر ہمیں کسی ایک سیکیورٹی کیمرے کی ریکارڈنگ نہیں مل سکی ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک مشہور اور معروف سڑک پر نصب سارے کے سارے کیمرے بیک وقت آؤٹ آف آرڈر ہوجائیں۔ یہ سب جان بوجھ کر کیا گیا ہے تاکہ ہمارے ہاتھ کوئی کلیو نہ لگ سکے۔'' وہ دلائل سے میڈم ایکس کا صدمہ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''خیر، جو ہوا اسے بدلا تو نہیں جاسکتا لیکن اب جو ہمیں ایک سنہری موقع ملا ہے اس سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ معاذ کی دوست بشریٰ کا ہاتھ آجانا اعظم کو کھو دینے کی تلافی بن سکتا ہے۔ تم لوگوں کو اسے ہر حال میں یہاں لانا ہے۔ کسی نقصان، کسی جوابدہی کی پروا کیے بغیر ہر حد سے

www.pklibrary.com

آگے نکل جانا لیکن اس لڑکی کو مجھ تک ضرور پہنچانا۔ میں معاذ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ کیے ہوئے دھوکے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔'' وہ ایک چوٹ کھائی ہوئی ناگن تھی جسے ہر حال میں معاذ کو زک پہنچانی تھی۔ معاذ اس کے پورے کیریئر پر ایک بدنما داغ تھا۔ وہ اس پر خاصی سرمایہ کاری کرنے کے باوجود اس سے مطلوبہ فوائد حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ صرف یہی ایک صدمہ کم نہیں تھا کہ اس نے سونیا کو اس سے چھین لینے کی جسارت بھی کر ڈالی تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس کا اپنا خون اسے دھوکا دے گیا۔ باوجود اس کے کہ اس نے اس کی پرورش کرنے میں مخصوص ماحول کا انتظام کیا تھا اور اسے ایسے لوگوں میں رکھا تھا جو پوری محنت سے اسے اسرائیل کا وفادار و جاں نثار بنانے کی جدوجہد کرتے رہے تھے۔ یہ ساری محنت ایک لڑکے کی محبت میں رائیگاں چلی گئی تھی اور وہ دن رات یہ سوچ کر پاگل ہوتی رہتی تھی کہ کبھی اگر سونیا اس کے مدمقابل آگئی تو وہ اس کے ساتھ کس طرح پیش آئے گی۔

''اس بار ہم اسے سبق ضرور دیں گے۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ جلد بشریٰ یہاں آپ کے سامنے حاضر ہوگی لیکن میری آپ سے استدعا ہے کہ ایک بار اس بات کی کھوج ضرور لگائیں کہ معاذ کے پیچھے کون ہے؟ اس کی طاقت توڑنے کے لیے ہمارے لیے اس کے سپورٹر کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔'' اس شخص نے میڈم پر زور دیا۔

''میں خود بھی اس بات کو سمجھتی ہوں۔ میرا بھی یہ اندازہ ہے کہ یہ سپورٹ اسے انڈیا کے منظر سے غائب ہونے کے بعد کہیں سے ملی ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی اس درمیانی عرصے میں غائب رہے ہیں۔ یقیناً اپنے سپورٹر کے زیر سایہ رہے ہوں گے اور اب اسی کے سہارے یہاں پہنچے ہیں۔ کسی حد تک مجھے ان سپورٹرز کے بارے میں اندازہ بھی ہے لیکن کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ٹھوس ثبوت حاصل ہونا ضروری ہے۔'' وہ بات کرتے کرتے گہری سوچ میں چلی گئی۔

''آپ نے ہمیشہ بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس بار بھی کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ مجھ سمیت آپ کے سارے وفادار آپ کی پوزیشن برقرار رکھنے کے لیے اپنی جان لڑا دیں گے۔'' وہ میڈم ایکس کے قریبی لوگوں میں سے ایک تھا اور اسے اپنی وفاداری کی یقین دہانی کروا رہا تھا۔ وہ اس وقت سے مصروف تھا جب عرفان اللہ نے کال کر کے بشریٰ کی باذل کے پاس موجودگی کا انکشاف کیا تھا۔ باذل کے لوگوں میں شامل عرفان اللہ کے مخبر نے اسے باذل کی موجودہ کمین گاہ کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا اور اس بار عرفان اللہ نے براہِ راست باذل سے الجھنے کے بجائے میڈم ایکس کو اس کے ٹھکانے کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب باذل، میڈم ایکس جیسی طاقتور عورت سے شکست کھائے گا تو اس کا دماغ خود بخود ٹھکانے پر آجائے گا۔

ان لوگوں کو عرفان اللہ کے مقاصد سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ انہوں نے بشریٰ تک پہنچنے کے لیے فوری طور پر اپنی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ ان کے آدمی سیلز مین کے روپ میں اس پورے علاقے کو اچھی طرح دیکھ آئے تھے۔ جدید ٹیکنالوجی سے جو مدد لی گئی تھی وہ اپنی جگہ تھی۔ باذل کی مذکورہ کمین گاہ اور اس کے آس پاس کے سارے علاقے کے بارے میں ممکنہ معلومات حاصل کرنے کے بعد اب وہ لوگ کارروائی کے لیے بالکل تیار تھے۔ میڈم ایکس اس موقع پر عملی طور پر ان کے ساتھ شامل نہیں ہو سکتی تھی اس لیے سختی سے ہدایات دینے کا سلسلہ جاری تھا۔ آخر یہ کام مکمل ہوا اور تین گاڑیوں میں سوار اس کے ہرکارے کسی ناگہانی آفت کی طرح باذل پر ٹوٹ پڑنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

''سیمی..... مائی ڈارلنگ! میں کتنی شدت سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ تمہارے بغیر آج کی رات کا لطف ادھورا رہ جاتا۔'' میرو کی معیت میں جیسے ہی سیمی کمرے میں داخل ہوئی، باذل نے اسے دیکھ کر ہانک لگائی اور گلے لگا کر پُرتپاک استقبال کیا۔

''کیسے ادھورا رہ جاتا؟ تمہاری پکار پر سیمی تمہاری خدمت میں حاضر نہ ہوتی، یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔'' وہ اگرچہ اندر سے پریشان تھی لیکن اس کے کاروبار کا اصول تھا کہ اپنی پریشانی کو خود تک محدود رکھ کر گاہک کو ہر حال میں خوش رکھا جائے۔

''تمہاری یہی ادا تو مجھے بار بار تمہاری یاد دلاتی ہے ورنہ یہاں تو سالی ایسی عورتیں بھی ہیں جنہیں آسائشوں سے لاد دو پھر بھی آپ کی وفادار نہیں بنتیں۔'' اسے مہناز یاد آگئی تو تلخ لہجے میں بولا۔ دنیا کی بے شمار عورتوں کو چکھ لینے کے باوجود اس کے لیے مہناز ہمیشہ خاص عورت رہی تھی۔ وہ ساری دنیا کے تجربات کرنے کے بعد پلٹ کر اس کی طرف ضرور جاتا تھا اور اس کے خاص ہونے کے انعام کے طور پر اسے بے تحاشا نوازتا بھی تھا لیکن یہ بات کبھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس کا اور مہناز کا تعلق ضرورت اور مجبوری کا تھا۔ اسے اپنی تسکین کے لیے مہناز کی ضرورت تھی تو مہناز بھی اپنے

www.pklibrary.com

معاشی مسائل حل کرنے کے لیے اسے برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ ضرورت اور مجبوری کے اس سنگم میں بھلا وفاداری کا کیا ذکر تھا اور ایسے میں مہناز اسے چھوڑ کر کسی مظلوم کے ساتھ کھڑی ہوگئی تھی تو یہ کوئی غیر متوقع یا تعجب خیز بات نہیں تھی۔

''کسی بے وفا کو یاد کرنے میں اپنا وقت کیوں برباد کرتے ہو۔ بس اسے دیکھو جو تمہیں اہمیت دیتا ہے۔'' سیمی کے لیے عورت کی بے وفائی کا رونا روتا مرد کوئی انوکھا تجربہ نہیں تھا۔ اسے ایسے بے شمار مرد ملے تھے جو کسی کی بے وفائی کا غم بھلانے کے لیے اس کی بانہوں کا سہارا لیتے تھے۔ ایسوں کا غم غلط کرتے ہوئے وہ ہر بار دل میں ہنستی تھی کہ محبوب کی بے وفائی کا شکوہ کسی عورت کی بانہوں میں کرنے والا خود وفا کے کس درجے پر ہوتا تھا۔

''دیکھ رہا ہوں اور پوری رات دیکھوں گا لیکن پہلے اس پدی کا تو شوربا بنا دوں جو باذل کو نیست و نابود کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔'' اس نے سیمی کی ٹھوڑی کے نیچے دو انگلیاں رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ یہ وہی ہوس اور غلاظت سے بھری ہوئی آنکھیں تھیں جن سے شریف زادیاں تو شریف زادیاں، سیمی جیسی کال گرل بھی خائف ہو جاتی تھی۔

''میں سمجھی نہیں۔'' سیمی نے اس کے چہرے پر موجود پُراسرار مسکراہٹ کو الجھ کر دیکھا۔

''وہ دیکھو۔'' باذل نے اس کے شانے تھام کر اس کا رخ بدلا۔ وہ جو کمرے میں داخل ہوتے ہی باذل کی طرف متوجہ ہوگئی تھی اور ارد گرد کا جائزہ لینے کی زحمت نہیں کی تھی، مشکل سے اپنی چیخ روک سکی۔

''یہ..... یہ کون ہے؟'' اس نے ایک رسی کی مدد سے چھت سے الٹے لٹکتے اس نحیف سے وجود کی طرف اشارہ کیا جس کا چہرہ اچھا خاصا بدصورت تھا۔

''یہ وہ چیونٹی ہے جو باذل کو کاٹنے کے شوق میں مسلی گئی ہے پھر بھی اپنے شوق سے دستبردار نہیں ہوئی۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج اس کا کافی وشافی علاج کر دیا جائے۔'' وہ طنز سے بولا۔ جواب میں سیمی نے الٹے لٹکے وجود کی آنکھوں میں گہری نفرت امڈتی دیکھی۔ اگر اس کے منہ کو کپڑا ٹھونس کر بند نہ کر دیا گیا ہوتا تو یقیناً وہ اس نفرت کا اظہار الفاظ میں بھی کرتی۔ سیمی اس صورتِ حال پر ایک جھرجھری سی لے کر رہ گئی لیکن باذل کو اس کی کیفیت کا اندازہ نہ ہوا اور اس کی کمر کے گرد اپنا بازو لپیٹتے ہوئے بولا۔

''کم آن بے بی! اس رات کو مزید پُرلطف بنانے کے لیے پہلے لال پری سے دل بہلاتے ہیں۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لگائے اس صوفے تک لے گیا جس کے سامنے پڑی میز پر پینے پلانے کے لوازمات، بھنے گوشت کے پارچے اور خشک میوہ جات سجے تھے۔

''دیکھ رہی ہو یہ نعمتیں؟ یہ سب میرے وفادار میرو کا بندوبست ہے۔ ہم مرد عورتوں کی طرح بے وفا نہیں ہوتے کہ ذرا سے حالات بدلتے ہی اپنی وفاداریاں بدل لیں۔ ہم ساتھ نبھاتے ہیں۔ میرو بھی ایک ایسے وقت میں میرا ساتھ دے رہا ہے جبکہ میرے حالات مکمل طور پر بدل چکے ہیں۔ دیکھو، اس کمرے کو غور سے دیکھو۔ کیا باہر سے گزرتا کوئی شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس پھٹیچر محلے کے اس معمولی سے مکان میں باذل کو ایسا شاندار سجا سجایا کمرا اور ایسی شاندار نعمتیں مل سکتی ہیں۔'' اس نے کمرے میں موجود قیمتی اشیا کی جانب ہاتھ گھماتے ہوئے آخر میں میز پر سجے لوازمات پر لا کر روکا۔ اس موقع پر سیمی کو پہلی بار احساس ہوا کہ باذل ذہنی طور پر ڈسٹرب ہے اور پہلے سے ہی اچھا خاصا پیے ہوئے ہے۔ وہ حالات سے واقف نہیں تھی کہ زبان سے اسے تسلی دیتی چنانچہ اپنے ہاتھ کی گردش سے اس کے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''جام بناؤ۔'' باذل نے اسے حکم دیا تو ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ سجائے وہ اس کام میں جت گئی۔ گھر پر جو کچھ اس کے اور فیضی کے ساتھ بیتا، اس کا ذکر باذل کے سامنے کرنے کا جو تھوڑا بہت خیال دل میں موجود تھا، وہ بھی نکل گیا۔ باذل کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ سب سن کر اپنے خراب موڈ کا سارا نزلہ اسی پر گرا دیتا۔

''باس!'' ابھی سیمی نے جام تیار کر کے باذل کے ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ میرو جو سیمی کو یہاں چھوڑنے کے بعد واپس چلا گیا تھا، کچھ گھبرایا ہوا سا وارد ہوا۔

''کیا بات ہے بے، یہ تیرے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟'' باذل نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

''حسن کی کال آئی ہے۔ وہ آپ کے حکم پر چاول کے گودام میں پہنچنے والا مال وہاں سے شفٹ کروانے گیا تھا۔ پیکنگ دیکھتے ہی اسے شک ہوگیا کہ یہ وہ مال نہیں ہے جو ہونا چاہیے تھا۔ اس نے کارٹنز کھلوا کر دیکھے تو اندر سے کپڑا، دھاگا اور دوسری الا بلا نکلی۔ اب وہ پوچھ رہا ہے کہ آگے کیا کرنا ہے؟'' میرو نے ایک سانس میں ساری بات بتا ڈالی۔

''کیا کرنا ہے، مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ تم لوگوں میں

www.pklibrary.com

خود عقل نہیں کہ اس سالے منیجر نذر حسین کی گردن دبوچو۔ اس وقت اس کے سوا ہمارے ساتھ یہ دھوکا کوئی اور کر ہی نہیں سکتا۔'' باذل، سیمی کو پرے دھکیل کر دہاڑتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ اس کے اس اچانک ردِعمل پر نہ صرف سیمی صوفے پر لڑھک گئی بلکہ اس کے ہاتھ میں موجود جام بھی الٹ گیا جس سے بہنے والے مشروب نے صوفے کے ساتھ ساتھ قالین کے کچھ حصے کو بھی خراب کر ڈالا تھا۔

''میں..... میں دیکھتا ہوں۔'' میرو باہر کی طرف دوڑا۔

''باذل کو اس طرح کوئی نہیں ہرا سکتا۔ میں دیکھ لوں گا۔ میں اپنے ایک ایک دشمن کو دیکھ لوں گا۔'' وحشت زدہ سا باذل بلند آواز میں چیخا اور جنونی سی کیفیت میں چھت سے الٹی لٹکی بشریٰ کی طرف بڑھا۔ سیمی نے یہ دیکھ کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا کہ اس کے ہاتھ میں تیز دھار والا ایک چھوٹا سا چاقو دبا ہوا ہے۔ اس نے اس چاقو سے بشریٰ کے بازو پر ایک زوردار وار کیا۔ منہ بند ہونے کی وجہ سے وہ چیخ تو نہ سکی لیکن اس کا پورا جسم بری طرح پھڑک کر رہ گیا۔ سیمی نے خوف کے عالم میں ایک زوردار چیخ ماری۔ ابھی اس کی چیخ کی گونج تھمی نہیں تھی کہ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔

☆☆☆

وکی کے دیکھتے ہی دیکھتے گلی میں گھومتے اجنبی سائے باذل کی کمین گاہ کو گھیر چکے تھے اور اب اس پر حملہ آور ہونے کے لیے پوری طرح تیار نظر آرہے تھے۔ اس نے اپنی ہدایت پر کچھ دور رک جانے والے اصغر اور اس کے ساتھیوں کو الرٹ رہنے کا پیغام دیا اور جیسے ہی فضا میں پہلی گولی کی آواز گونجی، انہیں بھی حرکت میں آنے کا حکم دے ڈالا۔ یہ اس کے حکم کا نتیجہ تھا کہ حملہ آوروں کی گاڑیوں پر اچانک ہی دھاوا بول دیا گیا۔ گاڑیوں میں موجود افراد کی توجہ کا اصل مرکز اپنے ساتھیوں کی کارروائی تھی چنانچہ اصغر اینڈ کمپنی کا حملہ ان کے لیے قطعی غیر متوقع ثابت ہوا۔ اصغر اور اس کے ساتھیوں نے بھی کچھ ایسی تیزی دکھائی کہ انہیں سنبھلنے اور کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا اور پہلے ہی ہلّے میں وہ ریت کی بھربھری دیوار کی طرح ڈھے گئے۔

وکی اس ساری کارروائی سے قبل حملہ آوروں کے ساتھ ہی شامل ہوکر مکان میں داخل ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اب مکان کے اندر موجود افراد کی طرف سے بھی ردِعمل میں فائرنگ کی جارہی تھی لیکن وہ اس جوابی کارروائی میں تاخیر کا شکار ہوگئے تھے۔ یہ ان کی حماقت تھی کہ باذل کی یہاں موجودگی کے باوجود پہرے اور حفاظت کا ایسا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں کیا تھا کہ علاقے اور گلی میں ہونے والی مشکوک حرکات و سکنات سے پیشگی آگاہ ہوکر کوئی مؤثر کارروائی کر پاتے۔ اپنی اس غفلت کا انہیں بھیانک نتیجہ بھگتنا پڑ رہا تھا۔ حملہ آور خطرناک ہتھیاروں اور پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے اور منٹوں سیکنڈوں میں چھا بھی گئے تھے لیکن ان کے لیے بھی باہر ہونے والی فائرنگ ایک غیر متوقع صورتِ حال تھی۔

''باہر کیا ہو رہا ہے؟ میں باہر موجود ساتھیوں سے رابطے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا۔'' وکی جس نے ان لوگوں کے ساتھ شامل ہوکر اندر داخل ہونے کے سوا کسی کارروائی میں عملی حصہ نہیں لیا تھا اور وہیں نچلی منزل پر ہی ایک محفوظ گوشے میں دبک گیا تھا، اپنے قریب سے سنائی دینے والی سرگوشی پر متوجہ ہوا۔ دو سیاہ پوش اس کے بہت قریب موجود تھے لیکن نچلی منزل کی روشنیاں بجھا دیے جانے کے باعث وہ پہلے انہیں نہیں دیکھ سکا تھا۔

''شاید ان کے کچھ ساتھی باہر کہیں چھپے ہوئے تھے جن کی موجودگی کا ہمیں علم نہیں ہوسکا اور اب انہوں نے ہی ہمارے ساتھیوں کے خلاف کارروائی شروع کردی ہے۔ ہمیں باہر جاکر اپنے ساتھیوں کی مدد کرنی ہوگی۔'' دوسرے سائے کے لہجے میں بھی تفکر تھا۔

''یہاں کے معاملات باقی ساتھی سنبھال لیں گے۔ ہم باہر جاکر دیکھتے ہیں۔'' پہلے والے نے تجویز دی تو دونوں نے باہر کی طرف پیش قدمی کی۔ یہی موقع تھا جب وکی نے اپنی گن نکالی اور ان پر فائرنگ کردی۔ ایک کی پشت اور دوسرے کے کولہے میں گولیاں پیوست ہوئیں اور دونوں چیختے ہوئے زمین بوس ہوگئے۔

''کیا سچویشن ہے؟'' اوپری منزل سے ہنوز فائرنگ اور چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔ وکی نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر سیڑھیوں پر نظر رکھتے ہوئے باہر موجود اصغر سے رابطہ کیا۔

''سب کنٹرول میں ہے۔'' اس نے رپورٹ دی۔

''کچھ ساتھیوں کو باہر نگرانی پر چھوڑ کر اندر آؤ۔'' اس نے حکم جاری کیا۔ اسی وقت سیڑھیوں پر ایک سایہ لہرایا۔ اس نے ہاتھ سیدھا کیا اور اس طرف ایک فائر جھونک دیا۔ سایہ ایک کریہہ چیخ کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے آرہا۔ نیچے گرنے کے بعد اس نے حرکت نہیں کی لیکن پہلے گولی کھا کر گرنے والوں میں سے وہ جس کے کولہے میں

www.pklibrary.com

گولی لگی تھی، کچھ دیر بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد خود پر قابو پا چکا تھا۔ اپنی جگہ پڑے پڑے اس نے وکی کی کمین گاہ کا بھی اندازہ لگا لیا تھا اور اب چپکے سے نیچے گر جانے والی اپنی گن ٹٹول کر اپنے قبضے میں کر لینے کے بعد اس کو نشانہ بنانے کی تاک میں تھا۔ اس کی مجبوری تھی کہ وہ جس جگہ گرا ہوا تھا، اس جگہ پڑے پڑے درست نشانہ لگانا ممکن نہیں تھا چنانچہ زخم سے اٹھتی شدید ٹیسوں کو ہونٹ بھینچ کر برداشت کرتے ہوئے اپنے جسم کو ذرا سا اوپر اٹھایا۔

وکی کو داخلی راستے سے اپنے ساتھیوں کے سوا کسی کی آمد کا خدشہ نہیں تھا اس لیے اپنی ساری توجہ سیڑھیوں اور اوپر سے آتی آوازوں پر مرکوز کر رکھی تھی۔ اسے قطعی علم نہیں تھا کہ اس پر کون سی آفت ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہے۔ علم اس وقت ہوا جب فائر کی تیز آواز اور اپنی پشت میں اترنے والے دہکتے لوہے کی تکلیف یکجان ہوئی۔ نیچے گرنے سے قبل وہ صرف یہ دیکھ سکا کہ اس کے ساتھی مکان کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے ہیں اور انہوں نے اسے نشانہ بنانے والے کو سر میں گولی مار کر جہنم رسید کر دیا ہے۔ جب تک اصغر اس تک پہنچا، اس کا سانس سینے میں اٹکنے لگا تھا۔

''شہزادے.....!'' اصغر روشنی کی کمی بلکہ تقریباً تاریکی کے باوجود سیدھا لپک کر اس کی طرف آیا اور اس کے نیچے گرے ہوئے وجود کو اپنی بانہوں میں سمیٹنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھوں نے فوراً اس کے جوان خون کی گرمی اور چپچپاہٹ کو محسوس کیا۔

''روشنی کرو اوئے.....'' نتائج کی پروا کیے بغیر وہ حسبِ عادت جملے میں ایک عدد گالی ٹانکتے ہوئے پوری شدت سے دہاڑا۔ فوراً ہی ایک ٹارچ روشن ہوئی اور اس سے نکلنے والی روشنی کے حلقے نے تیزی سے بہتے خون اور وکی کی الٹتی آنکھوں کو اپنی گرفت میں لیا۔ اصغر کے دل کو کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔

''اسپتال.....اسپتال لے کر چلو اسے۔'' وہ پھٹی پھٹی آواز میں چلایا۔ کئی ہاتھ اس کی مدد کو لپکے۔ کسی نے خون کا بہاؤ کم کرنے کے لیے اپنی قمیص اتار کر اس کے زخم پر رکھی، کسی نے اس کے ڈھیلے پڑتے جسم کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالا۔ یوں اس کو وہاں سے اٹھا کر باہر لے جایا جانے لگا۔ اصغر بھی بے خودی کی کیفیت میں ان لوگوں کے ساتھ شامل ہونے لگا تھا کہ فائرنگ کی تیز آوازوں نے اسے ایک جھٹکا سا لگایا اور اسے اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ وہ یہاں ایک مشن پر آیا تھا اور اس مشن کی تکمیل تک یہاں سے ہلنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

''تم لوگ اسے لے کر جاؤ اور راستے میں لالہ کو فون کر کے اطلاع دو تاکہ تمہارے اسپتال پہنچنے سے پہلے وہاں سب انتظام موجود ہو۔'' اس نے جلدی جلدی ہدایات جاری کیں اور پھر باقی کے چار ساتھیوں کے ساتھ اوپری منزل کی طرف پیش قدمی کی۔ وکی کو جس حالت میں اسپتال روانہ کیا تھا، اس نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لالہ کے نزدیک وکی کی کیا اہمیت ہے اور اس خبر کو سن کر وہ کس جذباتی صدمے سے دوچار ہوگا اسی لیے خود سے اسے یہ خبر دینے کی بھی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ پھر یہاں فرصت بھی کہاں تھی۔ فائرنگ کی آوازوں سے کان سنسنائے جا رہے تھے لیکن یہ بہرحال محسوس ہو رہا تھا کہ اوپر اب مزاحمت دم توڑ رہی ہے۔

وہ ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے اوپر پہنچے۔ لینڈنگ پر پہنچتے ہی ان پر گولیاں برسائی جانے لگیں۔ اصغر نے نیچے بیٹھ کر خود کو ان گولیوں کی زد میں آنے سے بچایا۔ اس دوران وہ دیکھ چکا تھا کہ فائرنگ کرنے والا سیڑھیوں کے اختتام پر بائیں جانب موجود ہے اور اس نے وہیں سے نکل کر ان پر فائر کیا تھا۔ وکی کو گولی لگنے کے بعد سے اس کے دماغ میں پہلے ہی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس وقت غم و غصے نے مل کر اسے جنون میں مبتلا کر دیا اور نتائج کی پروا کیے بغیر کسی بگولے کی طرح باقی رہ جانے والے چند قدچے طے کر کے اوپر پہنچا اور دوبارہ فائر کرنے کی حسرت دل میں لے کر اپنی کمین گاہ سے نکلنے والے دشمن کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا۔ اس کے ساتھی جو اس کی اس جنونی پیش قدمی پر لمحہ بھر کے لیے دم بخود رہ گئے تھے، تیزی سے حرکت میں آئے اور خود بھی جارحانہ انداز اختیار کیا۔ ان کی اس تیزی اور جارحیت نے پھر کسی کو ان کے سامنے ٹکنے نہیں دیا۔ لمحوں میں میدان صاف کر کے وہ بالائی منزل کا جائزہ لینے لگے۔ وہاں زیادہ تر لاشیں تھیں یا چند ایک انتہائی زخمی افراد۔ باذل کا کہیں کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ ایک کمرے میں داخل ہو کر اصغر دھک سے رہ گیا۔ اس کے سامنے بشریٰ چھت سے بندھی رسی سے الٹی لٹکی تھی اور اس کے عین نیچے کارپٹ پر خون کا بڑا سا دھبا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ خون بشریٰ کے جسم سے بہتا ہوا نیچے گر رہا تھا اور بالکل ایسا منظر تھا جیسے کسی بکرے کو کھال اتارنے کے لیے لٹکایا گیا ہو۔ اس نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کے لٹکے ہوئے جسم کو تھام لیا۔ اس کا لمس پا کر بشریٰ نے آنکھیں کھولیں تو اسے تھوڑا سا

www.pklibrary.com

اطمینان ہوا کہ وہ زندہ ہے۔

''وہ چھت کے راستے سے بھاگا ہے، میں نے سنا تھا۔ وہ اور میرو چھت پر جانے کی بات کر رہے تھے۔'' اس نے بہت دھیمی آواز میں اٹک اٹک کر اصغر کو بتایا تو وہ اس کے نام لیے بغیر ہی سمجھ گیا کہ وہ باذل کی بات کر رہی ہے۔

''باذل اور اس کے ساتھی کو اوپر چھت پر دیکھو۔''

اسے امید نہیں تھی کہ باذل اب اسے مل سکے گا پھر بھی اپنے دو آدمیوں کو اوپر دوڑایا اور خود دو افراد کے ساتھ مل کر بشریٰ کو نیچے اتارنے لگا۔ اس دوران اس نے جائزہ لے لیا تھا کہ گولی اس کے کندھے میں لگی ہے اور زخم سے زیادہ خون کا وہ بہاؤ خطرناک ہے جس نے اس کے چہرے کو زرد کر ڈالا ہے۔ نیچے اتارنے کے مختصر سے عرصے میں وہ دوبارہ آنکھیں بند کر چکی تھی اور اصغر کا اندازہ تھا کہ وہ بے ہوش ہے۔ اس نے اسے بھی اسی اسپتال منتقل کرنے کا حکم جاری کیا جہاں وکی کو لے جایا گیا تھا۔ وہ سب ممکنہ تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑیوں میں منتقل ہوئے۔

''یہ کون ہے؟'' ابھی بشریٰ کو اسپتال کے لیے روانہ کیا ہی گیا تھا کہ اس کے ساتھی اوپر چھت پر جانے والی سیڑھیوں سے ایک طرح دار لڑکی کو دھکیلتے ہوئے نیچے لے کر آئے۔ لڑکی بھی سنوری تھی لیکن اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور نچلا ہونٹ بھی پھٹا ہوا تھا۔ اصغر نے اس لڑکی کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے استفسار کیا تھا۔

''یہ اوپر چھت پر چھپی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ باذل اور اس کا قریبی ساتھی میرو فائرنگ شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی اوپر چھت سے پیچھے والے گھر کی چھت پر کود کر فرار ہو گئے ہیں۔ باذل اسے بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن دونوں گھروں کی چھتوں کا درمیانی فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ یہ ہمت نہیں کر سکی۔'' ان میں سے ایک نے اس کے سوال کا تفصیلی جواب دیا تو وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ خدشات کے عین مطابق باذل چھت کے راستے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''اسے گاڑی میں بٹھاؤ۔ اس کا تفصیلی تعارف ٹھکانے پر پہنچ کر حاصل کریں گے۔'' ہدایات دے کر وہاں رکے بغیر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ باہر اب ان کی صرف ایک گاڑی باقی رہ گئی تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اب تک مردوں کی طرح خاموشی سے اپنے گھروں میں دبکے آس پاس کے مکین دروازوں کی درز اور نیم وا کھڑکیوں سے باہر جھانک کر صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسلسل برستی گولیوں میں کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ زور سے سانس بھی لے سکے۔

''چلو۔'' اس کے دونوں ساتھی لڑکی سمیت گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ ہی رہے تھے کہ دور سے پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا جسے سن کر اس نے اضطراری لہجے میں حکم دیا اور ساتھ ہی پولیس کی کارکردگی کے بارے میں بھی سوچا۔ جب تک وہاں ہنگامہ برپا رہا تھا، پولیس کا نام و نشان نہیں تھا اور اب خاموشی چھاتے ہی وہ شور مچاتے ہوئے فرض کی بجا آوری کے لیے نکل پڑے تھے۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' اس نے اپنی آستین اور قمیص کے دامن پر لگے وکی کے خون کے دھبوں سے نظر چراتے ہوئے عقب نما آئینے میں نظر آتی لڑکی سے سوال کیا۔

''سیمی!'' اس نے انگلیاں مروڑتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''باذل سے کیا تعلق ہے تمہارا؟''

''دوست سمجھ لو۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا تو اصغر کو خود بخود اس کی حیثیت کا ادراک ہو گیا۔

''یہاں اس جگہ کیوں اس سے ملنے آئی تھیں؟''

گلیوں میں چکراتے وہ اس علاقے سے کچھ دور نکل آئے تھے لیکن اب بھی پولیس موبائل کے سائرن کی ہلکی آواز کانوں تک پہنچ رہی تھی بلکہ اب اس آواز میں ایمبولینس کا سائرن بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہ جرم کی دنیا کا فرد تھا اور بغیر دیکھے بھی جائے وقوعہ کا منظر جانتا تھا۔ افسران کی تیز آوازیں، کچے پکے ماہرین کی کارروائیاں، فون کی بجتی گھنٹیاں، میڈیا کی بھاگ دوڑ، لاشوں اور زخمیوں کی جائے وقوعہ سے منتقلی، آس پاس والوں کے بیانات اور دوسری دسیوں پنچایتیں..... جس کا کہیں کوئی نتیجہ نہیں نکلنا تھا۔

''روزی روٹی کا معاملہ ہے۔ جہاں سے بھی بلاوا آئے، پہنچ جاتے ہیں۔'' اس کے جواب نے اصغر کے اندازے کی تصدیق کر دی۔

''تمہارا ہونٹ کیسے پھٹا؟'' اصغر کو اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنا وہ سوال و جواب کے اس سلسلے میں الجھ کر اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا تھا پھر بھی رہ رہ کر اس کی نظر اپنے لباس پر موجود خون کے دھبوں پر چلی جاتی تھی اور جتنی بار ایسا ہوتا تھا، اس کا دل پوری شدت سے سکڑ کر پھیلتا تھا۔ وہ جو لالہ کی ناک کا بال اور ان سب کی آنکھوں کا تارا تھا جس طرح رکتی سانسوں

www.pklibrary.com

کے ساتھ اسپتال کے لیے روانہ کیا گیا تھا، اسے سوچ سوچ کر اسے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ فون کر کے کسی سے اس کا حال دریافت کرلے لیکن ہر بار ہمت ٹوٹ جاتی تھی کہ جانے دوسری طرف سے کیا سننے کو مل جائے۔ ایسے میں موبائل تھرتھرایا تو وہ لرز ہی گیا اور یوں پھٹی پھٹی نظروں سے اسکرین کی طرف دیکھنے لگا جیسے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو۔

''میں نے باذل کے کہنے پر چھت پر سے کودنے سے انکار کیا تھا تو اس نے غصے میں مجھے زور سے دھکا دے دیا تھا۔ میں جا کر ایک دیوار سے ٹکرا گئی اور میرا ہونٹ پھٹ گیا۔'' سیمی اس کی کیفیت سے بے خبر اسے اس کے سوال کا جواب دے رہی تھی لیکن وہ سن ہی کہاں رہا تھا۔ اندیشوں اور وسوسوں میں ڈوبا اس کا دماغ اس وقت فون کی اسکرین کے سوا باقی پوری دنیا سے کٹ چکا تھا۔

☆☆☆

''معاذ.....!'' لالہ کے ٹھکانے پر پہنچ کر معاذ کا سب سے پہلے جارو سے سامنا ہوا اور اس نے اسے دیکھتے ہی خوشگوار حیرت کے ساتھ گلے لگا لیا۔

''کہاں چلے گئے تھے یار! ہم سب یہ سوچ سوچ کر تمہارے لیے اتنے پریشان تھے کہ تم نے اپنے ہاتھوں سے خود کو میڈم ایکس کے حوالے کر دیا ہے اور اب وہ جانے تمہارے ساتھ کیسا سلوک کر رہی ہوگی۔'' اسے گلے سے لگائے لگائے جارو نے بولنا شروع کیا تو جذباتی انداز میں بولتا ہی چلا گیا۔

''آرام سے یار! سب کے ساتھ مل کر بیٹھتے ہیں تو میں ایک ساتھ ہی سب کو ساری تفصیل سنا دیتا ہوں۔'' معاذ کا مزاج کافی حد تک خوشگوار تھا کہ کرنل سکندر بخت سے ہونے والی ملاقات نے اس کے ذہن کو ہلکا پھلکا کر دیا تھا اور بہت سے مسائل میں گھرے ہونے کے باوجود زندگی میں کچھ آسانی محسوس ہونے لگی تھی۔

''اس وقت تو میرے اور لالہ کے سوا کوئی قریبی ساتھی موجود ہی نہیں ہے۔'' جارو نے کچھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں اسے اطلاع دی۔

''کیوں، کہاں گئے سب؟'' وہ اس کے ساتھ اندر کی طرف جاتے ہوئے ٹھٹکا۔

''بس نکلے ہوئے ہیں کسی نہ کسی کام سے۔'' جارو کو خیال آیا کہ وہ خود جانے کن حالات سے گزر کر یہاں پہنچا ہے۔ ایسے میں ایک دم سے اسے یہاں درپیش مسائل سے آگاہ کرنا مناسب نہیں اس لیے بات کو ٹال گیا۔

''بشریٰ کا کچھ پتا چلا؟'' اس کے ٹالنے سے کیا ہوتا تھا۔ معاذ نے سب سے پہلا سوال ہی وہ کیا جو سب سے نازک تھا۔

''میں کہہ رہا ہوں مجھے یہاں سے جانے دو، تم نہیں جانتے کہ وہ کتنے سفاک لوگ ہیں۔ میری غلطی کی سزا وہ میرے گھر والوں کو دیں گے۔'' اس کی سماعتیں ابھی جارو کے جواب کی منتظر تھیں کہ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی ایک حواس باختہ شخص سے سامنا ہو گیا۔ بظاہر وہ شخص قیمتی لباس میں تھا اور چہرے مہرے سے پڑھا لکھا بھی دکھائی دے رہا تھا لیکن ایک عجیب سی بے چینی نے اس کی پوری شخصیت کو گھیر رکھا تھا اور اسی بے چینی کو لہجے میں سموئے وہ جارو سے مخاطب ہوا تھا۔ اس نے جارو کے ساتھ اس کی موجودگی کو یوں نظر انداز کر دیا تھا جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔

''میں تمہاری، تمہارے گھر والوں سے بات کروا چکا ہوں اور تم انہیں کسی محفوظ مقام پر منتقل ہونے کی ہدایت کر چکے ہو پھر اتنی بے چینی کیوں؟'' جارو نے اسے گھورا۔

''پتا نہیں انہیں حالات کی سنگینی کا صحیح سے احساس ہوا بھی ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قیمتی ساز و سامان کو ساتھ سمیٹ کر لے جانے کی فکر میں وہ لوگ وقت ضائع کر دیں۔'' اس کی پریشانی ہنوز برقرار تھی۔ اگر اس کے دونوں پیر ایک کرسی کے پائے سے جکڑ کر نہ بٹھایا گیا ہوتا تو شاید وہ اٹھ کر یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا۔

''ٹھیک ہے، میں ایک بار پھر انہیں تمہاری طرف سے پیغام بھجوا دیتا ہوں۔'' جارو نے اسے تسلی دی اور موبائل پر کسی سے رابطہ کرنے لگا۔

''تم مجھے ان کے پاس کیوں نہیں جانے دیتے۔ میں خود انہیں کسی محفوظ مقام پر منتقل کروں گا تو مجھے اطمینان ہوگا۔'' وہ کسی طور راضی ہونے کو تیار نہیں تھا۔

''وہ لوگ تمہیں ڈھونڈنے سب سے پہلے تمہارے گھر ہی جائیں گے اور یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ تمہارے گھر والوں کے ساتھ وہ شاید کوئی رعایت کر دیں لیکن تمہیں تو دیکھتے ہی چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔'' اس بار جارو نے قدرے برہمی سے اسے سمجھایا۔

''لیکن.....!''

''کوئی لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر اب تم نے مجھے تنگ کیا تو میں تمہیں اس آرام دہ اور صاف ستھری جگہ سے اٹھوا کر کسی اسٹور روم میں بند کروا دوں گا، وہ بھی منہ میں کپڑا

www.pklibrary.com

ٹھونس کر۔'' جارو نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا اور جھنجلا کر دھمکی دی۔

''ٹھیک ہے۔ میں خاموش ہو جاتا ہوں لیکن کچھ بُرا ہو گیا تو ذمے دار تم ہو گے۔''

''نہیں، ذمے دار ہر صورت تم خود ہو گے کیونکہ تمہاری چوائس تھی کہ اپنی زندگی کے مسائل کو شارٹ کٹ کے ذریعے حل کرنے کے لیے جرائم پیشہ لوگوں کے آلۂ کار بن جاؤ۔'' جارو نے اسے تلخی سے جواب دیا اور معاذ کو بازو سے تھام کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔

''یہ کون تھا؟'' معاذ نے استفسار کیا۔

''عرفان اللہ کی ایک کمپنی کا منیجر۔ تمہارے لیے شاید یہ اطلاع دلچسپ ہو کہ یزدانی ہاؤسنگ اسکیم سے ایک سرنگ قریب ہی واقع عرفان اللہ کی ایک ٹیکسٹائل مل تک جاتی ہے اور اس سرنگ کے راستے غیر قانونی اسلحے کی بڑی کھیپ کو ہاؤسنگ اسکیم کے ایک تہ خانے میں ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ یہ شخص جس کا نام نذر حسین ہے، اپنی نگرانی میں یہ سارا کام کرواتا تھا لیکن آج ہماری زد میں آ گیا۔''

''مجھے یاد آ رہا ہے کہ عالم شاہ نے بھی اس بارے میں مجھے کچھ تفصیل سنائی تھی لیکن اس وقت ہم بالکل مختلف حالات میں تھے تو اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ جب سے پاکستان واپس آئے ہیں، حالات مسلسل الجھے ہوئے ہیں اس لیے مجھے اس معاملے کا خیال ہی نہیں آیا۔ تم بتاؤ، تم لوگ کیسے پہنچ گئے وہاں تک؟'' معاذ نے اس کا جواب سن کر دلچسپی سے پوچھا۔ اس کے بعد اس سیدھے سادے سوال کا جواب دینا جارو کے لیے قدرے مشکل تھا۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' معاذ نے اس کی ہچکچاہٹ کو محسوس کر لیا۔

''تمہارے جانے کے بعد ہمیں بشریٰ کے بارے میں خبر مل گئی تھی۔ ہمارے اندیشوں کے برخلاف وہ کسی مشکل میں نہیں بلکہ اپنی ایک پرانی سہیلی راحیلہ کے گھر تھی۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ میں جانتا ہوں راحیلہ کو۔ وہ بشریٰ کے ساتھ یونیورسٹی میں بھی تھی۔''

''وہ وہاں تھی لیکن پھر.....''

''لیکن پھر کیا؟'' معاذ اس کے انداز پر بے چین ہوا۔

''راحیلہ اور اس کے شوہر آصف کی زبانی ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق مہناز کا موبائل فون باذل کے ہاتھ لگ گیا تھا، اس نے اس موبائل فون کے ذریعے بشریٰ کو ٹریپ کیا اور جس وقت راحیلہ اور آصف بشریٰ کو مہناز کے اپارٹمنٹ پر چھوڑنے جا رہے تھے، راستے میں گھات لگا کر بشریٰ کو اغوا کر لیا گیا۔''

''مطلب بشریٰ اس وقت باذل کے قبضے میں ہے۔'' معاذ بے قراری سے بولا۔

''ایسا ہی ہے۔''

''کیا بشریٰ کو بھی اسی ہاؤسنگ اسکیم میں رکھا گیا تھا؟'' معاذ نے اندازہ لگایا۔

''ہاں، لیکن جب تک ہم وہاں پہنچے باذل، بشریٰ اور اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ البتہ ہم نے خفیہ سرنگ اور اسلحے کا ذخیرہ دریافت کر لیا۔'' جارو اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

''لالہ نے اپنے کچھ آدمی نگرانی کے لیے ہاؤسنگ اسکیم پر چھوڑ دیے ہیں لیکن اس معاملے میں کنفیوز ہے کہ اس اسلحے کے بارے میں کس ادارے کو اطلاع دے۔ پولیس کی طرف سے وہ مطمئن نہیں ہے۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں ابھی یہ پریشانی دور کر دیتا ہوں لیکن پہلے لالہ سے مل لوں۔''

''ہاں آ جاؤ۔ وہ بھی تمہیں دیکھ کر خوش ہو گا۔'' جارو نے جواب دیا اور دونوں ساتھ ساتھ چلتے لالہ کے پاس پہنچ گئے۔ لالہ اسے دیکھ کر واقعی خوش ہو گیا لیکن اس سے کوئی استفسار نہیں کیا کہ وہ اب تک کہاں تھا اور کیسے واپس آیا؟

''جارو بتا رہا تھا کہ آپ یزدانی ہاؤسنگ اسکیم سے ملنے والے اسلحے کے بڑے ذخیرے کی بابت پریشان ہیں کہ اسے کس حکومتی ادارے کے حوالے کیا جائے؟ میرے پاس آپ کے اس مسئلے کا حل موجود ہے۔'' اس نے لالہ کو کرنل سکندر بخت اور ان کے خفیہ ادارے کے بارے میں آگاہ کیا۔

''اگر تم مطمئن ہو تو ضرور انہیں طلاع دو اور ان سے جلد از جلد ایکشن لینے کے لیے کہو کیونکہ کچھ پتا نہیں کہ کب باذل کو اس بات کی خبر ہو جائے کہ اسلحہ تہ خانے سے نکال کر اس کی بتائی ہوئی جگہ پر منتقل نہیں کیا گیا ہے اور ہنوز وہیں موجود ہے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ اس کے حصول کے لیے اپنے آدمی دوڑا دے گا اور میرے پاس فی الحال اتنے آدمی نہیں ہیں کہ اس کے آدمیوں کا مقابلہ کر سکیں۔'' لالہ کے لہجے میں پریشانی سی تھی۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے؟ کوئی ایسی بات جسے مجھ سے چھپایا جا رہا ہو؟'' اس نے باری باری جارو اور لالہ کے چہروں کو دیکھا۔

www.pklibrary.com

''میں تمہیں تفصیل بتاتا ہوں لیکن پہلے تم اپنے کرنل صاحب سے بات کرلو اور ضروری تفصیلات بھی طے کرلو تاکہ میں ہاؤسنگ اسکیم میں موجود اپنے بندوں کو ان لوگوں کی آمد کے متعلق آگاہ کرسکوں۔''

''ٹھیک ہے۔ جیسا آپ چاہیں۔'' اس نے لالہ سے بحث نہیں کی اور طے شدہ طریقہ کار کے مطابق کرنل صاحب سے رابطہ کرنے لگا۔ رابطہ ہوگیا تو انہیں مختصراً کال کرنے کے مقصد سے آگاہ کیا۔ انہوں نے اسے تیز ترین کارروائی کا یقین دلانے کے ساتھ کچھ ضروری ہدایات جاری کیں۔ جتنی دیر میں وہ اس کال سے فارغ ہوا، لالہ بھی کہیں بات کرنے میں مصروف رہا۔ اس نے اسے کرنل صاحب کی ہدایات کے بارے میں آگاہ کیا۔

''ٹھیک ہے، میں اپنے آدمیوں کو بتادیتا ہوں۔'' لالہ نے فوراً ایک اور کال لگالی۔ وہ اس کال سے فارغ ہوا تو معاذ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''بشریٰ کو وہ مردود باذل اپنے ساتھ کسی ٹھکانے پر لے گیا ہے۔ اس وقت اصغر اور وکی کے ساتھ ہمارے لوگ اسے چھڑوانے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ دونوں طرف کے لوگوں کا ٹکراؤ ہوچکا ہے بلکہ وکی نے مجھے بتایا تھا کہ کوئی تیسری پارٹی بھی میدان میں موجود ہے۔ تم خود ہی اندازہ لگا سکتے ہو کہ کتنا زبردست معرکہ چھڑا ہوا ہوگا۔ بس اسی لیے میں تھوڑا سا پریشان ہوں۔'' لالہ نے اسے آگاہ کیا۔

''وہ لوگ کہاں ہیں؟ میرے خیال میں مجھے بھی وہاں جانا چاہیے۔'' معاذ مضطرب سا اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

''میں وقفے وقفے سے رپورٹ لے رہا ہوں۔ اصغر اور وکی سے تو فی الحال بات نہیں ہوسکتی لیکن باہر موجود ایک بندے نے سب ٹھیک چلنے کا اشارہ دیا ہے۔'' لالہ نے اسے آگاہ کیا۔ اسی وقت اس کے سامنے میز پر رکھے مختلف موبائل فونز میں سے ایک فون بجنے لگا۔ لالہ نے ایک نظر اسکرین پر ڈالی اور بڑبڑایا۔

''علینہ..... اس نے اس وقت کیسے کال کرلی؟''

''کیا حال ہے بٹیا! آج اس وقت کیسے یاد آگئی؟'' ذہن الجھا ہوا ہونے کے باوجود اس نے علینہ کی کال ریسیو کرلی اور لہجے کو بشاش بناتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

''بس دل میں آیا کہ بات کی جائے تو کال ملالی۔'' علینہ نے لاڈ سے جواب دیا۔

''اور وہ ہمارا شیر پتر کیسا ہے؟ تمہیں زیادہ تنگ تو نہیں کرتا؟'' لالہ کی پوری کوشش تھی کہ اس سے معمول کے انداز میں بات کی جائے۔

''ویسے تو تنگ نہیں کرتا لیکن آج بہت ستا رہا ہے۔ صبح سے پتا نہیں کیوں روئے جارہا ہے۔ ابو، حکیم صاحب کے پاس بھی لے گئے تھے۔ انہوں نے دیکھ کر کہا کہ کوئی جسمانی مسئلہ نہیں ہے۔ شاید کسی وجہ سے نیند خراب ہوگئی ہے یا کسی آواز وغیرہ سے ڈر گیا ہے جو گھبرا کر رو رہا ہے۔ تھوڑا بہلائیں اور بچے کو ماں کے ساتھ رکھیں تو پُرسکون ہوجائے گا لیکن پتا نہیں کیوں اسے فرق نہیں پڑ رہا۔ ذرا دیر کے لیے چپ ہوتا ہے پھر دوبارہ رونا شروع کردیتا ہے۔ ٹھیک سے فیڈ تک نہیں کررہا۔'' لالہ کے چھوٹے سے سوال کے جواب میں علینہ بتانے پر آئی تو ایک سانس میں بتاتی چلی گئی اور آخر میں روہانسی ہوگئی۔

''صبر سے بٹیا! چھوٹے بچے بعض اوقات ایسے ہی تنگ کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اسے نظر لگ گئی ہو۔ تم اسے کسی سے دم کروالو۔'' لالہ نے اسے تسلی دینے کے ساتھ ساتھ مشورہ بھی دیا۔

''جی، ابو بھی یہی کہہ رہے تھے۔ ابھی ابھی وہ اسے امام صاحب سے دم کروانے کے لیے ہی لے کر نکلے ہیں لیکن میرا دل بری طرح گھبرا رہا تھا تو میں نے سوچا آپ کو کال کرلوں۔''

''چلو اچھا کیا۔ اس طرح تمہارا دھیان بھی بٹ جائے گا۔'' لالہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا لیکن خود اس کا اپنا دل ایک پل کے لیے زور سے سکڑا تھا۔ وہ جی دار آدمی تھا اور ہمیشہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیا تھا لیکن آج ایک غیر محسوس کن گھبراہٹ اس پر بھی طاری تھی جسے وہ مسلسل نظرانداز کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

''وقاص کہاں ہیں؟ میری ان سے بات کروا دیں۔'' علینہ نے کچھ جھجکتے ہوئے خواہش ظاہر کی۔

''وہ تو کہیں باہر گیا ہوا ہے، لو تم اپنے بھائی سے بات کرلو۔'' لالہ نے فون معاذ کو تھما دیا۔ معاذ تھوڑی دیر اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے اسے بہلاتا رہا۔ جلد ملاقات کے لیے آنے کا وعدہ بھی کیا اور جب لگا کہ وہ تھوڑی سی پُرسکون ہوگئی ہے تب جاکر سلسلہ منقطع کیا۔

''کوئی خبر؟'' کال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے لالہ سے دریافت کیا۔ جواباً اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''میرے خیال میں مجھے وہاں جانا چاہیے۔ آپ مجھے لوکیشن.....''

www.pklibrary.com

وہ لالہ سے کہہ ہی رہا تھا کہ اس کے پاس کال آنے لگی۔ لالہ نے لپک کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے کیا کہا گیا، معاذ اور جارون نہ سن سکے لیکن انہوں نے لالہ کے تیزی سے زرد پڑتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ دوسری طرف سے کوئی سنگین اطلاع دی گئی ہے۔ ایسی اطلاع جس نے لالہ جیسے آدمی کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

''تم لوگ پہنچو، میں کال کر کے سارے انتظامات کرواتا ہوں۔'' اس نے جس انداز سے یہ جملہ کہا، اس سے صاف پتا چلا کہ وہ ضبط کی بے پناہ منزلوں سے گزر رہا ہے۔

''کیا ہوا؟'' معاذ کے ہونٹوں سے سوال پھسلا لیکن لالہ دوسری کال پر مصروف ہو چکا تھا۔

''میرا پیشنٹ پہنچ رہا ہے۔ گولی لگی ہے اور حالت نازک ہے۔ کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے ورنہ میں تم سمیت تمہارے پورے اسپتال کو آگ لگا دوں گا۔'' وہ دوسری طرف موجود شخص کو سنگین لہجے میں دھمکا رہا تھا لیکن لہجے کی اس سنگینی کی تہ میں جو ہلکی سی لرزش تھی، وہ معاذ کے دل کو لرزا رہی تھی۔ جو یکطرفہ گفتگو سننے کو ملی تھی اس سے اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ کسی کو گولی لگ گئی ہے۔ گولی کسے لگی ہے، اس بات کا جو اشارہ لالہ کی حالت سے مل رہا تھا، اسے سمجھ کر ہی معاذ کا اپنا دل لرز رہا تھا۔

''وکی کو گولی لگی ہے اور اس کی حالت نازک ہے۔'' آخر لالہ کال سے فارغ ہوا اور ان لوگوں کو اطلاع دی تو گویا ہر بھیانک اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔

''کک..... کہاں ہے وہ؟ کون سے اسپتال لے گئے ہیں اسے؟'' وکی اپنی ذاتی حیثیت میں تو اسے عزیز تھا ہی، علینہ کے شوہر کی حیثیت سے عزیز تر ہو گیا تھا اور اس کے بارے میں ایسی اندوہناک خبر سن کر خود اس کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اس کے بچے کی بے چینی، وہ علینہ کی گھبراہٹ..... کچھ بھی تو بے سبب نہیں تھا۔ جن کے دل کے رشتے تھے، ان کے دلوں نے پہلے ہی کچھ برا ہو جانے کے اشارے موصول کرنا شروع کر دیے تھے۔

''آؤ میرے ساتھ..... ہم اسپتال چلتے ہیں۔'' وقاص کے آگے لالہ کے لیے کسی شے کی اہمیت نہیں تھی۔ وہ سب بھول کر اس کے پاس جانے کے لیے بے چین ہو گیا۔

کچھ پل میں ہی وہ اسپتال کی جانب اڑے جا رہے تھے۔ ضبط کی کوشش کے باوجود لالہ کا بار بار پہلو بدلنا اور رومال سے ماتھے پر پھوٹنے والا پسینا پونچھنا اس کی اندرونی حالت کی غمازی کر رہا تھا۔ بے چینی کی اس کیفیت میں وہ پہلے ہی بہت تیز گاڑی چلاتے ڈرائیور پر دہاڑا۔

''تیز چلاؤ..... یہ کیا گدھا گاڑی کی طرح چلا رہے ہو۔''

''جج..... جی لالہ!'' ڈرائیور بے چارہ گھبرا گیا۔

''ریلیکس۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' معاذ خود اندر سے گھبرایا ہوا تھا لیکن اس وقت اس نے محسوس کیا کہ لالہ کو اس سے کئی گنا زیادہ تسلی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آہستہ سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ بوڑھے شیر کا ہاتھ بالکل ٹھنڈا پڑا ہوا تھا اور اس میں ہلکی سی لرزش تھی جو ثابت کر رہی تھی کہ جب کسی اپنے کی جان پر بن جائے تو پہاڑ جیسا حوصلہ رکھنے والے بھی ہل کر رہ جاتے ہیں۔

☆☆☆

''آپ سکون سے بیٹھ جائیں سر! اس طرح ٹہل ٹہل کر تو آپ بُری طرح تھک جائیں گے۔'' عرفان اللہ کی منظور نظر سیکریٹری صوفیہ کچھ دیر تو اسے ادھر سے اُدھر چکر کاٹتا دیکھتی رہی پھر آخر کار نرمی سے ٹوک دیا۔

''کیسے بیٹھ جاؤں سکون سے؟ تم نے سنا نہیں کہ اس خبیث باذل کے آدمی میرے آدمیوں کو پچھاڑ کر مال لے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔'' عرفان اللہ کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ مال جہاں بھی جائے گا، آپ کو اطلاع تو مل ہی جائے گی اور نہ بھی ملے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ صرف کچھ ہی گھنٹوں کی بات ہے پھر باذل ہمارے قبضے میں ہوگا اور ہم اس سے جو چاہے معلوم کریں گے۔'' صوفیہ نے اسے پُرسکون رکھنے کی کوشش جاری رکھی۔

''میڈم سے کہنا کوشش کریں کہ اسے نقصان نہ پہنچے۔ اس سے جو کچھ بھی حساب کتاب کرنا ہوا، میں خود کر لوں گا۔'' یوں تو عرفان اللہ کو باذل پر اتنا غصہ تھا کہ ایک دفعہ تو اسے ختم کروا دینے کا ہی فیصلہ کر لیا تھا لیکن پھر تاجور کا خیال آیا کہ وہ بیٹے کی موت پر بہت واویلا کرتی اور اگر ذرا بھی بھنک پڑ جاتی کہ اس کام کے پیچھے عرفان اللہ کا ہاتھ تھا تو طوفان ہی لے آتی۔ اپنے سیاسی کیریئر کے اس اہم موڑ پر اسے کسی پینڈورا باکس کا کھلنا منظور نہیں تھا۔ اس کے علاوہ شاید تھوڑا بہت خون نے بھی جوش مارا تھا کہ اس نے باذل کو ایک موقع دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''جیسی آپ کی مرضی سر! لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ یہ شخص آگے بھی بار بار آپ کے لیے مسئلہ بنتا رہے گا۔ تنظیم آپ کو جس مقام تک پہنچانا چاہتی ہے، اس تک پہنچنے کی راہ

www.pklibrary.com

ہموار کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے آپ کو ہر طرح کے اسکینڈل سے دور رکھیں۔'' صوفیہ نے اسے سمجھایا۔

''میں اس بات کو سمجھتا ہوں اسی لیے تو تم سے شادی کے مطالبے سے بھی فی الحال دستبردار ہو گیا ہوں۔'' عرفان اللہ نے صوفیہ کے پُرکشش سراپا پر ایک حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''آپ نے یہ فیصلہ کر کے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر آپ اپنی ضد پر اڑے رہتے تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تنظیم کے بڑے آپ کی جگہ کسی اور کا انتخاب کر لیتے۔ میرا کیا ہے، میں تو بغیر شادی کے بھی ہر وقت آپ کی دسترس میں ہوں۔'' صوفیہ کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ سے شہ پا کر عرفان اللہ کا خراب موڈ فوراً دوسرے ٹریک پر آ گیا اور موقع غنیمت جان کر اس نے پیش قدمی کرنی چاہی لیکن فون کی گھنٹی کی آواز نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ صوفیہ نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کال ریسیو کی۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے دوسری طرف موجود شخص کو ہولڈ کرنے کا کہا اور پھر عرفان اللہ کو اطلاع دی۔

''مل ایریا کا ایس ایچ او ہے۔ آپ کی مل کے باہر جو فائرنگ ہوئی ہے اس کے حوالے سے آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''لاؤ دو مجھے۔'' عرفان اللہ نے منہ بناتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس سے فون لے لیا اور بیزاری سے ''ہیلو'' بولا۔ دوسری طرف سے ایس ایچ او نے واقعے کے حوالے سے بات چیت شروع کی۔

''دیکھیے ایس ایچ او صاحب! جو کچھ ہوا اس حوالے سے میرا اسٹاف آپ کو تفصیلات فراہم کر چکا ہے۔ یہ سیدھی سادی ڈاکا زنی کی واردات تھی جسے میرے گارڈز نے ناکام بنا دیا۔ اس واردات کے حوالے سے میں آپ کو اپنے اسٹاف سے بہتر معلومات فراہم نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے بھی جو کچھ معلوم ہوا ہے، انہی کی زبانی معلوم ہوا ہے۔'' اس نے ایس ایچ او کی بات پوری سنے بغیر اس پر واضح کیا۔

''جی نہیں، یہ کسی دشمنی کا شاخسانہ نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ملزمان کو کسی ذریعے سے مال کی روانگی کی اطلاع مل گئی تھی اس لیے انہوں نے موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔'' ایس ایچ او کی طرف سے کسی مشتبہ شخص کا نام پوچھے جانے پر اس نے اسے جواب دیا لیکن ایس ایچ او مزید بال کی کھال نکالنے کے موڈ میں تھا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں۔ میرا آج کا شیڈول بہت ٹف ہے اور میں آپ کو زیادہ ٹائم نہیں دے سکتا۔ آپ کو جو کچھ معلوم کرنا ہے، اسٹاف ہی سے معلوم کریں اور جلد از جلد میرے منیجر کو بھی تلاش کریں۔ مجھے تشویش ہے کہ ان لوگوں کی قید میں اس بے چارے کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کیا جا رہا ہو یا وہ لوگ اسے مار مُور کر اِدھر اُدھر نہ پھینک دیں۔'' پولیس کے سامنے نذر کی غیر موجودگی کا جواز پیش کرنے کے لیے یہ جھوٹ بولا گیا تھا کہ ڈاکو اپنی جان بچانے کے لیے نذر کو یرغمال بنا کر لے گئے ہیں۔ اس نے اسی حوالے سے ایس ایچ او کو پولیس کی نااہلی جتائی اور مصروفیت کا بہانہ بنا کر سلسلہ جلد منقطع کر دیا۔

''آپ کو سارا الزام ڈاکوؤں کے سر ڈالنے کے بجائے اشارے کنائے میں ایس ایچ او کو جتانا چاہیے تھا کہ یہ آپ کے سیاسی مخالفین کی حرکت ہو سکتی ہے جنہوں نے اس حرکت سے آپ کا ذہنی سکون برباد کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ کہ ایسی حرکتیں کر کے وہ آپ کو سیاسی سرگرمیوں سے دور کر کے دوسرے معاملات میں الجھانا چاہتے ہیں۔'' صوفیہ نے کال بند ہونے کے بعد اسے مشورہ دیا۔

''کوئی بات نہیں۔ میڈیا سے بات ہونے پر میں ان کے سامنے یہ نکتہ اٹھا دوں گا۔ یہ ایس ایچ او تو ویسے بھی میرے سیاسی مخالفین کا پٹھو ہے۔'' عرفان اللہ مطمئن تھا۔

''یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ فوری طور پر ایک پریس کانفرنس ارینج کرتی ہوں۔ اس میں آپ اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مخالفین کو بھی رگید ڈالیے گا۔'' صوفیہ نے فوری طور پر پروگرام ترتیب دے ڈالا۔ عرفان اللہ کا دھیان میڈم ایکس کے آدمیوں کے باذل کے موجودہ ٹھکانے پر کیے جانے والے حملے کی طرف لگا ہوا تھا لیکن صوفیہ کو اس کے پروگرام سے نہ روک سکا۔ صوفیہ نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پریس کانفرنس کا سارا انتظام کر لیا۔ اس پریس کانفرنس میں عرفان اللہ کو کیا کہنا ہے، وہ بھی اس نے لکھ کر دیا۔ چنانچہ جب عرفان اللہ نے میڈیا والوں کے سامنے بات کی تو سننے والوں کو ایسا ہی محسوس ہوا جیسے واقعی ایک بے حد محب وطن شخص کو جو ایک کامیاب بزنس مین کی حیثیت سے پہلے ہی ملک کی ترقی میں مؤثر کردار ادا کر رہا ہے اور اب اپنے ہم وطنوں کی بھلائی کے لیے سیاست کے خارزار میں بھی اتر چکا ہے..... اس میدان سے باہر دھکیلنے کی سازشیں کی جا رہی ہیں تاکہ ملک کی

www.pklibrary.com

باگ ڈور انہی پرانے پاپیوں کے ہاتھ میں رہے جو اتنے برسوں سے ملک وقوم کو لوٹنے میں مصروف ہیں۔ اس موقع پر عرفان اللہ نے چند ایسی باتیں بھی کیں جن سے اشارہ ملا کہ وہ جلد ہی موجودہ پارٹی چھوڑ کر اپنی ذاتی سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھنے جا رہا ہے۔

اس کی اس پریس کانفرنس کے بعد مختلف چینلز پر تبصروں اور تجزیوں کا سیلاب سا آ گیا اور ایسا لگنے لگا کہ اس وقت ملک کا سب سے اہم مسئلہ عرفان اللہ کا سیاست میں کردار ہی ہے۔ کئی اینکرز نے اس کی تعریفوں کے پل باندھ ڈالے۔ اس کی کاروباری کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا، فلاح و بہبود کے کاموں کی یوں تعریف کی گئی گویا وہ ایدھی کا جانشین ہو۔ یہ ثابت کرنے کے لیے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا کہ پچھلی بار وہ جس حلقے سے ایم این اے منتخب ہوا تھا، سب سے زیادہ ترقیاتی کام اسی حلقے میں ہوئے۔ ظاہر ہے ان اینکرز کی زبان سے یہ قصیدے جاری کروانے کے لیے انہیں بھاری لفافے ارسال کیے گئے تھے لیکن عرفان اللہ خوش تھا کہ اس کی شخصیت ایک دم بہت اوپر اٹھ گئی ہے اور اس کے وزیراعظم کی کرسی تک پہنچنے کی راہیں تیزی سے ہموار ہو رہی ہیں۔ اس خوشی نے اسے باذل والے معاملے کی طرف سے بھی غافل کر دیا تھا۔ یہ معاملہ اسے اس وقت دوبارہ یاد آیا جب باذل کے ساتھیوں میں موجود اس کے مخبر نے اسے اطلاع دی کہ میرو نے چاولوں کے گودام میں جو مال منتقل کروایا تھا، اس میں اسلحہ شامل نہیں ہے۔ اس اطلاع نے اس کی ساری خوشی غارت کر دی اور صوفیہ کے سامنے پھنکارنے لگا۔

''مجھے اپنا مال ہر حال میں واپس چاہیے۔ ابھی تک تو میں مطمئن تھا کہ باذل ہاتھ آئے گا تو ساتھ میں وہ مال بھی واپس مل جائے گا لیکن یہاں تو باذل کے ساتھ ہی ہاتھ ہو گیا ہے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ آپ کے منیجر نے مال یزدانی ہاؤسنگ اسکیم سے منتقل ہی نہیں کروایا تھا۔ اس نے آپ کو اور باذل دونوں کو ڈبل کراس کیا ہے اور کسی تیسری پارٹی کے ساتھ مل گیا ہے۔'' صوفیہ نے اندازہ لگایا۔

''شاید ایسا ہی ہے کیونکہ نہ اس کا کچھ اتا پتا ہے اور نہ ہی اس کی فیملی کا۔ میرے آدمی اس کے گھر گئے تھے لیکن وہاں تالا لگا ہوا تھا۔'' عرفان اللہ نے اس کی رائے سے اتفاق کیا پھر بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے ہمیں ایک بار یزدانی ہاؤسنگ اسکیم میں چیک کروانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے مال اب بھی وہیں موجود ہو۔''

''میں آپ کو اس بات کا مشورہ نہیں دوں گی کیونکہ زیادہ امکان یہ ہے کہ وہاں کوئی ٹریپ لگا کر آپ کو پھانسنے کی کوشش کی جائے۔ بہتر ہے آپ پہلے آج والے مشن کو کامیاب ہونے دیں پھر اس معاملے کو دیکھیں۔'' صوفیہ نے اسے کسی بھی اقدام سے روک دیا۔ اس کے بعد کا ان کا سارا وقت انتظار میں گزرا۔ باذل کی پناہ گاہ پر جاری آپریشن میں عملی طور پر شامل نہ ہونے کے باعث انہیں صورتِ حال کی کوئی خبر نہیں تھی، نہ ہی صوفیہ یا عرفان اللہ میں سے کسی کی ہمت تھی کہ اس موقع پر میڈم ایکس سے رابطہ کر کے اس سے کچھ پوچھ سکیں۔ عرفان اللہ کا اپنے مخبر سے بھی رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ کچھ تھوڑی بہت سن گن ملی تھی تو خبروں سے جن میں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ شہر کے فلاں علاقے میں شدید فائرنگ کی آوازیں سنی گئی ہیں۔

''سر! میرا خیال ہے آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ جو صورتِ حال ہوگی، صبح تفصیلات مل جائیں گی۔ ناکامی کا تو ویسے بھی کوئی امکان نہیں۔'' رات گئے صوفیہ نے عرفان اللہ کو نصیحت کی۔

''تم باذل کو نہیں جانتیں صوفی ڈارلنگ! اس خبیث کے اندر کسی شیطان کی روح ہے۔ میں نے اسے بُرے سے بُرے حالات میں بھی بچ کر نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ سچ پوچھو تو اس کے نہ ہونے سے میری طاقت آدھی رہ گئی ہے۔ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ مشکل سے مشکل معاملے کو بھی چٹکیوں میں حل کر دیتا ہے۔ اس کی انہی خوبیوں کی وجہ سے میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔'' عرفان اللہ کا ذہن منتشر تھا۔ ایک طرف وہ باذل سے خوفزدہ تھا تو دوسری طرف اسے بچانا بھی چاہتا تھا۔

''میڈم ایکس کا تعاون ملنے کے بعد باذل جیسے گلی کے غنڈے کے بارے میں اس انداز میں سوچنا ایک طرح سے میڈم کی توہین ہے۔'' صوفیہ نے منہ بنایا۔

''نہیں نہیں..... میرا یہ مقصد نہیں ہے۔ میڈم کا تو ظاہر ہے بہت اونچا مقام ہے اور میں جانتا ہوں کہ باذل کا میڈم سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے لیکن بس اتنے عرصے سے وہ سب کچھ سنبھال رہا ہے تو مجھے اس کی عادت ہو گئی ہے۔'' صوفیہ کا منہ بنتا دیکھ کر عرفان اللہ جلدی جلدی وضاحت دینے لگا کہ کامیابی کے جس افق پر پہنچنے کے ان لوگوں نے خواب دکھائے تھے، انہیں ناراض کر کے وہ ان خوابوں سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

''عادتیں تو ہوتی ہی بدلنے کے لیے ہیں۔ اب یہی

www.pklibrary.com

دیکھ لیں کہ آپ نے برسوں اپنی بیوی کے ساتھ گزارے اور اب وہ آپ سے دور ہیں تو آپ کو ان کا خیال بھی نہیں آتا۔''

''جسے تم جیسا متبادل مل جائے، وہ اپنی باسی کڑھی جیسی بیوی کو خاک یاد کرے گا۔'' عرفان اللہ کا موڈ فوراً ہی بدل گیا۔ صوفیہ نے اس کے اس بدلے ہوئے موڈ کا بھرپور ساتھ دیا۔ عرفان اللہ وہ شخص تھا جسے اپنی عشوہ و غمزوں سے قابو میں رکھنا ایک طرف اس کی ذمے داری تھی تو دوسری طرف یہ لالچ بھی تھا کہ مستقبل میں وہ شخص جس مقام پر پہنچایا جانے والا تھا، موجودہ تعلق کی بنیاد پر وہ اس سے تنظیم کے مقاصد کے علاوہ ذاتی مفادات بھی حاصل کر سکتی تھی۔

ہوس اور لالچ کے گٹھ جوڑ سے بننے والے تعلق کے شوریدہ سر جذبات ذرا سرد ہوئے تو وہ دونوں تھک کر نیند کی وادی میں اتر گئے۔ ابھی نیند بہت گہری نہیں ہوئی تھی کہ زوردار دھماکے کے ساتھ دروازہ کھولنے کی آواز ایک جھٹکے سے ہوش و حواس کی دنیا میں واپس لے آئی۔ کھلی آنکھوں نے جس چہرے کو سامنے دیکھا، اسے دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

☆☆☆

''کیسا..... کیسا ہے وکی؟'' اسپتال پہنچتے ہی ان کا لالہ کے ایک آدمی سے سامنا ہوا۔ پورے راستے خود پر بند باندھے معاذ کا صبر اس موقع پر جواب دے گیا اور اسے تقریباً جھنجوڑتے ہوئے وکی کی بابت دریافت کیا۔

''آپریشن تھیٹر میں ہے۔ خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ ڈاکٹر نے بڑی مقدار میں خون جمع کرنے کو کہا ہے۔'' اس شخص کا ستا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ معاملہ کافی گڑبڑ ہے۔

''تو جمع کرواؤ خون۔ شہر میں اتنے بلڈ بینک ہیں۔ کیا ان سے میرے لاڈلے کے لیے چند بوتلیں خون نہیں مل سکتا۔ اگر نہیں مل سکتا تو آگ لگا دو سب کو۔'' لالہ کسی غضب ناک شیر کی طرح دہاڑا۔

''ہم کوشش کر رہے ہیں لالہ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وکی بھائی کا بلڈ گروپ او نیگیٹو ہے اور اس گروپ کا ڈونر بہت مشکل سے ملتا ہے۔'' اس شخص نے دھیمی آواز میں لالہ کو جواب دیا۔ حالات کی سنگینی کے اس ادراک نے معاذ کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی۔ وکی اسے اتنا عزیز تھا کہ اس کی زندگی بچانے کے لیے رگیں نچوڑ کر اپنے خون کا آخری قطرہ تک اسے دے سکتا تھا لیکن یہاں بات جذبات کی نہیں، حقائق کی تھی۔ قدرت کی مرضی کے آگے وہ بے بس تھے۔

''ہمارے لوگ شہر کے سارے بلڈ بینکس سے رابطہ کر رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر بھی بھاری انعام کے اعلان کے ساتھ ڈونر کے لیے اپیل کر دی ہے۔ اللہ نے چاہا تو کچھ نہ کچھ.....'' وہی شخص انہیں اپنے اقدامات سے آگاہ کر رہا تھا لیکن لالہ اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھ چکا تھا۔

''لالہ.....!'' معاذ اسے آواز دیتا ہوا اس کے پیچھے لپکا لیکن اس کے قریب پہنچنے سے قبل ہی لالہ ڈاکٹرز روم میں پہنچ چکا تھا۔

''وقاص احمد کے لیے جتنا خون درکار ہے، میرے جسم سے نکال لیں۔ اگر وہ نہ بچ سکا اور میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی بچ گیا تو تم میں سے کسی کی خیر نہیں ہوگی۔'' آنکھوں سے اگر خون ابلا پڑ رہا تھا تو لہجے میں غیظ کی چنگاریاں تھیں۔ اس کے اس انداز پر ینگ ڈاکٹر کا چہرہ سرخ پڑ گیا اور پُرطیش لہجے میں بولا۔

''پہلے آپ جا کر اپنا بلڈ ٹیسٹ کروائیں پھر آگے بات ہوگی۔ یہ کوئی انڈین مووی نہیں ہے کہ جذباتی بھڑکیں مار کر مریض کی جان بچائی جا سکے۔''

ایک تو وہ لالہ کی دنیا سے باہر کا شخص ہونے کی وجہ سے اسے جانتا ہی نہیں تھا، دوسرے سامنے والے کے جاہل ہونے کا یقین اور اپنی ڈگری کا زعم بھی تھا اس لیے لہجے کی ترشی بہت بڑھ گئی تھی۔ تجربے کی کمی نے اسے یہ اندازہ بھی نہیں لگانے دیا تھا کہ اس کے مقابل کھڑا شخص اندر سے کیسے کسی آتش فشاں کی طرح ابل رہا ہے۔

''میرا خون، میرے جگر کا ٹکڑا ہے وہ۔ میرا بلڈ گروپ اس سے میچ نہیں کرے گا تو پھر کس کا کرے گا؟ او نیگیٹو ہوں میں بھی اور یہ بات اس لیے اچھی طرح جانتا ہوں کہ تیری ڈگریوں سے کہیں زیادہ زخم سجے ہیں میرے بدن پر۔ ایک بار نہیں پچاسیوں بار ٹیسٹ ہوا ہے میرا بلڈ گروپ۔'' لالہ نے اس زور سے اس کا گریبان پکڑا کہ اس کی سانس رک گئی اور آنکھیں ابل پڑیں۔

''لالہ پلیز..... پلیز ریلیکس لالہ.....!'' معاذ نے تیزی سے آگے بڑھ کر ڈاکٹر کو اس کی گرفت سے نجات دلوائی۔

''اللہ سب ٹھیک کرے گا۔ کچھ نہیں ہوگا ہمارے وکی کو۔ آپ خود پر قابو رکھیں اور ڈاکٹرز کو ان کا کام کرنے دیں۔'' اس نے لالہ کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر ایک کرسی پر بٹھایا اور ڈاکٹر سے درشت لہجے میں بولا۔

''جیسا آپ سے کہا گیا ہے، ویسا کریں اور پلیز، خیال رکھا کریں کہ سامنے کون ہے؟ ہر آدمی کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش میں کسی دن آپ اپنا منکا تڑوا بیٹھیں گے۔''

www.pklibrary.com

ڈاکٹر نے جو موت کے منہ سے واپس آیا تھا، خاموشی سے اس کی بات سنی اور باہر کی طرف دوڑا۔ اسٹاف کے کچھ اور لوگ بھی جو آوازیں سن کر وہاں آگئے تھے، خاموشی سے پلٹ گئے تھے۔ یہ ایک نجی اسپتال تھا جہاں لائے جانے والے اس خاص مریض کی تفصیلات سے آگاہ نہ ہوتے ہوئے بھی انہیں یہی معلوم تھا کہ انہیں مریض کے ساتھ موجود افراد کے ساتھ بھرپور تعاون کرنا ہے اور مریض کی جان بچانے کے لیے اپنی جان لڑا دینی ہے۔ مریض کی اہمیت کا اندازہ تو اس بات سے بھی لگایا جاسکتا تھا کہ رات کے اس پہر اسپتال کا سب سے تجربہ کار اور قابل سرجن اپنے معاونین کے ساتھ مل کر اس کی جان بچانے کے لیے آپریشن تھیٹر میں مصروف تھا لیکن اس نئے اپائنٹ ہونے والے احمق ڈاکٹر نے صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھے بغیر مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔

''پانی پئیں۔'' اردگرد کی پروا کیے بغیر وہ لالہ کو پُرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اس کے باپ اور اپنے عزیز از جان بھائی کو نہیں بچا سکا تھا میں۔ میری بھتیجی بھی بھیڑیوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور بھاوج بھی بے بسی کی موت مری تھی۔ میں نے ہر بار دشمن کے خون سے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کی کوشش کی تھی لیکن سچ بتاؤں تو میرے اندر آج بھی سلگن ہے۔ اپنے چلے جائیں اور ایسے ظالمانہ طریقے سے چلے جائیں تو اس دکھ اور جلن کو مٹانے کے لیے کوئی طریقہ کامیاب نہیں رہتا۔ خود کو شراب میں ڈبونے پر یہ دکھ رگوں کو کاٹتا رہتا ہے۔ میں اس دکھ کی اذیت سے اچھی طرح واقف ہوں اس لیے اب کسی صورت دوبارہ اس سے نہیں گزرنا چاہتا، ہرگز نہیں گزرنا چاہتا۔'' لالہ نے پانی سے بھرا گلاس تھامنے کے بجائے بھرائی ہوئی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ کب اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، اسے خود بھی خبر نہ ہوسکی۔

''حوصلے سے لالہ! حوصلے سے..... کچھ نہیں ہوگا ہمارے وکی کو۔ آپ کو شاید نہیں معلوم لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کے ساتھ بے شمار دعائیں ہیں۔ وہ اپنوں اور غیروں کے دکھ بانٹنے والا اور مشکل میں لوگوں کا ساتھ دینے والا ہے۔ ایسے شخص کو اس کے مشکل وقت میں اللہ تنہا چھوڑ دے، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔'' لالہ جیسے شخص کو یوں ٹوٹتے دیکھنا بہت تکلیف دہ عمل تھا۔ معاذ نے بہ مشکل خود کو چھلکنے سے روکا اور بہت ہمت سے لالہ کا حوصلہ بندھاتا رہا۔ یہاں تک کہ اسپتال کا عملہ خون لینے کے لیے اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ لالہ کے جانے کے بعد وہ خود اس کی جگہ کرسی پر بیٹھ گیا اور میز پر سر رکھ کر خاموشی سے آنسو بہانے لگا۔ ان آنسوؤں کے ساتھ بے تحاشا دعائیں بھی تھیں کہ وہ وکی جیسے اچھے انسان، مخلص دوست اور سب سے بڑھ کر اپنی بہن کے سہاگ کو کسی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے دعا کرتے کرتے علینہ کی فون کال یاد آتی تھی تو گھبراہٹ سی ہونے لگتی تھی۔ یہاں سے اتنی دور بیٹھ کر بھی جیسے کسی انجان ذریعے سے وہاں تک مشکل کی خبر پہنچ گئی تھی جب ہی تو وہ ماں بیٹا بے چین و بے قرار تھے۔ کیا کوئی انہونی ہونے کو تھی؟ کوئی بڑا نقصان، کوئی دائمی دکھ گھات میں تھا؟ سوالات دماغ میں اٹھتے تھے تو دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ ابھی وہ اپنی اس کیفیت سے لڑ ہی رہا تھا کہ باہر کچھ شور سا سنائی دیا۔ وہ گھبرا کر جلدی سے باہر نکلا۔

''کیا..... کیا ہوا ہے؟'' اس نے وہاں موجود لالہ کے آدمیوں میں سے ایک سے پوچھا۔ خود اسے تو ایک بند ہوتے دروازے کے پیچھے گم ہوتے ہوئے اسٹریچر کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔

''بشریٰ صاحبہ کو لایا گیا ہے۔ ان کے شانے میں گولی لگی ہے۔'' اس شخص نے پست آواز میں اطلاع دی تو معاذ نے بے ساختہ ہی خود کو سہارا دینے کے لیے قریبی دیوار سے ٹیک لگالی۔ شاید آج کے دن ایک بھی اچھی خبر نہیں ملنے والی تھی۔

☆☆☆

''تم..... تم یہاں کیسے آئے، تمہیں اندر کس نے گھسنے دیا؟'' عرفان اللہ پہلے تو باذل کو اپنے سر پر کھڑا دیکھ کر بُری طرح گھبرا گیا پھر غصے سے چیخنے لگا۔ اس کے ساتھ موجود صوفیہ البتہ خاموش تھی اور خاموشی ہی سے بیڈ کراؤن سے پشت لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ نیم عریاں تھی اور اپنی بے ستری کو چھپانے کے لیے چادر کندھوں تک کھینچ لی تھی۔

''اندر کس نے گھسنے دیا سے کیا مطلب؟ کیا آپ نے میرے یہاں آنے پر پابندی لگا رکھی تھی؟ اگر ایسا تھا تو یقین کریں آپ کا اسٹاف شدید نکما ہے۔ اگر..... آپ کو موقع ملے تو پہلی فرصت میں اس اسٹاف کو فارغ کر دیجیے گا۔''

''اگر'' پر خاصا زور دیتے ہوئے اس کا لہجہ خاصا طنزیہ تھا۔ عرفان اللہ کو یکدم ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اپنے تئیں باذل کا انتظام کر چکنے کے باعث اسے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اس کے سلسلے میں سیکیورٹی اسٹاف کو کسی قسم کی خصوصی ہدایت دے سکے۔ باذل کا ہمیشہ سے اس کے گھر میں بے

www.pklibrary.com

تکلفانہ آنا جانا تھا اور صرف اتنا ہی نہیں تھا، اسے انتظامی معاملات میں بھی خصوصی اختیارات حاصل تھے اور وہ چاہتا تھا تو سیکیورٹی سے متعلق ازخود بہت سی تبدیلیاں کر کے محض اطلاع دے دیتا تھا۔ اس کی اس حیثیت کے بعد بھلا کس کی مجال تھی کہ اس کو رات کے اس پہر ہی سہی، اندر آنے سے روکتا۔ میڈم ایکس کے آدمی گھر کے سیکیورٹی اسٹاف میں شامل نہیں تھے۔ انہیں اس نے صرف باہر کی سرگرمیوں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی موجود ہوتا تو کم از کم صوفیہ کو ہی اطلاع دے دیتا۔ پرانے اسٹاف نے تو باذل کو پرانا پروٹوکول دیتے ہوئے آرام سے اندر آنے دیا تھا۔

''کیوں آئے ہو تم یہاں؟'' عرفان اللہ اگرچہ اندر سے گھبرا چکا تھا پھر بھی لہجے میں رعب لانے کی کوشش کی۔

''آپ میرے اوپر فوجیں چڑھا کر مجھے اپنے پاس بلوانے کی زحمت کر رہے تھے تو میں نے سوچا آپ کو اس مشکل سے بچالوں اور خود آپ کی خدمت میں حاضری دے دوں۔'' اس کے لہجے میں موجود طنز کی کاٹ کے ساتھ ساتھ عرفان اللہ نے کہیں تہہ میں بل کھاتے غصے کو بھی محسوس کیا تو اندر ہی اندر کانپ کر رہ گیا لیکن پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔ اگر مجھے تمہیں بلوانا ہوتا تو کوئی بھی الٹی سیدھی حرکت کرنے کے بجائے ڈائریکٹ فون کر کے یہاں بلوا سکتا تھا۔''

''ہونے کو تو بہت کچھ ہوسکتا تھا۔ آپ میری ماں سے نکاح پڑھوا سکتے تھے، مجھے اپنا نسبی نہ سہی، قانونی بیٹا تسلیم کر سکتے تھے، مجھے ایک غنڈے بدمعاش کی جگہ اپنا سیاسی جانشین بنا سکتے تھے لیکن آپ وہ سانپ ثابت ہوئے جو اپنے ہی بچوں کو کھا جاتا ہے۔'' باذل کے لہجے میں ایک پھنکار سی تھی۔

''کیا بکواس کیے جا رہے ہو۔ اپنی ان فضولیات پر بات کرنے کے لیے تمہیں رات کا آخری پہر ہی ملا تھا؟'' عرفان اللہ نے اسے ڈپٹا۔

''ہاں، یہی پہر ملا تھا اور میں نے اسی کو غنیمت جانا کیونکہ ہونے کو تو یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں اس پہر خود پر چڑھائی کرنے والوں میں سے کسی کی گولی کا نشانہ بن کر ہمیشہ کی نیند سو جاتا اور آپ اس عمر میں اس جل پری کے ساتھ دادِ عیش دیتے رہ جاتے۔'' اس نے بستر پر لب بستہ بیٹھی صوفیہ پر ایک تضحیک آمیز نظر ڈالی۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' عرفان اللہ نے تھوک نگل کر خشک ہوجانے والے گلے کو تر کرنے کی کوشش کی۔

''ہمارے درمیان ہونے والی آخری ملاقات کے بعد ہی کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ تابوت میں آخری کیل آپ کے مخبر کے پکڑے جانے سے ٹھک گئی۔ میرو نے خود آپ کی اور اس کی گفتگو سنی تھی، باقی سچ بھی اس کی زبان گدی سے کھینچ کر اگلوا لیا گیا ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ نے کب، کہاں اور کیسے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔'' وہ اطمینان سے بستر کے مقابل رکھے ایک سنگل صوفے پر جم کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ میں موجود خطرناک گن کو یوں نمایاں کر کے رکھا کہ عرفان اللہ کا خون خشک ہوجائے۔ وہ جانتا تھا کہ عرفان اللہ جوڑ توڑ اور چار سو بیسی میں کتنا ہی ماہر سہی، خود سے لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں ہے۔ اسے صرف حکم دینے اور اپنے پالتو غنڈوں کے ذریعے مخالفین کو ٹھکانے لگانے کی عادت نے ہاتھ پیر چلانے کے لائق ہی نہیں چھوڑا تھا۔

''میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ میں تو بس تم سے بات چیت کرنا چاہتا تھا تاکہ تمہیں سمجھا سکوں کہ ہم اب بھی پہلے کی طرح ایک ٹیم بن کر کام کر سکتے ہیں۔'' عرفان اللہ کو اس کے تیور گھبراہٹ میں مبتلا کر رہے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ کرتے ہیں بات چیت لیکن یاد رکھیں کہ ہماری پوری بات چیت کی بنیاد میری اس شرط کو مان لینے پر ہوگی کہ آپ مجھے اپنا بیٹا تسلیم کرلیں۔'' وہ ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گیا اور عرفان اللہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

''تمہاری سوئی اسی ایک بات پر کیوں اٹک گئی ہے۔ تمہاری یہ بے صبری میرا سیاسی کیریئر داؤ پر لگا دے گی۔''

''اور میں جو بچپن سے اب تک رسوائی سہتا آرہا ہوں، اس کا کچھ نہیں۔ آپ ساری زندگی ایک غلام کی طرح مجھے استعمال کرتے رہے ہیں۔ اب مجھے اپنی رسوائی اور غلامی دونوں کا مداوا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دوں گا۔'' عرفان اللہ کے جواب نے اس کے غصے کو سوا نیزے پر پہنچا دیا اور وہ ایک دم بل کھا کر کھڑا ہوا تو گن کا رخ عرفان اللہ کی طرف تھا۔ غصے کی شدت نے اس سے گولی بھی چلوا دی۔

گولی عرفان اللہ کے جسم کے کون سے حصے پر لگی، وہ دیکھ نہیں سکا کیونکہ یکدم ہی صوفیہ کا چادر کے نیچے چھپا ہاتھ باہر آیا تھا اور اس نے اپنے بائیں جبڑے سے دائیں جبڑے کے درمیان آگ کی ایک لہر سی گزرتی ہوئی محسوس کی تھی۔ تکلیف کی شدت کے باوجود اس نے گن ہاتھ سے نہ

www.pklibrary.com

چھوڑی اور ایک فائر صوفیہ کی طرف جھونک دیا۔ اسی وقت باہر سے میرو نے پکارا۔

''باس! نکلنے کی کرو۔ پولیس کی گاڑیاں اس طرف آرہی ہیں۔'' وہ تکلیف سے جلتے گال پر ہاتھ رکھ کر باہر کی طرف دوڑا۔ تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن اپنی مضبوط قوتِ ارادی کے سہارے وہ نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑا تھا بلکہ دوڑ بھی رہا تھا۔ اگر وہ اس وقت آئینہ دیکھ سکتا تو دیکھتا کہ اس کا چہرہ کتنا بھیانک ہو چکا ہے۔ دونوں رخسار اس بری طرح جلے تھے کہ آر پار چھید ہو گیا تھا اور اس چھید سے ہڈیوں کے ساتھ ساتھ جلی ہوئی زبان بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے پاس اس وقت واحد پلس پوائنٹ یہ تھا کہ وہ اس گھر کے چپے چپے سے اچھی طرح واقف تھا اور سیکیورٹی گارڈز سے سامنا کیے بغیر بھی بہ آسانی باہر نکل سکتا تھا۔ میرو اور اس کا دوسرا ساتھی شاید گارڈز کے ساتھ الجھ گئے تھے اس لیے فائرنگ کی تیز آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ جیسے ہی باہر نکلا، ایک زوردار دھماکا سنائی دیا اور ساتھ ہی زمین اتنے زور سے لرزی کہ وہ قدم اکھڑنے سے زمین پر گر گیا۔ ایک پل کے لیے اس کی آنکھوں کے آگے دھند چھا گئی۔

دھند کے اس پار اس نے اکھڑا ہوا گیٹ اور داخلی راستے پر بھڑکتے شعلے دیکھے۔ شعلوں کے پیش منظر میں سرپٹ دوڑتا میرو اور اس کا ساتھی دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً انہوں نے سیکیورٹی گارڈز سے جان چھڑانے کے لیے ہینڈ گرینیڈ کا استعمال کیا تھا لیکن دوسری مصیبت اس پولیس موبائل کی صورت ان کے سر پر سوار تھی جو ابھی ابھی وہاں آکر رکی تھی اور جس کا چنگھاڑتا سائرن ماحول کو مزید بھیانک بنا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس موبائل سے کوئی پولیس والا برآمد ہوتا یا ان کی طرف سے کوئی ایکشن لیا جاتا، دوڑتے ہوئے میرو نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک اور ہینڈ گرینیڈ برآمد کیا اور دانت سے اس کی پن کھینچ کر موبائل کی طرف اچھال دیا۔ متوقع دھماکے کے پیش نظر باذل نے فوراً ہی اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ یہ دھماکا پہلے والے دھماکے سے بھی زیادہ شدید تھا۔ پولیس موبائل کو کسی کھلونا گاڑی کی طرح اچھلتے اور پھر شعلوں کی زد میں آتے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ زمین کی لرزش بھی اس بار پہلے سے زیادہ ہی محسوس ہوئی لیکن وہ خود کو سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی گاڑی کی طرف دوڑا۔ میرو اور دوسرا ساتھی اس سے آگے تھے۔ فضا میں ایک اور پولیس موبائل کی آواز گونجنے لگی تھی اور وہ امید نہیں کر سکتا تھا کہ ان حالات میں میرو کو اسے اپنے ساتھ لے جانے کا خیال آئے گا۔ وہ اپنی دنیا کی سفاکیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ ایسے نازک حالات میں ہر ایک کی پہلی ترجیح اپنی جان کا تحفظ ہوتی تھی چنانچہ اسے بھی اپنی جان بچانے کے لیے خود ہی کوشش کرنی تھی۔ وہ گرتا پڑتا گاڑی کے قریب پہنچا تو میرو پچھلی نشست پر بیٹھ چکا تھا جبکہ اس کے ساتھی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

''جلدی..... جلدی کرو باس!'' میرو اسے دیکھ کر چیخا اور گردن گھما کر موقع پر وارد ہونے والی پولیس موبائل کو دیکھا۔ باذل جس کا جسم پوری کوشش کے باوجود اس وقت مکمل ردھم میں نہیں تھا، گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہونے ہی لگا تھا کہ موبائل میں سوار پولیس والوں میں سے کسی نے اندر بیٹھے بیٹھے گولی چلائی۔ اب پتا نہیں اس کا نشانہ ہی بہت اچھا تھا یا باذل کی گردش میں آئی قسمت تھی جس نے اس پر ایک اور وار کیا اور گولی سیدھی اس کی کمر میں گھستی چلی گئی۔ اس کے حلق سے تیز خرخراہٹ نما آواز نکلی اور جسم جھٹکا کھا کر یوں گاڑی کی نشست پر گرا کہ محض ٹانگیں ہی باہر رہ گئیں۔ پچھلی نشست پر موجود میرو نے اس پر بس ایک نظر ڈالی اور نئی وارد ہونے والی پولیس موبائل سے نمٹنے کے لیے تیسرے ہینڈ گرینیڈ کا استعمال کیا۔ اس کام کے لیے اسے گاڑی کی کھڑکی سے اپنا اگلا دھڑ آدھے سے زیادہ باہر نکالنا پڑا تھا۔ یہاں اس نے ہینڈ گرینیڈ موبائل کی طرف اچھالا وہاں ایک سنسناتی ہوئی گولی آکر اس کے بازو سے ٹکرائی۔ اس کے منہ سے تیز چیخ نکلی لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ موبائل اور موبائل والے اس لائق نہیں رہے تھے کہ ان کے تعاقب میں آسکتے۔

''نکلو یہاں سے۔'' اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ساتھی کو چیخ کر حکم دیا اور خود باذل کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا آدھے سے زیادہ جسم گاڑی کے اندر تھا اس کے باوجود اپنے زخمی بازو کے ساتھ اسے اندر گھسیٹنے میں اسے دانتوں پسینا آگیا۔ مجروح بازو سے بھی خون مزید تیزی سے بہنے لگا۔ ادھر باذل بالکل بے سدھ تھا اور اس میں اتنی طاقت اور ہمت ہی نہیں تھی کہ خود کو ہلا جلا سکے۔ وہ اسی طرح گاڑی کے پچھلے حصے میں پڑا تھا کہ اوپری جسم نشست پر تھا اور ٹانگیں نیچے گاڑی کے فرش پر تھیں۔

میرو نے ایک نظر اس کی کمر سے ابلتے خون کو دیکھا پھر اپنے بازو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جائزہ لینے پر اسے

www.pklibrary.com

اطمینان ہوا کہ گولی محض گوشت پھاڑتی ہوئی باہر نکل گئی ہے اور ہڈی بالکل سلامت ہے۔ اس نے گاڑی میں پڑا ایک کپڑا اٹھا کر کسی نہ کسی طرح اسے مضبوطی سے اپنے بازو کے گرد باندھا۔ گاڑی جس رفتار سے جا رہی تھی اس کے باعث یہ کام خاصا مشکل ثابت ہوا تھا۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر باذل کا جائزہ لیا۔ اس کی کمر کے زخم سے خون کا بہاؤ ہنوز جاری تھا اور آنکھیں بند تھیں لیکن وہ دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا۔ میرو نے اس کی نبض چیک کی۔ نبض کی رفتار بھی بے حد سست تھی۔

''راستے میں کوئی اسپتال پڑے تو اس پر گاڑی روک لینا۔'' کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس نے ڈرائیونگ کرنے والے کو حکم دیا۔ اس وقت ان کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کا تعاقب نہیں کیا گیا تھا اور وہ اطمینان سے سفر کر رہے تھے۔

''اسپتال.....؟'' ڈرائیور کو شاید ملنے والے حکم کا یقین نہیں آیا اس لیے حیرت سے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں اسپتال..... باس کی حالت بہت خراب ہے۔ کسی اسپتال پہنچ گیا تو شاید بچ جائے ورنہ ہم تو کچھ نہیں کر پائیں گے۔'' میرو نے اسے جواب دیا اور خود ہونٹ چبانے لگا۔ اسے اس لمحے پر افسوس تھا جب وہ باذل کا حکم مان کر اس کے ساتھ عرفان اللہ کے گھر چل پڑا تھا۔ وہ لوگ اچھے بھلے حملہ آوروں سے بچ کر محفوظ ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ حالات سازگار ہونے تک وہیں دبکے رہتے اور پھر موقع دیکھ کر جو کچھ کرنا ہوتا، کرتے لیکن غصے میں پاگل ہوتا باذل کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ وہ فوری طور پر عرفان اللہ سے حساب کتاب کرنا چاہتا تھا۔ ابتدا میں سب کچھ آسان بھی ثابت ہوا تھا لیکن پھر اچانک معاملات بگڑ گئے تھے اور وہ بہ مشکل ہی وہاں سے اپنی جان بچا کر فرار ہو سکے تھے۔ وہ تو اس بات پر ہی شکر ادا کر رہا تھا کہ اپنے ساتھ ہینڈ گرینیڈ لے کر نکلا تھا ورنہ کہانی ختم تھی۔

''لیکن اسپتال جا کر تو ہم خود بھی پھنس جائیں گے۔ موجودہ حالات میں تو ہمارے سر پر کسی کا ہاتھ بھی نہیں ہے۔'' ڈرائیور اب بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔

''ہم اسپتال نہیں جائیں گے۔ بس باس کو اسپتال کے سامنے ڈال کر خود نکل جائیں گے۔ قسمت اچھی ہوئی تو اسپتال والے رحم کھا کر اس کا ٹریٹمنٹ کر دیں گے۔ ہم ان حالات میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔'' میرو خود تناؤ کا شکار تھا لیکن وہ یہ بالکل صحیح کہہ رہا تھا کہ ان حالات میں اس کے بس میں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھا۔ عرفان اللہ کی چھپر چھاؤں سے نکلنے کے بعد وہ پہلے ہی بے آسرا ہو گئے تھے اور اب یہ بھی نہیں پتا تھا کہ کتنے ساتھی زندہ ہیں اور کتنے مارے جا چکے ہیں۔ زندہ بچ جانے والوں میں سے کچھ اِدھر اُدھر بکھر جاتے اور کچھ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے۔ پولیس کے ہتھے چڑھ جانے والے خطرہ ثابت ہو سکتے تھے کہ ان کے ذریعے بچے کھچے ٹھکانے بھی پولیس کی نظر میں آ جاتے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ پہلے اپنی بقا کی فکر کی جاتی۔

''اس روٹ پر کوئی سرکاری اسپتال تو نہیں پڑے گا، ہاں ایک پرائیویٹ اسپتال ہے۔ کیا وہاں گاڑی روک لوں؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''روک لینا۔ جب قسمت کو ہی آزمانا ہے تو کیا سرکاری، کیا پرائیویٹ۔'' میرو نے ایک آہ سی بھری اور باذل کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جس زخم نے اس کے چہرے کو اتنا بھیانک بنا دیا تھا وہ اس کی نوعیت نہیں سمجھ سکا تھا۔ رخسار اور جبڑے کی ہڈی اس طرح چھدی ہوئی تھی جیسے کوئی گولی آر پار ہو گئی ہو لیکن گولی کے زخم کی طرح متاثرہ حصوں سے خون نہیں بہہ رہا تھا اور جلنے جیسے آثار تھے۔ اس کی زندگی ہتھیاروں کے ساتھ گزری تھی لیکن اس نے کبھی ایسا کوئی ہتھیار نہیں دیکھا تھا جس کا زخم اس نوعیت کا ہو۔ ہاں لیزر گن وغیرہ کے بارے میں سنا ضرور تھا اور اس زخم کو دیکھ کر یہی سوچ رہا تھا کہ باذل پر ایسا ہی کوئی ہتھیار استعمال کیا گیا ہے۔ عرفان اللہ کی کوٹھی میں ایسا انوکھا ہتھیار کس کے پاس ہوگا؟ اس کے لیے یہ سوال اپنی جگہ ایک معما تھا کیونکہ وہ صوفیہ اور اس کی اصلیت سے واقف ہی نہیں تھا۔

''تیار ہو جاؤ۔ اسپتال بس آ گیا ہے۔ میں اسپتال کے گیٹ کے قریب اسپیڈ کم کر دوں گا۔ تم جلدی سے اپنا کام نمٹا لینا۔'' ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کی آواز نے اس کی توجہ باذل پر سے ہٹائی اور ایک ہنکارا بھر کر خود چوکنا ہو بیٹھا۔ دروازے کا لاک بھی پہلے سے ہی کھول لیا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا، باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

www.pklibrary.com

جیوتی نے ساونت سے شادی کر کے کوئی گناہ نہیں کیا تھا لیکن جیوتی کے سارے کٹم قبیلے نے اس شادی پر ناک بھوں چڑھا کر اس شادی پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ ایک طویل عرصے تک جیوتی نے میکے میں قدم نہیں رکھا لیکن پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد جب جیوتی بھری گود سے ماں باپ کے دروازے پر پہنچی تو ان کی محبت بھی جوش میں آئی اور دونوں نے بیٹی اور نواسے کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس ملاپ کے بعد جیوتی اپنے بچے پرشانت کو لے کر ہر مہینے ایک

تشنہ لب

آصفہ ضیا احمد

ازل سے لالچ کے ہاتھوں انسان، انسانیت کی تذلیل کرتا آیا ہے مگر... قدرت کی چکّی بھی ہمیشہ اپنا حساب برابر کرتی رہی ہے... اس کے باوجود نہ لالچ پیچھا چھوڑتا ہے اور نہ ہی عذاب الٰہی کا خوف کسی کو ہوتا ہے... سب کے ذہن میں ایک ہی بات گردش کرتی ہے کہ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا اور پھر ایک لمحہ وقت کی آمد کا ایسا اعلان کرتا ہے کہ ساری دیدہ دلیری دھری رہ جاتی ہے...

دو جمع دو پانچ کرنے والے عیار مجرم کا

الشا حساب

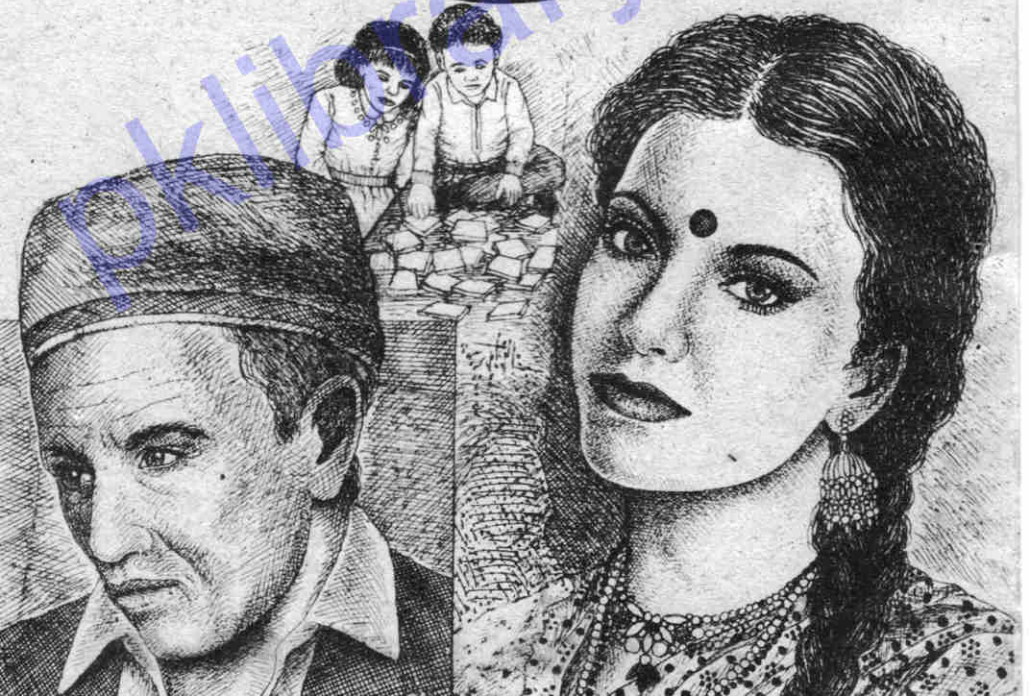

www.pklibrary.com

دو چکر ضرور لگا لیتی۔

ساونت سسرال والوں کی نظر اچھی طرح پہچانتا تھا اس لیے وہ کم ہی آتا جاتا تھا۔ البتہ ننھا پرشانت نانا، نانی سے اس قدر مانوس ہو چکا تھا کہ ان دونوں سے دوری اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس لیے جب جیوتی کا دوبارہ پیر بھاری ہوا تو اس نے مستقل طور پر پرشانت کو ماں باپ کے حوالے کر دیا۔ دونوں پتی پتنی اس گل گوتھنے سے کھلونے کو پا کر نہال ہو گئے کیونکہ ان کے سُونے گھر میں برسوں سے کوئی قلقاری گونجی تھی اور نہ گہوارہ ہلا تھا۔

ان کے اپنے اکلوتے بیٹے نے شادی کر کے پردیس بسا لیا تھا۔ ماں باپ دل تھام کر رہ گئے۔ پوتا پوتی کھلانے کی امنگ دل ہی دل میں دم توڑ گئی۔ نواسے کو پا کر دونوں کے پژمردہ چہروں پر بہار آ گئی۔ پرشانت کے ساتھ کھیلتے کھلاتے وقت اس طرح گزرا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ تخیال میں پرشانت کے عیش ہی عیش تھے۔ جوں جوں عمر بڑھی اور اسے شعور آیا، وہ مکمل طور پر کشوری ناتھ اور پدماوتی کے گلے کا ہار بن گیا۔ شاذ و نادر ہی ماں باپ کے پاس جاتا۔ ددھیالی رشتے داروں سے اسے کوئی اُنس نہیں تھا۔

اس کی جب اسکول جانے کی عمر ہوئی تب جیوتی نے بہت چاہا کہ اپنے بچے کو واپس لے جائے لیکن اس کے لیے نہ پرشانت رضامند ہوا اور نہ نانا، نانی تیار ہوئے کیونکہ وہ دونوں کی آنکھوں کا تارا تھا۔

کشوری ناتھ نے شہر کے بہترین اسکول میں اس کا داخلہ کروایا۔ کشوری ناتھ کا ڈرائیور روزانہ کار سے پرشانت کو اسکول چھوڑ کر آتا اور چھٹی ہونے پر اسے پک کر لیتا لیکن پرشانت نے دیکھا کہ اس کے وہ سارے سنگی ساتھی جو اس کے ساتھ کھیلتے کودتے ہیں، وہ وین میں اسکول آتے جاتے ہیں تو وہ مچل گیا اور اس کی بال ہٹ (بچے کی ضد) کے سامنے کشوری ناتھ اور پدماوتی نے گھٹنے ٹیک دیے۔ اس طرح وہ وین سے آنے جانے لگا۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ اب پرشانت پانچویں کلاس میں پہنچ چکا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن مونیکا بھی اسی اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کے تعلیمی اخراجات بھی کشوری ناتھ ہی برداشت کرتے تھے کیونکہ ساگرمتی میموریل اسکول ایک پرائیویٹ اسکول تھا۔ ساونت جو کہ ایک مالیاتی ادارے میں کلرک تھا، اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنی اولاد کو یہاں پڑھواتا۔ وہ تو کشوری ناتھ نے دونوں بچوں کی ذمے داری لے کر جیوتی کے سر سے بھاری بوجھ اتار دیا۔ جیوتی بہت خوش تھی کہ اس کے باپ نے بھلے ہی اسے جائداد میں سے کوئی حصہ نہیں دیا لیکن اس کے دونوں بچے شہر کے اعلیٰ ترین اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ اس کے جینے کے لیے یہی سہارا کافی تھا۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی، تنگدستی اور کشمکشِ زندگی نے اسے نڈھال کر دیا تھا لیکن کبھی ماں باپ کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے اور نہ کبھی ساونت نے ساس سسر سے کوئی ڈیمانڈ کی۔ ہاں البتہ ساونت کے ماں باپ اور بہنیں موقع محل دیکھ کر دل کا غبار ضرور نکالتے۔ کشوری ناتھ کی بے پناہ پراپرٹی دیکھ کر ان کے سینے پر سانپ لوٹ جاتے۔ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی ان کا اپنا خون تو کنگال ہی رہا۔

☆☆☆

وہ گرمیوں کی ایک صبح تھی۔ روشن، چمکیلی اور قدرے حرارت آمیز۔ بچوں کے سالانہ امتحانات قریب تھے۔ پرشانت اپنے صاف ستھرے یونیفارم میں ملبوس اپنا اسکول بیگ تھامے ہوئے وین کے ہارن پر باہر نکلا تو نانا نانی نے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے گڈ بائے کہا اور ملازم نے اس کا بیگ سنبھالتے ہوئے اس کی انگلی پکڑی اور دونوں وین کی طرف بڑھ گئے۔ جب تک وین نظر آتی رہی، کشوری ناتھ اور پدماوتی جاتی ہوئی وین کو دیکھتے رہے۔ دونوں کی آنکھوں میں محبت کا اتھاہ سمندر موجزن تھا۔

وہ دونوں آہستہ روی سے چلتے ہوئے ناشتے کی میز پر آئے اور ناشتا کرنے لگے۔ اسی اثناء میں کشوری ناتھ کا موبائل گنگنانے لگا۔ کشوری ناتھ نے کپ ایک طرف رکھتے ہوئے ''ہیلو'' کہا اور پھر معاً ان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے لرزیدہ آواز میں بولے۔

''تم کہاں سے بول رہے ہو..... یہ سب کیسے ہوا..... کب ہوا؟''

شوہر کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر پدماوتی کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے گھبرا کر استفسار کیا۔ ''اے سیٹھ جی! کیا ہوا؟ مجھے بھی تو کچھ بتائیے۔ کیا مزدوروں نے پھر ہڑتال کر دی ہے؟ ضرور کوئی اشبھ سماچار ہے۔''

کشوری ناتھ کے چہرے پر فکر و تردد کے سائے لہرا رہے تھے۔ لمحاتی توقف کے بعد اس کی سوچ میں ڈوبی

www.pklibrary.com

ہوئی آواز ابھری۔ ''جیوتی کی ماں! بڑے آپتی کا سامنا ہے۔ کسی نے پرشانت کو کڈنیپ کرلیا ہے۔ وین کے ڈرائیور کا فون تھا۔ کڈنیپر نے وین میں بیٹھے ہوئے سارے بچوں کو چھوڑ کر صرف پرشانت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ ڈرائیور کو بھی مارا پیٹا ہے۔ اسے بھی چوٹیں آئی ہیں۔''

پدماوتی یہ ساری کتھا سن کر صوفے پر ایسی گری کہ اپنے حواس ہی کھو بیٹھی۔ کشوری ناتھ نے سہارا دے کر بیوی کو بیڈ پر لٹایا اور گھر میں کام کرنے والی ملازمہ گائتری کو پکارا۔

''یہ بے ہوش ہوگئی ہے۔ ذرا اسے سنبھالنا اور ڈاکٹر پانڈے کو بھی کال کر کے بلا لینا۔ میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔''

گائتری نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور پدماوتی کے چہرے پر پانی کا چھڑکاؤ کرنے لگی۔ پدماوتی فوراً ہوش میں آگئی۔ آنکھیں کھول کر اس نے شوہر کی جانب دیکھا تو کشوری ناتھ نے قریب آکر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ''تھینک گاڈ! فوراً ہی تمہاری طبیعت میں سدھار آگیا۔ اب میں بے فکری سے باہر جا سکوں گا۔''

پدما نے اداس نظروں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے گلوگیر آواز میں جواباً کہا۔ ''آپ ابھی کہیں نہیں جایئے گا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔''

کشوری ناتھ پُرتشویش نظروں سے بیوی کو دیکھنے لگے۔ اُس کے بعد اپنا موبائل اٹھا کر اس میں انسپکٹر راکیش دت کا نمبر تلاش کرنے لگے۔ انسپکٹر دت آن لائن تھا۔ اس نے ''ہیلو'' کہتے ہوئے فوراً آواز پہچان لی اور لمحاتی توقف کے بعد کہا۔

''غالباً آپ کشوری ناتھ جی بول رہے ہیں؟''

کشوری ناتھ نے انسپکٹر کی یادداشت کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''تقریباً چار سال بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے ہمکلام ہیں لیکن اس کے باوجود آپ نے مجھے پہچاننے میں دیر نہیں کی۔''

انسپکٹر بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''شری مان جی! اسی کی تو روٹی کھاتے ہیں۔ نہ صرف اپنے آپ کو چاق و چوبند رکھنا پڑتا ہے بلکہ دل و دماغ میں بھی آوازیں اور حرکات و سکنات کو محفوظ رکھنا پڑتا ہے۔ ویسے بتایئے مجھے کیوں یاد کیا؟''

کشوری ناتھ نے پرشانت کے اغوا کا واقعہ سناتے ہوئے اس سے مدد کی درخواست کی۔ انسپکٹر نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ ''فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں سیٹھ جی! اگر یہ کیس ہمارے علاقے میں ہوا ہے تو پھر یہ میرے ہی کھاتے میں آئے گا اور اگر کسی اور پولیس اسٹیشن پر رپورٹ درج ہوتی ہے تو میں اپنے طور پر تفتیش کر کے مجرم کو اس کے انجام تک ضرور پہنچاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ رہا۔''

انسپکٹر سے بات کر کے کشوری ناتھ قدرے مطمئن نظر آرہے تھے۔

☆☆☆

انسپکٹر دت جب اپنے آفس پہنچا تو وہاں پرشانت کے اغوا کا کیس اس کا منتظر تھا۔ چند اہم اور ضروری امور سے فارغ ہونے کے بعد اس نے فوراً جائے وقوعہ کا معائنہ کیا۔ اپنی عقابی نظروں سے اس نے اس سڑک کا پورے طور سے جائزہ لیا۔ اس راستے پر آمد و رفت اتنی زیادہ نہیں تھی۔ بقول ڈرائیور کے، اس وقت سڑک پر دور دور تک کوئی نہیں تھا۔

جوں ہی انسپکٹر کو ڈرائیور کا خیال آیا، اس نے سٹی اسپتال کا رخ کیا۔ ڈرائیور سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد بھی اسے کوئی کلیو نہیں ملا۔ اس نے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ ''ناگن کی طرح لہراتی صاف و شفاف روڈ پر بڑا سا سیاہ نکیلا پتھر رکھا ہوا تھا۔ مجھے بات سمجھ میں آرہی تھی کہ دانستہ رکھا گیا ہے مگر میں یہ سمجھا کہ شریر اور بدتمیز لڑکے ہم ڈرائیور لوگوں کو ستانے اور پریشان کرنے کے لیے اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں اس لیے میں نے گاڑی کو بریک لگایا اور پتھر ہٹانے کے لیے نیچے اترا اور اپنی پوری قوت سے پتھر لڑھکانے لگا کہ دفعتاً عقب میں مجھے بچوں کے شور و غل بلکہ چیخنے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں برق رفتاری سے بھاگا ہوا وین کی جانب دوڑا لیکن اتنی دیر میں دو لحیم شحیم نقاب پوش نوجوانوں نے پرشانت کو اپنی بانہوں میں بھر کر اپنی گاڑی کی طرف دوڑ لگا دی۔ ان کے تعاقب میں، میں بھی دوڑا لیکن میں ناکام رہا کیونکہ وہ دو تھے اور ان کے جسم بتا رہے تھے کہ وہ ورزش کے عادی ہیں۔ ایک نقاب پوش نے پرشانت کو سنبھالا اور دوسرے نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔''

انسپکٹر دت نے اسے تسلی دیتے ہوئے بات ختم کر دی کیونکہ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ کس اذیت سے گزر رہا ہے۔ اس نے کڈنیپر کی گاڑی کا نمبر دریافت کرنا چاہا لیکن اس وقت اسے اپنا سوال انتہائی نامناسب لگا۔ اس لیے اس

www.pklibrary.com

نے دلاسے کے چند بول، بول کر تھانے کی راہ لی۔ وہاں اس کا اسسٹنٹ بانکے رام اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ دت نے الماری سے کچھ فائلز نکلوائیں اور اسے الٹ پلٹ کرتا رہا۔ بانکے رام بغور اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ بالآخر اس نے سوال کر ہی ڈالا۔ ''سر! اس وقت آپ ان فائلوں میں کسے کھوج رہے ہیں؟''

دت نے اپنا چشمہ اتار کر ایک جانب رکھا۔ اس کے چہرے پر فکر اور تشویش کے سائے تھے۔ کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ''دراصل ڈرائیور کے بیان کے مطابق ایک پہلوان نما جوڑی کو ڈھونڈ رہا ہوں جو کسرتی بدن کے مالک ہیں اور عمریں بھی زیادہ نہیں ہیں۔ عالمِ شباب ہے اس لیے جسموں میں پارہ بھرا ہوا ہے۔ چند لمحوں میں ان کی کامیابی کا راز یہی ہے۔''

انسپکٹر دت کے جواب پر بانکے رام نے ایک لمبی ہنکاری بھری اور بولا۔ ''سر! شنکر شمبھو، رتن دیپ، جیت اور سامن، یہ ہیں تو سہی لیکن یہ سارے گئے وقتوں کے ہیروز ہیں۔ اب تو ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں بلکہ لائف کیا گزار رہے ہیں، لائف انہیں گزار رہی ہے۔''

دت نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری بات سے سو فیصد متفق ہوں۔'' اس نے بانکے رام کو الماری میں فائلز رکھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''تم ذرا یہاں کے معاملات سنبھال لینا، میں کشوری ناتھ کے گھر جا رہا ہوں۔''

''او کے سر'' کہتے ہوئے بانکے رام نے سیلیوٹ مارا اور دت تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کشوری ناتھ کی رہائش گاہ پر آنے جانے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ انسپکٹر کے لیے یہ صورتِ حال انتہائی پریشان کن اور غیر تسلی بخش تھی۔ اسے اس بات کا پکا یقین تھا کہ آنے جانے والوں کے اس ہجوم میں مجرم بھی شامل ہوتا ہے اور بہت آسانی سے وہ تمام سراغ کو نیست و نابود کر دیتا ہے جو اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

چونکہ اغوا کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی اس لیے سارے سگے سمبندھی، اپنے پرائے، جانے انجانے، سب ہی جمع تھے لیکن انسپکٹر کی وردی دیکھ کر سارا مجمع تتر بتر ہو گیا۔ جب سارے اڑن چھو ہو گئے تو دت نے اپنی کارروائی شروع کی۔ اس نے شروعات کشوری ناتھ سے ہی کی لیکن انہوں نے وہی کچھ بتایا جو اب تک فون پر بتا چکے تھے۔

پدماوتی بول کم رہی تھیں اور جو کچھ بول رہی تھیں، وہ ان کی آہ و زاری میں انسپکٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہ مشکل انہوں نے ہچکیوں، سسکیوں کے درمیان اتنا کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! جوانی راجا اور اپنی ستری کے آگے تو ہم آنکھ نہیں اٹھا پا رہے ہیں۔ ان دونوں کے جگر کا ٹکڑا اور ہم اس کی رکھشا نہیں کر پائے۔ ہائے او پر والے، یہ کیا انیائے ہے جو نہ کرتے ہوئے بھی ہم چور بن گئے۔''

پدماوتی کے آنسوؤں کی برسات ذرا تھمی تو انسپکٹر نے فوراً دوسرا سوال داغ دیا۔ ''یہ بتائیے سیٹھانی جی! یہ بچہ، پرشانت اکلوتی اولاد ہے آپ کی بیٹی اور داماد کی؟''

پدماوتی نے نشو سے اپنا چہرہ صاف کیا، گلاس اٹھا کر دو گھونٹ پانی پیا اور بولا۔ ''نہیں انسپکٹر صاحب! ایک بیٹی بھی ہے۔ پرشانت سے چھوٹی ہے، مونیکا نام ہے اس کا۔''

''ہوں۔'' انسپکٹر نے ہنکاری بھری اور انہیں جانے کا اشارہ کیا۔ وہ ہانپتی کانپتی اپنے پہاڑ جیسے جسم کو لے کر کمرے سے نکل گئی۔ انسپکٹر ہر ایک کو باری باری بلوا رہا تھا۔ اب نمبر تھا جیوتی کا جس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ اس کی حالت دیکھ کر انسپکٹر بھی متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔ تابڑ توڑ سوالات کرنے کے بجائے اس نے انتہائی ملائمت کے ساتھ پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے تو جیوتی کو اس بات کا یقین دلایا کہ ''آپ کے بیٹے کو اغوا کرنے کا مقصد ہی دراصل یہ ہے کہ بچے کا نانا چونکہ ایک دھنوان اور دولت مند شخص ہے اور بچہ ان کی آنکھوں کا تارا ہے اس لیے تاوان میں موٹی رقم وصول کی جائے۔ آپ دیکھیے گا، وہ آپ کے بچے کے ناخن کو بھی دھکا نہیں پہنچائیں گے۔ جوں ہی کڈنیپر کی کوئی فون کال آتی ہے، ہم اپنا کام شروع کر دیں گے۔ آپ اطمینان رکھیے۔ آپ کے بچے کو تلاش کر کے بالکل صحیح و سالم آپ کے حوالے کریں گے۔''

انسپکٹر کے الفاظ جیوتی کے لیے آبِ حیات ثابت ہوئے اور اس میں زبردست تغیر آیا۔ اس نے بالکل نارمل لہجے میں انسپکٹر کا شکریہ ادا کیا اور بولی۔ ''ڈیڈی بھی آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے کہ آپ ایک فرض شناس اور دیانت دار آفیسر ہیں۔ آج سے چار سال قبل ڈیڈی کے دفتر میں ہونے والی چوری اور مزدوروں میں خلفشار پھیلانے والے مجرموں کی بھی آپ نے ہی نشاندہی کی تھی اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچایا تھا۔''

دت نے انکساری سے کام لیتے ہوئے مسکراتے

www.pklibrary.com

ہوئے کہا۔ ''ارے یہ کشوری ناتھ جی کا بڑا پن ہے ورنہ میں کس قابل ہوں۔'' پھر فوراً ہی اس نے اپنے سوالات کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے جیوتی کے ماضی کو کھنگالا۔ اس نے میٹرک کس اسکول سے کیا؟ گریجویشن کہاں سے کیا؟ ساونت سے ملاقات کب اور کس طرح ہوئی؟ سسرال والے کیسے ہیں، کتنے افراد پر مشتمل ہیں؟ ان لوگوں کا رویہ کیسا ہے اس کے اور بچوں کے ساتھ؟ بحیثیت شوہر ساونت اس کے ساتھ کیسے رہتا ہے؟ گھر کے مالی اور معاشی حالات کس رخ جا رہے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

جیوتی نے انتہائی سادہ لوحی اور سچائی کے ساتھ اس کے تمام سوالات کے جوابات دیے۔ ''رانی لکشمی بائی اسکول سے میں نے میٹرک کیا۔ جگ دمبا کالج سے گریجویشن کیا اور اسی جگہ میری ساونت سے ملاقات ہوئی۔ ان ہی ملاقاتوں کے دوران میں نے فیصلہ کیا کہ ساونت سے اچھا لائف پارٹنر مجھے مل ہی نہیں سکتا حالانکہ ممی ڈیڈی نے مجھے بہت روکا لیکن میں نے اپنی مرضی سے اپنا جیون ساتھی چنا۔ ساونت نے بھی ہر ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ اس نے ڈیڈی کی دولت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کا اندر باہر شیشے کی طرح صاف ہے۔ کہتے ہیں کہ شادی کے بعد پیار کم ہو جاتا ہے لیکن شادی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ ہم دونوں آج بھی ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ میرے ماتا پتا اور اس کے ماں باپ، دونوں نے بہت چاہا کہ ہم دونوں علیحدہ ہو جائیں لیکن سب کی کوششیں بیکار گئیں۔ سسرال والے بھی بس گزارے لائق ہیں۔ بہت اچھے بھی نہیں، بہت بُرے بھی نہیں۔ ان لوگوں کا رویہ بھی میرے اور بچوں کے ساتھ نیوٹرل ہے۔ سر آنکھوں پر بھی نہیں بٹھاتے اور نفرت سے ٹھوکریں بھی نہیں مارتے۔ چونکہ ساونت نے مجھے دل کے سنگھاسن پر بٹھا رکھا ہے اور یہ دونوں بچے بھی اس کے دل کے ٹکڑے ہیں اس لیے کوئی بھی ہمیں میلی نظر سے نہیں دیکھتا۔ گھر کے معاشی حالات پر تو انسپکٹر صاحب میں کوئی روشنی نہیں ڈالوں گی کیونکہ کمانے والا ایک اور کھانے والے دس، تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہاں کے حالات کیسے ہوں گے۔ وہ تو مکان نجی ملکیت ہے اس لیے گزارہ ہو رہا ہے۔ ساس، سسر اور میری ایک چھوٹی کنواری نند اوپر کی منزل میں رہتے ہیں۔ میں، ساونت اور میری بیٹی نیچے رہتے ہیں۔ پرشانت ممی ڈیڈی کے پاس رہتا ہے۔''

انسپکٹر دت نے اندازہ لگایا کہ جیوتی کافی سوجھ بوجھ والی اور ذہین عورت ہے۔

''آپ ایک حقیقت پسند اور باہمت خاتون ہیں۔'' انسپکٹر دت بے اختیار بول اٹھا۔

اپنی تعریف سن کر جیوتی بُری طرح شرما گئی۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے اس نے انسپکٹر سے سوال کر ڈالا۔ ''انسپکٹر صاحب! میرا بیٹا مل جائے گا ناں۔''

انسپکٹر نے اسے دوبارہ یقین دلاتے ہوئے دبنگ آواز میں کہا۔ ''جیوتی جی! آپ کا بیٹا بالکل سرکشت (محفوظ) ہوگا کیونکہ کڈنیپر جانتا ہے کہ بچے کو کچھ ہو گیا تو اس کا سارا کھیل بگڑ جائے گا۔'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے جیوتی سے پھر کہا۔ ''جیوتی جی! بس ایک آخری سوال اور پوچھنا چاہوں گا۔''

جیوتی ہمہ تن گوش بن گئی اور بولی۔ ''جی فرمایئے، کیا پوچھنا ہے آپ کو؟''

انسپکٹر بولا۔ ''سیٹھ صاحب کی کروڑوں کی جائداد ہے اور آپ ان کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ تو کیا اس میں آپ کا کوئی حصہ نہیں؟''

انسپکٹر کے اس سوال پر جیوتی نے یکدم خاموشی اختیار کی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے ایک سرد آہ بھری اور بولی۔ ''انسپکٹر صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میں اور میرا بڑا بھائی وشوا ناتھ، ہم دو بہن بھائی کشوری ناتھ کی سنتان ہیں لیکن بھیا حصول تعلیم کے لیے امریکا گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ ان کے بھی دو بچے ہیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ ڈیڈی بھیا سے بھی ناراض ہیں کیونکہ انہوں نے بھی اپنی پسند سے شادی کر لی اور میں نے بھی۔ وہ تو اپنی پراپرٹی کسی ٹرسٹ کو دینے والے تھے لیکن ممی نے انہیں بہت سمجھایا کہ ہماری اپنی اولاد کہاں جائے گی۔ بہرحال ڈیڈی راضی تو ہوئے ہیں کہ اپنی کل سمپتی کو ہم دونوں بہن بھائی میں بانٹ دی جائے لیکن جو بھی ہمارا حصہ بنے گا، وہ ہمیں ڈائریکٹ نہیں بلکہ ان ڈائریکٹ ملے گا۔''

انسپکٹر دت نے اپنی بھویں اچکائیں اور حیران کن نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ ڈائریکٹ ان ڈائریکٹ کا کیا چکر ہے؟ ذرا وضاحت کیجیے۔''

جیوتی نے واضح الفاظ میں اسے سمجھایا۔ ''انسپکٹر صاحب! ہم دونوں بہن بھائی کا حصہ ہماری سنتان کو ملے گا، جب وہ بالغ ہو جائیں گے۔ جب وہ اٹھارہ سال کے ہو جائیں گے تو آدھی جائداد میرے بھتیجا، بھتیجی اور آدھی

www.pklibrary.com

جائداد میرے بیٹا بیٹی کو منتقل ہوجائے گی۔ بس ہم یہ سوچ کر خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے بچوں کا مستقبل سنہری اور تابناک ہے۔ اب بھی میرے دونوں بچوں کے تعلیمی اخراجات، ڈیڈی ہی برداشت کررہے ہیں ورنہ ساونت کی قلیل آمدنی میں تو یہ سب ممکن ہی نہیں۔''

انسپکٹر دت نے مثبت انداز میں گردن کو جنبش دی اور بولا۔ ''اب آپ جاسکتی ہیں۔ مسٹر ساونت کو میرے پاس بھجوادیجیے۔''

جیوتی ''شکریہ'' کہتی ہوئی اپنی کرسی سے اٹھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ چند لمحوں بعد ہی ساونت اگروال، انسپکٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ بلند و بالا قد، مضبوط کاٹھی، سانولا نمکین چہرہ غرضیکہ مردانہ وجاہت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ دت دل ہی دل میں جیوتی کے انتخاب کی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکا۔ اس کے مقابلے میں جیوتی مدھم شکل وصورت کی حامل تھی۔ انسپکٹر نے تیز رفتاری کے ساتھ اس سے بھی چند ایک سوالات کیے اور اسے فوراً نمٹا دیا۔

اس نے بھی تقریباً وہی دہرایا جو جیوتی اس کے گوش گزار کرچکی تھی۔ کوئی نیا اور سنسنی خیز پوائنٹ انسپکٹر کو نہیں مل سکا۔ البتہ ساونت نے انتہائی بے بسی اور شاکی لہجے میں یہ ضرور کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! میرے پیرنٹس میرے اور میری پتنی کے لیے عذاب بن گئے ہیں۔ ان کی بس ایک ہی رٹ ہے، چاہے تمہیں پاتال میں ہی کیوں نہ جانا پڑ جائے، ہمیں ہمارا پوتا چاہیے۔ وہ ممی اور ڈیڈی کو دوشی مان رہے ہیں کہ انہوں نے ہی اپنے نواسے کو اغوا کروایا ہے تاکہ ہم لوگ پریشان ہوجائیں۔''

انسپکٹر دت اس کے ماتا پتا کے اس موقف پر ہنس پڑا۔ اس نے ساونت سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے ماتا پتا سے کھل کر اس موضوع پر بات کرے گا۔ ساونت کے ماں باپ کو انسپکٹر نے اکٹھا بلوالیا اور ساتھ ہی ان کی بیٹی آشا کو بھی بلوایا۔ آشا تو خاموش رہی لیکن ساونت کے ماتا پتا تو زبان سے گولہ باری کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے پولیس کی ایسی تیسی کی جو آٹھ گھنٹے گزرنے کے بعد بھی ان کے پوتے کی دھول کو بھی نہ پاسکے تھے۔

''جاہلوں کی سو باتوں کا جواب ایک خاموشی سے دیا جاتا ہے کیونکہ اسی میں عقلمندی پوشیدہ ہے۔'' اسی مقولے پر اس وقت انسپکٹر نے بھی عمل کیا۔ وہ دونوں جب بولتے بولتے تھک گئے تو خود ہی خاموش ہوگئے۔ انسپکٹر نے ان دونوں کو واپسی کا سگنل دیا تو دونوں متعجب نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ دونوں یہ سمجھ رہے تھے کہ پولیس والا ہے، وہ اپنی زبان میں ہمیں لتاڑے گا لیکن انسپکٹر کا رویہ دیکھ کر خود ہی اپنی جگہ سہم گئے اور اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کر یوں بھاگے کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

انسپکٹر نے آشا کو روکے رکھا تھا۔ آشا کچھ خوفزدہ لگ رہی تھی۔ انسپکٹر نے اس کا خوف اور وحشت دور کرنے کے لیے ہلکے پھلکے سوالات کیے۔ لڑکی کا ڈر اور تناؤ قدرے کم ہوا تو اس نے باتوں کے دوران بتایا کہ ''عنقریب اس کی شادی ہونے والی ہے۔ پچھلے ہفتے اس کی سسرال والے لگن کی تاریخ لینے آئے تھے۔ چونکہ اگلے مہینے کی چوبیس تاریخ پکی ہوگئی ہے اس لیے ماں، پتاجی اور بھیا بہت پریشان ہیں کیونکہ نہ چھدام نہ دھیلا پاس ہے نہیں اور اتنا بڑا کام آن پڑا ہے۔ ویسے بھیا نے کافی اطمینان دلایا ہے کہ ایک دوست نے قرض دینے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ اگر وقت پر پیسا دے دے گا تو شادی دھوم دھام سے کریں گے۔'' لڑکی کے لہجے میں حسرتیں اور امیدیں پوشیدہ تھیں۔ ''مرے پر سو درّے، میرے ماتا پتا اسٹریس کا شکار ہوگئے اس لیے آپ سے بدتمیزی کر بیٹھے۔''

اپنے ماں باپ کا رویہ دیکھ کر بھی وہ شرمسار تھی۔ معذرت خواہانہ انداز میں اس نے انسپکٹر سے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! میرے ماتا پتا کی پریشانی کا اصل کارن یہ ہے کہ ہمارے پرکھوں سے یہ چلا آرہا ہے کہ اولاد نرینہ صرف ایک ہوتی ہے۔ جیسے میرے پتاجی میرے دادا دادی کے ایک ہی بیٹے ہیں۔ اب میرا بھیا اکلوتا اور ہم تین بہنیں، دو بہنوں کی شادیاں ہوچکیں۔ اب پرشانت بھی اکلوتا ہے۔ اس کے بعد سندر تا ہے۔ اب اگر بھگوان کی کرپا سے اور سنتان ہوگی بھی تو وہ لڑکی ہی ہوگی۔ اس لیے ہمارا پورا پریوار اس مسئلے کی وجہ سے مایوسی اور تناؤ کا شکار ہے۔ اگر پرشانت نہیں ملا تو پھر بتایئے ہمارا کل ونش کس طرح آگے چلے گا۔''

انسپکٹر آشا کی منطق سن کر زیر لب مسکرایا اور بولا۔ ''اوپر والے کی دیا سے آپ کا کل ونش ضرور چلے گا۔ بس ہمیں حرکت میں آلینے دیں۔ آپ کا بہت شکریہ، اب آپ جاسکتی ہیں۔''

دس منٹ کے وقفے کے بعد انسپکٹر دت نے ملازمین سے پوچھ گچھ شروع کردی۔ غریب، ان پڑھ اور پریشان حال لوگ، پولیس کا نام سنتے ہی ان کی روح فنا ہوگئی۔ جو بھی ملازم انسپکٹر کے سامنے آیا، وہ اتنا حواس باختہ تھا کہ انسپکٹر سوال آم کرتا تو جواب املی ملتا۔ صرف مالی بابا جمال الدین

www.pklibrary.com

نے ہی اپنے اوسان خطا نہیں ہونے دیے۔ وہ پوری سمجھ داری سے پنے تلے انداز میں انسپکٹر سے گفتگو کرتا رہا۔ دوم گائتری دیوی تھی جس نے سوجھ بوجھ سے کام لے کر اپنی عقل استعمال کی اور نہایت سلجھے ہوئے انداز میں سوالات کے جوابات دیے۔

سب سے پہلے انسپکٹر نے گائتری دیوی سے اس کی رہائش کے بارے میں پوچھا۔ گائتری نے مراٹھی لب و لہجے میں جواب دیا۔ ''سر! گورکھا کالونی روڈ جو کچی آبادی آہے، وہیں می آنی می دون بستر رہتے آہے۔'' (جناب گورکھا کالونی کے قریب جو کچی آبادی ہے، وہیں میں اور میرے دونوں بیٹے رہتے ہیں)۔

انسپکٹر نے دوسرا سوال کیا۔ ''ماسی! تمہارے بیٹے پڑھتے ہیں؟''

گائتری نے جواب دیا۔ ''ناہیں ساب! ہنومان اکھاڑے میں کام بھی کرتے ہیں اور داؤ پیچ بھی سیکھتے ہیں۔ ابھی میگھنا پور کے میلے میں دونوں نے ٹرافی بھی جیتی تھی۔''

گائتری کے لہجے میں فخر اور خوشی کی جھلک تھی۔ انسپکٹر کا اگلا سوال تھا۔ ''سیٹھ جی کے گھر سے تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟''

گائتری نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولی۔ ''بس ساب جی! تین جنے ہیں۔ کاٹ کسر کر کے گزارہ کر لیتی ہوں۔ اوپر والے کی دیا سے سیٹھانی بہت خیال رکھتی ہیں۔ آپ ساب جی آپ سیٹھ جی اور سیٹھانی کو سمجھایئے کہ اگر.... ایہرن (اغوا) کرنے والے کچھ مانگتے ہیں تو لے دے کر معاملہ صاف کریں۔ اگر بھگوان نہ کریں بچے کو کچھ ہو گیا تو جیوتی مس ساب کو ان کے سسرال والے جینے نہیں دیں گے۔''

انسپکٹر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بالکل، بالکل۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ سیٹھ صاحب کو یہی مشورہ دوں۔'' پھر وہ چند لمحے سانس لینے کے لیے رکا اور بولا۔ ''ماسی! تمہارے پتی جیوت ہیں؟''

''ناہیں ساب! تین ورش پہلے ان کا دیہانت ہو گیا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''ہوں۔'' انسپکٹر نے ہنکارا بھرا پھر بولا۔ ''ماسی! تمہارے پتی کا نام؟''

''سمپت راؤ نام تھا جی ان کا۔''

انسپکٹر نے گائتری کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کے لیے کہا اور خود بھی اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ اپنے وہ تمام کاغذات سمیٹے جن پر وہ اپنے اہم پوائنٹس نوٹ کرتا رہا تھا۔ کشوری ناتھ سے ہاتھ ملا کر وہ اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ غور و فکر کے سمندر میں غوطہ زن ہے۔

☆☆☆

انسپکٹر دت بول رہا تھا اور بانکے رام کا قلم تیزی سے کاغذ پر پھسل رہا تھا۔ یہ دراصل کچھ نام تھے جنہوں نے انسپکٹر کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا کر دیے تھے۔ بانکے رام کو انسپکٹر نے خاص ہدایات دیتے ہوئے کہا کہ ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھی جائے۔ بانکے رام نے سب سے پہلے جمال الدین مالی کی خبر لی۔ جمال الدین تو اپنے کام پر جا چکا تھا لیکن اس کے محلے والوں نے بتایا کہ اتنا ہی بھلا مانس شخص ہے۔ ساری زندگی کنوارا رہا لیکن محلے کے بچوں سے بہت پیار کرتا ہے۔ بانکے رام نے جمال بابا کے نام پر کراس لگا دیا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے اس نے بیسیوں کی چھان پھٹک کی لیکن کوئی کارآمد بات برآمد نہیں ہوئی۔ سب سے آخر میں اس نے گائتری کا تعاقب کیا۔ کشوری ناتھ کے گھر کام ختم کر کے جب گائتری گھر سے نکلی تو بانکے رام اس کے پیچھے تھا۔ گائتری نے ایک جگہ رک کر ٹیکسی والے سے بات کی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوا ہو گئی اور بانکے رام بائیک پر سوار ہونے کے باوجود منہ تا کتا رہ گیا۔ کیونکہ سرخ بتی نے اشارہ دے دیا تھا۔

انسپکٹر دت کو تمام رپورٹ پیش کرنے کے بعد اس نے مؤدبانہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''سر! میرے لیے اور کوئی حکم؟''

انسپکٹر نے پُرتفکر نظروں سے اسے بغور دیکھا اور بولا۔ ''ہاں، ایک خاص حکم لیکن اس کے لیے تمہیں اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کرنا پڑے گی۔ جن لوگوں کے میں نے تمہیں نام دیے ہیں اگر یہ کہیں اکٹھا نظر آتے ہیں تو ان کی فوٹوز بنانے میں تاخیر مت کرنا۔''

بانکے رام نے ''یس سر'' کہتے ہوئے سیلیوٹ مارا اور بولا۔ ''سر! جیوتی کے ساس سسر کی انکوائری نہیں.....''

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے دت بول اٹھا۔ ''تم ان کی فکر چھوڑو۔ جو گرجتے ہیں، وہ برستے نہیں۔ مجرم کوئی چھپا رستم ہے جو ہمیں بیوقوف سمجھ رہا ہے لیکن اسے پتا نہیں ہے کہ ہم بھی پکی گولیاں نہیں کھیلتے ہیں۔''

ابھی دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ دت کا موبائل بجنے لگا۔ دوسری جانب کشوری ناتھ بول رہے تھے۔ انہوں نے انسپکٹر کو یہ دھماکا خیز خبر سنائی کہ کڈنیپر نے دو کروڑ کی ڈیمانڈ رکھی ہے۔ ڈیلنگ کس جگہ ہوگی، ابھی نام نہیں بتایا۔ انسپکٹر کا دورانِ خون تیز ہو گیا اور چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ

www.pklibrary.com

سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''سیٹھ جی! آپ فکر ہی نہ کریں۔ میرے ہاتھ میں اس الجھی گتھی کا ایک سرا آگیا ہے۔ یہ ننھا سا سراغ ہی ہمیں کامیابی تک پہنچائے گا۔ آپ یہ بتائیے گڈ نیچر کا اگلا فون کب آئے گا؟''

''کل صبح گیارہ بجے۔'' کشوری ناتھ نے جواب دیا۔

''بس تو ٹھیک ہے۔ میں آپ کے اردگرد ہی رہوں گا لیکن اگر اس دوران وہ پھر کال کرتا ہے تو پلیز ایک بار آپ اپنے نواسے سے ضرور بات کریں اور بچے سے کیا پوچھنا ہے، یہ میں نے آپ کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔''

کشوری ناتھ نے تائیدی انداز میں سر ہلا کر جواباً کہا۔ ''جی بالکل، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔''

انسپکٹر دت کا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ رات دس بجے کشوری ناتھ کو پھر کال موصول ہوئی۔ تیز اور بلند و بالا آواز میں کہا گیا۔ ''سنو ذرا دھیان سے۔ پولیس کو اگر ہوا بھی لگی تو ہم تمہارے نواسے کا قیمہ بنا کر تمہارے دروازے پر رکھ جائیں گے۔''

کشوری ناتھ زور سے چلّائے۔ ''نہیں، نہیں۔ بھگوان کے لیے تم ایسا مت کرنا۔ بس تم جگہ بتادو۔ میں تمہاری مطلوبہ رقم لے کر حاضر ہوجاؤں گا۔'' لہجے میں حد درجہ لجاجت تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کشوری ناتھ رو پڑے گا۔

مخالف سمت بولنے والا اور شیر بن گیا اور غراتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے سنا ہے تم لوگوں نے پولیس سے سازباز کرلی ہے۔''

کشوری ناتھ نے بات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔ ''نہ..... نہ..... نہ۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں کوئی غلط اطلاع ملی ہے۔ بس پرشانت کے اغوا کے بعد انسپکٹر اور چند پولیس والے محض خانہ پری کرنے کے لیے آئے تھے۔ اس کے بعد تو یوں لگتا ہے، سارے پولیس والے سو گئے اور..... اور تم سے ایک بات کرنی ہے۔ میری بیٹی جو پرشانت کی ماں ہے، وہ پرشانت کے لیے تڑپ رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ پرشانت کی آواز سن لے تاکہ اس کے دل کو ڈھارس بندھ جائے۔''

چند لمحوں کے لیے مکمل سناٹا چھا گیا جبکہ کشوری ناتھ مسلسل ''ہیلو، ہیلو'' کی گردان کررہا تھا۔

''ابے خاموش ہوجا، کرواتا ہوں بات لیکن دس منٹ سے زیادہ نہیں۔''

کشوری ناتھ نے وہیں سے جیوتی کو آواز دی اور سرگوشیانہ لہجے میں بیٹی سے کہا۔ ''تمہیں یاد ہے نا... کیا پوچھنا ہے؟''

جیوتی نے معنی خیز انداز میں آنکھیں گھمائیں اور بیتابی سے باپ کے ہاتھ سے موبائل لے کر بے قراری سے بولی۔ ''ہیلو پرشانت! میرے بچے، کیسے ہو تم؟'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اب وہ باقاعدہ رو رہی تھی۔

کشوری ناتھ نے زور سے بیٹی کا ہاتھ دبایا اور اپنی آواز دباتے ہوئے بولا۔ ''ضروری سوالات کرو، ہری اپ۔''

جیوتی فوراً ہوش میں آگئی اور اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''میرے بچے! تجھے ان لوگوں نے بھوکا تو نہیں رکھا نا...؟ تیرے کھانے پینے کا خیال رکھتے ہیں نا...؟''

پرشانت کا بھی دل بھرا ہوا تھا، بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مما! بریک فاسٹ تو نانی ماں نے کروا دیا تھا۔ گائتری ماسی نے جو لنچ بکس تیار کرکے دیا تھا، وہ اسکول بیگ میں تھا اور بیگ وین میں ہی رہ گیا۔ لنچ مجھے کافی لیٹ ملا لیکن ہر چیز کا ٹیسٹ بہت اچھا تھا۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے ہماری ماسی بناتی ہے۔ مجھے خوب بھوک لگی تھی۔ میں کھانا کھا کر سو گیا تھا۔ ابھی جاگا ہوں۔ جو بھیا میرے لیے ڈنر لائے تھے نا... انہوں نے ہی جگایا ہے۔ مما! آپ پریشان نہ ہوں۔ بھیا نے مجھے کہا ہے کہ وہ مجھے جلد ہی نانو کے گھر پر چھوڑ آئیں گے۔''

جیوتی نے ایک پُرسکون سانس لی اور پھر بیٹے سے استفسار کیا۔ ''پرشانت! وہاں سے تمہیں کچھ نظر آتا ہے؟''

''مما! ہرے ہرے کھیت نظر آتے ہیں۔ بہت دوری پر جانور چرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ رات میں کھڑکی کھلی رہتی ہے اس لیے نیلا آکاش اور جگمگ جگمگ تارے نظر.....'' اچانک ایک کلک کے ساتھ رابطہ منقطع ہوگیا۔

کشوری ناتھ نے من وعن سب کچھ انسپکٹر دت کو سنا دیا۔ سب کچھ سننے کے بعد انسپکٹر غور و فکر کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا اور اب اس کا چہرہ اس بات کی غمازی کررہا تھا کہ اس غوطہ زنی سے وہ ایسے موتی چن کر لایا ہے جس سے اس کے لیے ترقی اور مزید کامیابی کے دروازے کھل جائیں گے۔ ایک نئے عزم اور ہمت کے ساتھ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ فون پر بانکے رام سے محوِ گفتگو تھا۔

☆☆☆

گائتری جوں ہی سیٹھ کشوری ناتھ کے گھر سے کام نمٹا کر باہر نکلی، متلاشی نظروں سے ٹیکسی اور رکشا کھوجنے لگی پھر مایوس ہوکر پیدل ہی چل پڑی۔ اچانک ایک ٹیکسی اس کے قریب آکر رکی اور ڈرائیور نے اپنی کیپ سرکاتے ہوئے بھاری آواز میں کہا۔ ''کہاں جانا ہے بہن جی؟''

www.pklibrary.com

گائتری نے ایک پُرسکون سانس لی اور بولی۔
''ارے بھیا، جانا ذرا دور ہے مگر منہ مانگے پیسے دوں گی۔''
ڈرائیور خوش ہوگیا اور بولا۔ ''بس بس، بیٹھ بھی جاؤ دیوی جی۔ جہاں کہو گی، آرام سے پہنچا دوں گا۔''
گائتری نے دروازہ کھولا اور دھم سے پسنجر سیٹ پر براجمان ہوکر بولی۔ ''بھیا! گلاب گڑھ جانا ہے۔ بس دیو مالا بلڈنگ پر اتار دینا۔''
ڈرائیور فرطِ حیرت سے آنکھیں پھیلا کر بولا۔ ''اوہو، ماں کسم آپ سے وعدہ کرلیا ورنہ وہ علاقہ تو بہت دور ہے۔ کافی لمبا رن کا ٹنا پڑے گا۔''
گائتری جز بز ہوکر کھردرے لہجے میں بولی۔
''ارے تو کہا نا... کہ من چاہے پیسے دوں گی۔ خوش ہوجائے گا تو اور تیرا سارا پریوار۔''
''چلو، تو پھر ٹھیک ہے۔'' ڈرائیور یوں خوش ہوکر بولا جیسے اسے ہفتِ اقلیم کی دولت ہاتھ آگئی ہو۔ ٹیکسی اب ہوا سے باتیں کررہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ڈرائیور کو کچھ زیادہ ہی جلدی ہے۔ ایک دھچکے کے ساتھ جب ٹیکسی دیو مالا پلازا کے سامنے رکی تو گائتری خوش ہوگئی۔ اس کی توقع کے خلاف وہ وقت سے پہلے اپنی منزل پر پہنچ گئی تھی۔ اس نے فوراً اپنے خاکستری بالوں کا جوڑا کھولا اور اس میں سے ایک ننھا سا پرس نکال کر ہزار ہزار کے دو نوٹ نکال کر ڈرائیور کی جانب بڑھائے۔
ڈرائیور آنکھیں پھاڑ کر نوٹوں کو تکنے لگا اور پھر پھرتی سے اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں ڈال لیے اور... بہ عجلت استفسار کیا۔ ''بہن جی! اگر واپس جانا چاہو تو میری ٹیکسی حاضر ہے۔ جس طرح اڑن کھٹولے پر اڑتا ہوا لایا ہوں، اسی طرح پل کے پل میں پہنچا بھی دوں گا۔''
گائتری نے دوبارہ اپنے بالوں کا جوڑا بنایا اور بولی۔ ''ارے بھیا! واپسی کب ہوگی، کتنے بجے ہوگی؟ کچھ کہہ نہیں سکتی کیونکہ جن مہاشئے سے ملنا ہے، وہ پتا نہیں کب تک یہاں پہنچے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ٹیکسی سے اتر پڑی اور پھر نظریں گھماتے ہوئے اضطراری لہجے میں بولی۔ ''اے لو، بڑی لمبی عمر یا ہے۔ وہ دیکھو سامنے ہی کھڑت ہے۔ چل بھائی! واپسی بھی تیرے ساتھ ہی ہوگی۔ بس تجھے آدھ گھنٹا انتظار کرنا پڑے گا۔''
''میں راجی کھشی کھڑا رہوں گا۔ بس تم جلدی سے اسی جگہ آجانا۔''
گائتری لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''ارے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ اکتوبر 2023ء
کی جھلکیاں

آخری خلش
عالمی شہرت یافتہ ناول نگار کی حیرت انگیز سوانح حیات جسے پڑھ کر آپ بھی حیران رہ جائیں گے

چاکلیٹی ہیرو
اس معروف شخصیت کی دلچسپ داستان جس پر لڑکیاں واری بلہاری جاتی تھیں

دوہرا چہرہ
اس کے دو چہرے تھے، ایک آگے اور دوسرا پیچھے۔ پہلا چہرہ شفقت کا پرتو اور دوسرا چہرہ شیطانی

بے قدری
ایسی سچ بیانی کہ آپ سوچنے پر مجبور ہوجائیں۔ ہمارا معاشرہ کس رخ پر چل پڑا ہے۔

اس کے علاوہ
ندیم اقبال کا دلچسپ سفرنامہ
سمندروں پار اک جزیرہ
غلام قادر کی طویل کہانی ریگ رواں کا
آخری حصہ..... اور بھی بہت سی سچ بیانیاں، سچے واقعات جو سرگزشت کی پہچان ہیں

www.pklibrary.com

بس یہ سامنے پارک نظر آرہا ہے نا.... وہیں بیٹھ کر ہم دونوں باتیں کریں گے اور ٹیم (ٹائم) سے پہلے ہی آجاؤں گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے چل پڑی۔

جو شخص اس کا منتظر تھا، اس نے بھی لمبے لمبے ڈگ مارے اور پارک میں داخل ہوگیا۔ دونوں ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے ایک سنگی بینچ پر بیٹھ گئے۔ سارے جہاں سے بے خبر وہ سر جوڑ کر باتیں کررہے تھے۔ انہیں اس بات کا بھی ہوش نہیں تھا کہ قریب ہی جھاڑ جھنکاڑ میں بیٹھا ایک شخص نہ صرف ان کی ساری باتیں سن رہا ہے بلکہ اپنے جیبی ٹیپ ریکارڈر میں لفظ بہ لفظ ریکارڈ بھی کررہا ہے۔

☆☆☆

انسپکٹر دت اور بانکے رام کی ایک اہم میٹنگ جاری تھی۔ کافی دیر بعد دت نے ایک آسودہ سانس لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ کہیں جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ بانکے رام بھی فوراً کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ''سر! کیا میں گھر جاسکتا.....''

اس کا جملہ دت نے اچک لیا اور بولا۔ ''نہیں، تمہیں میرے ساتھ گلاب گڑھ چلنا ہے۔''

اب دونوں گلاب گڑھ کی جانب رواں دواں تھے۔

وہاں سے واپسی پر انسپکٹر نے فوراً سیٹھ کشوری ناتھ کو کال ملائی اور بولا۔ ''سیٹھ جی! کل دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا لیکن رازداری شرط ہے۔ گھر میں آپ اپنی شریمتی جی اور اپنی ستری کو بھی کوئی ہوا نہ لگنے دینا ورنہ اغوا کار بچے کو ادھر اُدھر نہ کردے اور اہم بات یہ ہے کہ تفتیش کے دوران میں نے جن لوگوں سے پوچھ گچھ کی تھی، ان تمام صاحبان کی موجودگی ضروری ہے۔ آپ کے گھر کے تمام افراد، آپ کے تمام نوکر چاکر اور آپ کا سمدھیانہ، اس کے علاوہ باہر کا کوئی فرد نہیں ہونا چاہیے۔''

کشوری ناتھ نے انسپکٹر کی پوری بات سننے کے بعد استفسار کیا۔ ''لیکن انسپکٹر صاحب! اگر کوئی شہر سے باہر گیا ہے تو پھر میں کیا کرسکتا ہوں؟''

انسپکٹر نے مطمئن لہجے میں جواباً کہا۔ ''کوئی کہیں نہیں گیا کیونکہ میں نے اسی دن سب پر یہ پابندی لگادی تھی کہ جب تک کیس کا انکاس نہ ہوجائے، کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔'' یہ کہتے ہوئے انسپکٹر نے رابطہ ختم کردیا۔

☆☆☆

کشوری ناتھ کے ویل ڈیکوریٹڈ ڈرائنگ روم میں تمام لوگ صوفوں پر براجمان تھے۔ ملازمین گُربہ قدمی سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سب ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ معاً سناٹے میں گاڑی رکنے کی آواز آئی اور سب اپنی اپنی جگہ پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔

انسپکٹر دت پولیس وردی میں ملبوس پُروقار چال چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس کے عقب میں بانکے رام تھا جو پرشانت کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ پرشانت کی نظر جیسے ہی کشوری ناتھ کے چہرے پر پڑی، اس نے بانکے رام کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور والہانہ انداز میں دوڑتے ہوئے نانا سے لپٹ گیا۔

بیک وقت کمرے میں موجود تمام لوگوں کی آواز ایک ساتھ ابھری۔ ''پرشانت آگیا، پرشانت آگیا۔'' جیوتی دیوانہ وار دوڑتی ہوئی آئی اور پرشانت کو لپٹا کر اس کے انگ انگ کو چومنے لگی۔ اس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ اس پر نیم بے ہوشی کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ مسز کشوری ناتھ نے جیوتی کو سنبھالتے ہوئے گائتری کو آواز لگائی۔ ''اری گائتری! ذرا میری بچی کو تو سنبھال۔''

انسپکٹر دت نے سخت اور چبھتے ہوئے لہجے میں ایک کرارا جملہ کسا اور بولا۔ ''سیٹھانی جی! اب بھی آپ گائتری کو نہیں سمجھ سکیں۔''

گائتری پہلے ہی بوکھلائی ہوئی تھی۔ انسپکٹر کی بات سن کر چہرہ مزید زرد پڑ گیا اور وہ وہاں سے بھاگنے کا راستہ تلاش کرنے لگی لیکن ایک لیڈی انسپکٹر نے اپنے مضبوط ہاتھ سے اس کی گردن پکڑی اور ایک زوردار طمانچہ لگایا۔

گائتری بین کرنے کے انداز میں زاروقطار رونے لگی اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ..... وہ صاحب میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے..... مجھے تو..... مجھے تو.....'' یہ کہتے ہوئے وہ کشوری ناتھ کے قدموں میں گر گئی۔

کشوری ناتھ نے اسے ایک ٹھوکر لگائی اور کہا۔ ''نمک حرام! میں نے اور میری پتنی نے آنکھیں بند کرکے تجھ پر بھروسا کیا اور تُو نے ہمارا ہی کلیجا نوچ ڈالا۔ نکل جا یہاں سے۔ میری نظروں سے دور ہوجا۔''

انسپکٹر دت نے سرد اور سپاٹ نظروں سے موجود لوگوں کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''سیٹھ صاحب! یہ تو آپ کی ادنیٰ ملازمہ ہے۔ یہ تو چلی جائے گی لیکن جو اس سارے معاملے کا ماسٹر مائنڈ ہے، وہ تو آپ کا اپنا ہے۔''

انسپکٹر کی بات سن کر سب کے ذہنوں میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ سب کی پُرتجسس نظریں انسپکٹر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ سیٹھانی نے مضطرب لہجے میں سوال کیا۔ ''کون

www.pklibrary.com

اپنا..... میں سمجھی نہیں انسپکٹر صاحب! ذرا وضاحت کیجیے۔"

انسپکٹر دت پلٹا اور اپنے آہنی پنجے سے ساونت کے گریبان کو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا اور کشوری ناتھ کے سامنے لا کھڑا کیا اور بولا۔ "یہ رہا آپ کا اصل مجرم۔"

ساونت کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ کنپٹیاں پھڑک رہی تھیں۔ اس کے ماں باپ اور بہن کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ہر شخص سے حیران نظروں سے تک رہا تھا اور جیوتی کی آنکھوں کی طغیانی مزید بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

انسپکٹر دت نے بولنا شروع کیا۔ "سیٹھ جی! مجھے گائتری پر شک اس وقت ہوا جب آپ نے بتایا کہ آپ کا نواسا یہ کہہ رہا ہے کہ کھانے کا مزہ بالکل ایسا ہے جیسے گائتری ماسی نے پکایا ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس سے پہلے مجھے گائتری یہ بتا چکی تھی کہ اس کے دو بیٹے ہیں اور دونوں کا تعلق ہنومان اکھاڑے سے ہے تو فوراً مجھے وین ڈرائیور کا بیان یاد آ گیا کہ وین سے پرشانت کو اٹھانے والے دو کسرتی بدن کے نوجوان تھے۔ میں نے اپنے طور پر ہنومان اکھاڑے جا کر انکوائری کی تو پتا چلا کہ وہ دونوں گائتری کے بیٹے ہیں۔ گائتری کے تعاقب میں، میں نے اپنے ایک آدمی کو لگا دیا جس کا نام بانکے رام ہے۔ بانکے رام نے بروقت مجھے ایسی رپورٹ لا کر دی جس سے پرشانت کو بازیاب کروانا آسان ہو گیا۔ آپ کے داماد نے جب دیکھا کہ جیوتی سے شادی کرنے کے بعد بھی آپ نے ایک پھوٹی کوڑی کا دان دکھشنا نہیں کیا بلکہ یہ کہہ کر بات آگے بڑھا دی کہ میں اپنی جائداد اپنے نواسی نواسے اور پوتا پوتی میں بٹوارہ کروں گا تو ساونت کو پتنگے لگ گئے۔ بہن کی شادی کے لیے اسے پیسے کی اشد ضرورت تھی۔ اسے سب سے سرل اور سمپل مارگ یہی نظر آیا کہ اپنے ہی بیٹے کا اپہرن کر کے سیٹھ جی سے موٹی رقم وصول کی جائے۔ اس کے لیے اس کی نظر انتخاب گائتری پر پڑی اور گائتری کے دونوں بیٹوں کو دیکھ کر تو اس کے منہ میں پانی آ گیا اور اس نے رقم کا لالچ دے کر تینوں کو اپنا آلۂ کار بنایا اور مکمل تیاری کے بعد پرشانت کو اغوا کر کے گلاب گڑھ میں ایک کمرا کرائے پر لے کر بچے کو وہاں رکھا اور گائتری سے کھانا بنوا کر اس کے بیٹوں کے ہاتھ بھجواتا۔ گائتری کے دونوں بیٹے پرشانت کے لیے قطعاً اجنبی تھے اس لیے بے فکری کے ساتھ دونوں کو ہاکی کا نشان بنایا۔ بذاتِ خود اور گائتری کبھی بھی بچے کے سامنے نہیں آئے۔"

انسپکٹر جوں ہی خاموش ہوا، ساونت نے وہاں سے بھاگنے کے لیے ایک لمبی جمپ لگائی۔ لیکن اس سے پہلے جھکائی دے کر بانکے رام نے اسے دبوچ لیا۔ گائتری اور ساونت کو اپنی تحویل میں لینے کے بعد گائتری کے ہٹے کٹے بیٹوں کو بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا۔ ساونت دھن دولت کے اس سمندر سے ایک قطرہ بھی نہیں حاصل کر سکا۔ اس کی تشنہ لبی اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔

واپسی پر بانکے رام نے انسپکٹر دت کو غور سے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "سر! کیا واقعی بچے کے ایک جملے کی وجہ سے آپ اصل مجرم تک پہنچ سکے؟"

انسپکٹر دت نے فوراً کہا۔ "کون سا جملہ؟"

"ارے وہی، کھانا بالکل گائتری ماسی کے ہاتھوں کا لگتا ہے۔"

انسپکٹر، بانکے رام کی اس بات پر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ "ہاں، اس جملے سے کیس حل کرنے میں بڑی مدد ملی بلکہ ہمیں لوکیشن کا بھی پتا چل گیا اور اس طرح گائتری اور اس کے دونوں بیٹے ہماری نظروں میں آ گئے لیکن دراصل میں چونکا اس وقت جب میں نے پہلی بار ساونت کو دیکھا۔ ہینڈسم، خوبرو اور قد آور شخصیت کا مالک جبکہ جیوتی کالی، سانولی ایک عام سی معمولی شکل کی لڑکی۔ دونوں کی جوڑی کچھ عجیب سی نہیں لگتی۔ پھر میں نے سوچا کہ آخر ساونت کو جیوتی میں ایسی کون سی چیز اچھی لگی جو اسے جیون ساتھی بنا بیٹھا تو فوراً میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کیا کہ دولت، دولت اور صرف دولت..... اور یہیں سے میں نے ساونت پر نظر رکھنی شروع کی اور تمہیں بھی خبردار کیا کہ ان میں کوئی شہر چھوڑ کر جانے نہ پائے۔ سیٹھ جی اور ان کے خاندان کے سامنے میں نے یہ نکتہ اس لیے بیان نہیں کیا کہ وہ لڑکی جیوتی مزید ٹوٹ کر بکھر جاتی۔"

بانکے رام نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور انسپکٹر کو پُرستائش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہاں سر! یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ اب بھی وہ غریب یہی سمجھ رہی ہے کہ بہن کی شادی کے لیے پیسے کی ضرورت تھی اس لیے ساونت نے یہ کام کیا ورنہ ساونت تو اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے۔"

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بالکل ٹھیک سمجھے۔"

دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے مگر شاید دونوں کے ذہنوں میں یہی بات گردش کر رہی تھی کہ انسان نے رشتے ناتوں کو پیروں تلے روند کر دھن دولت کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

اندھیر نگری

مرزا امجد بیگ

کبھی کبھی بعض چہروں پر اتنی ملمع کاری ہوتی ہے کہ ہمدرد ہی درد دینے کا سبب بن جاتے ہیں اور افسوس کا پہلو یہ کہ ان کی پہچان بھی بہت آخر میں ہوتی ہے... تب تک انسان اپنی قیمتی متاع لُٹا چکا ہوتا ہے... اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کی بدلتی آنکھوں اور پھرے ہوئے رویّوں کا سامنا کرتے ہوئے بھی وہ یقین و بے یقینی کی کیفیت سے دوچار رہتا ہے کیونکہ ان ہمدردوں کو اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ ان کی کہیں بھی شنوائی نہیں ہوگی اور جناب اسی کو کہتے ہیں... اندھیر نگری اور چوپٹ راج۔

کمزور انسانوں کی بے چارگی سے کھیلنے والے سفاک مجرم کا انجام

اس کیس میں میرا ڈبل رول تھا۔ میرے مؤکل کے معاملات اس قدر الجھے ہوئے بلکہ بگڑے ہوئے تھے کہ اسے اس بھنور سے نکالنے کے لیے مجھے بیک وقت وکیلِ صفائی اور وکیلِ استغاثہ کا کردار ادا کرنا تھا۔ میں اس عدالتی آزمائش میں کس طرح سرخرو ہوا، اس کا احوال کہانی کی صورت آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ ماہِ فروری کی ایک خنک اور خوشگوار صبح تھی۔ حسنِ اتفاق سے آج ہمارے کیس کا پہلا نمبر تھا۔ جج کرسیِ انصاف پر براجمان ہو چکا تو میں نے درخواستِ منتقلیِ مقدمہ اس کے سامنے رکھ دی۔

جج نے پوری توجہ سے اس درخواست کو پڑھا اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! لگتا ہے آپ اس عدالت کی کارکردگی سے خوش نہیں ہیں اسی لیے اپنے کیس کو دوسری عدالت میں منتقل کرنے کے خواہشمند ہیں۔''

''جنابِ عالی! بات میری خوشی کی نہیں بلکہ میرے پیشہ ورانہ اطمینان اور کلائنٹ کی آسانی کی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اپنی بات کی وضاحت کریں۔'' جج نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جنابِ عالی! کوئی بھی پریشان حال اور ضرورت مند شخص وکیل کی خدمات اس لیے حاصل کرتا ہے کہ اس کا

www.pklibrary.com

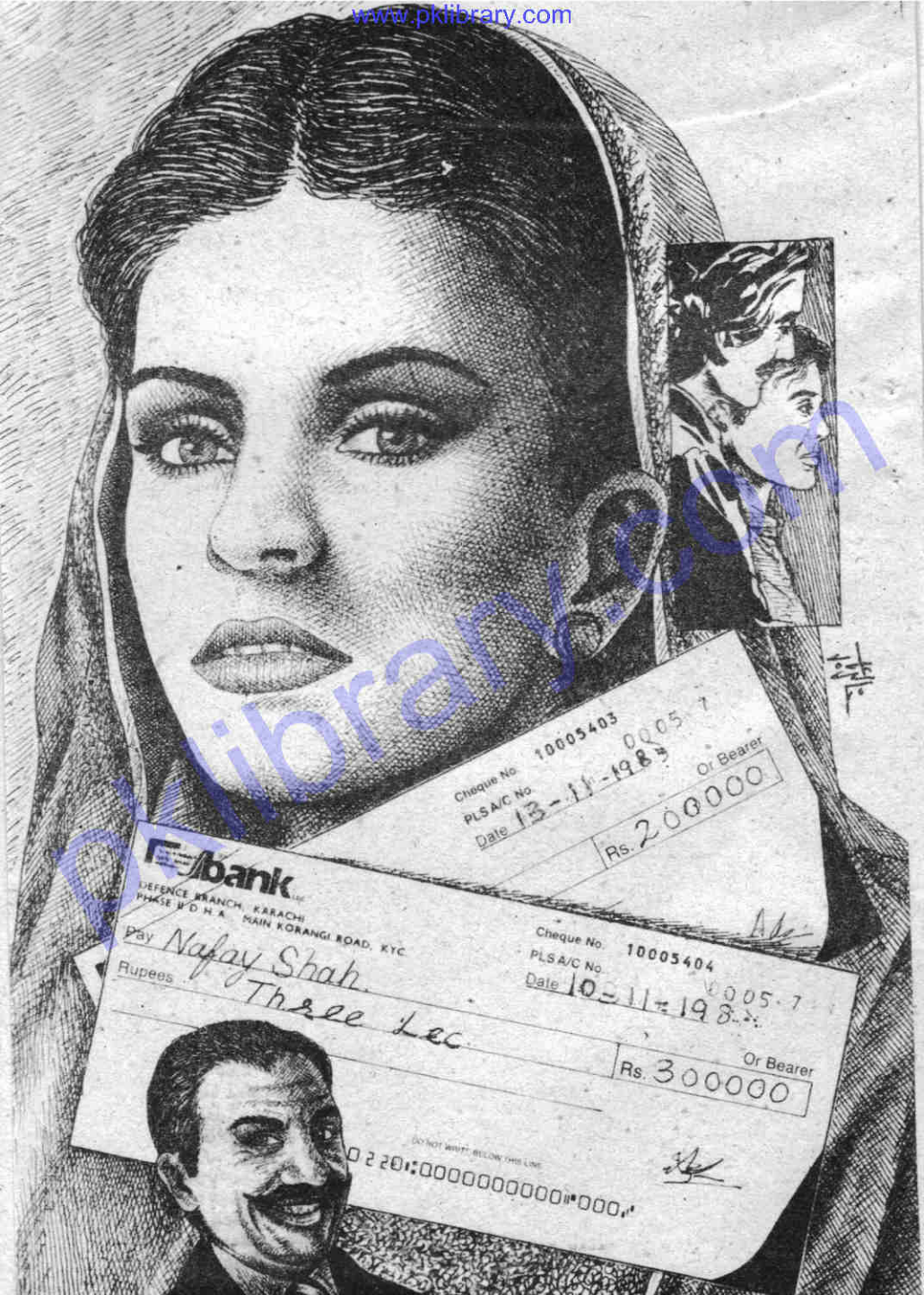

www.pklibrary.com

مسئلہ حل ہو۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''لگ بھگ دو ماہ پہلے میں نے اپنے مؤکل عمیر احمد کو انصاف دلانے کے لیے اس عدالت میں مقدمہ دائر کیا تھا۔ آپ نے اس کیس کی فائل کو پڑھ رکھا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک دھوکے باز شخص نے میرے مؤکل عمیر احمد کے پانچ لاکھ روپے دبا رکھے ہیں۔ زبانی کلامی تقاضوں اور منت خوشامد کے بعد بھی جب ملزم نافع شاہ میرے مؤکل کی رقم واپس کرنے کو تیار نہیں ہوا تو عمیر احمد نے میرے توسط سے اس عدالت میں کیس دائر کر دیا۔ اس کیس کے جواب میں ملزم نافع شاہ نے یہاں حاضر ہونے کے بجائے دوسری عدالت میں میرے مؤکل کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے۔'' میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پچھلے دو ماہ میں اس عدالت کی طرف سے ملزم نافع شاہ کو تین بار سمن جاری ہو چکا ہے لیکن وہ ایک مرتبہ بھی عدالت میں حاضر نہیں ہوا جبکہ دوسری عدالت میں وہ برابر جا رہا ہے۔ افسوس کہ سمن لے کر جانے والا بیلف عدالتی احکام کی تعمیل کرانے میں ناکام رہا ہے اسی لیے معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ اس کیس کو بھی اسی عدالت میں ٹرانسفر کر دیا جائے جہاں ملزم نافع شاہ نے میرے مؤکل عمیر احمد پر مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ موجودہ حالات میں میرے مؤکل کے ساتھ ڈبل زیادتی ہو رہی ہے..... ڈیٹس آل یور آنر!''

''ہوں.....!'' جج نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی اور مجھ سے سوال کیا۔ ''دوسری عدالت میں آپ کے مؤکل پر دائر مقدمے کی نوعیت کیا ہے؟''

''ملزم نافع شاہ کا دعویٰ ہے کہ میرے مؤکل عمیر احمد نے اس سے ایک ماہ کے لیے آٹھ لاکھ روپے ادھار لیے تھے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرے مؤکل نے ایک ماہ کے بعد پانچ لاکھ روپے حسب وعدہ نافع شاہ کو لوٹا دیے لیکن تین لاکھ ابھی تک میرے مؤکل کی طرف باقی ہیں۔ نافع شاہ نے اس عدالت سے درخواست کر رکھی ہے کہ اس کے تین لاکھ روپے مع ہرجانہ وغیرہ ہا اسے دلوائے جائیں۔ میرا مؤکل اس عدالت میں ایک مرتبہ جا چکا ہے لیکن سوئے اتفاق اس روز جج عدالت نہیں آیا تھا۔ میں نے یہ ساری تفصیل اس درخواست میں لکھ دی ہے۔''

جج نے مذکورہ درخواست پر نگاہ دوڑانے کے بعد معتدل انداز میں کہا۔ ''گویا اس عدالت کا ملزم اُس عدالت کا مدعی ہے اور اُس عدالت کا ملزم یہاں پر مدعی کی حیثیت کا حامل ہے۔''

''جی بالکل۔ یہی صورتِ حال ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''جناب عالی! اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ اس قضیے کو ایک عدالت تک محدود کر دیا جائے تاکہ جلد از جلد کوئی نتیجہ برآمد ہو سکے۔ میں سمجھتا ہوں اس طرح دونوں عدالتوں کا قیمتی وقت برباد ہونے سے بچ جائے گا۔ ایک کیس اگر دو حصوں میں بٹ جائے تو کسی فیصلے تک پہنچنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔''

''یہ عدالت.....!'' جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''آپ کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے دوسری عدالت میں منتقل کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ یہ عدالت سمجھتی ہے کہ اس کیس کا فوری فیصلہ اسی عدالت میں ہو سکتا ہے جہاں آپ کے ملزم نافع شاہ نے اپنے تین لاکھ روپے کی ریکوری کا مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ ان تین لاکھ روپوں کی ریکوری کا مطالبہ کر کے نافع شاہ یہ تسلیم کر چکا ہے کہ اس نے آپ کے مؤکل عمیر احمد سے پانچ لاکھ روپے لیے ہیں۔ امید ہے میرے پوائنٹ کو آپ نے پک کر لیا ہوگا؟''

''اسی پوائنٹ کی بنا پر تو میں نے اس کیس کو دوسری عدالت میں منتقل کرنے کی درخواست کی ہے جناب عالی!'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور ضروری کارروائی کے بعد مذکورہ درخواست میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آل دی بیسٹ!''

میں نے جج کا شکریہ ادا کیا اور ایک بلڈنگ کی سیڑھیاں اترنے کے بعد دوسری بلڈنگ کا رخ کیا۔ متعلقہ عدالت تک پہنچنے کے لیے مجھے پھر دو درجن زینے طے کر کے اوپر جانا پڑا۔ بہرحال میں نے اپنی فائل میں سے دونوں کیسوں کو مرج (ضم) کرنے والی درخواست نکال کر اس کے ساتھ دوسری عدالت کے جج کی منظور شدہ درخواست کو منسلک کرنے کے بعد اس عدالت میں دائر کر دیا۔

کم و بیش ایک گھنٹے بعد مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ اب یہ کیس ایک ٹریک پر آ گیا تھا جس نے فریقین اور ان کے وکلاء کے لیے آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ امید تھی کہ یہ کیس جلد از جلد نمٹ جائے گا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو اس کیس کے پس منظر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی

www.pklibrary.com

کے دوران میں آپ کا ذہن کسی بڑی الجھن کا شکار نہ ہوجائے۔ چھوٹی موٹی ذہنی الجھن موجود رہنا تو ناگزیر ہے۔ اس سے ذہن کی نہ صرف ایکسرسائز ہوتی ہے بلکہ حالات وواقعات کی پیشکش کے اندر حد درجہ تجسس اور سنسنی خیزی بھی پیدا ہوجاتی ہے جو کورٹ روم (کمرائے عدالت) کا خاصہ بھی ہے۔

☆☆☆

میرا مؤکل عمیر احمد پیشے کے اعتبار سے ایک ڈاکٹر تھا۔ اس کی عمر چالیس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک دراز قامت اور مائل بہ فربہی بدن کا مالک تھا۔ اس کی رنگت گندمی اور سر کے بال آمادۂ بغاوت تھے یعنی ان میں ''پت جھڑ'' کا عمل شروع ہوچکا تھا۔ عمیر احمد کی فیملی میں اس کی بیوی اور تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ان کے بیچ میں ایک چلبلی بیٹی۔ انہیں ہر لحاظ سے ایک ''ہیپی فیملی'' کہا جاسکتا تھا۔

اس شاد کام گھرانے کی زندگی میں اس وقت بھونچال آگیا جب ایک روز عمیر کی چھوٹی بہن شازیہ نے اس سے ایک درخواست کی۔

''بھائی جان! کیا آپ ایک ہفتے کے لیے مجھے پانچ لاکھ روپے ادھار دے سکتے ہیں؟''

شازیہ کی عمر پینتیس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک بیوہ عورت تھی اور شوہر کے انتقال کے بعد بھی وہ اپنی سسرال ہی میں رہائش پذیر تھی۔ اس کا ایک دس سالہ بیٹا بھی تھا جس کا شمار ''اسپیشل بچوں'' میں ہوتا تھا۔ عمیر گاہے بہ گاہے اپنی بیوی سے چھپا کر شازیہ کی مالی مدد کرتا رہتا تھا جو کہ ہزار، دو ہزار سے زیادہ رقم نہیں ہوا کرتی تھی لیکن جب شازیہ نے اس سے پانچ لاکھ روپے ادھار کی بات کی تو وہ پریشان ہوگیا۔

''شازیہ! ایسی کیا ضرورت آن پڑی ہے؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔ ''پانچ لاکھ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ تمہیں اچانک اتنے پیسوں کی ضرورت کیوں ہے اور وہ بھی صرف ایک ہفتے کے لیے؟ پلیز، مجھے کھل کر بتاؤ۔''

یہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس وقت پانچ لاکھ روپے واقعتاً ایک تگڑی رقم سمجھی جاتی تھی کیونکہ اس اماؤنٹ میں ایسا لگژری اپارٹمنٹ بہ آسانی خریدا جاسکتا تھا آج جس کی مارکیٹ ویلیو دو کروڑ سے بھی اوپر ہے۔

''میری سسرال میں ایک صاحب کا اکثر آنا جانا ہے۔ ان کا نام نافع شاہ ہے۔'' شازیہ نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''میرے مرحوم شوہر سے بھی شاہ صاحب کی اچھی دعا سلام تھی۔ شاہ جی ایک کاروباری انسان ہیں۔ وہ مختلف اشیا کی ٹریڈنگ کرکے خوب پیسا کماتے ہیں۔ دو روز پہلے وہ میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ چینی کا ایک بڑا اسٹاک خریدنے جارہے ہیں کیونکہ آگے چل کر چینی کے دام بہت زیادہ بڑھنے والے ہیں۔ اس اسٹاک کو اٹھانے کے لیے جتنی رقم درکار ہے، اس میں پانچ لاکھ روپے کم پڑ رہے ہیں۔ شاہ جی نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر میں ایک ہفتے کے لیے کہیں سے پانچ لاکھ کا بندوبست کردوں تو وہ ٹھیک ایک ہفتے کے بعد نہ صرف اصل زر مجھے واپس کردیں گے بلکہ اس رقم پر دس ہزار روپے منافع الگ سے دیں گے....''

''کیا نافع شاہ کسی شوگر مل کا سودا کرنے جارہا ہے؟'' عمیر نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں۔'' انہوں نے اسی قسم کی بات کی تھی لیکن میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔'' شازیہ نے متذبذب انداز میں جواب دیا اور کہا۔ ''بھائی جان! دس ہزار روپے کی آمدنی کوئی چھوٹی آمدنی نہیں ہے اور وہ بھی صرف سات یوم میں۔ اگر آپ میرے لیے پانچ لاکھ کا انتظام کردیں تو ہم منافع کی رقم کو آپس میں بانٹ لیں گے۔ پانچ ہزار میرے، پانچ ہزار آپ کے۔''

شازیہ نے اپنے بھائی جان یعنی میرے مؤکل عمیر احمد کو جو کہانی سنائی، اس کے مطابق نافع شاہ ایک ہفتے میں پانچ لاکھ کی رقم پر دو فیصد کے حساب سے شازیہ کو دس ہزار روپے منافع دینے کی بات کررہا تھا۔ اگرچہ راتوں رات دولت کمانے والی یہ کتھا عمیر کو پوری طرح ہضم نہیں ہوئی لیکن وہ شازیہ سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا اس لیے وہ اس کی بات ماننے کے لیے تیار ہوگیا۔

''مجھے منافع کا لالچ نہیں ہے شازیہ!'' عمیر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ دس ہزار روپے تم ہی رکھ لینا۔ اس سے تمہارا اور تمہارے بیٹے کا بھلا ہوجائے گا لیکن میں یکمشت تمہیں پانچ لاکھ روپے مہیا نہیں کرسکوں گا۔ میرے اکاؤنٹ میں اس وقت تین لاکھ روپے رکھے ہیں۔ میں تین لاکھ کا کراس چیک نافع شاہ کے نام بنادیتا ہوں۔ باقی کے دو لاکھ روپے میں چند روز میں ارینج کردوں گا۔''

شازیہ خوش ہوگئی۔ ''ٹھیک ہے بھائی جان! آپ ابھی مجھے تین لاکھ کا چیک بنادیں۔'' اس نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں یہ چیک کل شاہ جی کو دے دوں گی اور ان سے یہ بھی کہہ دوں گی کہ باقی کے دو لاکھ بھی چند روز میں

www.pklibrary.com

انہیں مل جائیں گے۔''

عمیر نے اپنی چھوٹی بہن کی محبت سے مجبور ہو کر نہ صرف اسی وقت نافع شاہ کے نام تین لاکھ روپے کا کراس چیک بنا دیا بلکہ اس کے تین دن بعد دوسرا دو لاکھ کا کراس چیک بھی شازیہ کے حوالے کر دیا۔ پہلے چیک کی طرح یہ بھی نافع شاہ ہی کے نام تھا۔ یہ دو لاکھ روپے عمیر نے اپنے ایک دوست سے ایک ماہ کے وعدے پر قرض لیے تھے۔ پہلے چیک پر دس نومبر کی تاریخ درج تھی جبکہ دوسرا چیک تیرہ نومبر کا تھا۔ یہ دونوں چیک علی الترتیب پندرہ اور سترہ نومبر کی تاریخوں میں کلیئر ہو گئے۔ کل ملا کر یہ پانچ لاکھ روپے ڈاکٹر عمیر کے اکاؤنٹ سے نافع شاہ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو گئے تھے۔

دوسرے چیک کے کلیئر ہونے کے ٹھیک دس دن بعد یعنی ستائیس نومبر کو شازیہ نے نافع شاہ کو اس کا وعدہ یاد دلایا۔

''شاہ جی! آپ نے ایک ہفتے کے بعد مجھے پانچ لاکھ دس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔'' اس نے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''اور اب تو دس دن گزر چکے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے یہ رقم اپنے بھائی سے ادھار لی تھی۔ اس سے پہلے کہ بھائی جان اپنے پیسوں کا تقاضا کریں، آپ وہ رقم لوٹا دیں پلیز!''

اب یہاں سے نافع شاہ ''ٹال مٹول'' کا عمل شروع کر دیتا ہے۔ اس نے بھولی بھالی شازیہ کو دولت (منافع) کا لالچ دے کر اپنی سودمند لچھے دار باتوں میں بہ آسانی پھنسا لیا تھا۔ اصل رقم یا اس پر منافع دینے کا اس کا ارادہ کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ ایک بدنیت اور دھوکے باز انسان تھا۔ جس طرح اس نے شازیہ اور شازیہ کے توسط سے ڈاکٹر عمیر کو ٹریپ کیا، یہ اس کا آزمودہ کار طریقۂ واردات تھا۔

''شازیہ! تم میری چھوٹی بہن کی طرح ہو۔'' نافع شاہ نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں ہمیشہ سے تمہارا خیر خواہ ہوں۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں نے چینی کی جو بڑی لاٹ اٹھائی تھی، وہ آگے ایک پارٹی کو فروخت کر دی ہے۔ ایک دو دن میں وہ پارٹی مجھے پیمنٹ کا چیک دے دے گی۔ ادھر وہ رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہوئی، اُدھر میں پانچ لاکھ دس ہزار روپے تمہیں ادا کر دوں گا۔''

''پکا نا.....؟'' شازیہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''ایک دم پکا۔''

''شکریہ شاہ جی!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ ''آج کل میں کافی پریشان رہنے لگی ہوں۔ مجھے آپ پر تو پورا بھروسا ہے لیکن پتا نہیں کیوں میرے دماغ میں الٹے سیدھے خیالات کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ میں نے کبھی اتنی بڑی رقم کا لین دین نہیں کیا اور..... یہ رقم میری اپنی بھی نہیں۔ آپ کو معلوم ہے میں نے یہ پانچ لاکھ روپے عمیر بھائی سے لے کر آپ کو دیے تھے۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔'' وہ سرسری لہجے میں بولا اور پوچھا۔ ''کیا ڈاکٹر صاحب نے تم سے رقم کا مطالبہ کیا ہے؟''

''ابھی تک تو بھائی جان نے اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔'' شازیہ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں نہیں چاہتی کہ ایسی کوئی نوبت آئے کہ انہیں مجھ سے اپنے پیسوں کا تقاضا کرنا پڑے۔ آپ میری پوزیشن کو سمجھ سکتے ہیں۔''

''میں تمہارے حالات سے بخوبی واقف ہوں شازیہ!'' وہ تسلی بھرے لہجے میں بولا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ آئندہ دو تین روز میں یہ معاملہ نمٹ جائے گا۔ میں تمہیں ڈاکٹر عمیر کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔ تم ایک کام کرو.....!''

بات کے اختتام پر اس نے شازیہ کو سوچتی ہوئی نظر سے دیکھا تو اس نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''کون سا کام شاہ جی؟''

''تم ڈاکٹر عمیر سے یہ پوچھ لو کہ پانچ لاکھ دس ہزار کا ایک ہی چیک بنانا ہے یا ان دو رقوم کے الگ الگ دو چیک؟'' نافع شاہ نے اپنے منصوبۂ دھوکا دہی کو کامیابی سے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ میں بھی کراس چیک ہی سے پیمنٹ کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کل بھائی جان سے پوچھ کر آپ کو بتا دوں گی۔'' شازیہ نے کہا۔

''ہاں، ایک بات اور.....!'' نافع شاہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر ڈاکٹر صاحب کہیں کہ دو چیک بنانا ہیں تو ان سے یہ ضرور پوچھنا کہ دس ہزار والا چیک ان کے نام کا بنانا ہے یا تمہارے نام کا؟''

''جی، میں سمجھ گئی۔'' شازیہ نے کہا۔

اسی رات شازیہ نے اس موضوع پر ڈاکٹر عمیر سے تفصیلی بات کی اور آئندہ روز نافع شاہ کو اپنے بھائی کے جواب سے آگاہ کر دیا۔

''شاہ جی!'' اس نے اپنے محسن نما دشمن کو بتایا۔ ''پانچ لاکھ والا چیک بھائی جان کے اکاؤنٹ میں جائے گا اور دس ہزار والا چیک میرے اکاؤنٹ میں۔ عمیر بھائی منافع کی رقم میں سے ایک روپیہ لینے کے بھی روادار نہیں

www.pklibrary.com

ہیں۔"

"ایسے عظیم اور ایثار پیشہ بھائی اللہ ہر بہن کو دے۔" نافع نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں دو روز کے لیے پارٹی سے پیمنٹ لینے لاہور جا رہا ہوں۔ اب ہماری ملاقات تین دن کے بعد ہوگی۔"

نافع شاہ نے شازیہ کو "جو بھی" سمجھانے کی کوشش کی، شازیہ نے اس سے کم سمجھا اور نہ ہی زیادہ۔ فراڈ شاہ کی بات کے جواب میں اس نے بس اتنا کہا۔

"ٹھیک ہے شاہ جی!"

یہ سب چونکہ ٹھیک نہیں تھا اس لیے چند روز کے بعد ان دونوں بھائی بہن پر بجلی سی گر گئی جب نافع شاہ نے انہیں ٹھینگا دکھاتے ہوئے واضح الفاظ میں یہ کہہ دیا۔

"میں نے تم لوگوں کا ایک روپیہ بھی نہیں دینا بلکہ ڈاکٹر عمیر میرا تین لاکھ کا مقروض ہے۔ اگر اس نے تین دن کے اندر میری رقم واپس نہیں کی تو میں اپنے پیسوں کی وصولی کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

اس واہیات صورتِ حال نے ڈاکٹر عمیر کا دماغ الٹا دیا۔ مہذب اور شائستہ انداز میں شروع ہونے والی وہ بات چیت طوفانِ بدتمیزی پر منتج ہوئی۔ اس موقع پر ڈاکٹر عمیر نے اس بدخصلت نافع شاہ کو دل کھول کر کھری کھری سنا ڈالی تھی۔

آگے عید سر پر کھڑی تھی۔ اس واقعے کی وجہ سے عمیر بہت زیادہ چڑچڑا ہو گیا تھا۔ ابھی تک اس نے اپنی بیوی کو اس "بیوقوفی" کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ قریبی یار دوستوں سے صلاح مشورہ جاری تھا۔ ان میں سے ہر ایک کی رائے دوسرے سے مختلف تھی۔ جو لوگ عدالت کا رخ کرنے کے حق میں تھے، وہ اپنے اس مشورے کی فیور میں مضبوط دلائل بھی رکھتے تھے اور جو یہ سمجھتے تھے کہ ڈوبے ہوئے پیسے دلوانا عدالتوں کے بس کا کام نہیں، وہ عمیر کو کیس کرنے سے روک رہے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ پانچ لاکھ تو جا ہی چکے ہیں۔ اگر اس رقم کی ریکوری کے لیے کسی وکیل کی خدمات حاصل کر کے عدالت سے رجوع کیا تو اس کیس پر آئے دن اور پیسے خرچ ہوتے رہیں گے۔ وکیل کی فیس اور اس کے دیگر فرمائشی اللّے تللّے اس کے علاوہ ہیں۔ عمیر کو اپنے پانچ لاکھ روپے وصول کرنے کے لیے پتا نہیں اور کتنے لاکھ روپے اس قضیے کی بھینٹ چڑھانا پڑیں گے۔ اس معاملے کی وجہ سے جس ذہنی تناؤ کا سامنا کرنا پڑے گا، وہ بہت تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت ہوگا۔ ان حالات میں وہ اپنے کلینک کا بھی نہیں رہے گا اور اگر کئی سال کی عدالتی چارہ جوئی کے بعد عمیر وہ مقدمہ جیت بھی گیا تو اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ نافع شاہ عدالتی حکم پر پانچ لاکھ کے کرارے نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دے گا۔ اس نوعیت کے ریکوری کیسز میں عدالت ملزم (ڈیفالٹر) پر دباؤ نہیں ڈال سکتی۔ اگر نافع شاہ نے خود کو مجبور اور لاچار ظاہر کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک ہزار روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں دے سکتا تو سمجھ لیں پانچ لاکھ روپے کی واگزاری، پانچ سو مہینوں یعنی ساڑھے اکتالیس سال میں ہو پائے گی اور وہ بھی اگر اس دوران میں نافع شاہ نے ایک ماہ بھی ناغہ نہ کیا تو۔ اس وقت ڈاکٹر عمیر احمد چالیس اور نافع شاہ پینتالیس سال سے اوپر کا تھا۔ اس حساب سے یہ امید نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ دونوں اپنی زندگی میں اس کیس سے جان چھڑا پائیں گے۔

عدالتی پروسیس کی یہ جو تفصیل بیان کی گئی ہے، یہ نہ تو صد فیصد سچ ہے اور نہ ہی صد فیصد جھوٹ۔ اس کارروائی کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ نمبر ایک، مظلوم کی مظلومیت اور ظالم کے ظلم کے ٹھوس ثبوت۔ نمبر دو، مظلوم کے وکیل کی قابلیت اور اس کی مظلوم کے ساتھ سچی ہمدردی۔ اگر تو یہ انحصاری دونوں اشیا موجود ہیں تو چند ماہ میں مظلوم کو اس کا حق مل جائے گا لیکن اگر مظلوم کا وکیل بونا اور بودا ہے تو پھر انصاف حاصل کرنے کے لیے مظلوم کی کئی نسلوں کو عدالت کے چکر لگانا پڑ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر عمیر کے جاننے والوں میں ایک دو افراد ایسے بھی تھے جو "لوہے کو لوہا کاٹتا ہے" کے فلسفے بلکہ اصول پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا مشورہ یہ تھا کہ نافع شاہ کوئی سیدھا اور شریف شخص نہیں ہے لہٰذا اس سے پانچ لاکھ روپے نکلوانے کے لیے ٹیڑھے اور غنڈا صفت لوگوں سے رجوع کرنا پڑے گا۔ وہ بھاری معاوضے (فٹی فٹی) پر چوبیس گھنٹے کے اندر نافع شاہ سے "وصولی" کر لیں گے۔

عمیر احمد اس لائن اور مزاج کا آدمی نہیں تھا کہ اپنی رقم کے حصول کے لیے وہ جرائم پیشہ افراد سے مدد لیتا اور وہ نافع شاہ کے دھوکے پر خاموش بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا چنانچہ وہ اپنے ایک شناسا مبین علی کے ساتھ میرے پاس آ گیا تھا۔ گویا اس نے انصاف حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں نے اس کی بپتا کو توجہ سے سنا۔ ڈاکٹر عمیر ایک معقول، سمجھ دار اور شریف النفس انسان تھا۔ نافع شاہ نے

www.pklibrary.com

اس کے ساتھ جو "ہاتھ" کیا تھا، وہ ٹھیک سے میری سمجھ میں بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ نے نافع شاہ کو اپنی بہن کے توسط سے جو پانچ لاکھ روپے دیے ہیں، اس ذیل میں کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس؟"

"میں اس حوالے سے تین ثبوت آپ کی خدمت میں پیش کرسکتا ہوں وکیل صاحب!" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "جن میں سے دو دستاویزی اور ایک شخصی ہے۔"

"بس اس کی تفصیل جاننا چاہوں گا۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔

اس نے اپنی بینک اسٹیٹمنٹ اور نافع شاہ کی دی ہوئی رسید میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ہیں دستاویزی ثبوت اور جہاں تک شخصی ثبوت کی بات ہے تو اس سلسلے میں میری چھوٹی بہن شازیہ کی گواہی مفید ثابت ہوسکتی ہے۔"

"بالکل!" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "پانچ لاکھ روپے کی لین دین کا معاملہ شازیہ کی ذات کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ وہ آپ کے حق میں ایک کارآمد گواہ ثابت ہوسکتی ہے۔ باقی جہاں تک دستاویزی ثبوت کی بات ہے تو ان میں بینک اسٹیٹمنٹ ہمارے کام آسکتی ہے کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے پندرہ نومبر کو تین لاکھ اور سترہ نومبر کو دو لاکھ آپ کے اکاؤنٹ سے بصورت کراس چیک نافع شاہ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کو جھٹلانا ممکن نہیں ہے لیکن.....!" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"میرے خیال میں دوسرا دستاویزی ثبوت یعنی نافع شاہ کی دی ہوئی پانچ لاکھ روپے کی وصولی کی رسید کسی اہمیت کی حامل نہیں ہے۔"

"وکیل صاحب!" اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟"

"میں سچائی کو آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں ڈاکٹر صاحب!" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "آپ ذرا اس رسید کے مضمون پر غور کریں۔" پھر میں نے اسے رسید کی عبارت پڑھ کر سنائی۔ "میں نافع شاہ بقائمی ہوش وحواس اس تحریر کے ذریعے اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے ڈاکٹر عمیر احمد سے مبلغ پانچ لاکھ روپے وصول کرلیے ہیں۔"

"تو.....؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"تو یہ ڈاکٹر صاحب کہ....." میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "کاغذ کے اس بے وقعت پُرزے سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے نافع شاہ کو پانچ لاکھ روپے دیے ہیں۔ کس مقصد سے۔ کتنے عرصے کے لیے دیے ہیں، اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ رسید پر دستخط کرکے تاریخ ڈالنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس رسید کی روشنی میں وہ دھوکے باز شخص یہ مؤقف بھی اختیار کرسکتا ہے کہ آپ اس کے پانچ لاکھ کے مقروض تھے۔ اس نے اپنی رقم وصول کرنے کے بعد یہ رسید لکھ دی ہے..... اللہ اللہ، خیر سلا!"

"اوہ!" وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔"

"آپ ایک سیدھے سادے انسان اور پیشے کے لحاظ سے دکھی لوگوں کے مسیحا ہیں لہٰذا اس قسم کی شیطانی پیترے بازیوں کی طرف آپ کا دھیان جا ہی نہیں سکتا۔" میں نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ "ایک بات ذہن میں اچھی طرح بٹھالیں کہ آپ کا پالا ایک شاطر اور عیار شخص سے پڑ گیا ہے چنانچہ آپ نے ہمہ وقت اپنی آنکھوں اور کانوں کو کھلے رکھنا ہے۔ میں تو آپ کا کیس لے ہی رہا ہوں لیکن اس سلسلے میں آپ کو بھی، خاص طور پر آپ کی بہن شازیہ کو تھوڑا فیلڈ ورک کرنا ہوگا۔ اس سے کام میں آسانی پیدا ہوگی اور آپ کی جیت کے امکان بڑھ جائیں گے۔"

"فیلڈ ورک سے آپ کی کیا مراد ہے؟" اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"مجھے نافع شاہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات چاہئیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ آپ، نافع شاہ کے پہلے شکار نہیں ہیں۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی لوگوں کو اسی طرح ٹھگ چکا ہے۔ اگر اس کا ڈسا ہوا کوئی بندہ مل جائے تو ہم اسے اپنے کیس کے لیے مثال بنا کر استعمال کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ....." میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"نافع شاہ کی کمزوریوں سے آگاہی بھی ضروری ہے۔ اس کے جتنے زیادہ ویک پوائنٹس ہمارے ہاتھ میں ہوں گے، ہم اسے اتنی ہی آسانی سے چت کرسکیں گے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے آپ اپنے خیرخواہ مبین علی سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جناب!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گا۔"

میں نے ڈاکٹر عمیر سے مختلف اہم قانونی کاغذات

www.pklibrary.com

اور وکالت نامے پر دستخط کرائے اور اپنی فیس ایڈوانس میں وصول کرنے کے بعد اسے رخصت کر دیا۔

دو روز بعد میں نے نافع شاہ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ میں نے اس کیس کو مؤرخہ پندرہ دسمبر کو عدالت میں فائل کیا تھا۔ اس کے ٹھیک آٹھ دن کے بعد یعنی چوبیس دسمبر کو نافع شاہ نے دوسری عدالت میں میرے مؤکل ڈاکٹر عمیر کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اس معاملے کی تفصیل میں کہانی کی ابتدا میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ یہ دونوں مقدمات دو الگ عدالتوں میں اس لیے دائر ہوئے تھے کہ ان کے مدعیان کی رہائش گاہیں دو مختلف پی ایس (پولیس اسٹیشن) کی حدود میں واقع تھیں۔ جس طرح کسی پی ایس میں کوئی رپورٹ درج کرانے کے لیے ضروری ہے کہ درخواست گزار کی رہائش اسی تھانے کی حدود میں ہو، بالکل اسی طرح ہر عدالت بھی اپنے متعلقہ تھانوں ہی کے کیس سنتی ہے۔

میرے مقدمہ دائر کرنے کے دو، ڈھائی ماہ بعد بھی جب کیس میں کوئی پیشرفت دیکھنے میں نہیں آئی تو میں نے دونوں عدالتوں سے درخواست کر کے اس کیس کو مرج کروا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے عدالتی احکامات کے ذریعے ایسا بندوبست بھی کروا دیا تھا کہ نافع شاہ ہر پیشی پر عدالت میں حاضر ہونے کا پابند ہو گیا تھا۔

آئندہ پیشی پندرہ روز بعد تھی۔

☆☆☆

بادی النظر میں نافع شاہ کا وکیل اور میں اس کیس میں ڈبل وکیل کا کردار ادا کر رہے تھے لیکن اگر تکنیکی اعتبار سے دیکھا جائے تو میری حیثیت وکیلِ استغاثہ کی تھی اور دوسرا وکیل ڈیفنس کے زمرے میں آتا تھا کیونکہ یہ کیس ہم نے پہلے دائر کیا تھا۔ ویسے اگر نافع شاہ عقلمندی کا مظاہرہ کرتا تو اسے جوابی مقدمہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس وہ اپنے وکیل کی مدد سے ہمارے دائر کیے ہوئے مقدمے ہی میں سنجیدگی اور نیک نیتی سے حاضر ہو جاتا تو اب تک یہ کیس کسی کنارے پر بھی لگ چکا ہوتا۔ بہرکیف، اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں۔

ڈیفنس کی جانب سے نصف درجن گواہان کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف اہم گواہوں اور ان کے بیانات کا ہی ذکر کروں گا۔ ہماری طرف سے نامزد کیے جانے والے گواہوں میں ڈاکٹر عمیر کی چھوٹی بہن شازیہ سب سے زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔

اس پیشی پر فریقین کے بیانات قلمبند کیے گئے اور مخالف وکلا نے ان پر جرح کی۔ ڈاکٹر عمیر نے اسی بیان کا اعادہ کیا جو میں نے اپنے دعوے کے ضمن میں شامل کر رکھا تھا۔ جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد وکیل مخالف نے اپنی جرح کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر عمیر نے کٹہرے میں کھڑے ہو کر اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا تھا اور وہ ابھی تک وہیں موجود تھا۔

''ڈاکٹر عمیر!'' وکیلِ مخالف نے میرے مؤکل کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ نے خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے جو دستاویزی ثبوت عدالت میں پیش کیے ہیں، وہ سراسر آپ کے خلاف جاتے ہیں۔ معزز عدالت کو بتائیں کہ آپ نے میرے مؤکل کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیوں کیا؟''

''دھوکا میں نے نہیں بلکہ نافع شاہ نے کیا ہے وکیل صاحب!'' ڈاکٹر عمیر نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''ایک تو میں نے اس کے ساتھ نیکی کی۔ بجائے اس کے کہ وہ میرا شکر گزار ہوتا، الٹا اس نے مجھ پر ہی مقدمہ کر دیا۔ یہ بھلا کہاں کا انصاف ہے؟''

''ہم سب لوگ اس وقت انصاف کے حصول کے لیے ہی عدالت میں حاضر ہوئے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ یہ عدالت ہمیں مایوس نہیں کرے گی۔'' وکیل مخالف نے نپے تلے الفاظ میں کہا پھر طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''ابھی آپ نے کسی نیکی کا ذکر کیا ہے۔ کیا آپ عدالت کو اپنی اس نیکی کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟''

ڈاکٹر عمیر نے مختصر الفاظ میں اپنا مؤقف بیان کرنے کے بعد کہا۔ ''یہ ساری تفصیل کیس کی فائل میں موجود ہے۔''

''کیس فائل میں درج چیزیں اگر مبنی بر حقیقت ہوں تو وہ خود بولتی ہیں۔'' وکیلِ مخالف نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اور آپ کے کیس کی ''چیزیں'' چیخ چیخ کر یہ اعلان کر رہی ہیں کہ آپ نے میرے مؤکل کو پانچ لاکھ روپے واپس کر دیے تھے یعنی تین لاکھ پندرہ نومبر کو اور دو لاکھ سترہ نومبر کو۔ آپ کے کیس میں میرے مؤکل کی دی ہوئی جو رسید لگی ہوئی ہے، اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے میرے مؤکل کے پیسوں میں سے پانچ لاکھ روپے حسبِ وعدہ ایک ماہ کے بعد اسے لوٹا دیے تھے چنانچہ ان پانچ لاکھ کا تو کوئی چکر ہی نہیں ہے۔ اگر معاملہ یہیں تک محدود رہتا تو میرے مؤکل کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ وہ بیچارہ تو اپنے باقی کے تین لاکھ حاصل کرنے کے لیے عدالت میں آیا ہے کیونکہ آپ نے اس کا مکمل قرضہ ادا نہیں کیا بلکہ آپ کی ڈھٹائی کا تو یہ عالم ہے کہ آپ ان تین لاکھ

www.pklibrary.com

کی ادائیگی کو ایک طرف رکھتے ہوئے میرے مؤکل سے آٹھ لاکھ کا قرض لینے ہی سے انکاری ہیں۔"

"میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے قرضہ نہیں لیا۔" ڈاکٹر عمیر نے واشگاف الفاظ میں جواب دیا۔ "آپ کے مؤکل نافع شاہ نے میری سیدھی سادی بہن کو منافع کا لالچ دے کر بیوقوف بنایا تھا اور میں نے اپنی بہن کی محبت سے مجبور ہو کر اسے پانچ لاکھ روپے دے دیے۔ اس نیکی کا صلہ مجھے یہ ملا ہے کہ آپ کا مؤکل میرے پانچ لاکھ کھانے کے بعد الٹا مجھ سے تین لاکھ مزید مانگ رہا ہے۔ یہ تو ایک طرح سے صریحاً زیادتی ہے لیکن....." وہ لمحے بھر کو تھما پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"مجھے امید ہے یہ عدالت انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے میری ڈوبی ہوئی رقم واگزار کرادے گی۔"

"ہمیں بھی اس عدالت سے یہی امید ہے کہ میرے مؤکل کو اس کے باقی ماندہ تین لاکھ لازمی دلوائے جائیں گے۔" وکیل مخالف نے ٹھوس انداز میں کہا پھر میرے مؤکل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "تو آپ اس نکتے پر جمے رہیں گے کہ آپ نے میرے مؤکل نافع شاہ سے مؤرخہ پندرہ اکتوبر کو آٹھ لاکھ روپے ادھار نہیں لیے تھے؟"

"بالکل..... یہی حقیقت ہے۔" ڈاکٹر عمیر نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔

مزید ایک دو سوالات کے بعد وکیلِ مخالف نے میرے مؤکل پر جرح ختم کر دی۔ میری باری پر نافع شاہ کو کٹہرے میں کھڑا کیا گیا اور میں جرح کے لیے اس کے نزدیک چلا گیا۔

"نافع صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنا کام شروع کر دیا۔ "کیا میں آسانی کے لیے آپ کو صرف "شاہ جی" کہہ سکتا ہوں؟"

وہ بے رخی سے بولا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"شکریہ شاہ جی!" میں نے معتدل انداز میں کہا اور جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "میرے مؤکل نے آٹھ روز پہلے آپ پر کیس کیا تھا یعنی آپ کے مقدمہ دائر کرنے سے آٹھ دن پہلے..... لیکن آپ عمیر احمد کے کیس والی عدالت میں ایک بار بھی حاضر نہیں ہوئے۔ مجبوراً مجھے ان دونوں کیسز کو مرج کروانا پڑا۔ کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ ان دو، ڈھائی ماہ میں آپ نے متعلقہ عدالت کا رخ کیوں نہیں کیا حالانکہ اس عدالت سے آپ کو تین بار نوٹس بھی بھیجا گیا تھا۔"

"ایک تو پچھلے دنوں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہی جو کہ ابھی تک مکمل بہتر نہیں ہوئی۔" اس نے جواب دیا۔ "دوسرے کاروباری مصروفیات نے بھی بے بس کر رکھا تھا۔ بیماری کے باعث کام کافی جمع ہو گیا تھا جسے نمٹانے کے لیے مجھے رات دن مصروف رہنا پڑا تھا۔ بس، اسی لیے میں عدالتی معاملات پر زیادہ دھیان نہیں دے سکا۔"

"شاہ جی! آپ کی ناسازیِ طبع کا سن کر مجھے دلی افسوس ہوا ہے۔" میں نے مصنوعی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کے ساتھ ہی میں کافی حیرت زدہ بھی ہوں۔"

"حیرت زدہ؟" وہ عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "وہ کس لیے وکیل صاحب؟"

"اس کی دو وجوہات ہیں شاہ جی!"

"کون سی دو وجوہات؟" اس نے پوچھا۔

"وجہ نمبر ایک.....!" میں نے اپنی جرح کا گیئر بدلتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ "آپ کے بقول، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے آپ نے عدالت سے جاری بلاوے کے نوٹسز کو نظر انداز کر دیا حالانکہ ایسی صورتِ حال میں آپ میڈیکل سرٹیفکیٹ عدالت میں دائر کر سکتے تھے۔ مطلب یہ کہ مذکورہ سرٹیفکیٹ کسی کے ہاتھ بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ وجہ نمبر دو.....!" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر ڈرامائی انداز میں اضافہ کر دیا۔

"انہی دو، ڈھائی ماہ کے عرصے میں علالت کے باوجود بھی آپ اس عدالت میں برابر حاضر ہوتے رہے ہیں جہاں آپ نے تین لاکھ کی ریکوری مع ہرجانہ کا کیس ڈال رکھا ہے، یعنی کہ یہاں۔" ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "الحمد للہ! میڈیکل کے شعبے کے حوالے سے میری معلومات خاصی وسیع اور قوی ہیں۔ یہ عدالت جاننا چاہتی ہے کہ حال ہی میں ایسی کون سی نئی بیماری منظرِ عام پر آئی ہے جس کا مریض اپنے گھر سے نکل کر سٹی کورٹ کے ایک کمرے میں تو ہشاش بشاش حاضر ہو جائے مگر اس کے ساتھ والے بلاک میں واقع دوسری عدالت میں حاضر ہونے سے معذور اور قاصر ہو؟"

میرے الفاظ کی تلخی نے نافع شاہ کو پیچ و تاب کھانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اس کے چہرے پر اپنے لیے ناپسندیدگی کے تاثرات دیکھے۔ قبل اس کے کہ وہ میرے الفاظ کے جواب میں کچھ کہتا، ڈیفنس کونسلر بیچ میں کود پڑا۔

"آبجیکشن یور آنر!" اس نے بہ آواز بلند کہا۔ "میرا مؤکل دوسری عدالت میں اپنی غیر حاضری کی وجوہ بیان

www.pklibrary.com

کر چکا ہے لیکن میرے فاضل دوست اپنے بے تکے سوالات سے خوامخواہ اسے پریشان کر رہے ہیں۔"

"میرا یہ سوال بے تکا ہے، نہ بے سروپا اور نہ ہی بے اصل ہے جناب عالی!" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بلکہ میں نے تو ایک برمحل، منطقی اور روزِ روشن کے مانند عیاں بات کی ہے۔ اگر شاہ جی اپنی عدالت میں حاضر ہونے کے ساتھ میرے مؤکل کی عدالت میں بھی چکر مار لیتے تو میں اور میرا مؤکل مل کر ان کا "شافی علاج" کر سکتے تھے۔ میں اپنے دلائل سے شاہ جی کو بے بس کرتا اور میرا مؤکل یعنی ڈاکٹر عمیر احمد، شاہ جی کی اس عجیب و غریب اور سمجھ میں نہ آنے والی نیو برانڈ بیماری کا "ٹریٹمنٹ" کر ڈالتے۔"

ادھر میری ٹھوس اور پُرطنز وضاحت مکمل ہوئی، اُدھر جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آبجیکشن اوور رولڈ۔ مسٹر بیگ! پلیز کنٹینیو۔"

میں نے جج کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے اپنی جرح کو "کنٹینیو" کر دیا اور نافع شاہ کے چہرے پر نگاہ جما کر دوستانہ انداز میں کہا۔

"شاہ جی! آپ کی بیماری پر مٹی ڈالتے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق مٹی میں امونیم کلورائڈ اور دیگر جراثیم کش معدنیات پائی جاتی ہیں جو اس عجوبہ بیماری کا قلع قمع کر کے آپ کو صحت یاب کر سکتی ہیں۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "اور مجھے آپ کی میڈیکل ایکسپرٹیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے آپ کے بزنس سے بہت دلچسپی ہے شاہ جی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "خصوصاً آپ کی شوگر ٹریڈنگ بزنس ایکسپرٹیز سے۔"

"آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟" وہ چیخ کر مستفسر ہوا۔

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے سپاٹ آواز میں پوچھا۔ "شاہ جی! آپ ایک کامیاب بزنس مین ہیں۔ آپ کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟"

"ن..... نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"آپ نے اسٹامپ پیپر پر تیار کیے گئے جس ایگریمنٹ کو عدالت میں پیش کیا ہے، اس کے مطابق میرے مؤکل نے پندرہ اکتوبر کو آپ سے آٹھ لاکھ روپے ادھار لیے تھے اور ایک ماہ کے بعد یہ رقم لوٹانے کا وعدہ کیا تھا؟" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مذکورہ ایگریمنٹ پر آپ کے اور میرے مؤکل کے دستخط بھی موجود ہیں۔ وقت آنے میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ میرے مؤکل کے وہ دستخط جعلی ہیں لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا لہٰذا مدعا پر رہتے ہیں۔" میں نے ذرا دیر کو رک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اسی ایگریمنٹ پر دو گواہوں کا بھی اندراج ہے یعنی امداد علی اور طارق محمود۔ آپ کا کہنا ہے کہ ان دو افراد کے سامنے آپ نے ڈاکٹر عمیر احمد کو آٹھ لاکھ روپے بطور قرض دیے تھے۔ کیا آپ اپنے بیان پر ڈٹے ہوئے ہیں؟"

"جی ہاں!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "سچ یہی ہے۔"

"مذکورہ ایگریمنٹ میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ آپ نے میرے مؤکل کو آٹھ لاکھ کی ادائیگی کس طرح کی تھی۔" میں نے معتدل انداز میں کہا اور سوالیہ لہجے میں اضافہ کر دیا۔ "کیش یا اوپن چیک یا کراس چیک اور یا پھر کسی اور شکل میں؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ لمحاتی تذبذب کے بعد اس نے اضطراری لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے وہ رقم بصورتِ کیش ڈاکٹر عمیر کو دی تھی۔"

"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں کہ آپ ایک دانا و بینا کاروباری آدمی ہیں۔" میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "کوئی بھی ہوشیار بزنس مین یوں نقد رقم کی صورت لین دین نہیں کرتا۔ اگر آپ نے بینک کو بیچ میں رکھ کر پیمنٹ کی ہوتی تو اس رقم کا آپ کے اکاؤنٹ سے ڈاکٹر عمیر کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہونے کا باقاعدہ ریکارڈ موجود ہوتا جیسا کہ ڈاکٹر نے آپ کو پانچ لاکھ روپے دیتے ہوئے کیا۔ باقی جہاں تک اس آٹھ لاکھ والے ایگریمنٹ کی بات ہے تو ضرورت پڑنے پر میں اسے بھی ایک بے وقعت ردی کاغذ ثابت کر دوں گا۔ خیر.....!" میں نے توقف کر کے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے گھورا اور ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"شاہ جی! مانتے ہیں نا، آپ نے ایک سنگین غلطی کر دی ہے۔"

میرے آخری جملے سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا جیسے مجھے نافع شاہ سے گہری ہمدردی ہو لیکن درحقیقت ایسا کچھ نہیں تھا۔ میں نے اس کی زبان سے اہم باتیں اگلوانے کے لیے دانستہ نرم رویہ اختیار کیا ہوا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں آگے چل کر اس کے ساتھ کون سا ہاتھ کرنے

www.pklibrary.com

والا ہوں۔ وہ غیر محسوس انداز میں میرے پھیلائے ہوئے نادیدہ جال میں قدم رکھ چکا تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھ سے غلطی تو ہوئی ہے۔ آپ اپنے کلائنٹ کو سمجھائیں نا، وہ میرے باقی کے تین لاکھ ادا کر کے اس معاملے کو ختم کر دے۔''

میں دل ہی دل میں اس کی عیاری بردار ڈھٹائی پر ''اش اش'' کر اٹھا۔ ''ڈاکٹر عمیر کو تو میں بعد میں سمجھا دوں گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پہلے میں آپ سے تو نمٹ لوں۔''

میرے اس طرزِ تکلم پر وہ چیں بہ جبیں ہوا لیکن کچھ بولا نہیں۔ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''ڈاکٹر عمیر نے کس مقصد کے لیے آپ سے آٹھ لاکھ روپے ادھار لیے تھے؟''

''وہ اپنے کلینک کو اسپتال میں بدلنے کا ارادہ رکھتا تھا۔'' وہ مقابلۂ دروغ گوئی میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کا ارادہ نیک تھا اس لیے میں نے انکار نہیں کیا پھر اس نے ایک ماہ بعد ہی رقم واپس کرنے کا یقین بھی دلایا تھا اس لیے میں نے زیادہ سوچا نہیں۔''

''شاہ جی! آٹھ لاکھ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ اتنے پیسوں میں ایک مناسب سا بنگلا خریدا جا سکتا ہے۔'' میں نے اپنی جرح میں تندی بھرتے ہوئے کہا۔

''میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا بلکہ معزز عدالت بھی اس معاملے کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ اگر ڈاکٹر عمیر نے ایک ماہ کے وعدے پر آپ سے آٹھ لاکھ روپے ادھار لیے تھے تو اس وقت آپ نے ڈاکٹر سے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ ایک ماہ کے بعد اس کے پاس آٹھ لاکھ روپے کہاں سے آئیں گے؟ یا آپ اس سے یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اگر ایک ماہ میں اس کے پاس کوئی بڑی رقم کہیں سے آنے والی ہے تو وہ اپنے اسپتال والے پروجیکٹ کو ایک ماہ کے لیے ملتوی کر دے۔ ایک ماہ میں کوئی قیامت برپا نہیں ہونے جا رہی تھی جس کے خوف سے فوراً سے پیشتر آٹھ لاکھ کا قرضہ اٹھا کر اسپتال کی تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے۔''

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے شازیہ کی وجہ سے ڈاکٹر عمیر پر بھروسا کر لیا تھا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''شازیہ کے مرحوم شوہر سے میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس کی وفات کے بعد بھی میں گاہے بگاہے شازیہ اور اس کے معذور بچے کی مدد کرتا رہا ہوں۔ شازیہ نے جب مجھے اپنے بھائی ڈاکٹر عمیر کی فوری ضرورت کے بارے میں بتایا تو میں انکار نہ کر سکا اور میں نے آٹھ لاکھ روپے کی رقم اٹھا کر ڈاکٹر کو دے دی۔ یہ تو ایک ماہ بعد پتا چلا کہ یہ دونوں بھائی بہن آپس میں ملے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑی چالبازی سے مجھے بیوقوف بنایا ہے۔''

''تو وہ چینی کے کسی بڑے اسٹاک کی خریداری والی کہانی جھوٹی ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔ ''جس کے لیے آپ نے میرے مؤکل کی بہن شازیہ کو مہرہ بنا کر پانچ لاکھ روپے بٹور لیے تھے؟''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیلِ صفائی نے عدالت میں اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''میرا مؤکل واضح طور پر بتا چکا ہے کہ ڈاکٹر عمیر نے پچھلے سال ماہ نومبر کے وسط میں میرے مؤکل کو بذریعہ کراس چیک جو پانچ لاکھ روپے ادا کیے تھے، وہ انہی آٹھ لاکھ کی جزوی واپسی تھی جو اکتوبر کے وسط میں میرے مؤکل نے بطور قرض ڈاکٹر عمیر کو دیے تھے۔ میرے فاضل دوست کے پاس پوچھنے کو کچھ نہیں ہے اسی لیے وہ لایعنی اور گھسے پٹے سوالات سے معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے میں مصروف ہیں۔ دیٹس آل یور آنر!''

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کیا کہتے ہیں؟''

''میں اپنے فاضل دوست کے ستراطی فتوے سے کامل اتفاق کرتا ہوں جناب عالی!'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے مطمئن انداز میں کہا۔ ''فی الحال میرے پاس پوچھنے کو واقعی کچھ نہیں ہے۔ کسی کے غیاب میں بات کرنا غیبت کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ میں اگلی پیشی کا انتظار کر لوں گا جب ڈیفنس کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوگا لیکن اس سے بھی پہلے.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔

''آئندہ پیشی پر میں صفائی کے گواہوں سے پہلے اس کیس کی مرکزی گواہ اور میرے مؤکل کی چھوٹی بہن شازیہ کو عدالت میں پیش کر کے اس کا حلفیہ بیان ریکارڈ کراؤں گا۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا جناب عالی!''

جج نے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت کو برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!''

☆☆☆

دو روز کے بعد ڈاکٹر عمیر میرے آفس میں آیا اور

www.pklibrary.com

اس نے بتایا۔ ''وکیل صاحب! گزشتہ شام نافع شاہ نے شازیہ سے فون پر بات کی ہے۔''

''وہ آپ کی بہن سے کیا کہہ رہا تھا؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''اس نے شازیہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔''

''وہ کس سلسلے میں آپ کی بہن سے ملنا چاہتا ہے؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''اس نے کھل کر کچھ نہیں بتایا۔'' ڈاکٹر عمیر نے کہا۔ ''بس اتنا اشارہ دیا ہے کہ وہ شازیہ کو ایک ایسی پیشکش کرنا چاہتا ہے جس کے ذریعے عدالتی جھنجٹ میں پڑے بغیر اس کیس کو حل کیا جاسکتا ہے۔''

''پھر شازیہ نے اسے کیا جواب دیا؟'' میں نے معتدل انداز میں استفسار کیا۔

''اس نے کہا کہ سوچ کر بتاؤں گی۔'' ڈاکٹر عمیر نے جواب دیا۔ ''اس کے بعد شازیہ نے مجھے فون کر کے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور یہ بھی پوچھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے کہا کہ وکیل صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد بتاؤں گا۔ میں آج اسی سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب! اصولی طور پر جب کوئی مقدمہ عدالت میں لگا ہوا ہو تو فریقِ مخالف سے دور ہی رہنا چاہیے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ہمارے کیس میں صورتِ حال قدرے مختلف ہے۔''

''مطلب، شازیہ اگر نافع شاہ سے ملاقات کا عندیہ دے دیتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے پچھلی پیشی پر شازیہ کے بیان کا ذکر کرتے ہوئے خاصے معنی خیز الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ نافع شاہ نے آپ کے ساتھ دھوکا کیا ہے لہٰذا اوپر سے وہ چاہے کتنا بھی مضبوط اور ڈھیٹ بنا رہے، اس کے دل میں چور بہرحال موجود ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر شازیہ نے عدالت میں آکر سچائی بیان کر دی تو اس کے لیے مصیبت کھڑی ہوسکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ شازیہ کے ساتھ کوئی ایسی مصالحت کرنا چاہتا ہے جس سے اس کی جان کسی سنگین وبال میں آنے سے بچ جائے۔''

''آپ کا اشارہ سیٹلمنٹ کی طرف ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''گزشتہ پیشی پر نافع شاہ نے میری جرح کا سامنا کیا ہے جس سے اسے اندازہ ہوگیا ہے کہ میں قبر تک اس کا تعاقب کروں گا۔ وہ یا تو آپ کے پانچ لاکھ روپے واپس کرے گا اور یا پھر اسے چند سالوں کے لیے جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔ اسی لیے اس نے عدالتی جھنجٹ سے نکلنے کی بات کی ہے۔''

''تو ان حالات میں شازیہ کو کیا کرنا چاہیے؟'' ڈاکٹر عمیر نے پوچھا۔

''آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ عموماً وکلاء کے آفسز میں زیادہ محفوظ اور قابلِ بھروسا ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ اس صورت میں فریقین کی باہمی رضامندی سے گواہان کی موجودگی میں پکے کاغذات تیار کر لیے جاتے ہیں اور اس نوعیت کے لیگل ڈاکیومنٹس متعلقہ عدالت کے لیے بھی قابلِ قبول ہوتے ہیں لیکن ہمارے کیس کی صورتِ حال قدرے مختلف ہے۔ نافع شاہ میرے آفس میں شازیہ سے ملاقات کا خواہشمند نہیں ہے۔ سو، میں سمجھتا ہوں ایک بار ان دونوں کی ملاقات ہوجانے دیں تاکہ پتا تو چلے نافع شاہ آپ کی بہن کو کون سی پیشکش کرنے والا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ جب نافع شاہ آپ کی بہن سے ملنے آئے تو آپ وہاں ضرور موجود ہوں۔''

''میں سمجھ گیا وکیل صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں شازیہ سے بات کرنے کے بعد آپ کو اپ ڈیٹ کرتا ہوں۔''

''آپ کو صرف ان دونوں کی میٹنگ میں موجود ہی نہیں رہنا.....'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''بلکہ اس تمام تر گفتگو کو ریکارڈ بھی کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے آپ کسی ٹیپ ریکارڈر کو کمرے میں کہیں چھپا کر بھی رکھ سکتے ہیں اور اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو ایک پورٹیبل پاکٹ سائز وائس ریکارڈر بھی مہیا کرسکتا ہوں۔ میرا ایک دوست جرمنی سے یہ ریکارڈر میرے لیے لے کر آیا تھا۔''

''یہ آئیڈیا زبردست رہے گا۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

میری مزید ہدایات کے بعد وہ دفتر سے رخصت ہوگیا لیکن اگلے ہی روز وہ ایک بار پھر میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے بتایا۔

''وکیل صاحب! جب سے نافع شاہ نے ہمارے ساتھ فراڈ کیا ہے، اس نے شازیہ کے گھر جانا چھوڑ دیا ہے۔''

''مطلب یہ کہ اس ملاقات کے لیے وہ شازیہ کے گھر نہیں آئے گا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور

www.pklibrary.com

وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''نافع نے شازیہ کو گلشن اقبال کے ایک معروف ریسٹورنٹ میں آنے کو کہا ہے۔ مذکورہ ریسٹورنٹ شازیہ کی رہائش کے نزدیک ہی واقع ہے۔ نافع نے شازیہ کو سختی سے تاکید کی ہے کہ اس ملاقات کے بارے میں کسی کو خصوصاً مجھے کچھ نہیں بتانا ورنہ وہ اپنا ارادہ بدل دے گا۔ شازیہ اس ریسٹورنٹ میں کئی بار جا چکی ہے اور وہاں کے اسٹاف کو اچھی طرح جانتی ہے لہٰذا فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس نے نافع شاہ کو یقین دلایا ہے کہ وہ اس ملاقات کو انتہائی خفیہ رکھے گی۔''

''ویری گڈ!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''یہ ملاقات کب اور کتنے بجے ہونے والی ہے؟''

''کل سہ پہر میں، پانچ اور چھ بجے کے درمیان۔''

ڈاکٹر عمیر کی بات سن کر میرے ذہن میں بھی ایک آئیڈیا آچکا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا آپ کل صبح نو بجے تک شازیہ کو لے کر میرے آفس آسکتے ہیں۔ اس ملاقات کے حوالے سے میں اسے چند اہم باتیں سمجھانا چاہتا ہوں۔''

''جی، لے آؤں گا۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا پھر پوچھا۔ ''کیا کل آپ عدالت نہیں جائیں گے؟''

''جاؤں گا مگر دس بجے کے بعد۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ادھر آفس میں ایک ضروری کام ہے لہٰذا گھر سے میں سیدھا یہاں آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے وکیل صاحب!'' وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''کل صبح ملاقات ہوتی ہے۔''

اس کے جانے کے بعد میں اپنے کلائنٹس کے ساتھ مصروف ہوگیا۔

آئندہ روز وہ دونوں بھائی بہن میرے آفس میں موجود تھے۔ اس وقت نو بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد شازیہ سے پوچھا۔

''کیا آپ چاہتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی ڈوبی ہوئی رقم واپس مل جائے؟''

''میں بھلا کیوں نہیں چاہوں گی۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''میری وجہ سے بھائی جان پریشانی میں آئے ہیں جس کے لیے میں اپنی نظر میں پل پل نادم ہوتی رہتی ہوں۔ میں اس دن سکون کی سانس لوں گی جب وہ شیطان میرے بھائی جان کے پانچ لاکھ روپے واپس کردے گا۔''

''وہ دن دور نہیں جب آپ کی یہ خواہش پوری ہوجائے گی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کے لیے آپ کو مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔''

''میں کروں گی۔'' وہ پُرعزم لہجے میں بولی۔ ''آپ بتائیں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''جذبات سے بھرپور اداکاری!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''میں سمجھی نہیں وکیل صاحب؟''

''میں آسان الفاظ میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آج سہ پہر پانچ اور چھ بجے کے درمیان آپ اپنے گھر کے نزدیک ایک ریسٹورنٹ میں نافع شاہ سے ملنے والی ہیں۔ آپ لوگوں کی ملاقات مختصر ہو یا طویل، آپ نے اس کی پیشکش سننے کے ساتھ ہی اپنا رونا دھونا جاری رکھنا ہے اور اس دوران میں کئی بار چینی کی خریداری اور اپنے بھائی کی رقم کا ذکر کرنا نہیں بھولنا۔ بات سمجھ میں آرہی ہے نا؟''

''جی بالکل!'' وہ جلدی سے بولی۔ ''آپ نے جو کہا، میں ویسا ہی کروں گی۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اب چند تکنیکی معاملات کا ذکر ہوجائے۔''

میں خاموش ہوا تو وہ دونوں اضطرابی نظروں سے مجھے تکنے لگے۔ میں نے اپنی میز کی دراز میں سے ''ون ٹین'' کیمرا کے سائز کا ایک وائس ریکارڈر نکال کر شازیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈر ہے۔ جب آپ گھر سے نکلیں تو اسے اپنے پرس میں رکھ لیں اور یہ کوشش کریں کہ آپ ٹھیک پانچ بجے اس ریسٹورنٹ میں پہنچ جائیں۔ جب نافع شاہ وہاں آئے اور آپ لوگوں کے بیچ گفتگو کا آغاز ہو تو آپ نے اس وائس ریکارڈر کو آن کردینا ہے۔ مطلب، آپ لوگوں کی باتیں ریکارڈ ہونا شروع ہوجائیں۔ آپ نے اپنے ساتھ کوئی ایسا پرس لے کر جانا ہے جو اوپر سے کھلا ہو تاکہ اعلیٰ معیار کی ریکارڈنگ ہوپائے۔ ٹھیک ہے نا؟''

''جی، ٹھیک ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''میں یہ سب آسانی سے کرلوں گی۔''

''بہت خوب!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اگر آپ اپنی اور نافع شاہ کی گفتگو ریکارڈ کرنے میں کامیاب ہوگئیں تو آپ کے اس کارنامے سے یہ کیس کافی آسان ہوجائے گا۔''

اس کے بعد میں نے انہیں چائے پلائی۔ انہوں نے

www.pklibrary.com

میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے آفس اسسٹنٹ ناصر خان کو اندر بلا لیا۔ آج میں نے خاص طور پر اسے صبح میں بلایا تھا کیونکہ میں ایک اہم ذمے داری اسے سونپنا چاہتا تھا۔ شازیہ اور ڈاکٹر عمیر کی آمد سے قبل میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ شازیہ کے چہرے کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے۔

وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے پوچھا۔

''ناصر خان! کیا تم نے اس عورت کی صورت کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیا ہے؟''

''یس سر!'' وہ توانا آواز میں بولا۔

میں نے اپنی میز کی دراز میں سے ایک اسمارٹ سا جدید (اس دور کے حساب سے) جاپانی کیمرا نکال کر ناصر خان کی طرف بڑھا دیا۔ جب اس نے میرے ہاتھ سے وہ کیمرا لے لیا تو میں نے ایک ریسٹورنٹ کا نام لے کر معتدل انداز میں کہا۔

''شازیہ آج سہ پہر میں پانچ بجے اس ریسٹورنٹ میں ایک آدمی سے ملاقات کرے گی۔ میں نے تمہاری زبانی متعدد بار یہ سنا ہے کہ تم ایک بہت اچھے فوٹو گرافر ہو۔ سو، آج تمہاری پیشہ ورانہ مہارت کا امتحان ہے۔ تم نے اس کیمرے سے ان دونوں کی دو تین تصاویر بنانا ہیں۔''

''کوئی مسئلہ ہی نہیں سر!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ یہ کیمرا حال ہی میں مارکیٹ ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں، اس کے فریم کے ایک کونے میں، تصویر کھینچنے کی تاریخ اور ٹائم بھی لکھا ہوا آتا ہے۔''

میں زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆☆

اس پیشی پر میں نے دانستہ شازیہ کو عدالت نہیں بلایا اور اس کی بیماری کا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کر دیا۔ میں نے نافع شاہ کو چاروں خانے چت کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، شازیہ کی غیر حاضری اسی کا حصہ تھی۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو جج نے مجھ سے کہا۔

''بیگ صاحب! آپ کی اہم گواہ کہاں ہیں؟ آپ ان کا بیان ریکارڈ کرا دیں تاکہ اس کیس کو آگے بڑھایا جائے۔''

''شازیہ صاحبہ وائرل انفیکشن کی جکڑ میں ہیں جناب عالی!'' میں نے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ دو چار روز میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں نے ان کا میڈیکل سرٹیفکیٹ جمع کرا دیا ہے۔''

جج نے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا جائزہ لیا اور اثبات میں سر ہلانے کے بعد وکیلِ صفائی سے استفسار کیا۔

''وکیل صاحب! آپ کے گواہوں کی کیا پوزیشن ہے؟''

''یور آنر! صفائی کے دو گواہ اس وقت عدالت میں موجود ہیں۔'' وکیل صفائی نے بتایا۔ ''پچھلی پیشی کے اختتام پر میرے فاضل دوست نے اپنی گواہ شازیہ صاحبہ کو پہلے پیش کرنے کی یقین دہانی کروائی تھی۔ وہ تو آج عدالت نہیں آئی ہیں۔ سو، میں معزز عدالت کی اجازت سے اپنے گواہوں کو کٹہرے میں بلانا چاہوں گا۔''

''پرمیشن گرانٹیڈ!'' جج نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

میرے منصوبے کا پہلا مرحلہ بہ خیر و خوبی طے ہو گیا تھا۔ جج کی اجازت ملتے ہی وکیل صفائی نے گواہ امداد علی کو وٹنس اسٹینڈ پر کھڑا کر دیا۔ امداد علی کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ وہ دراصل نافع شاہ کا ڈرائیور تھا۔ امداد علی کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل صفائی نے اس پر مختصر سی جرح کی۔

''امداد علی!'' وکیل صفائی نے معتدل انداز میں سوال کیا۔ ''آپ کتنے عرصے سے نافع شاہ کے پاس کام کر رہے ہیں؟''

''چار سال سے۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''کیا آپ جانتے ہیں آج آپ کو کس مقصد سے عدالت میں بلایا گیا ہے؟''

''جی، بالکل جانتا ہوں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میرے سامنے صاحب جی نے ڈاکٹر عمیر کو آٹھ لاکھ روپے ادھار دیے تھے۔ میں اسی بات کی گواہی دینے یہاں آیا ہوں۔ جب صاحب جی، ڈاکٹر صاحب کو پیسے دے رہے تھے تو مجھ سے اسٹامپ پیپر پر دستخط بھی کرائے تھے۔''

''یعنی تم اس واقعے کے گواہ ہو؟''

''جی، وکیل صاحب!'' گواہ نے مختصر جواب دیا۔

''جس اسٹامپ پیپر کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس پر ایک اور گواہ کے دستخط بھی موجود ہیں۔'' وکیل صفائی نے کہا۔ ''اس بندے کا نام طارق محمود ہے۔ معزز عدالت جاننا چاہتی ہے کہ جب تم نے اس ایگریمنٹ پر دستخط کیے تو کیا اس وقت طارق محمود بھی وہاں موجود تھا؟''

گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔

وکیل صفائی نے اپنی جرح موقوف کر دی اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یور ونٹس!''

میں وٹنس اسٹینڈ کے نزدیک پہنچا اور صفائی کے گواہ امداد علی کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔ ''امداد علی! تھوڑی

www.pklibrary.com

دیر پہلے آپ نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ عرصہ چار سال سے نافع شاہ کے لیے ڈرائیوری کر رہے ہو۔ کیا آپ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کی آخری سانس تک آپ نافع شاہ ہی کے پاس ملازم رہیں گے؟''

''نہیں جناب! میں ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''انسان کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وقت کب اسے کہاں لے جائے گا۔''

''لیکن یہ بات ہر انسان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ایک دن اسے مرنا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ہیں نا؟''

''یہ تو اٹل حقیقت ہے وکیل صاحب!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''جو بھی بندہ اس دنیا میں آیا ہے، اسے ایک دن لوٹ کر بھی جانا ہے۔''

''اور ہر انسان کو اپنی ہی قبر میں جانا ہے۔''

''جی!'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''مطلب یہ کہ آپ نافع شاہ کی قبر میں نہیں جائیں گے؟'' میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

''جی..... بالکل.....!'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''ظاہر ہے، میں تو اپنی ہی قبر میں جاؤں گا۔''

''جب آپ نافع شاہ کی جگہ اس کی قبر میں دفن ہونے کو تیار نہیں تو پھر اس کی خاطر جھوٹ بولنے کا کیا فائدہ؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

''م..... میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے؟'' وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کیا آپ کا تعلق گھوٹکی سے ہے؟''

''جی، میں گھوٹکی ہی کا رہنے والا ہوں۔'' اس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ پانچ ماہ پہلے آپ کے چھوٹے بھائی سرفراز علی کی شادی تھی؟'' میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے استفسار کیا۔ ''اور اس شادی میں شرکت کے لیے آپ تین دن کی چھٹی لے کر گھوٹکی گئے تھے..... میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تین دن کے لیے گھوٹکی گیا تھا۔''

''تاریخ.....؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔ ''سرفراز علی کا نکاح کس تاریخ کو ہوا تھا؟''

''چودہ اکتوبر کو اس کا نکاح ہوا اور اس سے اگلے روز اس کا ولیمہ تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''یعنی اس کا ولیمہ پندرہ اکتوبر کو ہوا تھا؟''

''جی ہاں!''

''آپ کی چھٹی کا دورانیہ کیا رہا تھا؟'' میں نے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔ ''میرا مطلب ہے، آپ کراچی سے کس تاریخ کو روانہ ہوئے اور آپ کی واپسی کس تاریخ کو ہوئی تھی؟''

''میں بارہ اکتوبر کی رات ہی کراچی سے روانہ ہو گیا تھا۔'' اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''اور میں سولہ اکتوبر کی شام واپس کراچی آ گیا تھا۔''

میں نے صفائی کے گواہ کو چند لمحات کے لیے نظر انداز کیا اور اپنی فائل میں سے اس اسٹامپ پیپر کی فوٹو کاپی نکال لی جو آٹھ لاکھ روپے کی لین دین کے ذیل میں ڈاکٹر عمیر اور نافع شاہ کے درمیان ایگریمنٹ کی حیثیت کا حامل تھا۔

''یور آنر!'' میں نے مذکورہ فوٹو کاپی جج کو دکھاتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''نافع شاہ نے آٹھ لاکھ روپے میرے مؤکل کو ادھار دینے کے ثبوت کے طور پر جو ایگریمنٹ تیار کروایا تھا، یہ اس کی کاپی ہے۔ اس دستاویز کے مطابق گزشتہ سال مؤرخہ پندرہ اکتوبر کو نافع شاہ نے میرے مؤکل ڈاکٹر عمیر احمد کو، دو گواہان طارق محمود اور امداد علی کی موجودگی میں مبلغ آٹھ لاکھ روپے ادھار دیے تھے جو کہ میرے مؤکل نے ایک ماہ کے بعد واپس کرنا تھے۔ مذکورہ ایگریمنٹ پر میرے مؤکل کے دستخط تو یقیناً جعلی ہیں ہی، علاوہ ازیں صفائی کے گواہ امداد علی کا یہ دعویٰ بھی ریت کی دیوار ثابت ہو چکا ہے کہ نافع شاہ نے اس کے سامنے پندرہ اکتوبر کے دن میرے مؤکل کو آٹھ لاکھ روپے بطور قرض دیے تھے کیونکہ.....!'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''کیونکہ صفائی کے گواہ امداد علی نے ابھی معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وہ بارہ اکتوبر کی رات سے سولہ اکتوبر کی شام تک کراچی میں موجود ہی نہیں تھا۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ جب پندرہ اکتوبر کے روز امداد علی گھوٹکی میں اپنے چھوٹے بھائی سرفراز احمد کی ولیمے کی تقریب اٹینڈ کر رہا تھا تو پھر کراچی میں اسی وقت نافع شاہ اس کے سامنے میرے مؤکل کو آٹھ لاکھ روپے بطور قرض کیسے دے سکتا ہے؟ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ پندرہ اکتوبر کے

www.pklibrary.com

دن نافع شاہ نے اپنے لیے جو قبر کھودی تھی، امداد علی اس قبر میں دفن ہونے کا خواہشمند ہے۔ ویٹس آل یور آنر!''

جج نے ناپسندیدہ نظر سے امداد علی کی طرف دیکھا اور ناگواری سے پوچھا۔ ''تم نے اپنی دروغ گوئی سے معزز عدالت کو دھوکا دینے کی کوشش کیوں کی؟''

اس کے پاس کوئی معقول جواب نہیں تھا اس لیے وہ سراسیمہ نظر سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ''آئیں، بائیں، شائیں'' کر کے رہ گیا۔

جج نے وکیل صفائی سے کہا۔ ''آپ اپنا اگلا گواہ پیش کریں۔''

امداد علی کے چھوٹے بھائی سرفراز کی شادی اور اس میں امداد علی کی شمولیت کے حوالے سے تمام تر معلومات مجھے ڈاکٹر عمیر کے دوست مبین علی نے فراہم کی تھیں۔ میں نے کیس کی ابتدا ہی میں شازیہ، ڈاکٹر عمیر اور مبین علی کو اس نوعیت کے ''کام'' میں لگا دیا تھا۔

صفائی کے اگلے گواہ کی حیثیت سے طارق محمود گواہی دینے وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ طارق محمود کے بارے میں شازیہ نے مجھے بہت کچھ بتا رکھا تھا کیونکہ یہ بندہ میرے مؤکل اور اس کی بہن شازیہ کا سگا بھانجا تھا۔ اگر اس کے لیے ''مارِ آستین'' کی ترکیب استعمال کی جائے تو عین مناسب ہوگا۔

طارق محمود کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل صفائی نے سرسری سی جرح کے بعد اسے فارغ کر دیا۔ اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔ اگر کبھی آپ کاسٹی کورٹ (سیشن کورٹ) جانا نہیں ہوا تو اکیوزڈ باکس اور وٹنس باکس کی اصل صورت آپ کے ذہن میں نہیں آسکتی کیونکہ ڈراموں اور فلموں نے آپ کے حافظے میں کمرائے عدالت یعنی کورٹ روم کا جو تصور محفوظ کر رکھا ہے، وہ لوئر کورٹس سے خاصا مختلف ہے۔

طارق محمود کی عمر پچیس اور ستائیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ متناسب البدن اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کے چہرے کے خال وخط اور آنکھوں سے جھلکتے تاثرات سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک جذباتی اور بیوقوف قسم کا انسان تھا۔

''طارق صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں سوال کیا۔ ''کیا نافع شاہ نے آپ کے سامنے ڈاکٹر عمیر کو آٹھ لاکھ روپے ادھار دیے تھے؟''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' ڈیفنس کونسلر نے برہمی بھرے تیز لہجے میں کہا۔ ''میرے مؤکل کی طرف سے آٹھ لاکھ روپے قرض کے سلسلے میں جو دستاویز داخلِ عدالت کی گئی ہے، اس کے دو گواہوں میں سے ایک طارق محمود بھی ہے۔ اس ڈاکیومنٹ کے بعد میرے فاضل دوست کو یہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آنا چاہیے کہ میرے مؤکل نافع شاہ نے اس کے سامنے ڈاکٹر عمیر کو آٹھ لاکھ روپے بطور قرض دیے تھے یا نہیں۔''

''یور آنر! مذکورہ ڈاکیومنٹ کی حقیقت کھل جانے کے بعد ہی تو اس سوال کی ضرورت اجاگر ہوئی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جیسا کہ معزز عدالت جانتی ہے، اس ایگریمنٹ کے دو گواہوں میں سے ایک یعنی نافع شاہ کا ڈرائیور امداد علی تھوڑی دیر پہلے ایک جھوٹا اور بوگس گواہ ثابت ہو چکا ہے۔ یہ ایگریمنٹ جس وقت تیار کیا گیا، اس تاریخ کو امداد علی کھوکھی میں یعنی جائے وقوعہ سے کئی میل دور اپنے چھوٹے بھائی کی تقریب ولیمہ میں شریک تھا۔ چونکہ ان دونوں گواہان میں ایک چیز قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے گواہ طارق محمود.....''

''کون سی قدرِ مشترک؟'' ڈیفنس کونسلر میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔

''یہ دونوں افراد نافع شاہ کے ملازم ہیں۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا۔ ''امداد علی، نافع شاہ کا ڈرائیور ہے اور طارق محمود، نافع شاہ کے آفس میں کام کرتا ہے۔''

وکیل صفائی نے ایسی شاکی نظر سے اپنے گواہ طارق محمود کی طرف دیکھا جیسے اسے گواہ کے نافع شاہ کے ہاں ملازم ہونے کی خبر نہ ہو۔

''آبجیکشن اوور رولڈ!'' وکیل صفائی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی جج کی آواز کورٹ روم میں گونجی۔

''مسٹر بیگ! پلیز پروسیڈ فردر!''

''طارق صاحب! ابھی تک آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' میں نے صفائی کے گواہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا نافع شاہ نے آپ کی موجودگی میں میرے مؤکل ڈاکٹر عمیر احمد کو آٹھ لاکھ روپے بطور قرض دیے تھے؟ اگر امداد علی کی طرح آپ بھی پندرہ اکتوبر کے دن جائے وقوعہ پر نہ پائے گئے تو پھر آپ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔''

میرے الفاظ کی سنگینی کو کسی حد تک محسوس کرتے ہوئے اس نے اضطراری لہجے میں جواب دیا۔ ''میں اس روز کراچی ہی میں تھا اور..... نافع سر نے میرے سامنے ہی..... ماموں کو..... آٹھ لاکھ روپے دیے تھے.....!''

''ماموں؟'' وکیل صفائی نے بے ساختہ کہا پھر طارق

www.pklibrary.com

محمود سے استفسار کیا۔ ''تم نے ڈاکٹر عمیر کو ماموں کیوں کہا؟''

''اس لیے کہ آپ کا یہ معزز گواہ میرے مؤکل کی بڑی بہن فوزیہ کا بیٹا ہے۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں وکیل صفائی کو منہ توڑ جواب دیا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ ایک شخص اپنی والدہ کے بھائی کو ماموں نہ کہے تو پھر کیا کہے؟ انگلش میں تو ''انکل'' کا لفظ چچا، ماموں، خالو، تایا اور متعدد سینئر رشتوں پر فٹ کیا جاسکتا ہے لیکن زبان اردو ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے بڑی زرخیز ہے میرے فاضل دوست!''

ان لمحات میں وکیل مخالف مجھے الجھن میں گرفتار نظر آیا۔ اس کی مشکل کو جج کے استفسار نے کندھا دیا تو وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''مسٹر طارق! کیا آپ ڈاکٹر عمیر کے سگے بھانجے ہیں؟'' جج نے صفائی کے گواہ سے پوچھا۔

''یس سر!'' گواہ نے جواب دیا۔

جج مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''پراسیکیوشن! اپنی جرح جاری رکھیں۔''

''طارق صاحب! میری معلومات کے مطابق آپ نے پچھلے سال کے آخری مہینے کے آخری عشرے میں نافع شاہ کے آفس میں جاب شروع کی تھی۔'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر اپنی اہم مگر پیچیدہ جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہو تو آپ میری تصحیح کرسکتے ہیں۔''

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا پھر لمحاتی تذبذب کے بعد جواب دیا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے دسمبر کی بیس تاریخ کو نافع سر کے آفس جانا شروع کیا تھا۔''

''اس سے پہلے آپ کیا کرتے تھے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں کافی عرصے سے بیروزگاری کا عذاب جھیل رہا تھا۔ میں نافع سر کا بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنے آفس میں نوکری دے دی۔''

''آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟'' میں نے دھیرے دھیرے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''میں زیادہ پڑھ نہیں سکا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''میری تعلیم میٹرک تک بھی نہیں ہے۔''

''مطلب، مڈل اور میٹرک کے درمیان؟''

''جی، کچھ ایسا ہی ہے۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''یہی وجہ ہے کہ آپ کو آسانی سے جاب نہیں مل رہی تھی۔'' میں نے اسے اپنی جرح کے گھیرے میں لیتے ہوئے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا نافع شاہ نے آپ کو کسی کی سفارش پر یہ جاب دی تھی؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے مضمحل لہجے میں بولا۔ ''میں نوکری کی تلاش میں یہاں وہاں مارا مارا پھرا کرتا تھا۔ بس ایک روز میں بولٹن مارکیٹ کے علاقے میں سر نافع کے آفس پہنچ گیا۔ انہوں نے میری درد بھری کہانی سنی تو بہت جذباتی ہوگئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرا ڈیڑھ سال کا ایک بچہ بھی ہے مگر روزگار نہ ہونے کی وجہ سے میں اذیت ناک زندگی گزار رہا ہوں اور میرے پاس رہنے کا کوئی معقول ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ یہ سب جاننے کے بعد ان کا دل پسیج گیا اور انہوں نے جاب دینے کے ساتھ ہی مجھے کچھ رقم بھی دی جس سے میں نے ایڈوانس دے کر ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا تھا۔ اب میں سکون سے اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ رہ رہا ہوں!۔''

''ماشاء اللہ!'' میں نے طنز بھرے توصیفی لہجے میں کہا۔ ''آپ کے سر نافع شاہ بڑے خدا ترس اور دیالو انسان ہیں۔ میرے مؤکل کو جب اپنے کلینک کو اسپتال میں بدلنے کا خیال آیا تو اس نے نافع شاہ سے اپنی ضرورت کا ذکر کیا اور حاتم سردار (طے قبیلے کا معروف سخی اور فیاض حاکم) کی خصلت کے مالک نافع شاہ نے فوراً سے پیشتر آٹھ لاکھ روپے میرے مؤکل کو دے دیے اور..... وہ بھی آپ کے سامنے..... ہیں نا؟''

لمحے بھر کو وہ ''نائے پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' ایسی کیفیت کا شکار رہا پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''جی..... ہاں..... بالکل.....!''

''آپ نے ابھی جاب حاصل کرنے کی جو تفصیل معزز عدالت کے سامنے پیش کی ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ گزشتہ سال بیس دسمبر سے پہلے آپ نافع شاہ کو نہیں جانتے تھے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا کر میرا کام آسان کردیا۔ میں نے اپنی جرح کے سلسلے کو وسیع کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یہ درست ہے کہ نافع شاہ کے پاس ملازمت حاصل کرنے سے پہلے آپ میرے مؤکل کی چھوٹی بہن

www.pklibrary.com

شازیہ کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے؟ میرا مطلب ہے کہ اپنی خالہ کے گھر میں جو ایک بیوہ عورت ہے اور وہ اپنے دس سالہ معذور بچے کے ساتھ اپنی سسرال میں جیسے تیسے گزارہ کر رہی ہے؟''

''جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے کڑوا گھونٹ جان کر میرے سوال کو حلق سے نیچے اتارتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔

''کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ آپ کے ناروا سلوک، نکھٹو اور ناکارہ پن کو دیکھتے ہوئے آپ کی والدہ صاحبہ اور میرے مؤکل کی باجی فوزیہ بیگم نے محض سبق سکھانے کے لیے آپ کو گھر سے بے دخل کر دیا تھا؟'' میں نے صفائی کے گواہ طارق محمود پر چڑھائی کرتے ہوئے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ''ان حالات میں آپ کی خالہ شازیہ نے ترس کھا کر آپ لوگوں کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ وہیں پر آپ کو یہ معلوم ہوا کہ کسی نافع شاہ نے آپ کے ماموں یعنی میرے مؤکل ڈاکٹر عمیر پر کوئی مقدمہ کر رکھا ہے۔ چنانچہ جب شازیہ نے سمجھا بجھا کر آپ کو اپنی رہائش کا الگ بندوبست کرنے کو کہا تو آپ اسی کے خلاف ہو گئے۔ آپ نے اپنی شازیہ خالہ کو دھمکی دی کہ اگر اس نے آپ لوگوں کو گھر سے نکالنے کی بات کی تو آپ ماموں اور خالہ کے خلاف نافع شاہ سے جا ملیں گے۔ شازیہ نے آپ کی دھمکی کی پروا کیے بغیر آپ لوگوں کو گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ بیچاری خود سسرال میں جیسے تیسے وقت گزار رہی تھی۔ آپ جیسی جونکوں کا بوجھ اٹھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔''

میں نے اپنی بات ختم کر کے جواب طلب نظر سے صفائی کے گواہ کی طرف دیکھا تو وہ مجھ سے نگاہ چرا کر امداد طلب انداز میں اپنے وکیل کو تکنے لگا۔ اس کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ وکیل صفائی اس کی دادرسی میں ایک دقیقہ بھی فروگزاشت کرتا۔

''آبجیکشن یور آنر!'' کوٹ روم وکیل مخالف کے نعرۂ مستانہ سے گونج اٹھا۔ ''صفائی کے گواہ طارق محمود نے اپنا گھر کیوں چھوڑا، اس کی بیروزگاری کے کیا اسباب ہیں، اس کی والدہ فوزیہ بیگم کی خفگی کی کون سی وجوہ ہیں، ان سب باتوں کا موجودہ کیس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میرے فاضل دوست بیکار کی غیر متعلقہ باتوں میں الجھا کر زیر سماعت کیس کو غلط رخ کی جانب موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر انہیں ایسی حرکتوں سے نہیں روکا گیا تو پھر اس کیس کا فیصلہ آنے میں صدیاں بھی لگ سکتی ہیں۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا جناب عالی!''

''آبجیکشن سسٹینڈ!'' جج نے ڈیفنس کے زخموں پر مرہم کا پھاہا رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ اپنے سوالات کو طارق محمود، نافع شاہ اور ڈاکٹر عمیر تک محدود کرتے ہوئے جرح جاری رکھیں۔''

''تھینک یو یور آنر!'' میں نے متحمل اور مشکور آواز میں کہا۔ ''معزز عدالت کے بتائے ہوئے یہ تینوں کردار اس بوگس ایگریمنٹ میں موجود ہیں جو نافع شاہ نے آٹھ لاکھ روپے کے قرضے کے ضمن میں تیار کروا رکھا ہے۔ میں عدالت کی اجازت چاہتے ہوئے صفائی کے گواہ سے ایک ایسا سوال پوچھنا چاہوں گا جو زیر سماعت مقدمے کی ڈولتی ہوئی نیا کو بہ حفاظت فیصلے کے کنارے تک پہنچا دے گا۔ میرا مطلب ہے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دینے والا چمتکارک سوال!''

جج نے میری بات کو پوری توجہ سے سنا اور معتدل انداز میں کہا۔ ''پرمیشن گرانٹیڈ!''

''طارق صاحب!'' میں نے صفائی کے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سفاک لہجے میں دریافت کیا۔ ''جب آپ گزشتہ سال بیس دسمبر سے پہلے نافع شاہ کو جانتے تک نہیں تھے تو پھر اس سے لگ بھگ دو ماہ پہلے یعنی پندرہ اکتوبر کو ہونے والے آٹھ لاکھ روپے کے ایگریمنٹ پر آپ کے دستخط کا کیا جواز ہے؟ آپ اس بات کے گواہ ہونے پر بضد ہیں کہ نافع شاہ نے آپ کے سامنے میرے مؤکل کو آٹھ لاکھ روپے دیے تھے..... یہ سب کیسے ممکن ہے؟ کیا آپ ماضی میں جانے کی تکنیک یعنی ٹائم ٹریولنگ سے واقف ہیں یا پھر..... نافع شاہ نے نوٹوں سے آپ کا منہ بھر کر اس گھناؤنے کھیل میں ایک مکروہ کردار ادا کرنے کی غرض سے آپ کا ضمیر خرید رکھا ہے؟''

صفائی کے گواہ کے پاس میرے اس سوال کا کوئی بھی جواب ہو نہیں سکتا تھا۔ ندامت، شرمندگی اور احساس گناہ نے اسے مجرمانہ انداز میں گردن جھکانے پر مجبور کر دیا۔ گویا یہ اس کا خاموش ''اقبالِ جرم'' تھا۔

میں نے آئندہ چند منٹ میں طارق محمود کی خاموش کو اپنے دلائل کی زبان دی اور عدالت کی نظر میں یہ ثابت کر دیا کہ صفائی کا یہ گواہ اپنی بعض مجبوریوں کے باعث نافع شاہ جیسے گھاگ شخص کا آلۂ کار بن گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نافع شاہ نے میرے مؤکل کے پانچ لاکھ روپے واپس نہ کرنے کے لیے یہ آٹھ لاکھ روپے والی سازش بُنی تھی جس کا ایک

www.pklibrary.com

کردار طارق محمود بھی تھا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔ وہ پیشی جس پر میں نے نافع شاہ کے فراڈ کے ثابوت میں آخری کیل ٹھونکنا تھی۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور وٹنس اسٹینڈ پر نافع شاہ کھڑا تھا۔ یہ کمبخت بڑی مشکل سے ہاتھ آیا تھا۔ پچھلی تین پیشیوں پر وہ میڈیکل سرٹیفکیٹ دے کر عدالتی کارروائی سے بچ نکلا تھا پھر بیچ میں عدالت کی سالانہ چھٹیاں بھی آگئیں اور اب تو ماہ اگست کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس دوران میں شازیہ نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرانے کے بعد وکیل مخالف کی جرح کا سامنا کرلیا تھا۔ وہ وکیل صفائی کے ہر تیز و تند سوال کے سامنے جرأت مندی سے ڈٹی کھڑی رہی تھی۔ اس پیشی پر وکیل صفائی نے نافع شاہ سے کچھ نہیں پوچھنا تھا لہٰذا عدالت کی اجازت سے میں اس کے نزدیک چلا گیا۔

''شاہ جی! طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے طنزیہ انداز میں استفسار کیا۔

وہ خشک لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہوں۔''

''شکرِ خدا..... آپ ٹھیک ہوگئے۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تو چلیں پھر شروع کرتے ہیں۔'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر نافع شاہ کی دھلائی کا آغاز کردیا۔

''آپ ''فوڈ کنگ'' نامی ریسٹورنٹ سے تو اچھی طرح واقف ہوں گے شاہ جی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''مذکورہ ریسٹورنٹ گلشن اقبال کے علاقے میں، آپ کے مرحوم دوست اور میرے مؤکل ڈاکٹر عمیر کے بہنوئی کے گھر کے انتہائی قریب واقع ہے؟''

واضح رہے کہ یہاں پر ''فوڈ کنگ'' ریسٹورنٹ کو فرضی نام کے طور پر درج کیا جارہا ہے۔ کسی قسم کی مطابقت اتفاقیہ ہوسکتی ہے لہٰذا اسے سنجیدہ لینے کی ضرورت نہیں۔

''وکیل صاحب! میری رہائش سمن آباد کے علاقے میں ہے۔'' وہ بے حد اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''گلشن اقبال کے کسی ریسٹورنٹ سے بھلا میرا کیا لینا دینا؟''

''یہ تو میں نے اس لیے پوچھ لیا کہ آپ شازیہ کے مرحوم شوہر اور اپنے دوست سے ملنے اس کے گھر جایا کرتے تھے۔'' میں نے فرمائی کرنے سے پہلے مچھلی پر مسالا لگاتے ہوئے شریر لہجے میں کہا۔ ''یہ ریسٹورنٹ آپ کے دوست کے گھر کے پاس ہی تو ہے۔ میں ''فوڈ کنگ'' کی بات کررہا ہوں۔''

''وہ فوڈ کنگ ہو یا فوڈ کوئین.....!'' وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے آج سے پہلے کبھی اس ریسٹورنٹ کا نام نہیں سنا۔ وہاں جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''چلیں، میں آپ کو اس ریسٹورنٹ میں لے جاکر یہ سوال پیدا کردیتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میرے اس سوال کا جواب آپ اپنے اندر سے نکالیں گے۔ اگر نہیں نکالیں گے تو مجبوراً آپ کو کسی میٹرنٹی ہوم میں لے جانا پڑے گا، چاہے اس جواب کو پیدا کرنے کے لیے آپ کو کتنی بھی تکلیف کیوں نہ اٹھانا پڑے۔''

''یہ کیا بکواس کررہے ہیں آپ؟'' وہ آپے سے باہر ہوگیا اور منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے انتہائی بدتمیزی سے مستفسر ہوا۔ ''آپ کو وکیل کس نے بنایا ہے؟ آپ کو تو ذرا سی تمیز نہیں ہے کہ کسی معزز انسان سے بات کس طرح کرتے ہیں۔''

اس موقع پر وکیل صفائی بھی بھلا کہاں نچلا بیٹھنے والا تھا۔ ''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' اس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''پراسیکیوشن میرے مؤکل کی عزت پر حملہ کررہا ہے۔ یہ ایک طرح سے توہینِ عدالت بھی ہے۔''

''آبجیکشن سسٹینڈ!'' جج نے دوٹوک انداز میں کہا پھر مجھے ہدایت دیتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''بیگ صاحب! آپ نافع شاہ سے فوڈ کنگ نامی ریسٹورنٹ کے بارے میں جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں، اس کے لیے گھماؤ پھراؤ کے بجائے سیدھے اور دوٹوک سوال کریں۔''

''اٹس او کے یور آنر!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میں معزز عدالت کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں جس سے یہ ثابت ہوجائے گا کہ نافع شاہ چند ماہ پہلے فوڈ کنگ نامی ریسٹورنٹ میں گیا تھا اور وہ بھی میرے مؤکل کی چھوٹی بہن شازیہ کے ساتھ ایک خفیہ ملاقات کرنے۔''

''آپ ایسی کون سی چیز عدالت کو دکھانا چاہتے ہیں بیگ صاحب؟'' جج نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے میں نے اپنے اسسٹنٹ ناصر خان کی محنت کا شاہکار وہ چار تصاویر اپنے بریف کیس میں سے نکال کر جج کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا۔

''ان میں ہر تصویر کے بالائی، بائیں کونے میں فوٹو گرافی کی تاریخ اور ریئل ٹائم کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر اب

www.pklibrary.com

بھی نافع شاہ فوڈ کنگ میں جانے سے انکاری ہے تو پھر میں اس ریسٹورنٹ کے اسٹاف کو گواہی کی غرض سے عدالت میں لانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ دیٹس آل یور آنر!''

وہ چاروں تصاویر مختلف زاویوں سے کھینچی گئی تھیں جن میں نافع شاہ اور شازیہ کے چہرے بڑے واضح نظر آرہے تھے۔ جج نے حیرت بھری دلچسپی سے باری باری ان تصاویر کو دیکھا پھر انہیں وکیل صفائی کی جانب بڑھاتے ہوئے نافع شاہ سے استفسار کیا۔

''یہ سب کیا ہے؟''

نافع شاہ کی ابلیسی حاضر دماغی کو ''خراج تحسین'' پیش کرنا تو بنتا ہے۔ جج کے سوال کے جواب میں اس نے عیاری بھری گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جج صاحب! شازیہ نے اس ریسٹورنٹ میں ملنے کے لیے مجھ سے درخواست کی تھی اس لیے میں وہاں جانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ اس مقدمے کا کوئی آسان تصفیہ چاہتی تھی۔ یعنی وہ مجھے اس بات پر آمادہ کرنا چاہتی تھی کہ اگر میں کیس واپس لے لوں تو ڈاکٹر عمیر ایک سال کے اندر میرے آٹھ لاکھ روپے اقساط کی صورت واپس کر دے گا لیکن میں نے شازیہ کی تجویز نما درخواست کو ماننے سے انکار کر دیا اور وہاں سے اٹھ آیا۔ ان چوری چھپے لی گئی تصاویر کی بس اتنی سی حقیقت ہے۔''

''یہ حقیقت نہیں بلکہ حقیقت کا مسخ شدہ چہرہ ہے جناب عالی!'' میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''اگر نافع شاہ اس غلط فہمی بلکہ خوش فہمی کا شکار ہے کہ یہ چار تصاویر خاموش رہ کر اس کے کالے کرتوت پر پردہ ڈال دیں گی تو میں ہرگز، ہرگز، ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

''تو پھر آپ کیا کریں گے؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے چٹانی لہجے میں کہا۔ ''میں ان تصاویر کو بولنے پر مجبور کر دوں گا، چاہے اس کے لیے مجھے کوئی ایسا راستہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے جو عدالت کی نظر میں عموماً قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا۔''

''یہ عدالت اس معمے کو حل کرنے میں گہری دلچسپی رکھتی ہے وکیل صاحب!'' جج نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ بولیں نہیں، کر کے دکھائیں۔''

میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے وہ ننھا منا وائس ریکارڈر برآمد کیا جس میں شازیہ نے ''فوڈ کنگ'' ریسٹورنٹ میں ہونے والی اپنی اور نافع شاہ کی باتوں کو بڑی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ محفوظ کیا تھا۔ جب میں نے اس ڈیوائس کا ''پلے'' والا بٹن دبا کر اسے جج کی میز پر رکھا تو کمرائے عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ وہاں موجود ہر ذی نفس اس ریکارڈر سے خارج ہونے والی آوازوں پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔

''شاہ جی! آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں.....؟''

شازیہ نے شاکی لہجے میں کہا۔ ''ایک تو بھائی جان نے چینی کی خریداری کے لیے آپ کو پانچ لاکھ روپے دیے، اوپر سے آپ نے ان کی رقم واپس کرنے کے بجائے جوابی کیس کر دیا ہے۔ مجھے کسی قسم کا منافع نہیں چاہیے۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔ ''آپ نے بھائی جان سے چینی کی کوئی بڑی لاٹ اٹھانے کے لیے جو پانچ لاکھ روپے لیے تھے، بس آپ وہ واپس کر دیں۔''

''میں نے کب انکار کیا ہے کہ میں نے تمہارے بھائی سے پانچ لاکھ روپے نہیں لیے۔'' نافع شاہ نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''میں تو ڈاکٹر کی رقم لوٹانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس نے میرے ساتھ جو سلوک کیا، اس کے بعد میرے دل میں تمہارے بھائی کے لیے ذرا سی بھی جگہ نہیں ہے۔''

''آخر بھائی جان نے ایسا کیا کر دیا؟'' شازیہ نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''جب رقم کی واپسی میں دیر ہو رہی تھی تو اس نے فون کر کے مجھے گالیاں دی تھیں۔'' نافع شاہ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی بے عزتی بھلا کیسے برداشت کر سکتا تھا۔''

''اگر آپ بھائی جان کی تلخ باتوں سے اتنا زیادہ خفا ہو رہے ہیں تو آپ اس سے دس گنا زیادہ گالیاں انہیں دے دیں۔'' شازیہ نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''لیکن خدارا! وہ پانچ لاکھ روپے واپس کر دیں جو ہم نے آپ کو چینی کی خریداری کے لیے دیے تھے۔''

''تم نے یہ کیا ''چینی، چینی'' کی رٹ لگا رکھی ہے؟'' نافع شاہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''اس ریسٹورنٹ میں ملاقات کے لیے میں نے تمہیں بلایا ہے اس لیے اپنا رونا پیٹنا بند کرو اور دھیان سے میری بات سنو۔''

''میں سن رہی ہوں۔'' شازیہ نے جلدی سے کہا۔ ''بتائیں، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

نافع شاہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اگر ڈاکٹر عمیر کیس واپس لے لے تو میں پانچ لاکھ روپے واپس کرنے کو تیار ہوں لیکن یہ رقم میں تمہارے بھائی کو ہرگز نہیں

www.pklibrary.com

دوں گا۔ اس نے مجھے جو کھری اور کڑوی سنائی ہیں، میں انہیں کسی قیمت پر بھلا نہیں سکتا۔"

"اگر آپ پانچ لاکھ روپے بھائی جان کو نہیں دیں گے تو پھر کسے دیں گے؟" شازیہ نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

"تمہیں۔" نافع شاہ نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن جب تمہارا بھائی اپنا مقدمہ واپس لے چکے گا تو..... اور ہاں.....!" لمحاتی توقف کر کے اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "یہ رقم میں ایک لاکھ روپے ماہانہ کے حساب سے ادا کروں گا۔ یوں سمجھو کہ اس سال کے آخر میں پانچ لاکھ روپے تمہیں واپس مل چکے ہوں گے۔ اگلی پیشی میں ابھی کافی دن باقی ہیں۔ اس سے پہلے تم مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔"

شازیہ نے اس نازک موقع پر کوئی بحث یا اختلاف نہیں کیا اور سمجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے، میں بھائی جان سے مشورہ کرنے کے بعد آپ کو بتا دوں گی۔"

اس کے بعد اس ڈیوائس سے آوازیں ابھرنا موقوف ہو گئیں۔ اب کہنے سننے کو کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ وکیل صفائی اور اس کے مؤکل کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ بے معنی اور ہراساں نظروں سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

جیسے ہی وہ ریکارڈنگ ختم ہوئی، کورٹ روم میں موجود افراد چہ میگوئیوں میں مصروف ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرائے عدالت پچھلی بازار کا نقشہ پیش کرنے لگا۔

"آرڈر، آرڈر!" جج نے چوبی ہتھوڑے کا استعمال کر کے سامعین کو خاموش کرانے کی مؤثر کوشش کی۔ "آرڈر ان مائی کورٹ پلیز!"

اگلے ہی لمحے سب کچھ اعتدال پر آ گیا۔

جج نے دو روز بعد کے لیے فیصلے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ "دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!"

☆☆☆

ہمارا کیس کرسٹل کلیئر تھا۔ میں نے قدم بہ قدم نافع شاہ کی سازش کو بے نقاب کیا تھا اور گزشتہ پیشی پر میں نے جج کے سامنے جو تصاویر اور ریکارڈنگ پیش کی تھی، اس نے نافع شاہ کا گھناؤنا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگرچہ آج سے چالیس سال پہلے ریکارڈنگ وغیرہ جیسے ثبوت کو عدالت زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی لیکن ہمارے کیس میں شازیہ اور نافع شاہ کی "فوڈ کنگ" ریسٹورنٹ والی گفتگو نے نافع شاہ کے مجرم ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ جج کے کڑے استفسار پر وہ انکار نہیں کر سکا تھا کہ شازیہ اور اس کی بات چیت اصلی نہیں تھی۔ اسے اپنا جرم قبول کرتے ہی بنی تھی۔

اس پیشی پر جج نے اپنا عادلانہ فیصلہ سنا دیا تھا جس کے مطابق عرصہ تین یوم میں نافع شاہ نے ڈاکٹر عمیر کو مبلغ چھ لاکھ روپے ادا کرنا تھے جن میں پانچ لاکھ روپے اصل زر تھا، دس ہزار روپے طے شدہ منافع اور نوّے ہزار روپے اس ذہنی اذیت کی مد میں تھے جو پچھلے آٹھ ماہ میں شازیہ اور اس کے بھائی ڈاکٹر عمیر نے برداشت کی تھی۔ علاوہ ازیں عدم ادائیگی کی صورت میں پاکستان پینل کوڈ (تعزیرات پاکستان) کی دفعہ چار سو بیس کے تحت نافع شاہ کو عرصہ سات سال کے لیے جیل جانا ہوگا۔ ایک لاکھ روپے جرمانہ اس کے علاوہ تھا۔

نافع شاہ ایک آسودہ حال شخص تھا۔ اگرچہ وہ ڈاکٹر عمیر اور شازیہ جیسے سادہ لوح انسانوں کو لوٹ کر ہی دولت مند بنا تھا۔ اس کے لیے سات سال کی جیل کاٹنے سے کہیں آسان چھ لاکھ روپے ادا کرنا تھا چنانچہ اس نے اگلے ہی روز ڈاکٹر عمیر کو اس کی دبائی ہوئی رقم اور اضافی ایک لاکھ روپے ادا کر دیے۔ یہ ادائیگی بھی کورٹ ہی میں ہوئی تھی۔

یہ معاملہ پوری طرح نمٹ گیا تو ڈاکٹر عمیر نے مجھ سے کہا۔ "میری تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کہ ہم یہ کیس کیسے جیت گئے ہیں؟"

"کیوں؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"ہم اس وقت جس اندھیر نگری میں سانس لے رہے ہیں، وہاں انصاف کا حصول تو قصے کہانیوں جیسا لگتا ہے۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

"قصے اور کہانیاں بھی انسانوں ہی کی بنائی اور سنائی ہوئی ہوتی ہیں ڈاکٹر صاحب!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اصل چیز ہے نیت اور کوشش۔ اگر انسان کی نیت صاف اور کوشش بے دریغ ہو تو انصاف خود چل کر اس کے پاس آ جاتا ہے پھر یہی اندھیر نگری، گلزار محسوس ہونے لگتی ہے۔"

وہ عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس سے الوداعی مصافحہ کیا اور پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھ گیا۔

(تحریر: حُسام بٹ)

www.pklibrary.com

سود و زیاں

زویا صفوان

زندگی ہر انسان کے لیے سب سے زیادہ قیمتی متاع تصور کی جاتی ہے اور جب یہ احساس کسی کو بے چین کردے کہ اس قیمتی متاع کا ایک ایک لمحہ کوئی اور جیتا ہے اور اس کے حصے کی تمام خوشیاں کسی اور کا حصہ ہیں اور بہت آخر میں... جب وہ خالی ہاتھ رہ جائے تو وقت کا کوئی ایک لمحہ اسے آگاہی دے کہ اس کی تمام تر کاوشیں بے سود و زیاں ہیں تو شاید دنیا میں کوئی بھی اس کی اذیت کا ادراک نہ کرپائے۔

اپنوں کی محبت میں اپنی زندگی لٹانے والی ایک مخلص مگر قلاش دوشیزہ کا احوال

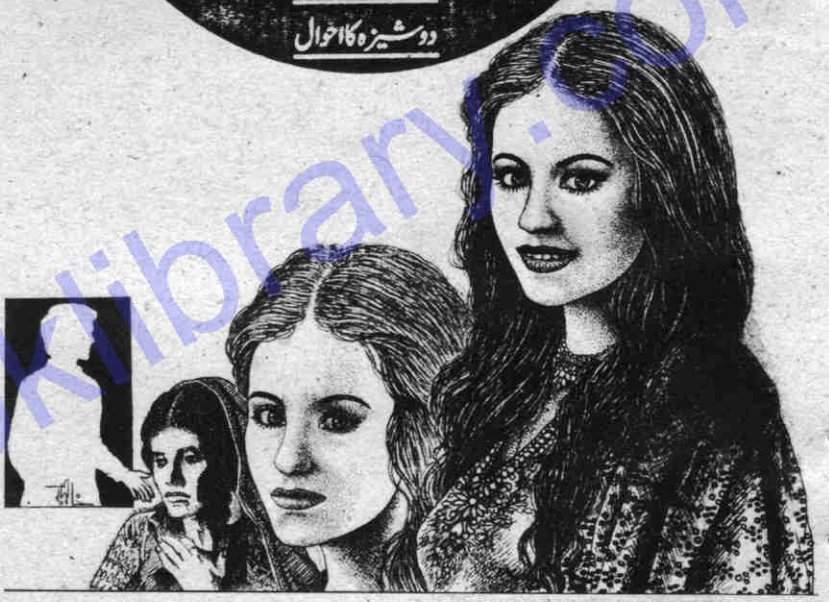

سورج تیزی سے مغربی افق کی جانب جھک رہا تھا۔ نیم تاریک کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی ہما کسی ہیولے کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی نظریں آئینے میں اس طرح پیوست تھیں گویا کوئی نادیدہ نقوش تلاش کررہی ہوں۔ کچھ ہی دیر میں سورج نے مغرب کی آغوش میں اپنا رخ مکمل طور پر چھپالیا اور نیم تاریکی کامل اندھیرے میں ڈھل گئی۔

نادیدہ ہیولے سے ارتکاز ختم ہوا تو ہما نے خودکار انداز میں کمرا برقی روشنی سے روشن کردیا۔ اس بار آئینے میں نظر پڑتے ہی اسے اپنا بے ترتیب بستر اور منتشر کتابیں دکھائی دیں۔ بستر کی ہر سلوٹ اسے استہزا کرتی محسوس ہوئی تھی۔ ہما نے بے ساختہ ہی نظریں چرالیں۔

اسی پل نگاہ آئینے سے منعکس ہوتی دیوار پر ٹھہر گئی جہاں

www.pklibrary.com

رواں برس کا کیلنڈر آویزاں تھا۔ کیلنڈر پر جگمگاتے چند ہندسے اس کے ذہن پر ہتھوڑا زنی کرنے لگے۔ دماغی رو میں شدید تلاطم پیدا ہو گیا تھا۔ اس تلاطم کا مدوجزر کچھ لمحوں کے لیے اپنے جوبن پر رہا پھر ایک نکتے نے اسے یکلخت جامد کر دیا۔ نگاہوں سے جھلکتا اضطراب اور وحشت بھی ایک پل میں نابود ہو کر شدید احساسِ زیاں میں ڈھل گئی۔

☆☆☆

اس سادہ سے ڈرائنگ روم میں نفاست کا عنصر غالب تھا۔ شمالی اور جنوبی دیوار کے ساتھ صوفے سجے تھے۔ مشرقی دیوار پر اسمائے الحسنیٰ پر مبنی قطعات اور مشرقی سمت میں ایک کھڑکی پر قدرے سستے تاہم صاف ستھرے اور نفیس پردے لٹک رہے تھے۔ کمرے کے وسط میں لکڑی کی ایک صاف ستھری میز رکھی تھی جس پر اس وقت مختلف اشیائے خورونوش موجود تھیں۔

''بچی کو بلوا دیجیے پلیز!'' سہ نشستی صوفے پر دو ادھیڑ عمر خواتین کے ساتھ بیٹھی ایک درمیانی عمر کی عورت نے اپنے سامنے بیٹھی خاتون سے کہا۔

''جی! ابھی بلوا دیتی ہوں۔'' خاتون نے نرمی سے مسکرا کر کہا۔ اس کی عمر تقریباً پچپن سال، قد درمیانہ اور رنگت سرخ و سفید تھی۔ وہ باوقار انداز میں اٹھ کر کمرے سے باہر گئی اور چند ہی لمحوں میں اپنی معیت میں ایک پچیس، چھبیس سالہ لڑکی کو اندر لے آئی۔

لڑکی کا رنگ گندمی، بال لمبے اور قد اپنی والدہ سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس کے چہرے پر معصومیت اور سنجیدگی کا ایک انوکھا ملاپ تھا۔ لباس صاف ستھرا تاہم بے حد سادہ تھا۔ سر پر چادر سلیقے سے اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی تینوں مہمان خواتین اور مرد کو اجتماعی طور پر سلام کیا اور ان کے مقابل یک نشستی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کیا نام ہے بیٹا آپ کا؟'' ایک خاتون نے ملائمت سے پوچھا۔ وہ ان میں سب سے عمر رسیدہ تھی۔

''جی، ہما۔'' لڑکی نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔ اس کی آواز میں بھی سنجیدگی اور ٹھہراؤ تھا۔

''کتنا پڑھی ہیں آپ؟'' دوسری خاتون نے دریافت کیا۔

''انگلش لٹریچر میں ماسٹرز اور بی ایڈ ہوں۔'' ہما نے سابقہ انداز میں ہی جواب دیا۔

''کہیں جاب وغیرہ کرتی ہیں کیا؟'' تیسری خاتون نے استفسار کیا۔

''جی! ایک پرائیویٹ کالج میں لیکچرار ہوں۔''

''کوکنگ وغیرہ تو آتی ہوگی آپ کو؟'' پہلی خاتون نے پوچھا۔

''جی ہاں!'' ہما نے مختصراً جواب دیا۔

خواتین نے ایک بار پھر تولتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے چند مزید سوالات کیے۔ ہما اسی طرح سادگی اور بے نیازی سے جوابات دیتی رہی۔

''برتن وغیرہ لے جاؤ بیٹا!'' کچھ لمحوں بعد اس کے والد نے کہا۔ شہباز کی عمر ساٹھ سال تھی۔ وہ بادی النظر میں ہی نہایت کم گو اور سنجیدہ مزاج معلوم ہوتا تھا۔

ہما خاموشی سے اٹھی اور برتن اٹھا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

''اچھا بہن جی! چلتے ہیں ہم بھی۔ آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔ اللہ پاک سب کے بچوں اور بچیوں کے نصیب اچھے کرے۔'' ادھیڑ عمر خاتون نے فرزانہ کو مخاطب کیا۔

''ہم اپنے جواب سے جلد ہی مطلع کر دیں گے۔'' دوسری خاتون نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

فرزانہ اور شہباز کے چہروں پر آس جگمگا اٹھی۔ انہیں اپنی بیٹی کے نصیب کھلنے کی امید ہو چلی تھی۔

☆☆☆

مہمانوں کی رخصتی کو تین دن بیت چکے تھے۔ اس شام شہباز اپنے دفتر سے گھر آیا تو بہت پژمردہ دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا ہوا جی! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' فرزانہ تشویش زدہ ہوئی۔

''ہاں، بس ویسے ہی تھکاوٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔'' شہباز نے جواب دیا اور ایک توقف سے کہنے لگا۔ ''ساجد کا فون آیا تھا۔''

''اوہ اچھا..... کیا جواب دیا ہے انہوں نے پھر؟'' فرزانہ رشتہ طے کروانے والے کا نام سنتے ہی چونک گئی۔

''وہی جو ہر بار ملتا ہے۔'' شہباز نے گہری سانس لی۔

''اس بار کیا عذر بنایا ہے؟'' فرزانہ کے لبوں سے سرد آہ برآمد ہوئی۔

''وہی جو ہر بار بنتا ہے۔ لڑکی بہت سادہ ہے۔ مزاج میں رکھائی بھی بہت ہے۔''

شوہر کے یہ الفاظ سماعت کے لیے نئے تو نہیں تھے تاہم اس کے باوجود فرزانہ کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ وہ چند لمحوں کے لیے گنگ ہو گئی۔

www.pklibrary.com

''کھانے کے بعد ہما کو ذرا میرے پاس بھیجنا۔ مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔'' شہباز نے کہا۔

فرزانہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

''دیکھو بیٹے! میں تم سے جو کہنے لگا ہوں، اس کے بعد میری نیت پر کوئی شک نہ کرنا۔'' شہباز نے سنجیدگی سے بیٹی کو مخاطب کیا۔

''جی ابو جی! کہیے، میں سن رہی ہوں۔'' ہما مضطرب ہوئی۔

''نظامِ قدرت میں تبدیلی ایک ناگزیر عمل ہے، اتنا تو جانتی ہو نا؟'' شہباز نے ایک توقف سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

ہما نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''موسم بدلتے ہیں۔ دن اور رات بدلتے ہیں تو انسان کو بھی تو خود کو وقت اور حالات کے مطابق تھوڑا بہت تبدیل کر لینا چاہیے نا؟''

والد کی اس بات پر ہما پل بھر میں ہی سارا پس منظر سمجھ گئی کہ اس رشتے سے بھی انکار موصول ہوا ہے۔ اس نے اپنے الفاظ مجتمع کیے اور حتی الامکان متانت و ادب سے والد کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''ابو جی! میں نے آج تک آپ سے کوئی ناجائز فرمائش نہیں کی۔ کبھی کسی معاملے میں شکایت کا موقع نہیں دیا۔ میرے مزاج میں سادگی ہے۔ میں فیشن سے کوسوں دور بھاگتی ہوں۔ مجھے اپنی نمائش کرنا پسند نہیں۔ میرا مزاج بہت حد تک سنجیدہ ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ مجھے اللہ پاک نے اسی فطرت سے بنایا ہے۔ میرا خمیر اسی مٹی سے گوندھا گیا ہے۔''

''لیکن وقت کے ساتھ ساتھ تھوڑی تبدیلی تو ضروری ہوتی ہے نا میرے بچے!'' شہباز نے اسے سمجھانا چاہا۔

''کیا تبدیل کروں میں؟ تنگ اور چھوٹے کپڑے پہنا کروں..... بال کٹوا کر کندھوں پر بکھیر لوں..... انہیں عجیب رنگوں سے رنگ لوں اور بات کرتے ہوئے خوامخواہ جھٹکا دیا کروں..... باتوں کے دوران اونچے اونچے قہقہے لگایا کروں؟ اگر آپ سب لوگ یہ تبدیلی چاہتے ہیں تو ریئلی سوری! یہ سب میرے بس میں نہیں ہے۔ یہ سب کر کے میں بے حد اوور لگوں گی۔ میں جیسی ہوں، ویسی ہی رہوں گی۔ جس نے مجھے پسند کرنا ہے، ایسے ہی کرے۔''

اس کے دوٹوک انداز پر شہباز اور فرزانہ ساکت رہ گئے۔

''ماں باپ سدا ساتھ نہیں رہتے۔ اللہ پاک تمہارے بہن بھائیوں کو سلامت رکھے لیکن حقیقت یہی ہے کہ فطرت ہمیشہ تبدیلی کی زد میں رہتی ہے۔ بہن بھائی ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔'' انہوں نے بھی دوٹوک کہا۔

ہما کے دونوں بڑے بھائی اور بہن شادی شدہ تھے۔ فرزانہ اور شہباز کو ان کے رشتے طے کرنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ دونوں بیٹوں کے رشتے تو خاندان میں ہی طے ہوئے تھے لیکن سیماب اور ہما کا خاندان میں کوئی جوڑ نہیں تھا۔

''محبت اور خلوص رشتوں کو ہمیشہ پاکیزہ اور مضبوط رکھتے ہیں۔ باقی میری قسمت میں شادی لکھی ہے تو اسی طرح ہوگی۔ جس نے پسند کرنا ہے اسی طرح کرے ورنہ مجھے شادی ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ہما نے جھنجلا کر کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اپنے کمرے میں جاتے ہوئے پردۂ تصور پر احمر کا ہیولا لرز رہا تھا۔ احمر یونیورسٹی میں اس کا ہم جماعت تھا۔ ان کی دوستی قانونِ فطرت کے تحت بہت جلد محبت میں تبدیل ہوگئی تھی۔ احمر اس کی سادگی کا ہی گرویدہ ہوا تھا لیکن اس محبت کا انجام بہت المناک ہوا۔ امتحانات سے ایک مہینا پہلے احمر کی موٹر سائیکل کا حادثہ ہوا جس میں وہ جانبر نہ ہو سکا۔ ہما کی گویا کل کائنات ہی اُجڑ گئی۔ اس کی روح میں بیوگی نے بسیرا کر لیا تھا۔ دنیاداری سے دل اُچاٹ ہو چکا تھا۔

''تم ایک انمول ہیرا ہو ہما!'' اس کی سماعت میں احمر کی سرگوشی گونجی۔ ''سیپ کی طرح قیمتی اور شبنم کے قطروں سی شفاف۔ بس جیسی ہو ویسی ہی رہنا۔''

''ہماری قسمت میں وصل نہیں لکھا تھا احمر! لیکن میں تم سے کیا ہوا یہ عہد ضرور نبھاؤں گی۔ میں خود کو کبھی تبدیل نہیں ہونے دوں گی۔'' ہما نے ایک عزم سے خود کلامی کی۔

اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ فرزانہ اور شہباز کس قدر آزردگی کا شکار ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

ہما کے مختصر کمرے میں اس وقت نصف درجن سے زائد افراد موجود تھے۔ ان سبھی کے چہرے آزردہ اور آنکھیں افسردہ تھیں۔

''یقین ہی نہیں آتا کہ آج ابو کو ہم سے بچھڑے دس سال ہو گئے ہیں۔ ابھی کل کی ہی بات لگتی ہے۔'' ہما کے سب سے بڑے بھائی سہیل نے بوجھل سانس خارج کی۔ وہ سب بہن بھائی شہباز کی برسی کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔

''ہاں، کل کی ہی تو بات لگتی ہے لیکن قیامت تھی وہ۔

www.pklibrary.com

ایک ہولناک قیامت۔'' سیماب نے کہا۔

''واقعی، باپ کا وجود سورج کی طرح ہوتا ہے۔ پُرتپش تو لگتا ہے لیکن اس کے بغیر زندگی تاریکی اور سرد جہنم کے سوا کچھ بھی نہیں۔'' روحیل نے بھی افسردگی سے کہا۔

ہما خاموشی سے آنکھوں میں نمی لیے ان کی گفتگو سنتی رہی۔ گزشتہ ایک دہائی میں اس کی سنجیدگی اور کم گوئی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

''اگلے ماہ کی چوبیس کو امی کو ہم سے بچھڑے آٹھ سال ہوجائیں گے۔'' سہیل کی اہلیہ جویریہ نے رنجیدگی سے کہا۔ اس رنجیدگی میں کسی قسم کا مصنوعی پن یا اداکاری نہیں تھی۔

''امی ابو کی بس ایک ہی خواہش تھی۔'' سیماب نے پہلو بدلا۔

''ہم سب کی دن رات یہی کوشش اور دعا ہے کہ وہ خواہش مکمل ہوجائے۔'' روحیل نے متانت سے کہا۔

''ہاں، لیکن ہماری بہن ہم پر بوجھ بھی نہیں ہے کہ اسے کہیں بھی، کسی بھی کھونٹے سے باندھ دیں۔'' سہیل سنجیدگی سے بولا۔ ''ہما کی شادی اس کی مرضی اور خواہشات کے مطابق ہی ہوگی۔''

''بالکل۔ ہما ہم پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ ایسی بے ضرر نیک طبع اور سیدھی سادی نند قسمت سے ہی نصیب ہوا کرتی ہے۔'' جویریہ نے اپنی دیورانی مائرہ کی طرف دیکھتے ہوئے خلوص سے کہا۔

''اللہ پاک میری بہن کے نصیب بہت اچھے کرے گا۔ اس نے ہم سب کی مشکل میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔ اللہ اس کے صبر، نیک نیتی کا اجر ضرور دے گا۔ اس کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔'' روحیل نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

ہما کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''میں نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ میرا گھر ہے۔ آپ سب میرا خاندان ہیں اور اپنے گھر کو سمیٹے رکھنے کے لیے، گھر والوں کی زندگیوں میں خوشیاں برقرار رکھنے کے لیے میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔''

اس کے پُرخلوص انداز پر وہاں موجود سبھی افراد کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد سہیل، جویریہ، روحیل اور مائرہ اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ہما کے پاس اب صرف سیماب ہی موجود تھی۔ وہ کتنی ہی دیر ہما کو افسردہ نظروں سے دیکھتی رہی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' ہما نے سکوت توڑتے ہوئے استفسار کیا۔

''یہی کہ تم کب تک صرف دوسروں کا خیال رکھتی رہوگی؟ اپنی زندگی کے بارے میں آخر کب سنجیدگی سے سوچوگی؟'' سیماب نے تاسف سے کہا۔

''دوسرے کون؟ تم سب میرے اپنے ہو۔ میرا خون، میرے ماں جائے۔ ہم سب میں کوکھ کی محبت ہے اور کوکھ کی محبت اس دنیا میں والدین کے بعد سب سے طاقتور ہوتی ہے۔'' ہما نے دوٹوک جواب دیا۔

''چلو ٹھیک ہے، مان لیا۔ بالکل درست کہہ رہی ہو لیکن یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ صرف دوسروں کی ضروریات کا خیال رکھتی رہو۔ قسمت نے تمہیں پرائیویٹ کالج سے سرکاری کالج میں ملازمت دلوادی لیکن اس سارے عرصے میں تم نے خود کے لیے کیا بچایا ہے؟'' سیماب نے قدرے ٹھہراؤ سے کہا۔

''تم سب کی محبت بچائی ہے نا اپنے لیے۔'' ہما مسکرائی۔

''دیکھو میری بہن! میں اس وقت بے حد سنجیدہ ہوں۔ کئی سالوں سے دیکھ رہی ہوں، کبھی کسی کے کمرے میں اے سی لگوا کر دے رہی ہو، کبھی کسی کو موبائل خرید کر دے رہی ہو تو کبھی بجلی، گیس کے بل بھر دیتی ہو۔ اپنے لیے کچھ جوڑ کر رکھو۔ اپنے اوپر بھی کچھ خرچ کیا کرو۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، پچھلے تین سال سے تم نے اپنے لیے کوئی کپڑے نہیں بنوائے۔ کالج آتے جاتے عبایہ پہن لیتی ہو۔ ہر کسی کی مدد اور تعاون کے لیے اپنی ذات کو نظرانداز کیوں کردیتی ہو؟''

''تم سب ''کسی'' نہیں ہو۔ پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میرے ماں جائے ہو۔ اپنوں میں سود و زیاں نہیں دیکھا جاتا۔ میرے اپنوں کو جب اور جہاں میری ضرورت ہوگی، میں کبھی پیچھے نہیں ہٹوں گی۔''

ہما کی اس بات پر سیماب افسردگی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ نرم خو، ہمدرد، سنجیدہ مزاج اپنی ذات میں اس قدر الجھنیں نہ سمیٹے ہوتی تو آج اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش باش ہوتی۔

''اچھا، تم نے میرے دوسرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اپنے بارے میں کب سنجیدگی سے سوچوگی؟'' سیماب اصل مدعا کی طرف آئی۔

''میری آج بھی وہی شرط ہے۔ مجھے کوئی میری حیثیت سے قبول کرلے تو میں شادی کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے ہٹ دھرمی سے جواب دیا۔

''تو پھر ایسا رشتہ مل گیا ہے۔ تمہاری سادگی دیکھ کر ہی

www.pklibrary.com

عبداللہ بھائی نے تمہیں پسند کیا ہے۔'' وہ آسودگی سے بولی۔

''تمہارا اشارہ اپنے جیٹھ کی طرف تو نہیں ہے؟'' ہما نے حیرت سے دریافت کیا۔ عبداللہ کی پہلی بیوی کا دو ماہ پہلے تیسرے بچے کی پیدائش کے دوران انتقال ہوا تھا۔

''ہاں، ان کا کہنا ہے کہ تم بچوں کو بڑی محبت سے سمیٹ لوگی۔ دیکھو ہما! اب بھی وقت ہے۔ اپنے لیے سوچو۔ مرد ہو یا عورت، کبھی بھی اکیلے نہیں رہ سکتے۔ ان کا وجود ہی ایک دوسرے کی تکمیل ہوتا ہے۔ پروردگار نے اس رشتے میں ان کی آسودگی اور بقا رکھی ہے۔''

سیماب کی اس بات پر ہما کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ وہ اب عمر کے اس حصے میں آ چکی تھی جب رنڈوے یا دوہاجو رشتے آنے لگے تھے اور ہر بار ہی اس کے دل پر گھونسا لگتا تھا۔ انا کہیں نہ کہیں بلبلا سی اٹھتی۔

''کسی غیر کے بچے سنبھال کر عمر بھر اپنی مامتا اور خلوص کا امتحان دیتے رہنے سے بہتر ہے کہ میں یہاں اپنے خونی رشتوں کا خیال رکھوں۔ میری طرف سے اس رشتے کے لیے انکار ہے۔'' اس نے رکھائی سے کہا اور منہ موڑ کر بستر پر دراز ہو گئی۔

''میری بہن! مجھے تمہارے خلوص سے انکار نہیں۔ میں جانتی ہوں تم ہم سبھی کے لیے صدقِ دل سے معاون رہتی ہو لیکن یہ دنیا بہت ظالم ہے اور رشتے اس سے بھی بڑھ کر سفاک ہوتے ہیں۔ اس کائنات میں انسان سے بڑھ کر کوئی اتنی جلدی رنگ نہیں بدلتا ہوگا۔ ہم کسی کے ساتھ اچھائی کرتے رہیں اور کہیں کسی ایک مقام پر چوک جائیں تو گزشتہ تمام جدوجہد اور خلوص بھلا دیا جاتا ہے۔ میری دعا ہے کہ تم ایسا وقت کبھی نہ دیکھو..... کبھی بھی نہ دیکھو۔'' سیماب کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

ہما منہ موڑے ساکت لیٹی رہی۔ سیماب نے تاسف اور آزردگی سے اسے دیکھا اور اپنے آنسو ضبط کرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

وقت کے پنچھی کی پرواز بہت تیز تھی۔ پانچ سال سبک رفتاری سے بیت گئے۔ ہما کی زندگی کے معمولات بھی جوں کے توں برقرار تھے۔ وہ اہلِ خانہ کے لیے ہر لحاظ سے معاون اور مددگار ثابت ہوا کرتی۔ ان کے بچوں پر جی جان سے قربان رہتی۔ کچھ بھی تو نہ بدلا تھا لیکن نہیں..... کچھ تبدیل ہوا تھا۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ رات کو بستر پر لیٹتے ہی اپنے وجود میں ایک صحرا کی سی ویرانی جانے کیوں محسوس ہوا کرتی۔ ایک خلش تھی جو بے چین رکھنے لگی تھی۔ اب نیند بھی روٹھی ہوئی سہیلی کے مانند تاخیر سے ملنے آتی۔ اس دوران آنکھوں کے گوشوں سے آنسو رینگ کر کنپٹیوں میں جذب ہو جاتے۔ احمر کا خیال، یادیں اور پیمان دھول سے اٹے محسوس ہوتے۔ بے جان، کھوکھلے، بے سود۔

مزاج کی سنجیدگی اب واضح پژمردگی، بیزاری اور تلخی میں ڈھلنے لگی تھی۔ نتیجتاً وہ بچوں کو شور و غل اور شرارت پر ڈانٹ بھی دیا کرتی پھر جب غصہ کچھ سرد ہوتا تو انہیں منانے کے لیے چاکلیٹ، آئس کریم اور مختلف النوع کھلونے خرید لاتی۔

یہ معمولات کچھ عرصہ یونہی جاری رہے پھر ایک طوفان نے سب کچھ تلپٹ کر دیا۔

☆☆☆

سرما کے اس یخ بستہ روز بارش نے مزید قہر ڈھا رکھا تھا۔ ہما دو روز سے نزلہ اور بخار میں مبتلا تھی۔ اس روز طبیعت زیادہ بوجھل ہوئی تو گیارہ بجے ہی گھر چلی آئی۔ اہلِ خانہ اپنے اپنے کمروں میں مصروف تھے۔ کسی نے اس کی آمد پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔ کمرے کے دروازے پر پہنچتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اسے اندرونی سمت سے اپنی بڑی بھتیجی ماہ نور کی آواز سنائی دی تھی۔ اگلے ہی لمحے اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ محوِ گفتگو ہے۔ ہما نے دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ یکدم ساکت رہ گئی۔

''شکر ہے تمہارے گھر میں کوئی تو پرائیویسی ملی ورنہ سکون سے بات ہی نہیں ہو پاتی تھی۔''

ہما نے یہ آواز پہچان لی تھی۔ یہ ماہ نور کے بچپن کی سہیلی ردا تھی۔

''ہمارا گھر بھی تو نرا چڑیا گھر ہے۔'' ماہ نور کی کوفت زدہ آواز آئی۔ ''کتنی بار مما پاپا سے کہا ہے کہ کہیں باہر گھر لے لیں لیکن سنتے ہی نہیں ہیں۔ کہتے ہیں یہ گھر فروخت نہیں کر سکتے۔ دادا ابو نے وصیت میں پھپو کے نام کر دیا تھا اور اپنا ذاتی گھر لینے یا کرایہ بھرنے کی کسی میں ہمت نہیں۔''

''تو تمہاری پھپو نے شادی نہیں کرنی کیا؟ اچھی خاصی شکل و صورت کی ہیں۔ اب تک تو ان کے اپنے بچے جوان ہو جاتے۔'' ردا نے تجسس سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ مجھے لگتا ہے یہ سادگی وغیرہ صرف ڈراما ہے۔ ضرور کسی بوائے فرینڈ نے شادی کا وعدہ کر کے دھوکا دے دیا ہوگا۔ اسی کے روگ میں اب تک ایسے بیٹھی ہیں۔ پتا نہیں کب جان چھوٹے گی۔ زندگی عذاب بنا کر رکھ دی ہے۔ ہر وقت غصہ، ہر وقت چخ چخ۔''

www.pklibrary.com

ماہ نور کی بیزاری ہما کے لیے اپنی ہی ساعت پر یقین کرنا دشوار بنا رہی تھی۔ سولہ سالہ ماہ نور اس کی چہیتی ترین بھتیجی تھی جس کی ہر ضد اور خواہش بلا تامل پوری کی تھی۔

''تمہارے ماما، پاپا کچھ نہیں کہتے کیا؟'' ردا نے پوچھا۔

''پاپا اور چاچو تو بس اس لیے چپ ہو جاتے ہیں کہ بل وغیرہ دے دیتی ہیں پھپو۔ مما اور چاچی پہلے چپ کر کے برداشت کر لیتی تھیں لیکن اب ان کی چیخ چیخ اور بیزاری سے وہ بھی تنگ رہنے لگی ہیں۔ وہ تو بس پھپو ذرا.....''

ردا کے فون کی گھنٹی بجنے پر ماہ نور نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ہما اس ادھوری بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ جویریہ اور مائرہ بھی یقیناً گھریلو اخراجات میں اس کے عملی تعاون اور اخلاقی دباؤ کے تحت کچھ نہیں کہتی تھیں۔ وقت کی گرد نے یقیناً بہت کچھ تبدیل کر دیا تھا۔ ہما کو اپنا وجود کرچیوں میں بٹتا محسوس ہوا کیونکہ آج شہباز کا تجربہ اور سیماب کے خدشات جیت گئے تھے۔

''کیا کہہ رہا تھا احسن؟'' ماہ نور کی شرارت بھری آواز نے اپنے خیالات سے چونکا دیا۔

''ملنے کے لیے کہہ رہا ہے۔'' وہ اترائی اور پھر ایک توقف سے بولی۔ ''ویسے تم بھی فون لے ہی لو۔ زیاب مجھے کہہ رہا تھا کہ کب تک تمہارے فون سے ماہی سے بات کرتا رہوں گا۔ اب برداشت نہیں ہوتا بھئی۔''

''نہیں۔ اس سے لے کر گھر میں اپنی پوزیشن خراب کرنی ہے کیا؟ اگلے ہفتے رزلٹ آ رہا ہے تو پھپو میرا اے ٹی ایم کارڈ ہیں نا۔ ان سے فرمائش کرنے کی دیر ہے، فون میرے ہاتھ میں۔ گھر میں بھی کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔''

ہما کے لیے اب مزید سننا ناممکن تھا۔ اس نے بے اختیار دروازے پر دستک دے دی۔ ماہ نور فوری طور پر باہر چلی آئی۔ وہ اس کی اچانک واپسی اور طبیعت پر خاصی تشویش کا اظہار کر رہی تھی۔ ہما کی ساعت گویا مفلوج ہو چکی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بستر پر گری اور ہانپتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ وجود میں پرورده صحرا یکدم ہی بیکراں وسعت اختیار کر گیا تھا۔ خلش کے کانٹے روح تک لہولہان کرنے لگے تھے۔

''بوائے فرینڈ..... دھوکا..... چیخ چیخ..... عذاب..... اے ٹی ایم کارڈ۔''

ان الفاظ کے کرب کا کہیں کوئی درماں نہ تھا۔

☆☆☆

بے ترتیب بستر، منتشر کتابیں اور بستر کی سلوٹیں ہما کے خلوص اور اس قدر جدوجہد پر استہزائیہ دیکھ رہی تھیں۔ کیلنڈر پر جگمگاتے ہندسے اس کے ذہن پر ہتھوڑا زنی کرنے لگے۔ وہ چالیس برس کی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال ایک سراب کے پیچھے گنوا دیے تھے۔ دماغی رو میں شدید تلاطم پیدا ہو گیا۔ اس تلاطم سے وجود میں دبی کوئی خلش پوری شدت سے عود کر آئی تھی۔

آئینے کے سامنے کھڑی ہما نے دراز سے اپنی ایک لپ اسٹک نکالی اور ہونٹوں پر پھیرنے لگی۔ اس عمل میں اسے احساس ہی نہ ہوا کہ اس نے لپ اسٹک ہونٹوں سے باہر رخساروں کے دائیں بائیں اطراف پھیلا دی ہے۔ اس کے بعد سیاہ میک اپ پنسل پکڑ کر آنکھوں پر پھیرنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں اس کے چہرے کی ہیئت ہی تبدیل ہو چکی تھی۔ اب وہ بالکل مختلف دکھائی دے رہی تھی۔ اپنا میک اپ سے لتھڑا چہرہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں انوکھی چمک بیدار ہو گئی۔ وہ ذہنی طور پر پندرہ برس قبل کے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی تھی۔ اس نے خیالی ٹرے اٹھائی اور خیالی میز پر ہی رکھ کر ہونٹوں پر بھرپور مسکراہٹ سجائے مہمانوں کے سوالات کے جواب دینے لگی۔

''یہ برتن لے جاؤ بیٹا!'' اس نے شہباز کے انداز و لہجے میں کہا۔

اس کے بعد وہ برتن اٹھانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

''ہمیں آپ کی بیٹی بہت پسند آئی ہے۔ بس ہم تو یہاں سے شادی کی تاریخ لے کر ہی اٹھیں گے۔'' اس نے کسی فرضی خاتون کی آواز میں کہا اور پھر خود شرماتے ہوئے برتن باہر لے آئی۔ اب اسے آئینے میں سیماب، سہیل، روحیل، جویریہ اور مائرہ کے خوشی سے چمکتے چہرے دکھائی دیے۔ وہ اسے دیکھ کر محبت و شرارت سے گنگنانے لگے تھے۔

''آیا لاڑیئے نی تیرا سہریاں والا ویاہون آیا۔''

ہما نے اپنے دونوں ہاتھ رقص کے انداز میں فضا میں لہرانے شروع کر دیے۔ گانے کے الفاظ کی گردان کرتے ہوئے بے حال ہوتی ہما کو اندازہ نہ ہوا کہ دروازے پر ماہ نور، جویریہ، مائرہ اور روحیل اسے سخت تشویش، حیرت اور الجھی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

''تیرا سہریاں والا ویاہون آیا..... ویاہون آیا..... ویاہون آیا.....''

وہ ان الفاظ کی گردان کرتے ہوئے اب تیورا کر زمیں بوس ہو چکی تھی۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

کیتھرین تیار ہوکر اپنا سیل فون کان سے لگائے، سامنے والی دیوار کو تکنے میں مصروف تھی۔ اس نے خوبصورت لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ کندھوں تک آتے بال اس نے نہایت نفاست سے سیٹ کیے ہوئے تھے۔ گلے میں ایک خوبصورت ہار تھا۔ وہ پانچویں بار اپنے شوہر مارٹن کو فون کر رہی تھی لیکن پانچویں بار بھی حسب سابق مارٹن کا نمبر بند ملا۔ کیتھرین نے جھنجلاتے ہوئے سیل فون قریب پڑی میز پر رکھا اور سوچنے لگی کہ آج مارٹن کو گھر

جب کوئی عقلمند اپنی عقلمندی کے ہاتھوں کسی کو دھوکا دیتا ہے تو قدرت بھی ساتھ ہی کھڑی اس کی کم عقلی کا ماتم کرتی ہے پھر وہ عقلمند منہ کے بل گرتے ہوئے اپنی اس عقل پر افسوس کر رہا ہوتا ہے... کچھ ایسا ہی تماشا اس کے ساتھ ہوگیا... جب ایک دھوکے باز نے دوسرے دھوکے باز کو چاروں شانے چت کر ڈالا۔

"جیسے کو تیسا" کی عملی اور سبق آموز تفسیر

جیسے کو تیسا

عاطر شاہین

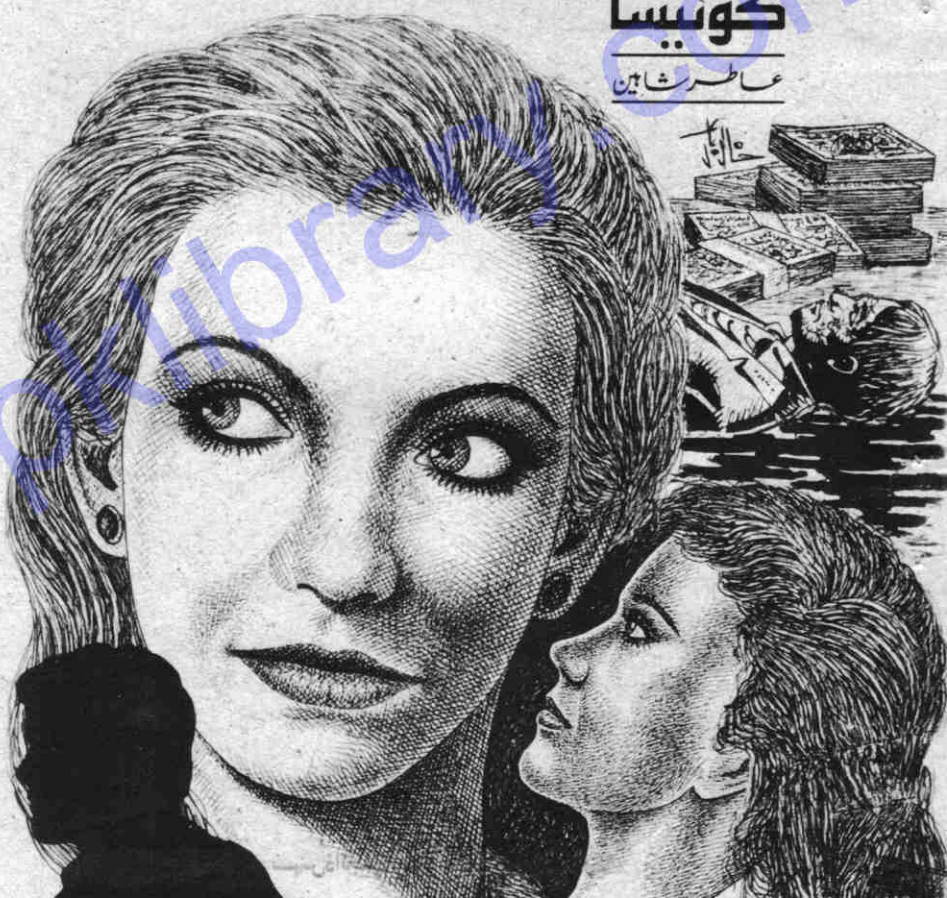

www.pklibrary.com

آنے میں کیوں دیر ہوگئی ہے اور اس نے اپنا سیل فون بھی کیوں بند کر رکھا تھا؟

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو اس وقت سہ پہر کے چار بج کر گیارہ منٹ ہو رہے تھے۔ پریشانی میں وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگی۔

''مارٹن! تم کہاں ہو اور فون کیوں بند کر رکھا ہے؟'' ٹہلنے کے ساتھ ساتھ وہ بڑبڑائی۔ مارٹن عموماً پانچ، ساڑھے پانچ بجے گھر آ جاتا تھا۔ وہ کبھی بھی لیٹ نہیں ہوتا تھا لیکن آج پانچ سے اوپر وقت ہوگیا تھا اور وہ ابھی تک گھر واپس نہیں آیا تھا۔ آج ان دونوں کو باہر گھومنے جانا تھا۔ یہ پروگرام مارٹن نے ہی بنایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ تین بجے تک گھر آ جائے گا۔ اس دوران وہ تیار ہو کر بیٹھے۔ یہی وجہ تھی کہ کیتھرین تو اس کے گھر آنے سے پہلے تیار ہو کر بیٹھی تھی۔

دفعتاً کیتھرین کو خیال آیا تو اس نے سیل فون اٹھایا اور اپنے باپ کے ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے ٹیلر کا نمبر ملایا۔ ٹیلر اسسٹنٹ منیجر تھا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے بے تابانہ لہجے میں کہا۔

''ہیلو ٹیلر! میں کیتھرین بول رہی ہوں۔ کیا مارٹن اپنے آفس میں موجود ہے؟''

''میں معلوم کرتا ہوں میڈم!'' دوسری طرف سے مردانہ آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ تقریباً دو منٹ بعد دوبارہ آواز سنائی دی۔

''ہیلو میڈم!''

''ہاں بولو۔''

''مسٹر مارٹن تو دوپہر کو ہی ریسٹورنٹ سے چلے گئے تھے۔''

''کیا.....!'' کیتھرین بے اختیار اچھلی۔ ''کیا وہ بتا کر گیا تھا کہ کہاں جا رہا ہے؟''

''نو میڈم!''

''کیا ڈیڈ آفس میں ہیں؟''

''وہ تھوڑی دیر پہلے ہی ریسٹورنٹ سے گئے ہیں۔'' ٹیلر نے بتایا۔

''اوکے'' کہنے کے ساتھ ہی کیتھرین نے رابطہ منقطع کیا اور اپنے باپ چارلس کا نمبر ملایا۔

''بولو میری پرنسز!'' چند لمحوں کے بعد کیتھرین کو چارلس کی خوشگوار آواز سنائی دی۔

''ڈیڈ! مارٹن کہاں ہے؟''

اس کی آواز میں پریشانی محسوس کر کے چارلس بھی چونکا۔ تبھی اس نے بے تابانہ لہجے میں کہا۔ ''مارٹن تو دوپہر کو ہی چلا گیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ آج اس نے تمہارے ساتھ گھومنے جانا ہے۔ کیا وہ گھر نہیں آیا؟''

''نہیں ڈیڈ! وہ ابھی تک گھر نہیں آیا۔ اس کا فون بھی بند جا رہا ہے۔'' کیتھرین نے رندھی ہوئی آواز میں کہا تو چارلس بھی حیران رہ گیا۔ دوپہر کو مارٹن اس کے پاس آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ آج اسے کیتھرین کے ساتھ گھومنے کے لیے جانا ہے اس لیے وہ آج جلدی جانا چاہتا ہے۔ چارلس نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی اور وہ فوری طور پر وہاں سے روانہ ہوگیا تھا۔

''مائی پرنسز! ہوسکتا ہے اسے کوئی کام یاد آ گیا ہو اور وہ پہلے کام نمٹانے چلا گیا ہو۔'' چارلس کی آواز سنائی دی۔

''لیکن اسے فون تو آن رکھنا چاہیے تھا۔''

''ہوسکتا ہے بیٹری ختم ہوگئی ہو۔''

''ٹھیک ہے ڈیڈ! میں اس کا انتظار کرتی ہوں۔'' کیتھرین نے لمبی سانس لے کر کہا۔

''اوکے مائی پرنسز! پریشان نہ ہو، مارٹن بچہ نہیں ہے کہ کہیں کھو گیا ہے۔ وہ آ جائے گا۔ تم پریشان مت ہو۔'' چارلس نے اسے تسلی دی۔

''ٹھیک ہے ڈیڈ!''

رابطہ منقطع ہونے کے بعد اس نے سیل فون میز پر رکھا اور کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ اس نے کھڑکی پر پڑا دبیز پردہ ہٹایا اور جالی دار گیٹ کی طرف دیکھنے لگی جہاں سے سڑک پر آتی جاتی گاڑیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

موسم بے حد خوشگوار تھا۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور سردی اپنے عروج پر تھی۔ کیتھرین کو امید تھی کہ ابھی مارٹن کی کار گیٹ پر آ کر رکے گی اور وہ اس میں سے برآمد ہوگا لیکن دس منٹ گزر گئے، مارٹن کی کار گیٹ پر نہ رکی تو اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ انجانے سے وسوسے اس کے دماغ میں کسمسانے لگے۔ بے اختیار اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ واپس پلٹی اور ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگی البتہ کھڑکی سے پردہ بدستور ہٹا ہوا تھا اور وہ جب کھڑکی کے پاس جاتی تو ایک نظر گیٹ کی طرف ڈال لیتی تھی۔

مارٹن اور کیتھرین کی شادی کو دو سال ہوگئے تھے لیکن ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ کیتھرین کے باپ چارلس کا ریسٹورنٹ لندن کا مشہور و معروف ریسٹورنٹ تھا۔ چارلس کے پاس بہت دولت تھی۔ کیتھرین اس کی اکلوتی اور بے حد لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ اس کی ہر خواہش منٹوں میں ہی پوری کر دیتا

www.pklibrary.com

تھا۔ مارٹن، کیتھرین کے باپ کے ریسٹورنٹ میں منیجر کے عہدے پر فائز تھا۔ اس کی سیلری بہت اچھی تھی۔ اس سیلری میں ان دونوں کی گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔

مارٹن، چارلس کے ریسٹورنٹ میں بطور ویٹر جاب کرتا تھا۔ وہ ایک خوبرو، دراز قد اور وجیہہ نوجوان تھا۔ وہ صنفِ نازک کے لیے بہت کشش رکھتا تھا۔ گو کیتھرین سانولی رنگت کی مگر قبول صورت لڑکی تھی۔ اس کی ناک لمبی، گال پچکے ہوئے اور آنکھیں چھوٹی تھیں۔ اس نے جب مارٹن کو اپنے باپ کے ریسٹورنٹ میں کام کرتے دیکھا تو وہ اس کی مردانہ وجاہت پر مرمٹی۔ بعد ازاں اس نے جب مارٹن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور بتایا کہ وہ ریسٹورنٹ کے مالک چارلس کی بیٹی کیتھرین ہے تو اس نے بھی دوستی کرنے میں ایک لمحے کی دیر نہ لگائی۔

یوں پہلے ان کی دوستی ہوئی جو بعد ازاں محبت میں بدل گئی۔ بالآخر انہوں نے شادی کرلی۔ مارٹن کو چاہنے والی لڑکیاں حیران تھیں کہ اتنے وجیہہ مرد نے معمولی شکل صورت والی لڑکی سے شادی کیسے کرلی؟ کچھ لڑکیوں کا خیال تھا کہ مارٹن نے کیتھرین کی دولت سے مرعوب ہوکر اس سے شادی کی ہے، کچھ کا خیال تھا کہ مارٹن کو کیتھرین سے سچی محبت ہوگئی تھی کیونکہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ وہ ذات پات، رنگ ونسل نہیں دیکھتی۔

وقت گزرتا رہا اور ان دونوں کی محبت بھی بڑھتی گئی۔ چارلس نے اپنی بیٹی کو شادی کے تحفے کے طور پر ایک شاندار بنگلا دیا تھا جہاں مارٹن اور کیتھرین دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ مارٹن کا کوئی نہ تھا۔ شادی سے پہلے وہ ایک اپارٹمنٹ میں اکیلا رہتا تھا۔ بقول مارٹن کے، اس کے والدین کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟ اسے کچھ معلوم نہیں کیونکہ جب اس نے شعور کی دنیا میں قدم رکھا تو اس نے خود کو چائلڈ ہوم میں پایا تھا۔ وہیں اس کی پرورش ہوئی اور پھر جب وہ اٹھارہ سال کا ہوگیا تو اس نے جاب کی تلاش شروع کی اور اسے فیکٹری میں نوکری مل گئی۔ جہاں اس نے دو سال کام کیا پھر اس نے جوتوں کی شاپ پر نوکری کی۔ آخرکار وہ مختلف شاپس اور دفتروں میں نوکری کرتے کرتے چارلس کے ریسٹورنٹ میں آگیا تھا اور اب ایک کامیاب زندگی گزار رہا تھا۔

☆☆☆

جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا کیتھرین کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک گھنٹا مزید گزر گیا اور مارٹن کی واپسی نہ ہوئی اور نہ ہی اس کا سیل فون آن ہوا تھا۔ کیتھرین نے اس دوران کوئی دس بار مارٹن کو کال کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا سیل فون ہنوز آف تھا۔

خوف اور پریشانی کے عالم میں اس نے دوبارہ اپنے ڈیڈ چارلس کو فون کیا۔ چارلس نے اسے تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہو، وہ مارٹن کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ مضطرب سی صوفے پر بیٹھی تھی کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے جلدی سے سیل فون اٹھایا کہ شاید مارٹن کی کال ہو لیکن وہ کوئی انجان نمبر تھا جو اس کے سیل فون پر چمک رہا تھا۔

کیتھرین کے دل میں خیال آیا کہ شاید مارٹن کے سیل فون میں کوئی مسئلہ ہوگیا ہوگا۔ ممکن ہے وہ کسی اور کے سیل فون سے کال کر رہا ہو، تبھی اس نے کال اٹینڈ کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔

''ہیلو۔''

''ک ک..... کیتھرین.....!'' دوسری طرف سے مارٹن کی آواز سنائی دی۔ اس کے لہجے میں خوف کی رمق شامل تھی۔

''مارٹن.....! میں کتنی دیر سے تمہیں فون کر رہی ہوں۔ تمہارا فون کیوں بند ہے..... کہاں ہو تم؟'' کیتھرین نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کیتھرین..... مجھ..... مجھے.....''

''ہاں، ہاں بولو۔'' کیتھرین نے اس کے خاموش ہونے پر جلدی سے کہا۔

''کیتھرین..... مجھے اغوا کرلیا گیا ہے۔''

''کیا.....!'' کیتھرین حلق کے بل چیخی۔ اسے اپنے پیروں کے نیچے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بے چینی حد سے سوا ہوگئی۔ ''کس نے اغوا کیا ہے، کہاں ہو تم؟''

''ان لوگوں نے مجھے بہت مارا ہے کیتھرین!'' مارٹن کی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''مجھے نہیں معلوم میں کہاں ہوں اور یہ لوگ کون ہیں۔''

''مارٹن..... مارٹن! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' کیتھرین کو اپنے وجود سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ سن کر ہی پریشانی اس کے دامن گیر ہوئی کہ اغوا کاروں نے اسے بہت مارا ہے۔

''سنو مسز مارٹن۔'' فون کے اسپیکر سے اس بار مارٹن کے بجائے ایک نسوانی مگر کرخت آواز ابھری۔ ''اگر تم اپنے شوہر کی زندگی چاہتی ہو تو جلدی سے دو لاکھ ڈالرز کا

www.pklibrary.com

بندوبست کرلو۔"

"دو..... دولاکھ ڈالرز؟"

"ہاں، اگر کم ہیں تو تین لاکھ ڈالرز کرلو۔" لڑکی نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"مم..... مم..... میں کہاں سے اتنی بڑی رقم کا بندوبست کروں؟" کیتھرین گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

"اگر شوہر کی زندگی پیاری ہے تو تمہیں دو لاکھ ڈالرز کا بندوبست کرنا ہوگا۔ اگر تم نے دو لاکھ ڈالرز نہ دیے تو میں تمہارے شوہر کی لاش تحفے کے طور پر بھیج دوں گی۔ میں تمہیں دو گھنٹے کا وقت دے رہی ہوں..... اور ہاں، پولیس کو مطلع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو....."

"نہیں، نہیں۔ میں پولیس کو مطلع نہیں کروں گی۔" کیتھرین نے جلدی سے اس کی بات قطع کی۔ "تم مارٹن کو کچھ مت کہنا، پلیز۔"

مارٹن کو مارنے کا سن کر ہی کیتھرین گھبرا گئی تھی اور یکدم اس کی آنکھوں کے سامنے مارٹن کا خون میں لت پت وجود گھوم گیا تھا۔

"سمجھ دار ہو تم۔" لڑکی ہنسی۔ "بہرحال میں رات کو دوبارہ فون کروں گی اور بتاؤں گی کہ پیسے کہاں پہنچانے ہیں۔ سمجھ گئی ہو نا؟"

"ہاں..... ہاں۔ میں سمجھ گئی ہوں۔" کیتھرین روہانسی آواز میں بولی۔ دوسری طرف سے کال منقطع ہو چکی تھی۔ کیتھرین کو اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دو لاکھ ڈالرز کا بندوبست کہاں سے کرے؟ اتنی بڑی رقم اس کے اپنے بینک اکاؤنٹ میں بھی نہیں تھی۔ اگر ہوگی بھی تو زیادہ سے زیادہ تیس پینتیس ہزار ڈالرز ہوگی۔ دفعتاً اسے چارلس کا خیال آیا تو اس نے اسے فون کیا۔

"ہاں مائی پرنسز! میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔ مارٹن کی کار کا پتا چل گیا ہے۔ وہ سڑک کے کنارے ملی ہے۔ شاید مارٹن کو اغوا کرلیا گیا ہے۔" چارلس بولتا چلا گیا۔

"ہاں ڈیڈ! مجھے پتا چل گیا ہے کہ مارٹن کو اغوا کرلیا گیا ہے۔" کیتھرین نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اوہ..... کیسے؟"

"ابھی اغوا کار لڑکی کا فون آیا تھا۔"

"لڑکی کا..... کیا کہہ رہی تھی؟"

"اس نے دو لاکھ ڈالرز کا مطالبہ کیا ہے۔"

"کیا.....؟"

"ہاں ڈیڈ! اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے دو گھنٹے کے اندر اندر اسے دو لاکھ ڈالرز نہ دیے تو وہ مارٹن کو مار دے گی۔" کیتھرین نے بتایا۔ "اس نے یہ بھی کہا ہے کہ پولیس کو بتانے کی صورت میں بھی وہ مارٹن کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

"تو پھر؟"

"ڈیڈ! پلیز، پولیس کو مطلع نہ کیجیے گا۔"

"تو تم اسے دو لاکھ ڈالرز دو گی؟"

"میرے پاس تو اتنا بڑا اماؤنٹ نہیں ہے ڈیڈ!" کیتھرین دھیمے لہجے میں بولی۔ "اگر آپ دے دیں تو مارٹن کی جان بچ جائے گی۔ پلیز ڈیڈ! انکار نہ کیجیے گا۔ یہ مارٹن کی زندگی کا سوال ہے۔"

"ہمم۔" فجاتی توقف کے بعد چارلس نے ہکاری بھری پھر بولا۔ "او کے۔ میں کچھ کرتا ہوں۔"

"تھینکس ڈیڈ!" کیتھرین کو کچھ سکون ہوا۔

☆☆☆

اس وقت دن کے تین بج رہے تھے۔ کیتھرین اپنی کار میں بیٹھی اسکائر ٹاؤن کی طرف جا رہی تھی۔ دو لاکھ ڈالرز سے بھرا بیگ سائڈ سیٹ پر پڑا تھا۔ وہ اسکائر ٹاؤن کی طرف اکیلی جا رہی تھی۔ گزشتہ رات ہی اس کی اغوا کار لڑکی سے بات ہوئی تھی۔ اس نے سختی سے کہا تھا کہ وہ بیگ لے کر اکیلی ہی اسکائر ٹاؤن آئے۔ اگر اپنے ساتھ کسی کو لائی تو وہ اس کے شوہر کو گولی مار کر دوسری دنیا کی طرف روانہ کر دے گی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بیگ لے کر اکیلی ہی روانہ ہوئی تھی۔ چارلس نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ وہ اکیلی نہ جائے۔ صورتِ حال بگڑ سکتی ہے۔ پولیس کو مطلع کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف اغوا کار لڑکی کو پکڑ لے گی بلکہ مارٹن بھی صحیح سلامت مل جائے گا لیکن کیتھرین نے اپنے باپ کی ایک نہ سنی۔ اسے مارٹن کی زندگی عزیز تھی۔ وہ مارٹن سے بے حد پیار کرتی تھی اور اسے کسی صورت کھونا نہیں چاہتی تھی۔

ہیوسٹن سے اسکائر ٹاؤن کا فاصلہ دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اغوا کار لڑکی نے بتایا تھا کہ اسکائر ٹاؤن میں ایک کاٹیج ہے جس پر سرخ رنگ کا پینٹ کیا گیا تھا۔ وہ بیگ اسی کاٹیج کے ایک کمرے میں رکھ کر چلی جائے۔ دو گھنٹے کے بعد مارٹن بھی زندہ سلامت گھر پہنچ جائے گا۔ پہلے تو کیتھرین نے انکار کر دیا تھا کہ وہ جب کاٹیج میں دو لاکھ ڈالرز سے بھرا بیگ رکھے گی تو وہ اسی وقت مارٹن کو اس کے حوالے کر دے لیکن اغوا کار لڑکی نے صاف انکار کر دیا تھا۔ تب کیتھرین کو اس کی بات ماننا ہی

www.pklibrary.com

پڑی کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

دو گھنٹے کے سفر کے بعد کیتھرین اسکائر ٹاؤن پہنچ گئی۔ سرخ پینٹ والا کاٹیج بھی تلاش کرنے میں اسے دقت نہ ہوئی۔ وہ گھنے درختوں کے بیچ میں بنا ہوا تھا۔ وہ خوبصورت تھا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کیتھرین دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوگئی۔ کاٹیج کے تین کمرے تھے۔ تینوں ہی ساز و سامان سے عاری تھے۔ فرش گرد آلود تھا جبکہ کھڑکیوں کے پردے بھی میلے کچیلے دکھائی دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کاٹیج کافی عرصے سے خالی پڑا ہو۔ بہرحال کیتھرین کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ جس مقصد سے وہاں آئی تھی، اس نے وہ کر کے واپس جانا تھا۔ چنانچہ اس نے بیگ فرش پر رکھا اور کاٹیج سے باہر نکل گئی۔ کار میں بیٹھتے ہی اس نے اغوا کار لڑکی کو فون کیا لیکن اس نے اس وقت ہونٹ بھینچ لیے جب اسے اغوا کار لڑکی کا فون بند ملا۔

''اس نے فون بند کیوں کیا ہوا ہے؟'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس نے سیل فون سائڈ سیٹ پر رکھا اور قرب و جوار میں دیکھا لیکن دور دور تک اسے کوئی ذی روح دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور واپس ہیوسٹن کی جانب روانہ ہوگئی۔

جب وہ گھر پہنچی تو شام ہو رہی تھی۔ چارلس اس کے گھر میں موجود تھا اور بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی بے تابانہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

''مارٹن کہاں ہے..... کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں آیا؟''

''وہ دو گھنٹے تک آجائے گا۔''

''کیا مطلب؟''

کیتھرین نے اسے اغوا کار لڑکی کی شرط بتادی تو وہ قدرے حیران ہوا پھر وہ مارٹن کا شدت سے انتظار کرنے لگے۔ کیتھرین کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ اسے ایک ایک لمحہ صدیوں پر محیط لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی بھوک پیاس بھی ختم ہوگئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد مارٹن گھر آجائے تو تب ہی اسے سکون ملے گا۔ اس دوران اس نے اغوا کار لڑکی کو بھی تین چار بار فون کیا تھا لیکن اسے ہر بار اس کا نمبر بند ملا تھا۔

اس کی جان میں جان اس وقت آئی جب دو گھنٹے کے بعد اغوا کار لڑکی نے اسے فون کیا۔ اس نے جلدی سے فون اٹھالیا۔

''ہیلو، مارٹن کہاں ہے؟'' وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''دو گھنٹے سے اوپر وقت ہوگیا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ میرے پہنچنے کے دو گھنٹے بعد مارٹن گھر پہنچ جائے گا۔''

اسیرِ جنوں

ایک شعلہ جوالہ نوجوان کی جنون خیزی

دو بہنوں کی آپسی رسہ کشی جس کا

سیدھا اثر کئی خاندانوں پر پڑا

بھیڑ کی کھال میں چھپے بھیڑیوں کی داستان

ایک ایسی طویل سرگزشت جو عرصہ دراز تک ذہنوں پر چھایا رہے گا

بہت جلد سرگزشت کے صفحات پر ملاحظہ کریں

www.pklibrary.com

''ہاں، میں نے یہی کہا تھا لیکن.....'' لڑکی کہتے کہتے رک گئی تو کیتھرین کی بے چینی بڑھی۔

''لیکن کیا؟''

''مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ مارٹن مارا گیا ہے۔''

کیتھرین کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔ اگر وہ بروقت صوفے کو نہ پکڑ لیتی تو یقیناً فرش بوس ہو جاتی۔ جب وہ بولی تو اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''کک.....کیا کہہ رہی ہو.....میں سمجھی نہیں؟''

''ہم نے مارٹن کو ایک کمرے میں کرسی کے ساتھ رسی سے باندھا ہوا تھا۔'' لڑکی صراحت سے بولی۔ ''نہ جانے اس نے کیسے رسی کھول لی اور اس نے فرار ہونا چاہا۔ میرے آدمیوں نے اسے گھیر لیا۔ مارٹن نے میرے ایک آدمی سے پستول چھیننے کی کوشش کی۔ اسی چھینا جھپٹی کے دوران اچانک پستول چل گیا اور گولی مارٹن کے سینے میں لگ گئی۔ میرے آدمی اسے اسپتال لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے اسی وقت دم توڑ دیا۔''

یہ سننا تھا کہ کیتھرین دھڑام سے صوفے پر گری۔ اس کے ہاتھ سے سیل فون بھی نکل کر فرش پر گر گیا۔ چارلس، کیتھرین کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

''کیا ہوا مائی پرنسز؟''

جواباً کیتھرین نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ چارلس کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے فرش پر پڑا سیل فون اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو!''

اغوا کار لڑکی لائن پر موجود تھی۔ کہنے لگی۔ ''کیتھرین کو کیا ہو گیا ہے؟ شاید مارٹن کی موت کا سن کر اسے بہت گہرا صدمہ پہنچا ہے؟''

''کیا بکواس کر رہی ہو، کون ہو تم اور مارٹن کہاں ہے؟'' چارلس نے چیختے ہوئے کہا۔

''آپ یقیناً کیتھرین کے ڈیڈ ہیں؟''

''ہاں۔''

جواباً اس نے چارلس کو بھی وہی کچھ بتایا جو چند منٹ پہلے اس نے کیتھرین کو بتایا تھا۔ غصے سے چارلس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔ شاید تم مزید پیسے بٹورنا چاہتی ہو؟'' چارلس غرایا۔

''میں کیوں جھوٹ بولوں گی۔ مجھے مارٹن کے بدلے جتنے پیسے چاہیے تھے، وہ مل گئے۔'' لڑکی نے کہا۔

''مارٹن کی لاش کہاں ہے؟''

''اسکائر ٹاؤن کے جنگل میں پڑی ہے۔'' لڑکی نے جواباً کہا۔ ''لیکن افسوس کہ مارٹن کی لاش ناقابلِ شناخت ہو چکی ہے کیونکہ اس کے مرنے کے بعد ہم نے اس کی لاش جنگل میں پھینک دی تھی۔ جنگل میں آوارہ کتے پھر رہے تھے جنہوں نے مارٹن کو نوچ ڈالا۔ البتہ اس کی کچھ باقیات جنگل میں موجود ہیں۔ وہ بے شک آپ لے سکتے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی کال منقطع ہو گئی لیکن چارلس ''ہیلو، ہیلو'' کرتا رہ گیا۔ اس نے کیتھرین کی طرف دیکھا تو وہ صدمے کی وجہ سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

اسکائر ٹاؤن کے جنگل سے جو لاش ملی تھی وہ واقعی ناقابلِ شناخت تھی۔ اس کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ جنگل کے درندوں نے اسے بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چارلس نے مارٹن کو اس کے لباس کی وجہ سے پہچانا تھا جو اس نے گزشتہ روز پہنا ہوا تھا۔

مارٹن کی لاش ایمبولینس میں ڈال کر کیتھرین کی رہائش گاہ لائی گئی۔ کیتھرین کا بہت بُرا حال تھا۔ اس پر بار بار غشی طاری ہوتی تھی۔ جب وہ ہوش میں آتی تو مارٹن کو پکارتی۔ جب وہ مارٹن کو سامنے نہ دیکھتی تو پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی۔ چارلس، اس کے عزیز و اقارب اور اس کے فرینڈز کیتھرین کو دلاسا دے رہے تھے۔

مارٹن کی تدفین ہو چکی تھی لیکن کیتھرین کی حالت نہیں سنبھل رہی تھی۔ اس کی حالت سنبھلنے میں ایک ہفتہ لگا۔ وہ مارٹن کو یاد کر کے بہت روتی تھی۔ چارلس اسے اپنے گھر لے گیا۔ وہ جانتا تھا کہ کیتھرین کو بچپن میں جب وہ بارہ، تیرہ سال کی تھی تو پاگل پن کے دورے پڑتے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اکیلے رہنے کے باعث اس پر پاگل پن کے دورے پڑیں اور وہ اپنا نقصان کر بیٹھے۔

چارلس نے مارٹن کو اغوا کرنے والی لڑکی کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرا دی تھی۔ ساتھ ہی وہ نمبر بھی دے دیا تھا جس نمبر سے اغوا کار لڑکی کال کرتی تھی۔ پولیس نے اس نمبر کے ذریعے اغوا کار لڑکی کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نمبر رجسٹرڈ نہیں تھا۔ پولیس نے اسکائر ٹاؤن میں اغوا کار لڑکی کو ٹریس کرنے کے لیے تحقیق کی۔ اسکائر ٹاؤن میں رہنے والے لوگوں نے انکار کر دیا کہ انہوں نے اپنے ٹاؤن میں

www.pklibrary.com

کسی ایسی لڑکی کو دیکھا جس کی شخصیت پُراسرار ہو اور وہ ان کے ٹاؤن کی نہ ہو۔

مارٹن کو اس دنیا سے گئے دس روز ہو گئے تھے اور کیتھرین اب کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ایک روز وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ موسم ابر آلود تھا، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

اس نے کافی پینے کے بعد کپ میز پر رکھا اور صوفے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اسے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے ڈیڈ آئے ہوں گے لیکن اگلے ہی لمحے اس نے دروازے پر مارٹن کو دیکھا تو وہ نہ صرف ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی بلکہ وہ ساکت و جامد بھی ہو گئی۔ وہ حیرت بھری نظروں سے مارٹن کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے مارٹن نہیں اس کی روح آ گئی ہو۔ اس کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات ابھر آئے۔

''مم..... مم..... مارٹن.....!'' اس کے منہ سے نکلا۔

مارٹن آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ نئے لباس میں ملبوس تھا اور اس کے چہرے پر ویرانی اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔

''ہاں کیتھرین! میں مارٹن ہوں۔''

''تم زندہ ہو؟'' کیتھرین کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں، میں زندہ ہوں۔'' مارٹن دھیمے لہجے میں بولا۔ ''جنگل سے جو لاش ملی تھی وہ میری نہیں تھی۔ وہ قبر سے مُردہ نکالا گیا تھا جسے میرا لباس پہنا کر جنگل میں پھینک دیا گیا تھا۔ یہ جنیفر کا منصوبہ تھا۔''

''جنیفر..... وہی اغوا کار لڑکی؟''

''ہاں۔'' مارٹن نے اثبات میں سر ہلایا۔

''دفع کرو اس لڑکی کو۔'' کیتھرین نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''تم زندہ ہو، اس سے بڑھ کر میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، ایک نہ ایک دن پکڑی ہی جائے گی۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''میں ڈیڈی کو کال کر کے تمہارے بارے میں بتا دوں۔'' کیتھرین نے چہکتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے زندہ ہونے کا سن کر وہ بھی خوش ہو جائیں گے۔ تم بیٹھو، میں فون لے کر آتی ہوں۔''

کیتھرین کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ ڈرائنگ روم سے چلی گئی جبکہ مارٹن ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے صوفے پر دراز ہو گیا۔ اس کے چہرے پر افسوس اور غصے کے ملے جلے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ دراصل اسے جنیفر پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اس کے غصے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے مارٹن کو دھوکا دیا تھا۔

جنیفر، مارٹن کی نئی گرل فرینڈ تھی۔ ان کی ملاقات ایک کلب میں ہوئی تھی۔ وہ بے حد حسین اور تیز طرار لڑکی تھی۔ مارٹن کے دل کو وہ پہلی ہی نظر میں بھا گئی تھی۔ مارٹن نے اسے اپنے بارے میں بتا دیا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے لیکن اپنی بیوی کیتھرین سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔ چنانچہ جنیفر کے شیطانی دماغ میں ایک منصوبہ آ گیا۔ دراصل جنیفر بھی دولت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اسے مارٹن سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اسے پتا چلا تھا کہ مارٹن ایک متمول فیملی کا داماد ہے تو اس نے جان بوجھ کر مارٹن سے راہ و رسم بڑھائے تھے۔ جب اسے پتا چلا کہ مارٹن اپنی بیوی کیتھرین سے محبت نہیں کرتا اور اس سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے تو اس نے مارٹن سے مل کر چارلس کی دولت ہتھیانے کا منصوبہ بنایا۔ ان کا منصوبہ تھا کہ دولت حاصل کرنے کے بعد وہ دونوں اس شہر سے کہیں دور چلے جائیں گے اور شادی کر کے اپنی باقی زندگی گزاریں گے۔

منصوبے پر عمل تو ہو گیا لیکن مارٹن نہیں جانتا تھا کہ جس طرح اس کے دل میں کھوٹ تھا اسی طرح جنیفر بھی بدنیت تھی۔ دولت حاصل کرنے کے بعد وہ دونوں ہیوسٹن سے نکل گئے تھے۔ دوسرے شہر پہنچتے ہی رات گزارنے کے لیے وہ ہوٹل میں آ گئے تاکہ آئندہ کے لیے منصوبہ بندی کر سکیں۔

صبح جب مارٹن بیدار ہوا تو جنیفر کمرے میں موجود نہیں تھی۔ البتہ جاتے وقت وہ ٹیبل پر ایک نوٹ چھوڑ گئی تھی جس پر لکھا تھا۔

''آئی ایم سوری مارٹن! میں تمہیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ مجھے تم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ مجھے دولت چاہیے تھی جو مجھے مل گئی ہے۔ اب تم واپس اپنی بیوی کے پاس چلے جاؤ اور مجھے بھول جاؤ۔''

یہی وجہ تھی کہ مارٹن واپس آ گیا تھا اور جلنے، کڑھنے اور جنیفر کو بُرے الفاظ میں یاد کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کیتھرین کو بھی اصل بات نہیں بتا سکتا تھا ورنہ اس کے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا ہو جاتی لیکن ایک بات اس کے ذہن میں ثبت ہو کر رہ گئی تھی کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہی ہے۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

محفلِ شعر و سخن

❁ رابعہ نسیم.....بہاولنگر

کاجل بھری آنکھوں سے کیا آنسو نہیں بہتے
مہندی لگے ہاتھوں سے کیا ماتم نہیں ہوتا

❁ آذین رضوان.....کراچی

مِری جگہ پہ کوئی اور ہو تو چیخ اٹھے
میں اپنے آپ سے اتنے سوال کرتا ہوں
اگر ملال کسی کو نہیں مِرا نہ سہی
میں خود بھی کون سا اپنا ملال کرتا ہوں

❁ بلال کاظمی.....کراچی

سچ کہوں اپنی محبت پہ ندامت سی ہوئی
جب بھی دیکھی تری اُتری ہوئی صورت میں نے

❁ نوشی خان.....راولپنڈی

خواب جل جائیں مِری چشمِ تمنا بجھ جائے
بس ہتھیلی سے اڑے رنگِ حنا آہستہ

❁ سہیل خان.....ملک وال

پاگل پن تو دیکھو جس دن ڈولی اٹھنے والی تھی
اپنے ہاتھ سے توڑ دیا اِک دلہن نے شہنائی کو

❁ ناصر خان.....کوئٹہ

ڈر ہے ترے حسیں تصور کا خوں نہ ہو
میں نقشِ ناتمام ہوں سوچا نہ کر مجھے

❁ ذوالفقار حسین.....ٹنڈو آدم

ہم اُن کو سوچ میں گم دیکھ کر واپس پلٹ آئے
وہ اپنے دھیان میں بیٹھے ہوئے اچھے لگے ہم کو

❁ عبدالغنی انجم.....ایبٹ آباد

لو میں آنکھیں بند کیے لیتی ہوں اب تم رخصت ہو
دل تو جانے کیا کہتا ہے لیکن دل کا کہنا کیا

❁ شگفتہ سحر.....گوجرہ

یہ بھی نیا ستم ہے حنا تو لگائیں غیر
اور اس کی داد چاہیں وہ مجھ کو دکھا کے ہاتھ

❁ نائلہ عزیز.....پشاور

اب سوچتی ہوں ترکِ تعلق ہوا تو کیوں
حالانکہ ہم میں کوئی بھی اتنا بُرا نہ تھا

❁ ارم کاشف.....جھنگ

آنکھیں ترے حسین تصور میں بند ہیں
دنیا سمجھ رہی ہے کہ نیند آگئی مجھے

❁ حرا اطہر.....کراچی

چراغ گھر میں جلا رہا ہوں
ہوا سے رشتہ نبھا رہا ہوں
اٹھا رہا ہوں زمیں سے موتی
فلک پہ تارے سجا رہا ہوں

❁ ناہید یوسف.....اسلام آباد

وہ اگر جا بھی چکا ہے تو نہ کھولو آنکھیں
یوں ہی محسوس کیے جاؤ رفاقت اُس کی

❁ نوشین.....کراچی

وہ نہ آئے گا ہمیں معلوم تھا اس شام بھی
انتظار اس کا مگر کچھ سوچ کر کرتے رہے

www.pklibrary.com

❁ عائشہ خان.....مانسہرہ

وہ رُت بھی آئی کہ میں پھول کی سہیلی ہوئی
مہک میں چمپا کلی ، روپ میں چنبیلی ہوئی

❁ نواب یاسر.....ملتان

ہم تو چپ چاپ پڑے ہیں خود میں
گرنے والے ہی سنبھلتے ہوں گے
جانے وہ کون سا رستہ ہوگا
کس کے ہمراہ وہ چلتے ہوں گے

❁ راحیل احمد.....منڈی بہاالدین

شام بھی ہوگئی ، دھندلا گئیں آنکھیں میری
بھولنے والے میں کب تک تیرا رستہ دیکھوں

❁ غلام رسول.....سرگودھا

بند آنکھوں میں بھی کیا ہوگی تری بے پردگی
چھین لے مجھ سے یہ نیندیں یا مرے خوابوں میں آ

❁ جاوید نعیم.....روہڑی

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی

❁ شہزاد احمد.....نواب شاہ

یادوں کے چمن مہکے سنسان فضاؤں میں
پھر دل کے اندھیرے میں چاندی سی اتر آئی

❁ انعم کمال.....حیدرآباد

بے سبب روٹھ کے جانے والے
آ چکے لوٹ کے آنے والے
کتنے افسردہ نظر آتے ہیں
شہر میں آگ لگانے والے

❁ مہتاب احمد.....حیدرآباد

شاید کہ مرے لب پہ پھر نام تیرا آیا
کیوں صحن تمنا میں ہے بجنے لگی شہنائی

❁ اسلم خان.....مری

لمحے لمحے میں بسی ہے تری خوشبو کی مہک
آج کی رات تو خوشبو کا سفر لگتی ہے

❁ شہریار خان.....اسلام آباد

مری ہتھیلی میں مہندی کسی کے نام کی تھی
مگر وجود میں خوشبو تمہاری پھیلی تھی

❁ اویس احمد.....کراچی

آنکھ میں آنسو نہ آئے ، لب پہ خاموشی رہی
کیا جتن کرتے رہے اک جی کے بہلانے کو ہم

❁ طاہر زیب.....فیصل آباد

کھو دیا رات وہ تارا میں نے
دن اسی دکھ میں گزارا میں نے
ایسے مت روٹھ کے جا شامِ فراق
دھیان رکھا ہے تمہارا میں نے

❁ شکیلہ جمال.....سکھر

نہ پوچھ حال کسی بھی اداس چہرے کا
ہر ایک شخص کی اپنی الگ کہانی ہے

❁ شاہینہ مہتاب.....چنیوٹ

ڈھونڈوں اُسے کہاں جو رگ و پے میں بس گیا
دیکھوں اسے کدھر جو بظاہر نظر میں ہے

❁ صبا سحر.....کراچی

ہائے وہ راز جسے دل میں چھپایا میں نے
کس سے اب جا کے کہوں قابلِ اظہار بھی تھا

❁ اعجاز تبسم.....چکوال

سب کو ہم بھول گئے جوشِ جنوں میں لیکن
اِک تری یاد تھی ایسی کہ بھلائی نہ گئی

❁ سرفراز شاہ.....ساہیوال

جس طرح خواب مرے ہوگئے ریزہ ریزہ
اس طرح سے نہ ٹوٹ کے بکھرے کوئی

❁ شہلا لطیف.....حیدرآباد

چمن ہزار ہیں لیکن نہ جانے کیوں بجلی
مچل رہی ہے فقط میرے آشیاں کے لیے

❁ سیدہ نورین.....لاہور

گونجی ہے تخیل میں اس طور سے شہنائی
ارمانوں کے آنگن میں اتری ہو دلہن جیسے

❁ رضا خان.....بہاولپور

خوابوں میں خواب اس کے یادوں میں یاد اس کی
نیندوں میں گھل گیا ہو جیسے کہ رت جگا سا

❁ چودھری سعید.....اوکاڑہ

تم جاگتی آنکھوں میں بھی آجاؤ کسی دن
خوابوں میں ملاقات ہوا کرتی ہے اکثر

❁ ارشد اقبال.....ایبٹ آباد

مجھے منزلیں نہ بخشو ، مجھے محفلیں نہ سونپو
میرے راستو بتاؤ میرا ہم سفر کہاں ہے

❁ طارق سعید.....میرپورخاص

یہ زندگی کا دشت یہ محرومیوں کی آنچ
بیٹھوں کہاں کہ سایۂ دیوار بھی نہیں

www.pklibrary.com

❁ منظور حسین.....نواب شاہ

زباں بھی بند ہے آنسو بھی ساتھ چھوڑ گئے
نظر بدل گئی دو روز میں زمانے کی

❁ فیاض احمد.....اوکاڑہ

تزئینِ لب و گیسو کیسی ، پندار کا شیشہ ٹوٹ گیا
تھی جس کے لیے سب آرائش اس نے تو ہمیں دیکھا بھی نہیں

❁ نفیسہ اکرام.....مردان

اجلی ہتھیلیوں پہ سلگتی ہوئی حنا
چندن کی شاخ ہے کہ لچکتا ہوا بدن

❁ تنویر خان.....سوات

رنگِ حنا یوں ہی ہاتھوں پہ سجا رہنے دو
چاند چپکے سے درِ بام اتر آئے گا

❁ عارف حسین.....گجرات

آج تک قائم ہے اس کے لوٹ آنے کی امید
آج تک ٹھہری ہوئی ہے زندگی اپنی جگہ

❁ محمد خلیل خان.....ایبٹ آباد

تم نئے پیار کی راہوں میں بکھیرو سجدے
بھول جاؤ کہ سسکتا ہے کہیں تنہا کوئی

❁ نسیم قریشی.....اٹک

آ بھی جا صبحِ مسرت کے اجالوں کی طرح
خواب بن کر میری آنکھوں میں سمانے والے

❁ ساجد بنگش.....بدین

میرے لہو کے رنگ سے چمکی مہندی کتنے ہاتھوں میں
شہر میں جس دن قتل ہوا تھا عید منائی لوگوں نے

❁ افتخار علی.....بی

ہاتھوں پہ لکھ کے چومتے رہتے ہیں اس کا نام
مدت گزر گئی ہے جسے خط لکھے ہوئے

❁ اسلم نیازی.....حسن ابدال

کرنے کو انتظار تیرا حشر تک کروں
لیکن سوال زندگیِ مختصر کا ہے

❁ امتیاز کھوکھر.....لیہ

عجب حسن ہے تیری بند آنکھوں میں
سکوتِ صبحِ ازل کا خیال آتا ہے

❁ شاہانہ فیض.....کراچی

شبِ فراق تو کٹتی نظر نہیں آتی
خیالِ یار میں آؤ فراز سو جائیں

❁ تمکین فاطمہ.....بھکر

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری
جی میں یہ کس کا تصور آگیا

❁ سمیرا خان.....وزیر آباد

ماضی سے کٹ کے روپڑی دلہن کسے خبر
براتیوں کے کان تو شہنائیوں پہ تھے

❁ اظہر اقبال.....نوشہرہ

اُف یہ یادوں کا تسلسل یہ خیالوں کا ہجوم
چھین لی آپ نے مجھ سے میری تنہائی بھی

❁ نور احمد.....ڈیرہ مراد جمالی

بھاگتے لمحے تو آنکھوں میں سجے ہی رہ گئے
تتلیوں کے رنگ ہاتھوں میں لگے ہی رہ گئے

❁ لبنیٰ شاہد.....لاہور

یادیں بھی ہیں، امید بھی ہے، بے بسی بھی ہے
اے دوست کیا نہیں ہے ہماری نگاہ میں

❁ شاہنواز خان.....رحیم یار خان

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا

❁ عروج خان.....سوات

شرم روکے ہے ادھر، شوق ادھر کھینچے ہے
کیا خبر تھی کبھی اس دل کی یہ حالت ہوگی

❁ روبینہ نفیس.....شیخوپورہ

بزمِ طرب میں دوست نہ مجھ کو تلاش کر
لکھا ہے میرا نام دکھوں کی کتاب میں

❁ فائزہ فیوم.....آزاد کشمیر

کسی کا عشق آپہنچا ہے رسوائی کی منزل تک
نگاہِ شوق اب کچھ شرمگیں معلوم ہوتی ہے

❁ محمد عتیق.....مظفر آباد

میں ان کے تصور سے ذرا کھیل رہا ہوں
اس وقت مجھے گردشِ دوراں نہ پکارے

محفلِ شعر و سخن

کوپن برائے شمارہ نومبر 2023

نام : _____

پتا : _____

www.pklibrary.com

سوا سیر

علی امجد

کچھ عقل کے اندھے غلط راستوں پر چل کر درست منزل تلاش کرتے ہیں مگر... قدرت کی لاٹھی ایسے اندھوں پر کچھ اس انداز میں چلتی ہے کہ چاروں طبق روشن ہوجاتے ہیں۔ یہی حال اس کا بھی تھا جس کے دل و دماغ میں سوائے جھوٹ اور دھوکے کے کچھ نہیں تھا۔ بالآخر ایک دن اسے بھی سوا سیر ٹکرا گیا۔

ہلکے پھلکے انداز میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو آشکار کرتی تحریر

ارشد مقدر کا سکندر تھا۔ آج سے نہیں، بلکہ ان دنوں سے جب ہم کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم دل ہی دل میں اس سے جلتے تھے لیکن کچھ کر نہیں سکتے تھے کہ جس کے مقدر کا ستارہ عروج پر ہو، آپ اسے گرانے کی جتنی بھی کوشش کرلیں، کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

اس ضمن میں ارشد کی ذاتی رائے بہت مختلف تھی۔ اسے اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ لڑکیاں اس

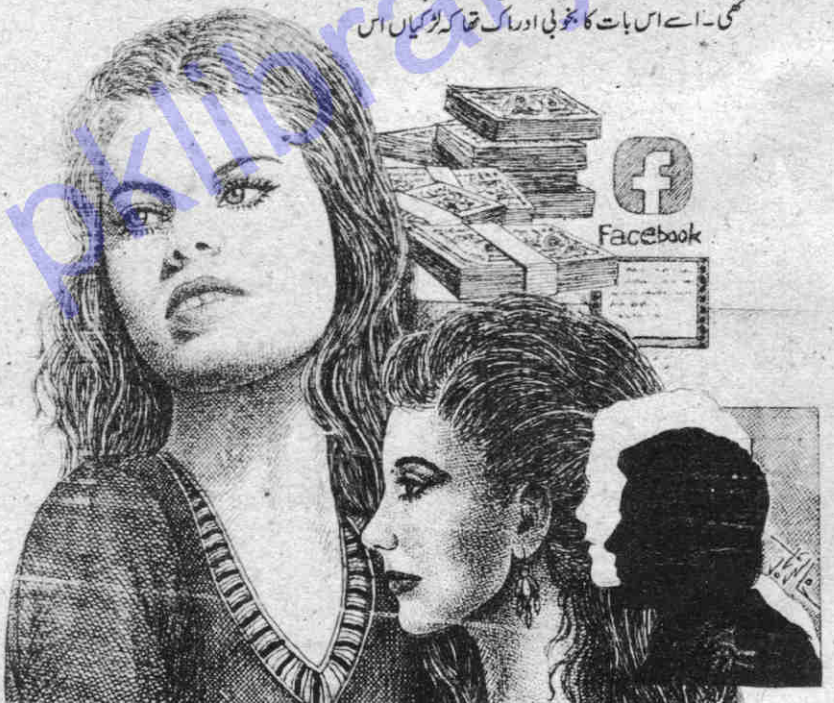

www.pklibrary.com

کے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔ تاہم وہ نہ تو مقدر پر یقین رکھتا تھا، نہ مقدر کے ستارے کو مانتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ سب اس کی پُرکشش شخصیت کا اثر تھا اور دوسرا یہ کہ اس کا ہنر تھا۔

بہرحال مدعے کی بات یہ ہے کہ کالج میں بھی وہ راجا اندر بن کر پھرا کرتا تھا۔ اب بھی اس کا ستارہ وہیں کھڑا تھا۔ مثلاً وہ فرٹیلائزر کمپنی میں ملازمت کررہا تھا اور اپنی چار کولیگز کو اس نے بیک وقت اپنے دامِ فریب میں پھنسایا ہوا تھا۔ شام کو وہ ایک سائنس اکیڈمی میں جاکر میٹرک اور انٹر کے طالب علموں کو ریاضی اور فزکس پڑھایا کرتا تھا۔ اکیڈمی میں تین لڑکیاں بھی پڑھاتی تھیں۔ ان میں سے دو کے ساتھ ارشد کی دوستی تھی۔ اسی طرح محلے میں کتنی لڑکیوں کے ساتھ اس کا چکر چل رہا تھا، اس کا تو شمار ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی جتلاؤں کی نہ صرف واٹس اپ چیٹ مجھے دکھایا کرتا بلکہ ان کی تصاویر بھی دکھایا کرتا تھا۔

بات یہیں تک محدود ہوتی تو اور بات تھی۔ ارشد اپنی محبوباؤں سے پیسے بھی لیتا تھا۔ نہ جانے اس کی شخصیت میں کیا نشہ تھا کہ لڑکیاں بخوشی اس کو پیسے دیا کرتی تھیں۔ میں یہ خالی خولی دعویٰ نہیں کررہا ہوں بلکہ ان گنت مرتبہ ارشد نے خود مجھے چیٹ بھی دکھائی تھی اور موبائل پر رقم وصولی کے میسجز بھی۔

میں محکمۂ ایجوکیشن میں ملازم تھا اور میری تنخواہ ارشد کی تنخواہ سے کم ہی تھی۔ ارشد کی نوکری اگرچہ پرائیویٹ تھی لیکن تنخواہ اسے بڑی پُرکشش ملتی تھی۔ علاوہ ازیں وہ شام میں اکیڈمی میں بھی پڑھاتا تھا۔

کوئی کتنا بھی مقدر کا سکندر ہو، پریشانیاں سب کو ہی ہوتی ہیں۔ آزمائشیں اور بحران سب پر ہی آتے ہیں۔

انہی دنوں ارشد کی نوکری جاتی رہی لیکن مجال ہے جو اس کے چہرے پر پریشانی کی ایک سلوٹ بھی پڑی ہو۔ پریشانی ہوتی بھی کیوں..... وہ میری طرح کسی ایک ذریعۂ روزگار سے تو وابستہ نہیں تھا۔ ملازمت چھن جانے کے بعد بھی وہ مجھ سے زیادہ ہی کمالیتا۔

ملازمت سے محرومی کے چار ماہ بعد اس کی بیوی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی۔ ارشد اس پر تلملایا کیونکہ اسے بیوی سے محبت ہوگئی تھی لیکن اس کی یہ تلملاہٹ بھی چند دن ہی رہی۔ اس کا دل بہلانے والیاں بہت تھیں۔

اس کی پریشانی اس وقت ظاہر ہوئی جب ایک روز اس نے کھوئے کھوئے انداز میں مجھے بتایا۔ ''یار! اکیڈمی بند ہوگئی ہے، ڈیڑھ ماہ سے کوئی دوسری اکیڈمی پکڑنے کی کوشش کررہا ہوں مگر کوئی بھی مناسب تنخواہ دینے کو تیار نہیں۔''

لیکن اس جھٹکے سے بھی وہ سنبھل گیا۔ وہ بھوکا نہیں مرسکتا تھا کیونکہ اس کے پاس ہنر تھا..... لڑکیاں پٹانے اور ان سے پیسے کھانے کا ہنر۔

پھر ایک روز اس نے میرے سامنے انکشاف کیا۔

''والدہ ناراض ہیں یار!''

''کیوں؟''

''وہ کہتی ہیں کہ میں شادی کرلوں۔''

''پھر؟''

''میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔ صوفیہ کے بعد مجھے شادی کی خواہش نہیں رہی۔'' وہ اداس انداز میں بولا۔ ''لیکن والدہ کا کہا ٹال بھی نہیں سکتا۔''

''تو کرلو شادی..... کوئی مناسب سی لڑکی دیکھ کر۔'' میں نے مشورہ دیا۔ ''پیسے کی تو اب بھی تمہیں کمی نہیں ہے۔ چار چھ مہینوں میں کوئی اچھی سی نوکری بھی مل جائے گی اگر تم نے نوکری کی تلاش جاری رکھی تو.....''

وہ اپنے عروج سے زوال کی طرف آتے ستاروں کو دیکھ چکا تھا شاید یا پھر یہ صوفیہ کی بے وفائی کی جھنجلاہٹ تھی جو ارشد کو اداس رکھتی تھی۔

صوفیہ تین سال تک اس کی بیوی رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن صوفیہ کو جب یہ لگا کہ ارشد ناقابلِ اصلاح ہے اور کبھی نہیں سدھرے گا تو اس نے ارشد کا گھر چھوڑ دیا اور خلع کے لیے عدالت سے رجوع کرلیا۔

دو مہینے مزید گزر گئے۔ ارشد مسلسل کوششیں کرتا رہا لیکن ملازمت نہ مل سکی لیکن وہ گھریلو پریشانیوں کا اظہار کھل کر نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی خامیوں اور محرومیوں پر پردہ ڈال کر رکھتے ہیں، ہر وقت مسکرا کر ملتے ہیں۔ ہمیشہ اپنی ذات کے ایسے پہلو سامنے لاتے ہیں جن سے ان کے ہیرو یا مقدر کا سکندر ہونے کا تاثر لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھے۔

انہی دنوں ارشد نے انکشاف کیا۔ ''میں شادی کرنے جارہا ہوں۔''

''کس سے؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہے ایک لڑکی۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''تم تو جانتے ہو، میں ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا جس کا کریکٹر ڈھیلا ہو،

www.pklibrary.com

جو آن لائن دوستیاں کرتی ہو یا اپنے عاشق کو پیسے کھلاتی ہو۔ شادی تو میں کسی سیدھی سادی اور باپردہ اور شریف لڑکی سے ہی کروں گا۔"

"اور ایسی لڑکی فی زمانہ کیسے ملے گی۔" میں نے کہا۔ "مطلب کہ یقیناً یہ فریضہ پھر آنٹی ہی انجام دیں گی۔"

"لڑکی میں نے ڈھونڈ لی ہے۔" وہ مسکرایا۔ "بالکل شریف، سیدھی سادی اور باپردہ لڑکی ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔ وہ باتیں ہی ایسی معصوم اور اچھی کرتی ہے کہ..... اب دیکھو، اس کے ساتھ گپ شپ کو ابھی تین ہفتے ہوئے ہیں اور وہ مجھ پر دباؤ ڈالنے لگی ہے کہ میں نماز پڑھا کروں۔ وہ پانچوں وقت نماز پڑھتی ہے۔"

"بڑی بات ہے بھائی!" میں نے معترف ہو کر کہا۔ "ایسی لڑکی تمہیں کہاں مل گئی؟"

"فیس بک پر آن لائن دوستی ہوئی حالانکہ اس نے آئی ڈی پر اپنی تصویر بھی نہیں لگائی ہوئی۔ سمجھو کہ غائبانہ عشق ہے۔ بن دیکھے ہی اس سے محبت ہوگئی ہے۔"

"مجھے تمہاری باتوں پر یقین نہیں آرہا۔"

مجھے یقین دلانے کے لیے اس نے مجھے واٹس ایپ پر اس لڑکی کے ساتھ ہونے والی لمبی چوڑی چیٹ دکھائی اور بولا۔ "یار! وہ ایسی باپردہ ہے کہ کسی قیمت پر اپنی شکل دکھانے پر تیار نہیں ہوتی۔ کہتی ہے منہ صرف اس کو دکھاؤں گی جس سے شادی کروں گی۔"

میں نے کہا۔ "دیکھ بھال کر چلو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں رگڑا لگا جائے۔ بعد میں پچھتاتے پھرو گے۔"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

"میں حیران ہوں کہ وہ اگر اتنی ہی باپردہ ہے تو اس نے تم سے یہ بات چیت ہی کیوں کی۔ وہ سوشل میڈیا پر کیا کر رہی ہے؟" میں نے کہا۔ "تم مانو چاہے نہ مانو، مجھے تو امینہ کے پیچھے امین نظر آرہا ہے۔"

وہ ہنسا۔ "بھائی فکر نہ کرو۔ تمہارے دوست نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ مجھے فوراً پتا چل جاتا ہے کہ وہ امین ہے یا امینہ۔ کیا تم مجھے جانتے نہیں ہو؟"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

پندرہ بیس روز بعد ارشد میرے گھر پر آیا، کہنے لگا۔ کہیں کسی خاص کام سے جانا ہے۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے ایک جیولری شاپ پر لے گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک ڈبیا نکال کر جیولر کے سامنے رکھ دی۔ "میں یہ زیورات بیچنا چاہتا ہوں۔"

جیولر زیورات دیکھنے لگا۔

میں نے ارشد سے کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہو..... کہاں سے لائے ہو یہ زیورات؟"

"کچھ پیسوں کی ضرورت پڑ گئی ہے یار! تم تو جانتے ہو آج کل ملازمت نہیں ہے۔ امی کے زیورات اٹھا لایا ہوں۔ نوکری مل جائے گی تو بنوا دوں گا امی کو۔"

مجھے افسوس ہوا تھا۔ "ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟ کہیں کسی لڑکی کو تو نہیں دینا چاہتے؟"

وہ چونکا پھر سنبھل کر بولا۔ "ارے نہیں یار! تم جانتے ہی ہو، میں لڑکیوں کو پیسے نہیں کھلاتا بلکہ ان سے کھاتا ہوں۔ تیرے بھائی کا ریکارڈ ہے یہ۔"

میں نے دکھ سے کہا۔ "یعنی اب تم اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے آنٹی کے زیورات بیچ دو گے؟"

وہ بولا۔ "بنوا دوں گا یار.....! جلد ہی۔ ذرا میرے حالات بہتر ہو جائیں۔"

میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ "ارشد! زیورات اٹھا لو۔ تمہیں یہ بیچنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ ٹھٹکا۔ "بھائی! مجھے پورے دو لاکھ چاہئیں۔ اتنی رقم تیرے پاس نہیں ہوگی۔"

وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی والدہ کے زیورات بکنے سے بچانے کے لیے اسے قرض دینے والا ہوں لیکن ایسا نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ "تم زیورات اٹھاؤ، باہر بات کرتے ہیں۔"

وہ الجھن میں پڑ گیا۔ زیورات لے کر میرے پیچھے پیچھے باہر آگیا۔ "تیرے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟"

"دو لاکھ کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اس پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر کہا۔ "امینہ پیسے نہیں لے گی۔"

وہ ہزار واٹ کا کرنٹ کھا کر پلٹا۔ "کیا..... کیا کہا.....؟ امینہ پیسے نہیں لے گی؟ تم کیسے جانتے ہو کہ میں اسے پیسے دینا چاہتا ہوں؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "کیونکہ وہ امینہ نہیں، امین ہے..... اور وہ امین اس وقت تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ وہ میری ہی فیک آئی ڈی ہے۔"

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

جنگباز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر 20

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور حیرانگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

pklibrary.com

www.pklibrary.com

pklibrary.com

www.pklibrary.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

روشنیوں کا شہر کراچی..... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے، ان گنت داستانوں کی امین اس مہربان گود کے کسی کونے میں سہراب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنتا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ، مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ میں تو راحیلہ کو بچپن سے ہی سگی بہن سمجھا کرتا تھا مگر وہ بچپن سے ہی مجھے ایک بھائی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی ''نگاہ'' سے دیکھا کرتی۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن یہ حقیقت آشکار ہونے کے باوجود بھی میرے اس جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اب بھی اسے ایک ''بہن'' کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ راحیلہ نے میرے اس برتاؤ پر برا منایا مگر میں اسے بری طرح جھڑک دیتا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ پتا چلا کہ اصل نحوست غربت کی نہیں بلکہ ایک غصہ ور شخص کی روز روز کی داتا کل کل کی تھی۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف لڑھکا ضرور دیا تھا مگر چونکہ شاید میری رگوں میں ''نسلی'' خون دوڑ رہا تھا اسی لیے میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس ''سنبھلنے'' کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجو اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلۂ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا ''باس'' کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں (سلیم، راجو، ماجد اور مجھے) ایک روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا جہاں ہمیں لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ میں جسامت کے لحاظ سے چھریرا، لمبا اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔ سلیم مناسب قد و قامت کا جبکہ راجو اور ماجد قدرے گٹھی ہوئی جسامت کے مالک تھے۔ گروہ نے ہمارے ناموں کے ساتھ عجیب و غریب قسم کے ''لاحقے'' نتھی کر ڈالے۔ میں سہراب لبو کہلایا۔ سلیم کے ساتھ ''چھالیا'' نتھی ہو گیا۔ راجو ''بوری'' ہو گیا جبکہ ماجد ''ماجا''۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے ''باس'' اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میری غیرت جاگی۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتا دیں کہ بھتا نہ دینے کی صورت میں اس کی فیکٹری کو بم سے اڑا دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ میں نے بروقت بم کی اطلاع دے کر جہاں سیکڑوں غریب ورکروں کی جان بچالی، وہیں سیٹھ سکندر کو بھی بھاری مالی اور جانی نقصان سے بچالیا۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری ''نمک حلالی'' سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر تو تھا ہی میرا معترف۔ عقدہ کھلا کہ سدرہ کا ماموں یعنی سیٹھ سکندر کا سالا، سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب ہے۔ بعد میں اس راز سے بھی پردہ ہٹا کہ وہ سدرہ کی ماں کا سوتیلا بھائی تھا۔ وہ بھائیوں والی محبت جتا کر سوتیلی بہن کا سب کچھ ہتھیانا چاہتا تھا اور اپنے گروہ کو بھی مالی فائدہ پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ فوزیہ مجھ سے متنفر نہ ہوئی تھی کیونکہ بعد میں راحیلہ نے اسے حقیقت بتا ڈالی تھی۔ میں لاک اپ ہوا۔ اسی دوران کوئی ''پھوٹا خان'' نامی اجنبی میری مدد کو آیا۔ اندازہ ہوا کہ یہ گروہ کا کوئی مخالف تھا۔ اس کی مدد سے میں نے کسی طرح قانون سے رہائی پائی۔ باس اقبال، سلیم چھالیا اور راجو بوری میرے خون کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ وہاں سدرہ کا کوئی مکان خالی پڑا تھا۔ ادھر سدرہ کو اپنے نام نہاد ماموں سجاد بیگ سے بھی جان کا خطرہ تھا۔ سیٹھ سکندر کے دو وفادار محمود قریشی اور مشتاق بھی تھے۔ ٹرین کراچی سے پنجاب کے لیے روانہ ہوئی اور صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں بااثر ''چودھری جی برادران'' کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگ سے چودھری شالا جی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اسے درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام بختیار تھا۔ بختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ نگہت کسی وسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی ہے۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور نگہت بیٹی مگر شوہر کی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی نگہت کے

www.pklibrary.com

ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھی۔ اس کی الگ کہانی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جوجی میرا دوست بن جاتا ہے۔ نگہت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی ہے۔ سیالکوٹ میں اقبال چوک پر اس کے باپ یعنی باس کا بنگلا ہے۔ وہاں دو چوکیدار اور ملازم ارشد وغیرہ ہیں۔ ایک خفیہ گروہ ''کالی لہر'' سے میرا ٹاکرا ہوتا ہے۔ یہ جادو ٹونے کرنے والا گروہ ہے۔ عدیل جو کہ جگنو نامی شخص کا بھائی ہے ان کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلۂ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن جاتا ہے۔ کالی لہر کے رانگا بابا اور میڈم نجمی سے میری دشمنی عروج پر ہے اور ان کے میرے خلاف جادو ٹونے بھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آکر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ اس کی بیٹی نگہت میری دشمن بن جاتی ہے جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی ہے۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی..... باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چودھری جی برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری ہے۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانگا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہوں اور اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آتا ہوں۔ رانگا نے منتر پڑھنا شروع کردیے اور اچانک وہاں ہانڈیوں کی بارش ہونے لگی۔ مجھے سر پر کچھ مار کر... بے ہوش کردیا گیا..... اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ باور کرانے لگے کہ میں مرچکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ عجیب عجیب شعبدہ بازیاں دکھائی گئیں، پھر مجھے حالت بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ وہاں بجو نے حملہ کیا اور تب ہی غیبی مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے دربدر کردیا تھا۔ وہاں کے چودھری کا بیٹا صمد یار چنبیلی کے پیچھے پڑا ہوتا ہے۔ وہ وہاں آکر ہم لوگوں کو ہراساں کرنے لگا۔ اماں میرے علاج کی غرض سے خاص بوٹی لینے سرحد پار نکل گئی۔ صمد یار اور اس کے گماشتوں نے ہم پر حملہ کردیا تاہم میں نے اسے اپنی باتوں میں الجھا کر کسی طرح اپنی اور چنبیلی کی جان بچائی۔ اماں خاص بوٹی لے آئی تھی اور اس نے دوا کا سفوف اور تیل تیار کرلیا تھا۔ دوا نے مجھ پر جادوئی اثر دکھایا اور میرے اندر طاقت کا خزانہ بھر گیا۔ جنگل میں عورت کی چیخ پر میں وہاں پہنچا تو دیکھا ایک تیندوا عورت کو دبوچے ہوئے تھا۔ میں نے درندے کو ٹھکانے لگا دیا۔ زخمی عورت صمد یار کی ماں شمیلہ خانم تھی۔ صمد یار کے گماشتوں نے اماں کی مڑھی کو آگ لگا دی۔ میں انہیں تھانے لے گیا تاہم انہوں نے مجھے ہی لاک اپ کردیا۔ میں تھانے سے بھاگ نکلا۔ مجھے شمیلہ خانم نے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر ٹھہرا دیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ ہمیں یہاں سے نکال کر شہر پہنچا دے گا تاہم میں مطمئن نہ تھا۔ میں نے ڈاکٹر کے پاس ایک پراسرار آدمی کو دیکھا۔ جب تھوڑا تحقیق کی تو پتا چلا ڈاکٹر ہمیں پھنسانا چاہتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو گرفت میں لیا مگر وہ نکل گیا اور ہمیں مجبور کیا کہ جیسا وہ کہے، ہم کریں۔ تاہم دھینگا مشتی میں ڈاکٹر جان سے چلا گیا اور میں اماں اور چنبیلی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں استاد جوجی کے ٹھکانے پر آگیا۔ وہاں سے ہم کالی لہر والوں کے ایک ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں نزاکت اور راڑاں کی لاشیں ملیں۔ میں نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ وہاں سے میں ایک قصائی صورت بدمعاش کو اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس پر تشدد کرکے ہم معلومات لے رہے تھے کہ وہاں ہانڈیوں کی بارش ہوگئی۔ ہم نے دشمنوں کو مار بھگایا اور قبضے میں موجود بدمعاش سے کالی حویلی کا پتا معلوم کرلیا۔ ہم کالی حویلی پہنچ گئے، ابھی ہم کارروائی کا سوچ رہے تھے کہ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں رانگا بابا ہماری موجودگی کا پتا نہ چلالے۔ وہ میرا ''ہاٹ ٹارگٹ'' تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

یکا یک ماحول پر ٹھٹکا دینے والا سکوت طاری ہوگیا۔

میں اور استاد جوجی محتاط انداز میں کھڑے تھے۔ وہ میری پیش قدمی کا منتظر رہا۔

رانگا بابا اپنے دونوں چیلوں کے ساتھ دائیں جانب والے دروازے سے اندر کسی کمرے میں داخل ہوچکا تھا۔ ان تینوں کو شاید ابھی باہر ہونے والی ''مارا ماری'' اور اپنے محافظ ساتھیوں کے انجام کا علم نہیں تھا۔

میں نے جوجی کو مخصوص اشارہ کیا اور مذکورہ کمرے کی جانب قدم بڑھائے پھر قریب جاکر رک گیا۔ ایک کان لگایا کہ اندر سے کوئی سن گن مل سکے۔ شاید یہ بڑا کمرا تھا اور وہ تینوں کسی دور افتادہ گوشے میں جاچکے تھے۔ اگرچہ بھاگی بوٹی کی کرامت نے میری قوتِ سماعت میں بھی اضافہ کیا تھا مگر اس وقت اندر خاموشی ہی محسوس ہوئی۔

میں نے جوجی کو ادھر ہی کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور خود دبے پاؤں چلتا ہوا راہداری کے اختتام پر سامنے کے رخ پر ڈبل ڈور دروازے کے قریب آگیا۔ اس کے دونوں پٹ کے درمیان کی جھری سے بھی کچھ نظر نہیں آسکا۔ میں نے ایک کان لگا دیا۔ دفعتاً میں چونکا۔

اندر سے عجیب و غریب آواز آئی۔ میں نے غور کیا مگر یہ ادراک نہ کرسکا کہ یہ آواز کیسی تھی۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے کوئی آٹا پیسنے والی مشین دھیرے دھیرے چل رہی ہو اور رفتار بھی پکڑ رہی ہو۔ اچانک وہ آواز دروازے کے بالکل قریب

www.pklibrary.com

آ گئی۔ میں نے گھبرا کر ذرا پیچھے ہٹنا چاہا۔ معاً ہی دونوں پٹ کھلے۔ دائیں بائیں کہیں چھپنے کی فوری طور پر جگہ نہ تھی تاہم میں پیچھے ہٹ گیا۔

جوجی بھی چونک پڑا۔ دونوں دروازے کھلے اور میری آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ کوئی بڑی سی ٹرالی تھی جس پر کوئی دیو ہیکل سی شے لدی ہوئی تھی اور اس پر سیاہ موٹا کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ اس کا سائز اس قدر بڑا تھا کہ مجھے اور جوجی کو فوری طور پر خود ہی اس کی آڑ مل گئی۔ ٹرالی کو دھکیلنے والے دوسری طرف تھے۔ ظاہر ہے ان کی نظر بھی ہم پر ابھی نہیں پڑی تھی۔

یہ کٹھن چکر دیکھنے کے لیے میں اور جوجی پھرتی سے مگر بے آواز الٹے پاؤں پلٹے اور دوبارہ اپنی سابقہ جگہوں پر جا دبکے۔ ہال سے لاؤنج میں آ کر دیو ہیکل ٹرالی کا رخ تبدیل ہوا۔ میں چونکا۔

اس ٹرالی کو دھکیلنے والے دو تنومند افراد تھے جبکہ ایک تیسرا شخص بھی تھا جو انہیں ٹرالی کو احتیاط سے دھکیلنے کی تاکید کیے جا رہا تھا۔ یہ جبرو تھا۔

تو گویا میرا اندازہ درست تھا۔ سیدھے ہاتھ والے کمرے سے ایک دروازہ اندرونی سمت سے اسی ہال میں بھی کھلتا ہوگا۔

نہ جانے اس دیو ہیکل ٹرالی پر کیا دھرا تھا اور اسے کہاں منتقل کیا جانے والا تھا۔ باہر لے جانے کا مقصد یہی معلوم ہوتا تھا کہ اسے کسی ٹرک یا ڈالے میں لادنا مقصود ہوسکتا تھا۔

''بس، ادھر روک دو۔'' اچانک جبرو نے ان سے کہا۔ ''اسے باہر تک لے جانے کے لیے تین آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔ نہ جانے یہ لوگ کہاں مر گئے ہیں؟''

اس کا اشارہ شاید اپنے انہی ساتھیوں کی طرف تھا جو ہمارے ہاتھوں مر چکے تھے۔ وہ انہیں بلانے یا دیکھنے کے لیے بیرونی دروازے کی طرف لپکا۔ عقبی دروازہ اب بند کر دیا گیا تھا۔ یوں بھی اتنی بڑی ٹرالی اس دروازے سے باہر نہیں جاسکتی تھی۔ اس عمارت کا مرکزی دروازہ البتہ بڑا تھا۔

دونوں ساتھی وہیں کھڑے انتظار کرنے لگے۔ جبرو باہر چلا گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یقینی طور پر انہیں خطرے کا علم ہونے لگا تھا۔ میں نے جوجی کو مخصوص اشارہ کیا اور خود دونوں گرگوں کی نظروں سے بچتا اور کھسکتا ہوا اس کھڑکی کی طرف چلا گیا جو باہر کو کھلتی تھی اور جدھر سے کراس بو کے ذریعے بے ہوش کرنے والی گولیاں ہم پر پھینکی گئی تھیں۔ کیونکہ مرکزی دروازے سے باہر نکلنا خطرناک تھا، میں جبرو یا اندر کھڑے اس کے ساتھیوں کی نظروں میں آسکتا تھا۔

میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ شام کی ملگجاہٹ اب رات کی تاریکی میں بدلنے لگی تھی اور باہر روشنی کر دی گئی تھی۔ مجھے جبرو وسیع و عریض پورچ میں اپنے ساتھیوں کو آوازیں دیتا کھڑا دکھائی دیا۔ وہ بہت جھلایا ہوا تھا۔ وہ جن لوگوں کو آوازیں دے کر بلا رہا تھا، انہیں ہم ڈھا چکے تھے۔

میں نے کھڑکی سے باہر جست لگائی اور سیدھا جبرو کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔ وہ چونک کر پلٹا تو میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ یہ افتاد اس کے لیے اچانک اور غیر متوقع تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور چند لمحے کے لیے تو وہ کسی قسم کی مزاحمت یا دفاع میں بھی کچھ نہ کر پایا۔

''پہچانا مجھے جبرو!'' میں نے زہریلی مسکراہٹ تلے کہا۔ اس نے بدکنے یا جوابی وار کرنے کی کوشش کی تو میرا دوسرا بازو حرکت میں آیا اور اس کی گردن سمیت پورے جسم کو جیسے شکنجے میں کس لیا۔

''تو جن لوگوں کو آوازیں دے رہا ہے وہ سب جہنم رسید ہو چکے۔ اب تیری باری ہے۔''

''تت..... تم..... تم.....'' اس کے حلق سے گھٹے گھٹے انداز میں صرف اسی قدر برآمد ہوسکا کیونکہ اگلے ہی لمحے میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔ منکا ٹوٹتے ہی اس کا ناپاک جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اسے بھی میں نے ایک طرف پھینک دیا۔

رانگا بابا اور میڈم لچھمی کی افرادی قوت پر جس تیزی سے میں ضرب لگا رہا تھا وہ درحقیقت انہیں عبرت ناک سبق دینے کی ابتدا ابھی تھی۔ ساتھ ہی ان دونوں مردودوں کے خلاف میری وہ انتقامی کارروائی بھی جس کی آگ میرے سینے میں ایک دم ہی بھڑک اٹھی تھی۔

راڑاں اور نزاکت کی کٹی پھٹی اور تشدد زدہ لاشوں کا دردناک منظر مجھے نہیں بھول پا رہا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک جنون سا سوار کر دیا تھا۔ میں اندر کی جانب لپکا اور درانہ وار وسیع ہال میں ان کے دونوں ساتھیوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ دونوں دیگر ساتھیوں اور جبرو کی واپسی کے منتظر تھے۔ اس کے بالکل برعکس مجھے سامنے پا کر وہ ایک لمحے کے لیے بھونچکا رہ گئے۔

دونوں میری جانب تیزی سے لپکے۔ اسی وقت ایک شخص پر کوئی بجلی بن کر گرا اور اسے چکنے فرش پر رگیدتا ہوا

www.pklibrary.com

لے گیا۔ یہ جوجی تھا جسے اندازہ ہو چکا تھا کہ میں اب کیا کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔

دوسرا آدمی بُری طرح بوکھلا گیا۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ آئی۔ میری جانب جارحانہ انداز میں بڑھتے ہوئے اس کے قدم ایک دم ہی رک گئے اور پھر وہ تیزی سے پلٹ کر راہداری کی جانب شور مچاتا بھاگا۔ مقصد رانگا بابا کو یہاں نازل ہوئی موت کے بارے میں خبر کرنا تھا۔

میں نے جست بھری اور اس پر کسی چیتے کی طرح جا پڑا۔ یہ لانگ جمپ غیر معمولی تھی جسے دیکھ کر جوجی جیسا آدمی بھی ضرور حیران ہوا ہوگا۔ وہ اپنے مدمقابل کو بے حس و حرکت کر چکا تھا۔

اس گماشتے پر پڑتے ہی میں نے اسے بے بس کر دیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ فرش پر چت پڑا تھا اور میں اس کے سینے پر سوار۔

''رانگا کون سے کمرے میں چھپا ہوا ہے؟'' میں نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔ جواب میں وہ منمنانے لگا۔ میری دہشت پہلے ہی اس پر سوار تھی۔

''یہاں موجود تمہارے سارے کتے، جبرو سمیت ختم ہو چکے ہیں۔ کیا تمہارا بھی یہی حشر کروں؟ جواب دو۔'' میں خونخوار آواز میں بولا۔

''وہ..... وہ..... اندر کمرے میں.....'' اس کی بات پوری نہیں ہوئی، میں نے اسے گردن سے دبوچ کر کھڑا کر دیا۔ اس نے موقع تاک کر اپنی ایک ٹانگ کا گھٹنا میرے پیٹ پر رسید کر دیا۔ مجھے تکلیف کا احساس ہوا مگر میں سہہ گیا۔ میرے سر پر اس وقت خون سوار تھا۔

میں نے اس کی ٹھوڑی پر مکا رسید کر دیا۔ اس کا نچلا جبڑا اس بُری طرح ہل کر رہ گیا کہ دو ایک دانت خون کا فوارہ چھوڑتے باہر کو اچھلے۔

''رانگا کو تو ہم تلاش کر ہی لیں گے، تو گیا.....'' میرے لہجے کی سفاکی پر وہ تھرا اٹھا اور فوراً گھگیاتے ہوئے بولا۔

''مم..... مجھے معاف کر دو، رررر..... رانگا..... سیدھے ہاتھ والے کمرے میں موجود ہے۔''

میں اسے بھی واصل جہنم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر میں نے کچھ سوچ کر اس کی رگِ حساس مسل کر اسے اتنا غلیل کر دیا پھر اسے ایک کونے میں ڈال کر میں سیدھے ہاتھ والے کمرے کے بجائے سامنے والے بڑے دروازے پٹ والے دروازے کی جانب لپکا۔ جوجی میرے پیچھے تھا۔

یہ ایک وسیع ہال تھا۔ یہاں بھی دائیں بائیں دو کمرے نظر آئے۔ دایاں کمرا وہی تھا جس کا دروازہ اس ہال میں کھلتا تھا۔ اسی کمرے میں رانگا موجود تھا۔

اپنے اہم شکار کی اندر موجودگی پر میرے جلتے سلگتے وجود کا رُواں رُواں جوشِ غیظ تلے کانپ رہا تھا۔ راڑاں اور نزاکت کے خون آلود چہرے میری خوں ریز آنکھوں کے سامنے لہرانے لگے پھر اس سے پہلے کہ میں اس طرف بڑھتا، ایک دم اندھیرا چھا گیا۔

روشنیاں بجھ گئیں۔ ہال میں ایک دم تاریکی چھا گئی۔ میں لمحے بھر کو ٹھٹک گیا۔ اسی وقت زہر میں ڈوبی ہوئی ایک کرخت آواز ہال میں گونجی۔

''اب تو نہیں بچ سکتا مورکھ! میں تجھے ادھر ہی ختم کروں گا۔''

یہ رانگا بابا کی منحوس آواز تھی۔

یہ آواز ایسی غراتی ہوئی اور شدت انتقام کی آگ میں لپٹی ہوئی محسوس ہوئی تھی کہ چند ثانیے کے لیے میں بھی بت سا بن گیا۔ رانگا بابا کا اچانک یہ انداز میرے لیے غیر متوقع ہی تھا۔ اس رذیل کو جانے کیسے میری یہاں موجودگی کی خبر ہو گئی تھی۔

''جوجی! ہوشیار رہنا۔'' میں نے چلا کر کہا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ حسبِ عادت ''ای شاوشے'' ضرور کہتا مگر لگتا تھا جیسے اچانک اس بدلتے لمحات نے اسے بھی گنگ کر کے رکھ دیا ہو۔

اسی وقت ہال میں سرخ، نیلے، عنابی بلبوں کی روشنیاں جلنے بجھنے لگیں۔ یہ عام روشنی کے مقابلے میں مدھم تھیں۔ یوں یہ روشنیاں بھی اندھیرے کا تاثر لیے ہوئے تھیں۔ کبھی منظر سامنے ہوتا اور کبھی ڈوب جاتا۔

اسی ڈوبتے ابھرتے منظر میں ایک تیز آواز ابھری اور ہال کی فضا میں معلق کسی شے کو میں نے تیرتے دیکھا۔ جلتی بجھتی لائٹوں میں جب وہ شے قریب آئی تو مجھے لگا جیسے کوئی اڑن کھٹولا ہو۔ اس پر کوئی بہت بڑا جادوگر اپنے تمام جادوئی لوازمات کے ساتھ سوار ہو۔

وہ رانگا بابا ہی تھا۔ ایک چارپائی جتنے تختے پر سوار مگر تختہ کس طرح فضا میں معلق تھا، رسی سے یا پھر کسی اور شے سے..... یہ نظر نہیں آتا تھا۔ بس انطر میں مجھے یہ کوئی طلسماتی یا فینٹیسی ٹائپ کی فلم کا کوئی منظر لگا۔

مجھے غور سے دیکھنا پڑا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رانگا بابا تختے سمیت ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی شیشے کا آدمی ہو۔ اس کا تختہ بھی ایسا ہی تھا۔ عام فہم الفاظ میں ٹرانسپیرنٹ۔ یعنی ان کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ یہی نہیں، وہ بھی کسی

www.pklibrary.com

رنگین بلبوں کی طرح جل بجھ رہا تھا۔ عجیب سائنسی شعبدے بازی تھی۔

جوجی اور میرے پاس ہتھیار تھے۔ وہ ہم نے بیک وقت نکال کر اس پر یکے بعد دیگرے گولیاں برسا دیں۔ رانگا بابا کے شیطانی قہقہے ہال کی محدود وسعتوں میں گونجتے رہے۔ گولیاں اس کے منحوس اور ناپاک وجود سمیت تختے کے آر پار گزر کر ہال کی دیواروں اور چھت میں پیوست ہوگئیں۔

''اب میری باری ہے۔'' معاً ہی رانگا کسی زخمی درندے کی طرح دہاڑا۔

اس نے کوئی شے مٹھی میں پکڑ کر میری جانب اچھالی۔ میں پہلے ہی مستعد تھا۔ یکدم جگہ بدل لی۔ وہ شے فرش پر پڑی اور اگلے ہی لمحے ہلکا سا دھماکا ہوا۔

میں یہی سمجھا کہ اس کے وار سے میں بہ آسانی بچ گیا ہوں۔ دھواں اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھواں کسی دیوزاد ہیولے کی شکل اختیار کر گیا جس کے پیر تو دو تھے مگر ہاتھ چار اور ہر ہاتھ میں قدیم طرز کا ہتھیار دبا ہوا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہی تھی کہ وہ مجسم وجود نظر نہیں آتا تھا، جیسے دھوئیں کے بادل نے کسی دیوہیکل انسان کی شکل اختیار کرلی ہو، جس کے نقوش عنقا تھے۔

یہی حال اس کے ہاتھوں میں پکڑے قدیمی ہتھیاروں کا تھا۔ وہ بھی ٹھوس نہیں تھے، ہیولے ہی کی طرح لہراتے ہوئے۔ یوں، جیسے کوئی کارٹون ہو۔ میں الجھ کر رہ گیا۔ اگر یہ کوئی سائنسی شعبدہ گری تھی تو بہت اعلیٰ درجے کی تھی۔ یہ مجھے کیا نقصان پہنچاتی۔

مجھے الجھا ہوا، سوچتا سا پا کر رانگا نے شیطانی قہقہہ بلند کیا۔

''مورکھ! تُو نے یہاں آکر بڑی فاش غلطی کی ہے۔ نہیں جانتا تو کہ یہ میری جادوگری ہے۔ اب یہاں سے تو یا تیرا ساتھی زندہ بچ کر نہیں جاسکتے۔''

میرا ذہن اس عجیب وغریب صورتِ حال میں غیر معمولی طور پر تیزی سے کام کررہا تھا۔ میں نے رانگا بابا پر ہی نہیں، اس کی آواز پر بھی غور کیا تو اس کی آواز مجھے عام نہیں لگی بلکہ اس میں ایک گونج، ایک بازگشت سی تھی۔ یوں جیسے ''ایکو ساؤنڈ سسٹم'' ہو۔

جوجی بھی بے چارہ پہلی بار اس مردود کی شعبدہ بازی کا یہ مظاہرہ دیکھ دیکھ کر الجھن آمیز پریشانی کا شکار تھا کہ آخر وہ اس دھوئیں والے گرانڈیل ہیولے پر اپنے داؤ کس طرح آزمائے؟

ہیولا ایک دم سیاہ بن گیا، ہتھیار بھی اسی رنگ کے ہوگئے۔ ایک زنجیر سے بندھا گرز تھا، دوسرے میں کلہاڑی، تیسرے ہاتھ میں ہنٹر اور چوتھے میں خم دار تلوار۔ بس، یہ سب ایک لہراتے ہیولوں یا سائے کی طرح تھے۔

ہیولے نے میری جانب پیش قدمی کی۔ رانگا اپنا تختہ اونچا لے گیا اور چھت تک چلا گیا۔ ہیولا میری جانب دھوئیں کے بگولے کی طرح لپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے میرے گرد چکر لگانے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں پکڑے ہتھیار بھی لہروں کی شکل میں میرے گرد لپٹنے لگے۔

میں نے ہاتھ پاؤں چلائے مگر مجال ہے میں انہیں چھو بھی پاتا۔ میں نے جست لگائی مگر اسی وقت ایک گرز لہرایا اور میرے سر پر لگا۔ دفعتاً ہی مجھے محسوس ہوا جیسے مجھے ہلکی سطح کا الیکٹرک کرنٹ لگا ہو۔ میں چکرا کر گر پڑا۔

ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ دوسرے ہاتھ کا ہنٹر لہرایا اور میری پشت پر پڑا۔ کسی ضرب یا چوٹ کا احساس تک نہ تھا ماسوائے ایک ہی طرح کے ہلکی سطح کے کرنٹ شاک کے۔ یوں جیسے ارتھ محسوس ہورہا ہو۔ اس میں جلن کا احساس اور تھرا ڈالنے کا اثر ضرور تھا جس نے مجھے بوکھلا دیا۔

میں ابھی سنبھالا ہی لے رہا تھا کہ باقی دو ہاتھ بھی حرکت پذیر ہوئے اور ان میں دبی کلہاڑی اور تلوار نے میری گردن اور سینے پر حملہ کیا۔ وہی..... ضرب کے بجائے شاک محسوس ہوا۔ اس نے مجھے تڑپا دیا۔ میرا ذہن اس عجیب و غریب صورتِ حال سے بس تھوڑی دیر کے لیے ہی بدحواس ہوا تھا اور پھر جیسے میں اس کی شعبدہ بازی سمجھ گیا اور اٹھ کر درانہ وار ہیولے سے جا ٹکرایا۔ اس بار مجھے پہلے سے زیادہ شاک لگا۔ میرے منہ سے باقاعدہ پہلی بار کراہ خارج ہوگئی لیکن ایک امر ضرور واضح ہوا۔ جب میں ہیولے کو قابو کرنے کی غرض سے اس سے ٹکرایا تو اس کے آر پار نکلنے کے دوران مجھے کچھ باریک تاروں کے جال کی جھلک ضرور نظر آئی تھی۔ یوں جیسے انہی تاروں کے گرد ہیولے کا مجسم رقصاں ہو۔

جوجی بے چارہ تو گم صم کھڑا رہ گیا تھا۔ مجھے مقابلہ کرتے پا کر اس کا سکتہ بھی ٹوٹا اور اس نے قریب آنا چاہا کہ میں نے چلا کر اسے روک دیا۔

''نہیں، جوجی! میرے قریب آنے کی غلطی بھی مت کرنا۔ مجھے یہ کوئی الیکٹرومیگنیٹک شاکنگ فیلڈ کا شاخسانہ معلوم ہوتی ہے۔ تم میرے قریب آؤ گے یا مجھے چھوؤ گے تو سرکٹ مکمل پاور میں آجائے گی اور ہم دونوں کے وجود بھسم ہوجائیں گے۔''

www.pklibrary.com

جوجی وہیں رک گیا۔ اس کی آنکھیں تشویش تلے کھلی رہ گئیں۔ خود میں بھی الجھن آمیز پریشانی کا شکار تھا۔

جوجی سے میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ میں نے رانگا کے مکروہ چہرے کے تاثرات بدلتے محسوس کیے۔ اس میں جھلاہٹ تھی۔ اس نے خطرناک چال چلنے کی کوشش کی تھی۔ جوجی کو دانستہ نظر انداز کر کے ہیولے سے پہلے مجھ پر حملہ کروایا تھا تاکہ جوجی جوش تلے مجھے بچانے کو لپکے، سرکٹ پورا ہو اور ہم دونوں غیر مرئی بجلی کی شعاعوں تلے پل کے پل بھسم ہو جائیں۔

یہ وار خالی جاتے ہی اس نے اپنے ایک ہاتھ کو جنبش دی۔ مجھے اس کے ہاتھ میں کوئی آلہ سا تھما نظر آیا جیسے کوئی ریموٹ کنٹرول تھما ہوا ہو۔

اچانک اس کے اڑن کھٹولے نے جھکائی دی اور وہ کسی جیٹ طیارے کی طرح میری جانب لپکا۔ میں اپنی جگہ تنا کھڑا رہا۔ جوجی نے چلا کر مجھے خبردار کرنا چاہا مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ کھٹولا میرے وجود سے ٹکرایا..... مگر نہیں، وہ تو آر پار گزر کر دوبارہ ہال کی محدود وسعت میں جا ٹکا البتہ مجھے پہلے کی طرح ہلکا سا شاک ضرور لگا جسے میں سہہ گیا۔

ہیولا غائب ہو چکا تھا۔ رانگا بابا کی ایک شعبدہ گری کو میں نے ناکام بنا دیا تھا۔ میں اب بھی جارحانہ انداز میں تنا کھڑا تھا لیکن میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن نے ادراک کر لیا تھا کہ رانگا اور اس کا اڑن کھٹولا محض ایک ڈمی ہے۔ اس منبع و مخرج کا اصل کہیں اور ہے۔ اسے تلاش کرنا چاہیے ورنہ میں اس کے خلاف محض ٹامک ٹوئیاں مارتا رہ جاؤں گا اور اس کا کسی بھی وقت کوئی وار کاری یا کامیاب جا سکتا تھا۔

یہ سوچتے ہی میں تیزی سے جوجی کے قریب آیا اور اپنا مقصد مختصر سرگوشی میں بیان کر دیا۔ وہ میری بات سمجھ گیا۔

ادھر ہمیں ساتھ کھڑا دیکھ کر رانگا کا اڑن کھٹولا دوبارہ ہماری طرف تیزی سے بڑھا۔ وہ سرکٹ مکمل کرنا چاہتا تھا کہ اچانک میں اس کی چال سمجھ گیا اور قلابازی کھا کر راہداری کی جانب جا پڑا۔

''جوجی! مجھ سے کم از کم سات فٹ کا فاصلہ رکھنا۔'' میں نے چلا کر جوجی سے کہا۔ رانگا کی بھنائی ہوئی غراہٹ ابھری۔ نہ جانے وہ کمبخت کون سی جدید سائنسی ٹیکنالوجی استعمال کر رہا تھا جس کا عقدہ میں اس کی جادوئی ہانڈیوں کی طرح کھولنا چاہتا تھا۔

راہداری میں آتے ہی میں نے ڈبل ڈور والے دروازے پر جست لگائی اور ایک فلائنگ کک مار کر اسے کھولتا ہوا اندر جا پڑا۔ میں نہایت مستعد انداز میں ہاتھ پاؤں پھیلائے، تنا کھڑا چاروں طرف عقابی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور تب ہی میری گہری سماعتوں سے عجیب گھرگھراتی آواز کرائی جو بائیں جانب کے دروازے سے آتی محسوس ہوئی۔ یہ بہت باریک سہی مگر مجھ تک پہنچ گئی تھی۔ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس قدر باریک آواز جوجی نے بالکل نہیں سنی ہوگی۔

میں اسی دروازے کی جانب دوڑا۔ جوجی میری تقلید میں تھا، نیز میری ہدایت کے مطابق اس نے مجھ سے سات فٹ کا فاصلہ قائم کر رکھا تھا۔ رانگا بابا کا کھٹولا کسی بھی وقت یہاں نمودار ہو سکتا تھا۔ میں نے دروازے کو زوردار کندھے کی ٹھوکر رسید کی۔ جب دروازہ ٹوٹ کر گرا تو مجھے بھاگی بوٹی کی طاقت کا صحیح اندازہ ہوا کیونکہ وہ بھاری اور فولادی دروازہ کم از کم عام انسانی ٹھوکر کے بس کی بات نہ تھا۔

اندر کا منظر میرے لیے جتنا حیرت انگیز تھا، اتنا ہی خوش کن بھی۔ اس لیے کہ وہاں میں نے رانگا بابا کو اس کے اصل وجود میں دیکھ لیا تھا۔ وہ مردود ایک شیشے کے رنگین سے چوکور باکس میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے جلتے بجھتے بلبوں والا پینل تھا، ہاتھ میں جوائے اسٹک، ایک تختہ جس کے درمیان میں نیچے سہارے کے لیے ایسا ستون تھا جو بہ وقتِ ضرورت اسے اِدھر اُدھر اور اوپر نیچے کر رہا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی تھری ڈی کیمرا یا کوئی ہولی گرافی ہو یا پھر کوئی ویڈیو گیم۔

میں نے اس کے بارے میں کسی سائنسی میگزین میں پڑھا تھا۔ یہ جس زمانے کی میری داستان ہے، اس وقت کمپیوٹر یا موبائل نہیں تھا مگر یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہ تھی کہ یہ سب ٹیکنالوجی بیرونِ ممالک میں متعارف ہو چکی تھیں۔

اس وقت رانگا جس جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کر رہا تھا، اسے سیون ڈی ہولوگرافی ٹیکنالوجی کہا جاتا تھا۔ یہ تکنیک ''اسکائی اینڈ اسپیس'' شعاعوں کے انعکاس کی رہینِ منت ہوتی ہے جس سے کہیں چھپے بیٹھے آدمی کو سامنے ایک ماحول پیدا کر کے یوں دکھایا جاتا تھا جیسے وہ واقعی ہمارے سامنے موجود ہو مگر درحقیقت وہ وہاں ہوتا نہیں ہے۔

''فائر۔'' میں نے چلا کر کہا اور اپنے پستول کا رخ اسی شیشے کے باکس کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ جوجی نے بھی فوراً ہی آواز سن کر یہی کیا۔

یکے بعد دیگرے دھماکے ہوئے۔ گولیاں شیشے کے باکس سے ٹکرائیں اور چنگاریاں اڑاتیں اچٹ گئیں۔

www.pklibrary.com

ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ باکس مکمل طور پر بلٹ پروف تھا۔ رانگا بابا یہاں تک ہمیں دیکھ کر سرخ ہوگیا۔ اس نے تیزی کے ساتھ پینسل سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔

بلب تیزی سے جلنے بجھنے لگے پھر ایک دم ہی تاریکی چھاگئی۔ ساتھ ہی ایک ہلکی ''شائیں'' کی سنسناتی آواز کے ساتھ ہی وہ باکس بھی غائب ہوگیا یا پھر اس کی روشنی بھی گل کردی گئی تھی۔ یہ ہمارے لیے خطرناک صورت حال تھی مگر جوجی نے ایک دم ٹارچ روشن کرلی۔ شیشے کا وہ باکس رانگا بابا سمیت غائب تھا۔ اسی وقت کمرے میں دھواں بھرنے لگا۔

''اس طرف.....'' میں چلّایا اور ہال کے بعید ترین گوشے میں نظر آنے والے دروازے کی طرف لپکا۔ جوجی بدستور میری تقلید میں تھا۔ دروازے کو میں نے ایک طوفانی ٹکر سے مار گرایا اور اندر جا پڑا۔ کمرا خالی تھا۔ جوجی میرے قریب آگیا۔

''ای شاوشے! یہ کیا شعبدہ بازی ہے سہراب؟'' اس نے مخصوص لہجے میں کہا۔

''ابھی اور بھی دیکھو گے لیکن اس شیطان کو پکڑنا ہے۔'' میں نے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی وقت ہال میں پھیلنے والا دھواں اندر بھی آنے لگا۔

''نکلو یہاں سے..... گم۔ سانس روک لو۔'' کہتے ہوئے میں اسی کمرے کے دوسرے دروازے کی جانب بڑھا اور اسے کھول دیا۔ اب ہم لاؤنج والے ہال میں تھے۔ یہاں سے میں اوپر جانے والے زینے کی طرف دوڑا۔ تیزی سے دو دو، تین تین قدمچے طے کرتا ہوا اوپر جا پہنچا۔ یہاں مجھے ایک بالکونی نظر آئی۔ دائیں بائیں چند کمرے بنے ہوئے تھے۔ جوجی کی ٹارچ خوب کام آرہی تھی ورنہ تاریکی اس قدر پھیل چکی تھی کہ اس کے بغیر ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

میں چند ثانیے کے لیے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے وہیں کھڑا رہا پھر ایک کمرے کی جانب قدم اٹھائے ہی تھے کہ اچانک ایک تیز گونج دار آواز ابھری۔ دفعتاً ہی تاریکی میں رانگا بابا کا وہی طلسماتی اژدن کھٹولا نمودار ہوا۔ وہ ہماری جانب بڑھا آرہا تھا۔

''جوجی! دور ہوجاؤ'' میں چلّایا۔ وہ بے چارہ بھی اس کھٹولے کو دیکھ کر پریشان سا ہوگیا اور بوکھلا کر ہولے سے ''ای شاوشے'' کہتا ہوا فوراً دور ہٹ گیا۔ میں نے ایک کمرے کی جانب دوڑ لگادی۔ اسی وقت کھٹولے سے تین چار چمک دار لکیریں نمودار ہوئیں اور سانپوں کی طرح لہراتی ہوئی میری جانب لپکیں۔ جیسے ہی وہ مجھ سے ٹکرائیں تو اس بار مجھے زبردست شاک لگا۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو اس شاک کو سہہ نہ پاتا مگر شاید یہ اماں جی کی بھاگی بوٹی کا کرشمہ تھا کہ میں اچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا اور بالکونی کے فرش پر جا گرا۔

میں نے گرتے ہی سنبھالا لیا اور نیچے جست لگادی۔ رانگا بابا میرے ''فضائی'' تعاقب میں تھا۔ اس نے اپنے ''اصل'' کو کسی شعبدہ بازی سے غائب تو ضرور کرلیا تھا مگر دوبارہ ظاہر ہوکر وہی کرشمہ بازیاں دکھا رہا تھا۔

میں عمارت کے اندرونی احاطے میں گرا اور جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہاں قدرے روشنی تھی۔ مجھے جوجی کی فکر ہوئی، کہیں یہ بدبخت رانگا اسے خطرناک برقی لہروں کا نشانہ بنانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ جوجی ان برقی لہروں کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ رانگا نے اب اپنی برقی تکنیک کا پول کھل جانے کے بعد دوسری چال چلی تھی۔ اس نے شاید پاور بڑھادی تھی۔

کھٹولے والا رانگا ڈی نہ ہوتا تو میں اسے بھی زیر کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ وہ اس وقت میرے لیے ایک منحوس برقی سایہ بنا ہوا تھا لہٰذا میں اس کے منبع کی تلاش میں تھا۔ باہر آتے ہی میں پھر اندر کو لپکا۔ مجھے اسی کمرے میں جانا تھا جہاں میں نے اس کا اصل منبع دیکھا تھا۔

کھٹولا بدستور کسی اڑن طشتری کی طرح میرے تعاقب میں رہا۔ اس کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ اس کے سامنے کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہ تھی۔ وہ دیواروں سے بھی بہ آسانی گزر کر چشم زدن میں میرے سر پر آن پہنچتا تھا۔ اس وقت بھی یہی ہو رہا تھا۔ میں جیسے ہی دوبارہ اندر پہنچا، وہ بھی ملک الموت کی طرح میرے سر پر نازل ہوگیا۔

اس کی طشتری نے پھر برقی لہریں مجھ پر ''نچھاور'' کیں۔ اس سے بچنے کے لیے میں نے بھی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ قلابازی لگائی۔ لہریں زمین اور دیوار سے ٹکرائیں۔ دفعتاً ایک ہلکا دھماکا ہوا۔ میں فرش پر گرتے ہی سنبھلا تو غور کیا۔ برقی لہریں فولاد پر پڑنے کے سبب دھماکا کررہی تھیں اور اس سے اڑن طشتری کو غیر معمولی جھٹکا لگتا۔

تب ہی ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں گونجا۔ لاؤنج ہال میں روشنیاں دوبارہ جل اٹھی تھیں۔ اسی وقت دوبارہ مجھ پر حملہ ہوا۔ میں نے پھر جست لگائی لیکن اس بار مکار رانگا نے برقی لہروں کا جال سا پھیلا کر پھینکا تھا جنہوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں کدھر جاتا؟ اور دوسری بار مجھے زبردست شاک لگا۔ اس قدر کہ اس بار میری چیخ نکل گئی۔

www.pklibrary.com

"سہراب!" جوجی نے نہ جانے کہاں سے میری چیخ سن کر آواز لگائی تھی۔ وہ شاید ابھی تک اوپری منزل پر تھا۔ اس بار مجھے پہلے سے زیادہ شاک لگایا گیا تھا۔ میں فرش پر گر کر کپکپانے لگا۔ کوئی اور ہوتا تو اب تک اس کا ہارٹ فیل ہو چکا ہوتا۔ خود مجھے بھی ایسا ہی لگا جیسے میرے اعصاب اس شاک کے بعد جواب دینے لگے ہوں مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ بھاگی بوٹی کی غیر معمولی طاقت اپنی جگہ مگر اس بار اس مردود رانگا نے ہائی پاور شاک لگایا تھا۔

اس کی اڑن طشتری پھر میری جانب پرواز کرتی آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ آر پار گزرتی، میں نے منتشر حواسوں کو پل کے پل مجتمع کیا اور فرش پر لیٹے لیٹے تیزی سے لڑھکنی لگائی۔ رانگا کا برقی وار خالی گیا۔ میں جانتا تھا کہ میں تھک کر چور ہو جاؤں گا مگر یہ اڑن طشتری نہیں تھکے گی۔ تب تک میں اپنے اس ہدف تک پہنچ چکا تھا جہاں میری عقابی نظروں نے ایک الیکٹرک سوئچ بورڈ سے کچھ وائرنگ کھلی جھولتی دیکھی تھیں۔

بورڈ کافی پرانا ہو چکا تھا یا شاید ادھر کی وائرنگ زیر مرمت تھی۔ وہیں میں نے دیوار سے لگی، فرش پر رکھی ہوئی ایک فولادی جالی بھی دیکھی جو زیر مرمت بورڈ کی کنسیلڈ وائرنگ کے لیے رکھی ہوگی۔ میں تیزی سے اٹھا اور اس طرف لپکا۔ اس میں مین سوئچ لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے جلدی سے آف کیا اور فولادی جالی اٹھا کر برقی تار کو احتیاط سے پکڑا۔ یہ ایک رسکی عمل تھا۔

بورڈ کا مین سوئچ آف ہونے کے باوجود کرنٹ لگنے کا خطرہ ضرور رہتا ہے کیونکہ وہ صرف اسی کمرے کے بورڈ کا مین سوئچ تھا، پاور مین سوئچ بدستور آن رہتا ہے، ارتھ یا کرنٹ آسکتا تھا۔ تاہم میں نے پیروں میں ربر سول کے جوتے پہن رکھے تھے۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور جھولتی برقی وائر کو پکڑ کر اس کا سرا کسی طرح چھیلا اور پھر اس کے ننگے سرے کو جالی کے ساتھ جوڑ دیا۔ اب تک مجھے جو سمجھ میں آسکا، میں نے وہی کیا۔ ادھر جیسے ہی وہ طشتری میری جانب دوبارہ لپکی، میں نے خود کو دیوار سے لگا لیا۔ اس طرح کہ اڑن طشتری مجھ سے آر پار ہوتی اس فولادی جالی سے بھی گزر رہے۔ اس کے لیے مجھے ایک آخری قربانی یہ دینا پڑی تھی کہ میں ایک بار پھر زبردست شاک سے گزرتا۔

وہی ہوا۔ جیسے ہی وہ طشتری قریب آئی، میں نے مین سوئچ آن کر دیا۔ فولادی جالی سے لگی وائر میں زبردست اسپارک ہوا۔ طشتری قریب آئی اور میرے منہ سے ایک بار پھر دلدوز چیخ نکل گئی۔ اس بار تو مجھے لگا کہ میں بچ نہیں پاؤں گا۔ کیونکہ میرے وجود سے گوشت کے جلنے کی بو اور دھواں اٹھنے لگا۔ میں دیوار سے ہٹ کر فرش پر گر پڑا اور اکھڑی اکھڑی سی سانسیں لینے لگا۔ یوں جیسے میرا دم نکلا جا رہا ہو لیکن میری آنکھوں تلے چھا جانے والے مدھم اندھیاروں نے مایوسی کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ میری اس خطرناک تدبیر سے بھی اس منحوس برقی طشتری کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

رانگا کے منحوس اور شیطانی قہقہے پورے ہال میں گونجتے پھر رہے تھے۔

"مورکھ! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ آج میری برسوں کی خواہش پوری ہو رہی ہے..... اپنے دشمن کو تڑپا تڑپا کر مارنے کی۔ تو نے مجھے نقصان پہنچایا ہے۔ دیکھ لی میری شکتی....."

رانگا غرور اور تکبر تلے بھونکتا جا رہا تھا۔ "پر تو بھی ایک سخت جان دشمن ہی واقع ہوا ہے ورنہ کوئی اور ہوتا تو اب تک پہلے حملے میں ہی ختم ہو چکا ہوتا۔" اس کی بکواس جاری تھی اور ادھر میں اپنے حواس بحال کرنے کی جستجو میں لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

جوجی نہ جانے کدھر غائب ہو چکا تھا حالانکہ پہلے حملے کے سبب میرے منہ سے برآمد ہونے والی چیخ سن کر اس نے مجھے آواز دی تھی اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ نیچے ہی نہ چلا

حکمت کی باتیں

☆ دل میں برائی رکھنے سے بہتر ہے کہ ناراضگی ظاہر کر دی جائے۔

☆ میں سب جانتا ہوں، بس یہی سوچ انسان کو کنوئیں کا مینڈک بنا دیتی ہے۔

☆ یہ دو باتیں اپنے اندر پیدا کر لو۔ ایک چپ رہنا اور دوسرا معاف کر دینا کیونکہ چپ رہنے سے بہتر کوئی جواب نہیں اور معاف کر دینے سے بہتر کوئی انتقام نہیں۔

☆ زندگی میں کبھی بھی اپنے ہنر پر غرور مت کرنا کیونکہ پتھر جب بھی پانی میں گرتا ہے تو اپنے ہی وزن سے ڈوب جاتا ہے۔

☆ زندگی میں تین لوگوں کو کبھی مت بھولنا۔ مصیبت میں ساتھ دینے والوں کو، مصیبت میں ساتھ چھوڑنے والوں کو اور مصیبت میں ڈالنے والوں کو۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

www.pklibrary.com

آئے۔ وہ رانگا کے وار سے نہیں بچ سکتا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ غائب ہو چکا تھا مگر کہاں اور کیوں؟ کیا اسے نہیں معلوم تھا کہ میں کس قدر شدید خطرے سے دوچار تھا؟

اس بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا مگر زیادہ غور کرنے کا یہ وقت نہ تھا۔ ادھر وہ اڑن طشتری جس پر رانگا کا منحوس سایہ سوار تھا، پھر میری جانب تیزی سے لپکی۔ مجھ میں اب اتنی سکت ہی کہاں تھی کہ میں اس سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا۔ شاید میرا آخری وقت آ گیا تھا۔

میں نے اس منحوس طشتری کو قریب آتے دیکھتے ہی آنکھیں بند کر لیں..... مگر یہ کیا؟ مجھے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے فوراً آنکھیں کھولیں اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ رانگا اپنی اڑن طشتری سمیت غائب ہو چکا تھا۔

یکا یک مجھے یوں لگا جیسے وقت رک گیا ہو۔ ہال میں گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ اس پر مجھے ایک خوشگوار حیرت ضرور ہوئی تھی کہ میری جان اس اڑن طشتری سے چھوٹی تھی..... لیکن کیسے؟ یہ سب اچانک کیسا معجزہ ہوا تھا؟ استاد جوجی کدھر تھا؟ کیا اس نے ہی تو کہیں کوئی ''استادی'' نہ دکھائی ہو۔

میں خود کو سنبھالنے لگا۔ مجھے اپنے جسم میں کسی کسی جگہ جلن کا احساس ہونے لگا۔ میرے کپڑے بھی کہیں کہیں سے جل کر لیروں لیر ہو گئے تھے۔ میری حالت عجیب ہو گئی تھی۔ میں زور زور سے سانس لیتا اور دیوار کا سہارا لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ تب ہی میں نے حیرت انگیز طور پر اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کی۔ ایک غیر معمولی تبدیلی..... میری حالت زور زور سے اور گہری سانس لینے سے حیرت انگیز طور پر جلد بحال ہو رہی تھی۔ میں نے یہی عمل جاری رکھا۔ پھر یہی وہ وقت تھا جب مجھے داہنی جانب والے کمرے سے ایک لرزا دینے والی چیخ سنائی دی۔ میں اسے پہچان کر بری طرح دہل گیا۔

یہ چیخ استاد جوجی کی تھی..... یوں جیسے وہ سخت جان کنی کے عالم میں ہو۔ میری طاقت بحال ہوتے ہی میں مجنونانہ انداز میں اسی کمرے کی طرف دوڑا اور کسی چیتے کی طرح برق رفتار تیزی سے وہاں پہنچا۔ چیخ کی آواز مجھے اسی کمرے سے سنائی دی تھی جہاں کچھ دیر پہلے میں نے رانگا کو اصل حالت میں ایک شیشے کے باکس کے اندر دیکھا تھا جو بعد میں ایک دم تاریکی چھاتے ہی غائب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

کمرے میں روشنی تھی۔ وسط میں خلا..... بس اور کچھ بھی کمرے میں نہیں تھا۔ میرے اندر زبردست دھکڑ پکڑ مچی ہوئی تھی اور دل و دماغ ہلچل کا شکار تھے۔ جوجی کی درد انگیز چیخ کی آواز مجھے اسی کمرے سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

میں خلا کی جانب بڑھا۔ نیچے جھانکا تو تاریکی کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آیا۔ غور کرنے پر مجھے اندر گہرائی میں کسی کے زور زور سے کراہنے کی آوازیں سنائی دیں۔

میں یکدم فرش پر لیٹ گیا اور خلا میں منہ دے کر چلّایا۔ ''جوجی..... جوجی!''

''سس..... سہراب..... عقبی راستے سے باہر..... باہر..... جاؤ..... جلدی..... مم..... میری فکر مت کرو۔''

یہ جوجی کی کراہتی اور گھٹی گھٹی آواز تھی۔ جوجی کو اس حالت میں چھوڑ کر میرا جانے کو دل نہیں چاہا۔ نہ جانے وہ کس حال میں تھا؟

''لل..... لیکن جوجی..... تم.....؟'' میں نے کہنا چاہا مگر اس نے نہ جانے کس طرح اپنی رہی سہی قوت مجتمع کر کے مجھ سے دوبارہ کہا۔

''سہراب..... وقت ضائع مت کرو۔''

ممکن تھا عین وقت پر جوجی نے اپنی جان پر کھیل کر رانگا کی شعبدہ گری کو تہس نہس کر دیا ہو اور رانگا اسے زخمی کر کے بھاگ نکلا ہو۔ میرا یہ قیاس غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ جوجی نے یقیناً مجھے خطرے میں دیکھ کر یہ بہادرانہ قدم اٹھایا ہوگا۔

میں اٹھا اور تیزی سے لپک کر دروازے کی جانب پلٹا ہی تھا کہ بری طرح ٹھٹک گیا۔

وہاں وہی گرگا کھڑا تھا جسے میں بے ہوش کر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار کلہاڑا تھا۔ اس نے دروازے پر میرا راستہ روک رکھا تھا۔ نہ جانے اسے کب اور کس وقت ہوش آ گیا تھا یا پھر یہ رانگا کی کارستانی تھی۔ وہ خود راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے اسے میرا راستہ کھوٹا کرنے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں میرے لیے حد درجہ نفرت اور انتقام کے شعلے ناچ رہے تھے۔ اس نے ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ کلہاڑے سمیت مجھ حملہ کر دیا۔ میں نے جھکائی دے کر خود کو نہ صرف بچایا بلکہ اس کے ہاتھ سے کلہاڑا بھی اچک لیا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے نکلا تو میں نے گھما کر کلہاڑے کا وار اس پر کیا جو اس کے داہنے کندھے پر لگا۔ اس کے حلق سے کریہہ چیخ بلند ہوئی اور وہ کمرے کی دیوار سے ٹکرا کر گرا۔ میں کلہاڑا لیے باہر دوڑا اور اس طرف رخ کیا جدھر عقبی سمت میں دروازہ کھلتا تھا۔ وہ ٹرالی بھی اسی سمت رکھی ہوئی تھی۔ نہ جانے اس میں کیا تھا جس پر بڑا سا موٹا کپڑا ڈالا گیا تھا۔

www.pklibrary.com

اس کے قریب سے گزرتا ہوا میں آندھی طوفان کی طرح باہر پہنچا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں چند ایک گھنٹے پہلے میں نے رانگا، میڈم چھی اور ان کے دو گورے مہمانوں کو دیکھا تھا۔ دفعتاً ہی میں نے کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ وہ پرانے ماڈل کی لینڈ کروزر تھی جو تیزی سے دائیں طرف بنے کسی پورچ یا گیراج سے ایک دم ہی موڑ کاٹ کر سامنے آئی تھی اور اس کا رخ بیرونی روش کی طرف تھا۔ میں نے اس کی طرف دوڑ لگا دی۔

گاڑی کے اندر رانگا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مجھے نظر آ گیا تھا۔ وہ راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش میں تھا اور اسے اس پر یقیناً جوجی کے کسی بہادرانہ اقدام نے ہی مجبور کیا تھا۔

میں پوری رفتار سے دوڑتا ہوا اس کے پیچھے لپکا اور پختہ سڑک پر آنے سے پہلے ہی میں اس کی چھت پر جا چڑھا۔ یہی نہیں، وہاں سے تیزی کے ساتھ سینے کے بل رینگ کر میں نے کلہاڑے کا وار پوری قوت سے اس کی ونڈ اسکرین پر کیا۔

زبردست تڑاخا ہوا اور ونڈ اسکرین ٹوٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی بری طرح لہرائی۔ رانگا کا ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہکا تھا۔ خود میں بھی گاڑی کی چھت سے نیچے گرتے گرتے بچا۔ میں نے دوسرا وار ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی پر کیا۔ اس کا شیشہ بھی ٹوٹ گیا اور پھر میں نے بونٹ کی جانب چھلانگ لگائی۔ سامنے رانگا کی منحوس شکل نظر آئی۔ وہ بری طرح بوکھلایا ہوا اور پریشان تھا مگر اس کے حواس قابو میں تھے۔

اس نے ٹوٹی ہوئی ونڈ اسکرین سے مجھے شعلہ بار نظروں سے گھورا اور سنبھالا لیتے ہی گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ ساتھ ہی اسے اِدھر اُدھر لہرانے لگا تاکہ میں نیچے جا گروں اور وہ مجھے گاڑی تلے کچل ڈالے۔

اب میں کلہاڑا نہیں سنبھال سکتا تھا کیونکہ مجھے اب دونوں ہاتھوں کی مدد سے خود کو گرنے سے بچانا تھا۔ تاہم میں نے آخری وار کے طور پر کلہاڑا ونڈ اسکرین سے اندر پھینک مارا۔ اس کا تیز دھار آلہ تو نہیں البتہ اس کا موٹا دستہ میں نے رانگا کے سینے پر لگتے دیکھا۔ وہ بدکا اور گاڑی اس سے بے قابو ہو کر ایک درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔

میں نیچے آ گرا مگر پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی اثنا میں گاڑی رکتے ہی رانگا دروازہ کھول کر جلدی سے باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں میرا وہی پھینکا ہوا کلہاڑا تھا۔ وہ اسے تولتے ہوئے مجھے بڑی قہر آلود نظروں سے گھورنے لگا اور پھر ایک دم وحشیانہ چیخ کے ساتھ مجھ پر پل پڑا۔

یہی تو میں چاہتا تھا کہ یہ مردود کسی طرح دوبدو میرے مقابلے پر آئے۔ آج جیسے میری برسوں کی یہ دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔ میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں آج اس کا غرور خاک میں ملانا چاہتا تھا۔ میرے قریب آتے ہی اس نے کلہاڑے کا وار مجھ پر کیا اور میں نے اس کا وار جھکائی دے کر زائل کیا پھر دوسرے ہی لمحے اس کے پہلو پر ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔

مجھے اعتراف تھا کہ رانگا کو میں آج تک صرف شعبدہ گری والے جادو ٹونے کا ہی ماہر سمجھتا تھا مگر وہ سخت جان، بھینسے کی طرح طاقت رکھنے والا اور لڑائی بھڑائی کا بھی ماہر تھا۔ میرا یہ زوردار مکا اگر کسی عام آدمی کو لگتا تو وہ اسی وقت خاک چاٹ رہا ہوتا۔ میں نے رانگا کو کمزور سمجھنے کی غلطی کی تھی۔

ضرب سہتے ہی اس نے میرے منہ پر اپنے ہاتھ کا ہتھوڑے جیسا گھونسا رسید کر دیا۔ چند لمحوں کے لیے مجھے یوں لگا جیسے مناظر گھوم رہے ہوں۔ میں چکرا گیا۔ خاصا زوردار مکا تھا۔ میں نے سر کو دو ایک جھٹکے دیے۔ اسی دوران اس کی لات چلی، ہدف میرا پیٹ تھا۔ بچاؤ کے لیے میں نے فوراً اپنی دائیں ٹانگ کا گھٹنا اٹھا دیا اور تاک کر کلہاڑے کا وار اس کے سر پر کیا۔ مجھے اس سے نمٹنے کی یوں بھی جلدی تھی کیونکہ اندر جوجی نہ جانے کس حالت میں تھا۔ اس کی طرف سے مجھے تشویش لاحق تھی۔

کلہاڑے کے وار کو اس نے بلاخیز پھرتی کے ساتھ بچایا اور ساتھ ہی مجھے اڑنگا مارا۔ میں منہ کے بل بھربھری مٹی والی زمین پر گرا۔ میں نے بھی اپنے حواس مجتمع رکھے تھے کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں اس وقت اپنے سب سے خطرناک دشمن سے برسرِ پیکار ہوں بلکہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہوں لہٰذا گرتے ہی میں نے اپنی ایک لات چلا دی جو اس کی ٹانگوں پر اس قدر زور آوری سے رسید ہوئی کہ وہ بھاری بھرکم ہونے کے باوصف تھوڑا اچھل کر دھپ کی بھدی آواز سے گرا۔

ادھر میرے گرتے ہی کلہاڑا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، وہ میں نے سرک کر اٹھایا۔ اسی دوران رانگا نے بھی حرکت کی اور لیٹے لیٹے میرے چہرے پر ٹانگ چلائی۔ میں نے اپنا چہرہ بچایا اور دوبارہ کلہاڑے کا وار کیا۔ اس بار وہ اس کی ٹانگ پر گھٹنے سے ذرا نیچے لگا۔

کلہاڑے کا پھل بلاشبہ بہت تیز تھا اور کچھ وار بھی اوچھا پڑا۔ اس کی ٹانگ کٹ کر الگ ہو گئی۔ خون کا فوارہ ابلا اور اس نے کریہہ چیخ ماری۔ اب اسے موت سامنے نظر آنے

www.pklibrary.com

لگی۔ وہ پیٹھ کے بل کہنیوں پر تھوڑا اٹھا، گردن اور سر اٹھا کر اپنی ٹنڈی ٹانگ کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بیک وقت دہشت، انتقام اور نفرت کے سائے لہرا گئے۔ میں نے اس کی بے بسی والی ہیت کذائی پر اپنے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

''شیطان کی اولاد! اب تو آج سے رانگا بابا نہیں رانگا لنگڑا کہلائے گا۔ تو بابا جیسے معزز نام کا قطعی اہل نہیں ہے، رانگا لنگڑا.....!'' اس نے میری بات سنی اور پھر شدت تکلیف اور ..... اذیت کے مارے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے بے بس کر کے میں نے کلہاڑا سنبھالا اور اندر کی طرف دوڑا۔

میں جیسے ہی اندر پہنچا تو مجھے ایسی انسانی آواز سنائی دی جیسے مذبحہ خانے میں کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ دفعتاً میری نظر دائیں جانب راہداری پر پڑی اور میں وہاں کا گویا جاں گسل منظر دیکھ کر ایک لمحے کو سن ہو کر رہ گیا مگر دوسرے ہی لمحے ایک مجنونانہ چیخ مار کر کلہاڑا لہراتے ہوئے دوڑا اور اس سے پہلے کہ وہ گرگا جو فرش پر ڈھے ہوئے جوجی کو کسی چھرے سے ذبح کر رہا تھا، اس پر جا پڑا۔

کلہاڑے کے ایک ہی وار نے اس کی گردن اڑا دی اور اس کا سر کسی فٹ بال کی طرح دور لڑھکتا ہوا جا گرا۔ میں نے کلہاڑا پھینکا اور جوجی کو دیکھا۔ اس کی گردن سے خون بہے جا رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میری نظروں کے سامنے راڑاں اور نزاکت کے مرنے کا منظر گھوم گیا۔ مجھے چکر سا آ گیا۔ شدت غم تلے میرے حواس جاتے رہے، اعصاب اور دل و دماغ جیسے ساتھ چھوڑنے لگے۔

اپنا کوئی پیارا کھلی آنکھوں کے سامنے اس طرح جان کنی کے انداز میں مر رہا ہو تو چند لمحوں کے لیے یوں لگتا ہے جیسے ہم بالکل بے بس ہیں، کچھ نہیں کر سکتے، ایک ذرا جنبش بھی۔

یہی حال اس وقت میرا تھا۔ جوجی فرش پر لیٹا میری طرف دیکھ رہا تھا اور خون آلود ہونے کے باوجود مسکرا رہا تھا جیسے..... جیسے..... مجھے خدا حافظ اور ''ای شاوشے'' کہہ رہا ہو۔ جیسے..... جیسے مجھ سے کہنا چاہتا ہو۔ ''ای شاوشے..... یارا! بس ہمارا اتنا ہی ساتھ تھا۔'' میرا دل سینے میں گھٹنے لگا۔ یوں جیسے کوئی اسے مٹھی میں لے کر مسل رہا ہو۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میرے اندر ایک ہی خیال ابھرا۔ ''اللہ'' جتنا بڑا نام، اتنا ہی بڑا آسرا۔

''تجھے کچھ نہیں ہوگا جوجی!'' نہ جانے کیسے یہ الفاظ میرے منہ سے برآمد ہوئے۔ میں نے اس کی گردن کے زخم کا جائزہ لیا۔ چھری کی ابھی دھار ہی آزمائی ہوئی لگی تھی۔ وہ گہرائی میں نہیں اتری تھی لیکن گردن کا اتنا زخم بھی معمولی اور کم خطرناک نہیں ہوتا۔

میں نے جلدی سے اپنی شرٹ اتار کر پھاڑی اور اس کے زخم پر لپیٹ دی تاکہ کم سے کم جریان خون ہو پھر میں نے اسے بہ احتیاط دونوں ہاتھوں میں لے کر اٹھایا اور باہر کو دوڑا۔ تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ رانگا لنگڑا غائب تھا۔ یقیناً وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لنگڑی ٹانگ کے ساتھ گھسٹ گھسٹ کر دور جا چکا ہوگا، گاڑی البتہ کھڑی تھی۔ میں جلدی سے اس کی جانب لپکا۔ عقبی دروازہ کھولا اور جوجی کو حوصلہ دیتے ہوئے سیٹ پر لٹا دیا۔ اس کے بعد میں جس قدر تیزی سے گاڑی دوڑا سکتا تھا، دوڑاتا ہوا اسے لے کر قریبی اسپتال پہنچا۔

شکر تھا ایمرجنسی میں ڈاکٹرز موجود تھے۔ انہوں نے فوراً جوجی کو او ٹی (ایمرجنسی آپریشن تھیٹر) منتقل کیا۔ میں باہر کھڑا اللہ سے اس کی جان بچ جانے کی دعائیں مانگنے لگا۔ بہت گڑگڑا کر آنسوؤں سے لبریز ہو کر میں نے اللہ سے دعا کی۔ ''اے میرے معبود! بے شک زندگی اور موت تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو سارے جہانوں کا مالک اور ساری مخلوقات کا خالق عظیم ہے۔ ان کا بھی جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ بس، میرے دوست جوجی کی زندگی بچا لے۔ میرے تین ساتھیوں کا بھی کچھ پتا نہیں۔ ایک جان نثار دوست تھا، وہ بھی موت کے دہانے میں پہنچ چکا ہے۔ تو ہی میری مدد فرما اور جوجی کو نئی زندگی عطا کر۔ میری کسی بھولی بھٹکی نیکی کے صلے میں ہی میرے جگری یار کو زندگی عطا فرما دے..... آمین۔''

مجبور اور بے بس انسان کے لیے ایک دعا ہی آسرا ہوتا ہے۔ میرے دل کو قدرے سکون ہوا۔ میں آپریشن تھیٹر کے باہر لاؤنج میں ہی ٹہلتا رہا۔ اندر سے جو بھی نرس یا ڈاکٹر باہر آتا جاتا، میں دوڑ کر پہنچتا اور جوجی کا حال پوچھتا۔

''اللہ سے دعا کرو، ہم کوشش کر رہے ہیں۔'' ایک ہی جملہ مجھے سننے کو ملتا رہا۔ کچھ میڈیسنز وغیرہ لانے کا کہا گیا۔ فارمیسی اندر ہی تھی۔ میرے پاس اتنی رقم نہیں تھی تاہم میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ رقم کی فکر نہ کریں۔ ایمرجنسی ڈیل کریں، باقی سب بندوبست ہو جائے گا۔ اسٹاف بھلا مانس تھا، سچویشن سمجھ رہا تھا۔

تاہم میں نے جلدی سے اسپتال کے فون سے ہی سدرہ کو فون کیا اور اسے رقم لانے کا کہہ دیا۔ آفرین ہے سدرہ پر، وہ انکل محمود کے ساتھ اسی وقت چلی آئی۔ شکر تھا کہ رقم کیش کی صورت میں اس کے پاس موجود تھی ورنہ

www.pklibrary.com

بینک اس وقت کہاں کھلے تھے۔ شگفتہ خاتون بھی ان کے ساتھ ہی چلی آئی تھیں۔ سدرہ نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ جان چکی تھی کہ میں جس آدمی کے لیے اس قدر پریشان اور تشویش زدہ ہو رہا تھا، وہ میرے لیے کیا حیثیت رکھتا ہوگا۔

تین گھنٹے گزر گئے۔ میں وہیں کھڑا کبھی اٹھتا کبھی بیٹھتا اور کبھی بے چینی سے ٹہلنے لگتا۔ سدرہ بھی میرے ساتھ ہی رہی۔ میں نے اسے گھر جانے کا کہا بھی مگر وہ میری فکر، تشویش اور پریشانی دیکھ کر نہیں گئی۔ اس نے صبح دفتر بھی جانا ہوتا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا اس نے میرے مشورے کے مطابق اپنا تقریباً سارا کاروبار کراچی سے سیالکوٹ منتقل کر دیا تھا۔ انکل محمود اس کے ساتھ تھے۔

''سہراب صحیح کہہ رہا ہے۔ تم گھر چلی جاؤ سدرہ بیٹی!'' معاً شگفتہ خاتون نے بھی اس سے کہا۔ ''فکر نہ کرو، میں یہاں موجود ہوں۔''

''لیکن آپ.....''

میں نے شگفتہ خاتون سے کہنا چاہا تو اس نے مجھے ٹوک دیا۔ ''تمہارے دوست تمہاری ہی طرح میرے بچے ہیں سہراب بیٹا!''

وفورِ جذبات تلے مجھ سے آگے کچھ نہ کہا جا سکا۔ سدرہ اور انکل محمود مجھے تسلیاں دے کر چلے گئے۔

''آپ بھی دعا کریں جوجی کے لیے۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''کیوں نہیں، مگر تم خود کو تو سنبھالو اور ذرا آرام کر لو۔'' شگفتہ خاتون نے ملائمت آمیزی سے کہا۔

''مجھے کہاں آرام آئے گا جب تک جوجی کی خیریت کی اطلاع اندر سے نہیں آجاتی۔''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور اس بار میں نے ان کے سب سے سینئر ڈاکٹر کو سبز رنگ کے سرجیکل ڈریس میں باہر آتے دیکھا۔ اس کے ہمراہ ایک ڈاکٹر اور نرس بھی تھے۔ میں تیر کی طرح ان کی طرف لپکا۔

''ڈاکٹر صاحب! وہ کیسا ہے..... جج..... جوجی؟''

میں نے امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ میری آواز اٹک رہی تھی اور جملے بے ربط سے ہوئے جا رہے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری سانسیں رک گئی ہوں۔

ڈاکٹر نے اپنے چہرے سے ماسک اور پھر کیپ اتارا۔ اس کے بعد میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میری پھٹی پھٹی اور انکی انکی نظریں جیسے اس کے تھکے ماندے سے چہرے پر ثبت ہو چکی تھیں۔

''اللہ نے کرم کیا ہے۔ مریض کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔''

ڈاکٹر کے ان الفاظ نے جیسے میرا اسکڑا سمٹا سینہ ایک دم پھلا دیا۔ فرطِ مسرت تلے میری آنکھیں اس معبود کے لیے بھر آئیں جس نے میری دعا قبول کر لی تھی۔

''بلاشبہ اللہ نے تمہارے دوست کو نئی زندگی دی ہے۔'' ڈاکٹر آگے بولا۔ ''لیکن اس میں تمہارا بھی اہم رول رہا ہے۔ اگر تمہیں اسے لانے میں تھوڑی سی بھی دیر ہو جاتی تو پھر شاید ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے لیکن بہرحال اللہ کی ذات غفور و رحیم ہے۔''

میرا دل بھر آیا۔ میں نے اسی وقت اسپتال کے اندر کمپاؤنڈ والی میں بنی مسجد کا پوچھ کر وہاں جا کر وضو کیا اور اللہ کے حضور شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ واپس لوٹا تو میں نے فوراً پرویز کو کلب فون کر کے اسے مختصراً سب بتا کر اسپتال پہنچنے کو کہا۔

جوجی کی حالتِ زار سن کر وہ سکتے میں آگیا تھا۔ کئی لحظوں کے لیے تو اس بے چارے سے بولا بھی نہیں گیا تھا۔ تاہم وہ فوراً پہنچ گیا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ میں اس کی اس کیفیت کا ادراک کر سکتا تھا۔ جوجی ان کے لیے ایک ''باپ'' کا ہی درجہ رکھتا تھا۔ تاہم میں نے اسے تسلی دی۔ شگفتہ خاتون بھی ساتھ کھڑی تھیں۔

ڈاکٹرز نے جوجی کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا تھا اور ابھی کسی کو اس سے ملنے کے سلسلے میں ممانعت کر رکھی تھی۔

''پرویز! تم اِدھر ہی رہو گے۔ مجھے ابھی ایک اور اہم کام نمٹانا ہے۔ تفصیل بعد میں.....'' میں نے اس سے کہا پھر شگفتہ خاتون سے بولا۔

''کوئی مسئلہ یا بات ہو تو سدرہ کو فون کر دیجیے گا۔''

''لل..... لیکن تم اس وقت کہاں جا رہے ہو بیٹا؟ رات کا آخری پہر ہوا جا رہا ہے؟'' وہ تفکر سے بولیں۔

''کسی اور کی جان بھی سولی پر اٹکی ہوئی ہے۔ انہیں بھی میری ضرورت ہے۔'' میں نے ایک گم صم سے لہجے میں کہا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

میں گاڑی میں سوار ہوا اور اسے دوڑاتا ہوا دوبارہ کالی حویلی جا پہنچا۔

وہاں ہنوز سناٹے کا راج تھا۔ احتیاط اور کسی مصلحت کے تحت میں نے گاڑی کالی حویلی سے ذرا دور ہی روک دی

www.pklibrary.com

تھی اور نیچے اتر کر پیدل ہی اس طرف کو چل دیا تھا۔ میں محتاط روی سے چلتا ہوا قریب پہنچا تو آس پاس ویسا ہی سناٹا اور گھور تاریکی تھی۔ اطراف میں گھنے درختوں کا جنگل ہونے کے سبب سپیدۂ سحر دیکھنے میں نہیں آتا تھا ورنہ میرے اندازے کے مطابق مشرق سے پَو پھٹ چکی تھی۔ صبح دم بیدار ہونے والی تھی۔

میں گرد و پیش پر گہری نظر ڈالتا ہوا عقبی دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مجھے یہاں سے گئے ایک اندازے کے مطابق تین سے چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ رانگا لنگڑا ابھی اتنی جلدی اپنے کسی ساتھی سے رابطے میں نہ آسکا ہوگا۔ وہ شدید زخمی ہو کر اور موقع تاک کر کسی خارش زدہ لنگڑے کتے کی طرح پہلے اپنی حالت کو سدھارنے کی فکر میں ہوگا۔

میں اندر آگیا۔

☆☆☆

وہی مناظر تھے۔ سناٹا، اسرار بھری خاموشی اور..... ہر لمحہ ٹھٹکا دینے والا ماحول۔

ٹرالی اپنی جگہ موجود تھی۔ دل چاہا اس کا کپڑا اتار کر اپنا تجسس دور کروں لیکن مجھے فوزیہ، راحیلہ اور جگنو کی فکر تھی۔ اس سے پہلے کہ رانگا یا پھمی کے آدمی یہاں پہنچتے، میں انہیں تلاشنا چاہتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی اس منحوس کالی حویلی میں میرا ہی تسلط باقی رہ گیا تھا، خواہ عارضی سہی۔

میں نے جلدی جلدی سارے کمروں میں جا کر تلاشی لینا شروع کر دی مگر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ میں زینے طے کر کے اوپر آگیا۔ یہاں نیچے کی بہ نسبت کمروں کی تعداد کم تھی۔ یہاں بھی وہی حال تھا۔ ان کا کوئی پتا نہیں چلا۔ میں مایوس ہونے لگا حالانکہ مجھے پوری امید تھی کہ ان تینوں کو کالی حویلی میں ہی کہیں رکھا گیا ہوگا۔ میں نے کمروں کی دیواروں اور فرش کو بھی اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا۔ کیا خبر کوئی تہ خانہ ہو مگر اس طرف سے بھی مایوسی ہوئی۔

اچانک ایک آواز پر میں چونکا۔ یہ آواز باہر سے ابھری تھی۔ میں ابھی اوپری منزل پر تھا اور ایسے کمرے میں کھڑا تھا جس کی ایک کھڑکی بیرونی گیٹ کی طرف کھلتی تھی۔ میں لپک کر کھڑکی کے قریب آیا اور ذرا سا پردہ سرکا کر نیچے دیکھا۔ تب ہی یکلخت میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ وہ ایک وین تھی اور اس کے اندر سے چار پانچ مسلح افراد برآمد ہوئے۔ انہوں نے چست لباس پہن رکھے تھے اور انداز جارحانہ تھا۔ مجھے لگا لنگڑے رانگا نے کوئی گل کھلایا ہوگا۔ کسی طرح اس نے میڈم پھمی کو میرے اور یہاں کے حالات کے بارے میں مطلع کر دیا ہوگا۔ اب میری ہی تلاش میں انہوں نے اپنے لڑاکا آدمی روانہ کیے تھے مگر وہ خود کہاں تھے؟

میں اس کا اندازہ لگا سکتا تھا مگر ابھی مجھے ان سے بھڑنا تھا مگر نہیں..... یہ وقت کے زیاں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ابھی مجھے ان کے مقابلے میں گھات ملی ہوئی تھی۔ میں لپک کر کمرے سے نکلا اور بے آواز مگر تیزی سے چلتا ہوا بالکونی کی طرف آیا۔ تب تک مجھے نیچے بھاری قدموں کی گونج سنائی دینے لگی تھی۔ وہ سب اندر آچکے تھے۔

میں نے نیچے چھلانگ لگا دی اور لپک کر ان کی وین کے عقب میں آگیا۔ وین خالی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ وین کی چھت پر سینے کے بل لیٹ جاؤں یا پھر اندر کسی سیٹ کے نیچے دبک لوں مگر دونوں ہی رسکی کام تھے۔ ایک تو وین کی چھت سپاٹ تھی اور میرے دیکھ لیے جانے کا احتمال تھا، دوسرا اندر بھی یہی خطرناک صورت حال ہو سکتی تھی۔ میں دراصل ان کے ساتھ ہی ان کے اگلے ٹھکانے تک پہنچنا چاہتا تھا جدھر میرے محتاط اندازے کے مطابق نہ صرف لنگڑا رانگا بلکہ میڈم پھمی سے بھی سامنا ہونا ممکن ہوتا۔

ابھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں؟ چاہتا تو میں ان سے مقابلہ کر سکتا تھا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میڈم پھمی یا اور کوئی ان کا اہم فرد ہمراہ ہوتا تو اور بات تھی۔ میں چند لمحے ہونٹ بھینچے سوچتا رہا۔

اچانک مجھے کبیر اور زبیر کا خیال آیا جنہیں ہم ان کے تعاقب میں کئی گھنٹے پہلے ہی روانہ کر چکے تھے۔

'وہ دونوں کہاں رہ گئے؟' میں نے سوچا۔ میں نے انہیں میڈم پھمی اور ان کے ہم نشین گورا پارٹی کے تعاقب میں روانہ کیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ان دونوں کو اب تک لوٹ آنا چاہیے تھا۔

اچانک میں نے دو مسلح افراد کو تیزی سے حویلی سے باہر نکلتے دیکھا۔ میں ایک دم محتاط ہو گیا اور قریب میں موجود پورچ کے ایک ستون کی آڑ میں چلا گیا۔

پانچ میں سے صرف دو افراد کا باہر آنا اور تین کا اندر موجود رہنے کا مطلب کیا ہو سکتا تھا، میں یہ جان سکتا تھا۔ اب وین کے اندر یا اوپر سوار ہونا کم خطرناک ہو گیا تھا۔ وجہ ان کی کم تعداد تھی۔

میں دھڑکتے دل سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ جلدی سے وین میں سوار ہوئے تو میں ان کا ارادہ بھانپتے ہی فوراً وین

www.pklibrary.com

کی جانب بڑھا۔ فوری طور پر اس وقت کوئی اور موقع نہ تھا اسی لیے میں بہ احتیاط وین کے عقبی اسٹینڈ پر اس طرح جا ٹکا کہ اگلی نشستوں پر موجود ان دونوں کو نظر نہ آسکوں۔

وین اسٹارٹ ہو کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ مجھے بھی جھٹکے لگنے لگے مگر میں نے مضبوطی سے آئرن راڈ پکڑ رکھا تھا اور پچھلے بمپر پر پاؤں ٹکا رکھے تھے۔ کچے پر تو تھوڑی دیر تک وین ہچکولے کھاتی درمیانی رفتار سے چلتی رہی، اس کے بعد پختہ سڑک پر آتے ہی اس نے مزید رفتار پکڑ لی۔

میرے لیے زیادہ دیر تک یوں وین کے پیچھے لٹکے رہنا مناسب نہ تھا۔ تھکنے کی بات تو نہ تھی لیکن اس طرح میں دوسروں کی نظروں میں آسکتا تھا لہٰذا ایک موقع تاک کر میں نہایت احتیاط اور آہستگی کے ساتھ چھت پر رینگ گیا۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا، چھت سپاٹ تھی لیکن پھر بھی میں نے سینے کے بل خود کو چھت سے چپکا لیا تھا اور ٹانگیں قدرے سکیڑ کر اپنے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلا کر چھت کے کناروں کو اس طرح پکڑے رکھا کہ نیچے موجود دونوں کو میری چھت پر موجودگی کا ذرا سا بھی احساس نہ ہو سکے۔ یوں بھی وہ دونوں اگلی نشستوں پر براجمان تھے۔ اگر یہ دو کے بجائے پانچ ہوتے تو میرے نظر آجانے کا زیادہ خطرہ ہوتا۔ یہاں میں خود کو نسبتاً محفوظ اور آرام دہ سمجھ رہا تھا۔ سفر جاری رہا۔ میں بھی ذرا ذرا دیر بعد گردن اچک کر گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہتا۔

وین اسی سڑک پر آگئی تھی جو سیالکوٹ روڈ سے دریائے توی کی طرف جاتی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے اندر ایک جوش سا عود کر آیا۔ یہ لوگ یقیناً وہیں جا رہے تھے جدھر یہ خبیث لوگ راجا تیمور کی معرفت اپنے کسی نئے ٹھکانے کی خفیہ داغ بیل ڈالنے میں مصروفِ کار تھے اور جہاں میں پہلے بھی شب خون مار چکا تھا۔ یہ بات ان کے لیے خاصی پریشانی کا سبب بنی رہی تھی۔

مجھے ان کے نئے یا پرانے ٹھکانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں تو اب فوزیہ، راحیلہ اور جگنو کا کھوج لگانا چاہتا تھا کہ معلوم ہو ان بدبختوں نے ان بے چاروں کو کہاں اور کدھر محبوس کر رکھا ہے۔ فوزیہ اور راحیلہ کا معاملہ تو الگ تھا۔ وہ جگنو سے پہلے ہی غائب کر دی گئی تھیں جبکہ جگنو کی گمشدگی چند دن پہلے ہی عمل میں آئی تھی۔ اب یہ ضروری نہ تھا کہ ان سب کو ایک ہی جگہ یا اکٹھا کہیں رکھا گیا ہو۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ان کی منزل یہی عمارت ہو سکتی ہے لیکن یہ دیکھ کر میں چونک گیا کہ وہ ادھر رکے بغیر آگے نکل گئے۔ اس عالم میں

انمول باتیں

☆ کوئی نہیں دیکھتا کہ آپ کسی کے لیے کتنا کرتے ہیں۔ وہ صرف وہی دیکھتے ہیں جو آپ نہیں کرتے ہیں۔

☆ جتنی جلدی اردو ڈائجسٹوں کی ہیروئنیں کڑاہی گوشت بنا کر ساتھ شامی کباب تل لیتی ہیں اور گرم پھلکے پکا کر سلاد بھی کاٹ لیتی ہیں اور پھر نہا کر ہلکے گلابی رنگ والا کاٹن کا سوٹ پہن کر ہلکا سا میک اپ کر کے اور بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنا کر تیار ہو جاتی ہیں، اتنے وقت میں ہمارے والی کچن میں ماچس ڈھونڈ رہی ہوتی ہے۔

☆ خاموش ہو جایا کریں اور سہہ جایا کریں، جھک جایا کریں، مان لیا کریں، یہ عاجزی ہے جو اللہ کو بہت محبوب ہے۔ بندہ جب بااختیار ہوتے ہوئے خاموش ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نظر میں معتبر ہو جاتا ہے۔

☆ وقت سب کو ملتا ہے زندگی بدلنے کے لیے لیکن زندگی دوبارہ نہیں ملتی وقت بدلنے کے لیے۔

قابلِ غور

☆ جب لوگ دل سے اترتے ہیں تو ان سے بات کرنا تو دور تب ان کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔

☆ زندگی کا یورپین اسٹائل یہ ہے کہ زندگی ان لوگوں کے لیے اچھی ہے جو دوسروں کی پروا نہیں کرتے۔

☆ سچ کہہ دینے سے ذہن کو خلفشار سے نجات مل جاتی ہے۔

☆ ہر جملہ خوبصورت ہے اگر وہ ہماری امیدوں کے مطابق ہو۔

☆ غم کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو، نیند سے پہلے تک ہوتا ہے۔

☆ شیریں کلام اور نرم زبان انسان کے غصے کی آگ پر پانی کا سا اثر رکھتی ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ اسلام نگر، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

www.pklibrary.com

بھی میری پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوگئیں۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' میرے ذہن میں ابھرا۔ یہ لوگ یہاں کیوں نہیں رکے؟ وین عمارت کے قریب سے گزرتی آگے بڑھتی چلی گئی اور میں سینے کے بل وین کی چھت پر لیٹے لیٹے، گردن گھمائے عمارت کو دیکھتا رہ گیا۔ مجھے اس کے آس پاس سناٹے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

نہ جانے یہ کیا چکر تھا۔ یہ لوگ آگے کسی اور ہی طرف جا رہے تھے۔ کیا میں چھلانگ لگا دوں؟ لیکن نہیں، عمارت کی ویرانی اور ایک بار پہلے میری یہاں ''دھواں دھار'' آمد کے بعد شاید اب یہ میرے ''اہم مقاصد'' کے لیے بیکار کردی گئی تھی۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، یہاں کا میزبان بگا تھا جو میرے زیر عتاب آتے آتے رہ گیا تھا۔

'تو پھر اب یہ کس طرف جا رہے تھے؟ کیا اپنے کسی اور خفیہ ٹھکانے کی طرف؟'

یہی ایک خیال میرے ذہن میں ابھرا اور میں چھلانگ لگانے کا ارادہ ترک کر کے تن بہ تقدیر ہوگیا۔ تاہم تھوڑی گردن اٹھا کر میں گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ ویران اور بنجر علاقہ تھا۔ ناپختہ سڑک پر وین کبھی ہلکے اور کبھی تیز ہچکولے کھاتی اب درمیانی رفتار سے آگے بڑھتی رہی۔ یہ دریائے توی کے اطراف کا علاقہ تھا۔

گاڑی دریائے توی کے قریب آنے کے بعد اس کے اونچے ریتیلے کراڑے کے ساتھ ساتھ نیچے بنے راستے پر گامزن رہی۔ پندرہ بیس منٹ تک یہ سفر بھی جاری رہا پھر ایک موڑ گھوم کر وہ دریا سے دور ہونے لگی اور ایک نسبتاً اونچے ٹیلے سے موڑ کاٹ کر بائیں جانب کو گھومی تو میں چونک گیا۔

سامنے ہی مجھے ایک گودام ٹائپ کی بیضوی سی عمارت دکھائی دی۔ یہ نئی عمارت تھی اور قرمزی پتھروں سے تیار کی گئی تھی۔ یہ پہلی والی عمارت سے زیادہ بڑی نہیں تھی مگر نسبتاً نئی ضرور لگی۔ اس کے باہر مختصر سا احاطہ تھا۔ اس عمارت کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا کیونکہ ان کے اس ٹھکانے کے بارے میں غائبانہ طور پر مجھے انہی کی باتوں سے علم ہوا تھا کہ ان کا اسی مقام پر ذرا آگے ایک اور ٹھکانا بھی تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب پہلی بار میں نے مندرے والے اور راجا تیمور کو سالکوٹ روڈ سے اس طرف جاتے دیکھا تھا پھر چھپ کر ان کی گفتگو سنی تھی۔ اندازہ تو مجھے اسی دن ہوگیا تھا کہ ان کا اسی مقام پر ایک اور ٹھکانا بھی ہے۔ یہ وہی معاملہ تھا جس کے سلسلے میں گڑھ مولا کے بھانڈیل سائیں اور ان کے درمیان تنازعہ بھی ہو چکا تھا کیونکہ اس ٹھکانے کے قیام کے لیے وہ بھانڈیل سائیں کے گاؤں میں دلچسپی رکھتے تھے مگر اس نے وہاں زمین خریدنے کی انہیں اجازت نہیں دی تھی۔ وہ بھانڈیل سائیں کی جاگیر تھی۔

اس پر بھانڈیل سائیں کو ان پر کچھ شبہ ہوا تھا۔ یہ کوئی غیر قانونی کام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اسی لیے اس کی شہر سے دور دراز جاگیر کا انتخاب کیا تھا۔ جب اس نے اپنے ساتھی باس اقبال سے اس بات کا تذکرہ کیا تو اس نے اپنے خاص آدمی عدیل کو ان کے پیچھے لگایا تھا۔ یوں عدیل کی ان کالی لہر والوں کے ہاتھوں ہلاکت ہوئی تھی اس لیے کہ عدیل ان کالی لہر والوں کی اصلیت جان چکا تھا۔

بہرکیف، یہ بات اب ماضی کا حصہ بن چکی تھی۔ یہاں تذکرہ کرنا اس لیے ضروری ہوا کہ سلسلے کی کڑیاں بھی ایک دوسرے سے ملتی محسوس ہوتی رہیں۔

وین اسی عمارت کے قریب آکر رک گئی۔ میں یکدم محتاط ہوگیا اور خود کو سینے کے بل وین کی سپاٹ چھت سے چپکائے رکھا۔ یہاں میرے دیکھ لیے جانے کا احتمال تھا اسی لیے میں نے ذرا سر اونچا کر کے گرد و پیش کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

دن کافی نکل آیا تھا۔ دھوپ پڑنے لگی تھی۔ وین عمارت کے احاطے میں کھڑی تھی اور وہ دونوں اس کے اندر سے تیزی کے ساتھ اتر کر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ باہر کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

یہ تسلی ہونے کے بعد میں اسی طرح چھت سے چپکے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے کی جانب کھسکنے لگا پھر عقب سے وین کی آڑ لیتا ہوا نیچے اتر آیا۔ پہلے سامنے اور دائیں بائیں دیکھا۔ کوئی نظر نہیں آیا لیکن احاطے میں ایک طرف لمبی سی کار کھڑی دیکھ کر میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔ یہ وہی سیاہ مٹسوبشی تھی جس میں گورا جوڑا اور میڈم کچھی سوار ہو کر کالی حویلی سے روانہ ہوئے تھے۔

مٹسوبشی کی یہاں موجودگی ظاہر کرتی تھی کہ وہ سب ادھر ہی آئے تھے۔ باقی لنگڑا رانگا کہاں مر گیا تھا، اس کا ابھی کچھ پتا نہ تھا۔ کیا خبر اس نے بھی کوئی جگاڑ مار لیا ہو اور اپنے ساتھیوں کے درمیان یہاں پہنچ چکا ہو۔

ساتھ ہی مجھے کبیر اور زبیر کا بھی خیال آیا جنہیں میں نے کالی حویلی سے ہی ان کی روانگی دیکھتے ہی فوراً ان کے تعاقب میں روانہ کر دیا تھا۔ میرے ذہن میں یہی سوال ابھرا کہ پھر وہ دونوں کہاں تھے؟ اس بارے میں، میں

www.pklibrary.com

زیادہ نہ سوچ سکا۔ ابھی میرا ہدف فقط میرے ساتھیوں کی تلاش اور کھوجنا تھی۔ میں گردوپیش پر نگاہ دوڑاتا ہوا وین کی آڑ سے نہایت محتاط روی سے نکلا اور احاطے کی دیوار کے عقب میں تیزی سے سرک آیا اور جھکا جھکا چلتا ہوا عمارت کی عقبی سمت قدم بڑھایا ہی تھا کہ اچانک دور سے میں نے گرد وغبار کا بگولا سا اڑتا دیکھا۔ شاید کوئی گاڑی تیزی سے اس طرف آرہی تھی۔

وہ مین روڈ سے نہیں بلکہ دریائے توی کے اس بنجر مقام کی طرف سے ادھر آرہی تھی جہاں ریتیلا کراڑ اتھا۔ اس طرف بنجر ویرانوں کے سوا کچھ نہ تھا کیونکہ وہ سرحدی علاقہ تھا اور وہاں سے دریا پار بھارتی علاقہ جموں شروع ہوتا تھا۔

دریائے توی، بھدرواہ سے کچھ دور سیوج دھار سے نکلتا ہے اور رام نگر کی پہاڑیوں کی طرف بہتا ہوا علاقہ چمنی میں آتا ہے اور پھر ادھم پور سے ہو کر جموں شہر کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا پاکستان میں دریائے چناب سے جاملتا ہے۔

میری نظریں چند لمحے تک اسی دریا کی طرف جمی رہیں۔ گاڑی مٹی کا غبار اڑاتی تیزی سے اسی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ میں اپنی پیش قدمی روک کر اس کے قریب آنے کا منتظر رہا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس گاڑی کی منزل کون سی تھی۔ وہ گاڑی ایک لمبی سی جیپ تھی۔ میں اسے دیکھ کر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس بات پر نہیں کہ وہ عمارت کے احاطے میں داخل ہو کر گیٹ کے سامنے رک چکی تھی بلکہ یہ دیکھ کر کہ یہ وہی گاڑی تھی جس میں گزشتہ دن میں نے سیٹھ راجا تیمور اور دیگر کو اس میں سوار دیکھا تھا۔ اس کے اندر سے راجا تیمور، بگا اور ایک ڈرائیور کے ساتھ نیچے اترا۔

''یہ کہاں سے آرہے ہیں اور گئے کدھر تھے؟''

میرے ذہن میں یہ سوال آیا اور میری ایک ٹک نظریں انہی پر مرکوز رہیں۔ ممکن تھا یہ پہلی والی عمارت سے روانہ ہوئے ہوں۔ مگر نہیں، وہاں تو میں نے کوئی گاڑی کھڑی نہیں دیکھی تھی۔ گویا یہ لوگ سیدھے شہر سے ہی ادھر آئے تھے۔

میں نے دیکھا راجا تیمور تو وہیں گاڑی کے بونٹ سے ٹک کر جیب سے سگار نکال کر سلگانے لگا جبکہ بگا اور ڈرائیور فوراً لپک کر عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔ میں عجیب سی الجھن کا شکار ہو گیا۔ کیا کروں..... یہ لوگ کیا کرنے والے تھے؟ راجا تیمور کا باہر ہی موجود رہتے ہوئے سگار پیتے رہنے کا مطلب ایک ہی تھا کہ یہ لوگ یہاں زیادہ دیر نہیں رکنے والے تھے..... مگر کیوں؟ کیا انہیں معلوم نہیں تھا کہ اندر ان کی پوری ''قیادت'' موجود تھی پھر کالی حویلی کے تازہ کار حالات اور میرے ساتھیوں سمیت وہاں شب خون مارنا..... کیا اس بارے میں راجا تیمور واقف نہ تھا؟

وہی ہوا۔ جلد ہی بگا دوڑا دوڑا باہر آیا اور تیمور سے مؤدبانہ انداز میں کچھ کہا۔ اس کے بعد تیمور بھی اس کے ساتھ ہی فوراً دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ سگار اب بھی اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر آج بھی بہترین تراش کا سوٹ تھا۔

میں چند لمحے ادھر ہی دیوار کی آڑ میں چھپ کر کھڑا رہا پھر عقبی سمت بڑھ گیا۔ مجھے کسی کھڑکی یا ایسے راستے کی تلاش تھی جس سے میں اندر جاسکوں یا پھر باہر سے ہی اندر کی کارروائی کا جائزہ لے سکوں۔ کھڑکیاں تو مجھے تین چار نظر آئیں، روشن دان بھی تھے اور چھت بھی مگر کھڑکیوں کے سارے پٹ بند تھے۔ ان پر لوہے کی گرلیں نصب تھیں۔ چھت پر جانے کے لیے بھی مجھے کوئی راہ دکھائی نہ دی۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

میں ناچار پلٹا اور اسی وقت میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ یہ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ میں عقب سے خود پر حملہ کرنے والے کو دیکھ بھی نہ پایا تھا۔

☆☆☆

جب ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک ہال کمرے کے فرش پر رسن بستہ حالت میں پڑے پایا۔ میرے سر کا پچھلا حصہ بری طرح دکھ رہا تھا مگر میں اس زخم کو سہلانے سے بھی قاصر رہا۔ آنکھوں کے سامنے کچھ دیر اندھیرے کی کیفیت رہی۔ سر کو ہلکا سا ہی میں جھٹک پایا پھر کچھ منظر مزید واضح ہوا تو مجھے اپنے سامنے دھندلے دھندلے خاکے نظر آنے لگے۔

میں انہیں واضح طور پر دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں بار بار کھول بند کرنے لگا۔ تب ہی کچھ ماحول شفافیت اختیار کرنے لگا تو مجھے چند شیطانی چہرے نظر آئے جن کے بدہیبت ہونٹوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ تھی۔ میں ان شیطانی چہروں کو پہچان سکتا تھا۔ ان میں ایک تو میڈم پچھی تھی، دوسرا راجا تیمور، تیسرا بگا اور چوتھے کو دیکھ کر تو میں جیسے سن ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

آخر الذکر اس شخص کا اگرچہ یہاں ان کے درمیان میں موجود ہونا میرے لیے غیر متوقع تو نہیں تھا مگر ''اچانک'' ضرور تھا۔ ''غیر متوقع'' اس لیے نہ تھا کہ ایک دو دن پہلے ہی میں اس کے بارے میں قدرے صراحت سے راجا تیمور اور بگا کے درمیان ہونے والی گفتگو چوری چھپے سن چکا تھا اور مجھے علم ہو چکا تھا کہ آخر الذکر یہ شخص جو سجاد بیگ ہی تھا، ان

www.pklibrary.com

کے ساتھ مل چکا ہے۔

ہاں، یہ چوتھا شناسا شخص میرے ازلی دشمنوں کی فہرست میں پہلے نمبر پر تھا۔ سجاد بیگ..... باس اقبال کا نائب اور سدرہ کا خود ساختہ سوتیلا ماموں..... ایک خونی اور قاتل انسان..... اقبال کے واصل جہنم ہوجانے کے بعد جو اپنے خاص آدمی اور جگنو کے بھائی عدیل کی طرح کالی لہر والوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا کیونکہ اقبال نے ان سے اپنے دوست بھانڈیل سائیں کے حوالے سے تعاون کرنے اور ساتھ دینے سے صاف انکار کردیا تھا۔ ممکن تھا اب بھانڈیل سائیں بھی ان کے ''ٹارگٹ'' پر ہوتا۔

اب سجاد بیگ ابن الوقت اور موقع شناس ثابت ہوا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ بھانڈیل سائیں سے ہی رابطہ جاری رکھتا مگر اس نے اس کے برعکس کالی لہر والوں کے ہاتھوں اپنے ضمیر کا سودا کرلیا تھا اور ایسا یقیناً اس نے میری دشمنی میں کیا تھا۔ جیسا کہ مروجہ اصول ہوتا ہے کہ ''دشمن کے دشمن سے یاری'' یہی سجاد بیگ نے کیا تھا۔

میں اب کے بُرا پھنسا تھا۔ کالی لہر کی پوری قیادت، چند ایک کو چھوڑ کر، مع اپنے حلیفوں کے یہاں موجود تھی۔ گورا پارٹی (جوڑا) ابھی نظر نہیں آئے تھے۔ ان سب لوگوں کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ کبھی ان کی نظروں میں شیطانی مسکراہٹیں کھیلنے لگتیں تو کبھی خونخوار چمک اور منتقمانہ رعونت۔

ان کے وہی دو حواری جن کی دین کی چھت پر میں یہاں تک پہنچا تھا، میرے دائیں بائیں مستعد کھڑے تھے۔ ایک نے مجھ پر پانی کی بھری ہوئی بالٹی ڈال دی۔ میں پانی سے شرابور ہوگیا۔ ایسا انہوں نے شاید مجھے پوری طرح ہوش میں لانے کے لیے کیا تھا۔

''سہراب! تمہارا آخری وقت اب تمہاری زندگی سمیت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔'' یہ کریہہ سی آواز میڈم پچھی کی تھی۔ اس میں نخوت اور شدید قسم کی انتقامی نفرت بھی تھی۔

''زندگی اور موت صرف اور صرف میرے اللہ کے ہاتھوں میں ہے خبیث عورت!'' میں نے بھی لیٹے لیٹے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فوراً غضب ناک لہجے میں کہا۔ اس میں طنز کا زہر بھی تھا۔ ''کیا بھول گئیں تم..... پہلے بھی میں تمہارے ہتھے چڑھا تھا اور تم نے مجھے یہ سمجھ کر زندہ قبر میں دفنا دیا تھا کہ میرا آخری وقت آن پہنچا لیکن دیکھ لیا تم سب نے..... میرے اللہ نے مجھے بچالیا۔''

''اس کی بکواس سننے سے بہتر ہے کہ اس کا اسی وقت بندوبست کردیا جائے۔'' اس بار راجا تیمور نے غصیلے لہجے میں میری طرف گھورتے ہوئے میڈم پچھی سے کہا۔ میں نے خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے شاید علم نہ تھا کہ میں اسے غائبانہ طور پر ہی، پرجان چکا تھا۔

''ابھی نہیں راجا صاحب! ذرا رانگا کو ٹھیک ہوجانے دو۔ میں اس سے اس کے بارے میں مشورے کی پابند ہوں۔''

''تو کیا پھر اس کا لیکچر سننے کے لیے اسے یہاں ڈالا گیا ہے؟ اسے فوراً قید خانے میں لے جاکر پھینک دو۔'' راجا جھلا کر بولا۔

''ہمارے نئے ساتھی سجاد بیگ نے اس سے کچھ گفتگو کرنا تھی۔'' میڈم پچھی نے اس کی جھلاہٹ کا بُرا منائے بغیر کہا پھر وہ سجاد بیگ سے مخاطب ہوئی۔

''مسٹر سجاد بیگ! شکار سامنے ہے۔ اس سے تم کیا بات کرنا چاہو گے؟''

سجاد نے میری جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ راجا تیمور سگار سلگانے میں مصروف ہوگیا۔

''سہراب! مجھے اب تک تمہاری بے وقوفیوں پر بہت حیرت اور افسوس ہوا ہے۔'' سجاد نے کہنا شروع کیا۔ میں خاموشی سے اس کی بکواس سننے لگا البتہ یہاں ایک سوال نے میرے سوچتے ذہن میں سر ضرور اٹھایا تھا کہ باس اقبال کی ''باقیات'' یعنی سجاد بیگ اگر یہاں موجود تھا تو پھر سلیم چھالیا اور راجو بوری کہاں تھے؟ وہ اس کے ہمراہ کیوں نظر نہیں آئے؟ راجو بوری تو ممکن تھا میرے اس رات والے تباہ کن حملے کے بعد ختم ہوچکا ہو مگر سلیم چھالیا کو تو یہاں اس کے ساتھ موجود ہونا چاہیے تھا..... پھر ''چودھری جی برادران'' کے بارے میں بھی سوال اٹھتا تھا۔

''چاہیے تو تمہیں یہ تھا کہ ہمارے گروہ میں رہتے ہوئے تم خود کو منواتے، تنظیم کے وفادار رہتے۔ اس کے صلے میں تمہیں ایک بڑا عہدہ اور بڑا مقام ملتا مگر افسوس کہ اس کے برعکس تم نے ہماری دشمنی میں نام کمایا۔ کیا فائدہ ہوا اس کا؟'' بالآخر اس نے اپنی بکواس کی ابتدا کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''اقبال صاحب کے مرنے کے بعد میں نے تنظیم کی باگ ڈور سنبھال لی۔ یہ تنظیم خود ایک ''باس'' ہے۔ اسے کوئی ختم نہیں کرسکتا۔ آج تم میرے نائب ہوتے اور ایسی زندگی گزارنے کے بجائے ہمارے ساتھ عیاشی اور آرام سے رہتے مگر تم نے یہ سب اچھا نہیں کیا۔''

''میں نے وہی کیا جو میرے ضمیر کی آواز تھی اور اب بھی میں یہی کروں گا۔'' میں نے اسے انتہائی نفرت بھرے

www.pklibrary.com

انداز میں جواب دیا۔ میری جوابی کارروائی پر اس کے چہرے پر شعلے سے چمکے اور وہ اسی لہجے میں بولا۔

''بہت غرور ہے تمہیں خود پر مگر یہ مت بھولنا کہ عنقریب تمہارا انجام بہت بُرا ہونے والا ہے۔ تم کیا سمجھ رہے ہو کہ میں تم سے واپس تنظیم میں آنے کی منتیں کروں گا؟ ہرگز نہیں، میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے تنظیم سے ہٹ کر میرا جو ذاتی نقصان کیا ہے، اگر اس کا ازالہ کردو تو میں تمہاری زندگی بچانے کی کوشش کرسکتا ہوں۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

''میں اس وقت جکڑا ہوا ہوں اور اس حالت میں تمہاری کوئی بات سمجھنے کے قابل ہوں نہ ہی کہنے کے۔ اگر مجھ سے کسی معاملہ داری کی بات کرنی ہی مقصود ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر اس تکلیف دہ حالت میں مجھے تمہاری بات سمجھنے میں دقت ہوسکتی ہے۔''

سجاد نے میری بات سن کر اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور میڈم پچھی کی طرف متوجہ ہوا۔

''میڈم! اس کی رسیاں کھول کر اسے کرسی دے دو۔''

''یہ بہت خطرناک آدمی ہے، کیا تم نہیں جانتے؟''

میڈم پچھی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ لوگوں کو اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس سے ایک معاملے کی بات کرنی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ اس کی بات مان لی جائے۔ یہ بھلا اب یہاں سے کہاں جاسکتا ہے۔''

''میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔'' راجا تیمور سگار کے مرغولے اڑاتا ہوا بولا اور ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میڈم پچھی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم کہاں چلے راجا صاحب؟''

''مجھے اور بھی معاملات دیکھنا ہیں اور مہمان پارٹی کی رہائش کا بندوبست کرنا ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''لیکن اس لڑکے کا آج ہی کوئی آخری بندوبست کرڈالو، یہ میرا مشورہ ہے۔ اسے زیادہ ڈھیل دینا ہمارے اور ہمارے مقاصد کے لیے اچھا نہیں۔ آگے تم لوگوں کی مرضی..... کیونکہ مجھ سے زیادہ تم اسے بہتر جانتے ہو۔''

اس کے بعد وہ پلٹ کر چل دیا۔ مجھے راجا تیمور اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک سنجیدہ آدمی لگا۔ اس کے پیچھے ایک آدمی بھی چل دیا۔ وہ شاید اس کا ڈرائیور تھا۔ میڈم پچھی نے اس سے کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ پائی۔ راجا تیمور کا کسی ''مہمان پارٹی'' کا ذکر کرنا مجھے چونکا گیا۔ کہیں اس کی مراد اس غیر ملکی جوڑے سے تو نہیں تھی؟

البتہ سجاد بیگ نے اس سے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

''آپ فکر نہ کریں میڈم! میں یہاں موجود ہوں اور میرے ساتھی بھی۔ میں دیکھتا ہوں یہ کس حد تک میری بات مانتا ہے۔'' اس کا اشارہ میری جانب تھا۔

میڈم پچھی نے وہاں موجود اپنے دو حواریوں کو مخصوص اشارہ کیا۔ انہوں نے میرے جکڑ بند کھول ڈالے اور مجھے بیٹھنے کے لیے ایک کرسی بھی دے دی۔ دونوں ہاتھ آزاد ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے اپنے سر کی عقبی چوٹ کو سہلایا پھر سجاد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

یوں میں اندر ہی اندر ان کی اس بے وقوفی اور مجھے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں
جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 2400 روپے
بیرون ممالک کے لیے زرِ سالانہ 25,000 روپے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں
رابطہ:
مرزا ثمر عباس: 0334-5498977
0301-2454188
سرکولیشن مینیجر محمد شہزاد خان: 0333-2256789
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فنز: ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

www.pklibrary.com

''ہلکا'' سمجھنے کی احمقانہ سوچ پر ہنسا مگر شاید سجاد بیگ نے میرے چہرے سے جھلکتی مسرت کی ہلکی سی رمق بھی بھانپ لی تھی۔ وہ جمے ہوئے لہجے میں بولا۔

''سہراب! تم نے اپنی نادانی کی وجہ سے اپنے بہت سے دشمن پیدا کر لیے ہیں جو نہ صرف تمہارے بلکہ تمہارے خیر خواہ اور جان نثار ساتھیوں کے بھی خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ ان میں تم مجھے بھی سرفہرست سمجھو..... کیونکہ تم نے ہمارے بعض ساتھیوں کو بھی بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔''

''اس کی ابتدا تم لوگوں کی طرف سے ہوئی تھی۔'' میں نے بات کاٹی۔

''خاموش رہو اور پوری بات سنو پہلے۔'' معاً میڈم پچھی پہلی بار مجھ سے بڑے غصیلے لہجے میں مخاطب ہو کر غرائی۔ میں نے بھی جواب میں اس کے مکروہ ڈائن جیسے چہرے پر ایک نفرت انگیز نگاہ ڈالی۔

''ہمارا ایک اہم ساتھی اب بھی تمہاری قید میں ہے۔'' سجاد بیگ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یاد رکھو، ہم سے دشمنی میں تمہیں کچھ نہیں ملے گا سوائے بربادی اور اپنے پیاروں سے محرومی کے۔''

''میرا ایک ساتھی جگنو بھی تم لوگوں کی قید میں ہے اور میری بہن راحیلہ اور منگیتر فوزیہ بھی۔'' میں نے میڈم پچھی کی سخت تاکید کے باوجود سجاد سے کہا۔

''میں ان کی رہائی کے لیے میڈم سے بات کر سکتا ہوں۔'' سجاد نے کہا۔ مجھے اس کے لہجے سے سخت منافقت کی بو آتی محسوس ہوئی پھر میں بات کو ختم کرنے کی غرض سے بولا۔

''تم کسی معاملہ داری کی بات کر رہے تھے، میں اسی بات کا منتظر ہوں۔''

''ہاں۔'' سجاد بیگ نے ایک گہری سانس لی۔ ''یوں تو ہمارے تقریباً سب ہی ساتھی تم نے ہلاک کر ڈالے ہیں مگر شکرا نامی ہمارا ایک آدمی اب بھی تمہاری قید میں ہے۔ اس کی بہ خیر و عافیت واپسی کا بندوبست تمہیں کرنا پڑے گا۔''

مجھے اس کی بات پر اندر سے تسلی ہوئی کہ ان لوگوں نے دوبارہ کلب کی عمارت میں شب خون نہیں مارا تھا ورنہ نہ صرف ان کا ایک خطرناک اور تباہ کن ساتھی شکرا آزاد ہو چکا ہوتا بلکہ پرویز سمیت وہاں مقیم اماں اور جنبیلی کی جانیں بھی خطرے سے دوچار ہو جاتیں۔ کیا خبر انہوں نے اپنی پہلی ناکامی کے بعد وہاں دوسری بار بھی ہلا بولا ہو لیکن پرویز نے اپنی ہوشیاری اور چالاکی سے حالات پر قابو پا لیا ہو یا ان لوگوں کے ہتھے نہ خود اور نہ ہی دوسروں کو چڑھنے دیا ہو۔ یوں یہ حملہ بھی ناکامی سے دوچار ہوا ہو۔ کم از کم اس وقت ان لوگوں کی برہمی اور جھلاہٹ سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

تب ہی یہ بات میرے ذہن میں ابھری کہ اگر ایسا ہوا بھی تھا تو پرویز کو جوجی کی ''لک آفٹر'' کے لیے میں نے اسپتال بلوایا تھا۔ ایسی بات ہوتی تو پرویز مجھ سے ذکر تو کرتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بعد میں یہ سب ہوا ہو مگر اتنی جلدی..... کچھ الجھن درمیان میں تھی۔ اس کا عقدہ آگے چل کر ہی کھل سکتا تھا۔

زبیر اور کبیر الگ میرے لیے ایک معما بنے ہوئے تھے جنہیں میں نے کالی حویلی سے میڈم پچھی اور ان کے گورے مہمانوں کے تعاقب میں روانہ کیا تھا۔ اب نہ جانے وہ دونوں کدھر غائب ہو گئے تھے؟

''بدلے میں مجھے میرے تینوں ساتھی چاہئیں۔'' میں نے بھی سودے بازی کی بات کر ڈالی۔

''بکواس بند کرو اپنی۔'' میڈم پچھی پھر غیظ آلود لہجے میں مجھے گھور کر بولی۔ اس کا ڈائن جیسا سیاہ رو اور بدہیئت چہرہ طیش کی سرخی تلے اور بھی بھیانک اور مکروہ نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اس پاگل اور دیوانی چڑیل کو پھر نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے سجاد بیگ سے کہا۔

''کیا ایسے ماحول میں کسی معاملہ داری کی بات ہو سکتی ہے؟''

سجاد نے میڈم پچھی کی طرف دیکھا اور ہولے سے اس سے کچھ کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔

''تم بھی ہم سے ذرا اپنی اوقات میں رہتے ہوئے بات کرو۔ مت بھولو کہ تم اس وقت ہمارے رحم و کرم پر ہو۔'' اس کی بات سن کر میں نے بھی زہریلے لہجے میں کہا۔

''پھر تمہیں بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تشدد کر کے میرے منہ سے اپنے ساتھی شکرا کے بارے میں اگلوا لو۔''

میرے زہریلے طنز پر اس کے جبڑے اندرونی ابال تلے بھنچ گئے۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔ ہم یہ بھی کر سکتے ہیں۔''

''بصد شوق۔'' میں نے بے پروا انداز میں کندھے اچکا دیے۔ میڈم پچھی کو میرا یہ دلیرانہ انداز سخت کھلنے لگا۔ سجاد بیگ بھی اس بار آپے سے باہر ہو گیا اور ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی جیب سے ایک لمبی نال والا پستول نکال کر مجھ پر تان لیا۔ اس کا چہرہ اس وقت لال بھبوکا ہو کر مسخ ہو رہا تھا۔

''میں تم پر تشدد کرنے میں وقت ہرگز ضائع نہیں کروں گا۔ تمہیں اسی وقت گولی مار دوں گا۔'' کہتے ہوئے

www.pklibrary.com

اس نے فائر کر ڈالا۔

یہ حملہ میرے لیے اچانک تھا۔ مجھے اس کی توقع کم ہی تھی۔ گولی میرے دائیں بازو پر لگی اور آر پار ہوگئی۔ میرے حلق سے کرب انگیز کراہ خارج ہوئی اور میں کرسی سمیت عقب میں الٹ کر فرش پر آرہا۔ باقی دو حواریوں نے بھی اپنی جیبوں سے پستولیں نکال کر مجھ پر تان لی تھیں۔ میڈم لجھی کے چہرے پر زہر خند مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ شاید اس کی ''خواہش'' کے عین مطابق یہ عمل ہوا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے میرے بازو میں کسی نے گرم سلاخ اتار دی ہو۔ زخم سے خون بھل بھل بہنا شروع ہوگیا۔ درد اور جلن کے احساس تلے میرے چہرے پر کرب انگیزی طاری ہوگئی۔ میں نے تکلیف کو سہنے کی کوشش میں ہونٹ بھینچ لیے۔

''میں تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ میرے سلسلے میں ذرا سی بھی خوش فہمی کا شکار مت ہونا سہراب!'' سجاد نے ذرا دیر بعد مجھ سے سرد اور سفاک لہجے میں کہا۔

''تمہارے لیے میرے دل و دماغ میں جس قدر انتقام کا آتش فشاں پک رہا ہے، تم اس کا شاید اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ بولو، شکرا کو تم نے کہاں یرغمال بنا رکھا ہے ورنہ دوسری گولی تمہاری دائیں ٹانگ میں پیوست ہوجائے گی۔''

کہتے ہوئے اس نے پستول کی نال کا رخ اس بار میری ٹانگ کی طرف کردیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ دوسری گولی چلانے میں بھی دریغ نہیں کرے گا۔ حقیقت یہی تھی کہ جب اس نے مجھ سے کچھ نرمی برتی تھی تو میں نے اسے واقعی ہلکا لے لیا تھا۔

''دیتے ہو میرے سوال کا جواب؟'' اس نے پھر پوچھا۔ اس کے کرخت لہجے میں خونخواری بھی اتر آئی تھی۔

''وہ کلب میں ہے۔'' میں نے بتادیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اسے خفیہ تہ خانے میں رکھا گیا ہے کیونکہ مجھے شبہ ہوچکا تھا کہ یہ لوگ پہلے حملے کی ناکامی کے بعد ''نچلے'' نہیں بیٹھے ہوں گے۔ انہوں نے دوسرا ہلا بھی فوراً ہی بول دیا ہوگا مگر اس بار بھی ناکامی ہوئی ہوگی۔ بھی وہ مجھ سے شکرے کے بارے میں دریافت کرنے پر مجبور تھے لیکن یہاں پھر بات وہی پرویز سے میری اسپتال میں ہونے والی تازہ ملاقات کی الجھن کی بھی آتی تھی۔ بہرکیف، دیکھنا تھا یہ الجھن آمیز عقدہ کب کھلتا ہے۔

''آخری موقع ہے، اب جھوٹ مت بولنا۔'' سجاد نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ''ہمارے آدمی ابھی ابھی وہاں سے لوٹے ہیں۔ تمہارے دوست کرائے ماسٹر استاد جوجی کی کلب والی عمارت میں سناٹے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کی وجہ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے پہلے والے ناکام حملے کے بعد تم محتاط ہوگئے ہوگے اور وہاں سے تم نے شکرا سمیت اپنے ساتھیوں کو کہیں اور منتقل کردیا ہوگا۔''

''بالکل یہی بات ہوسکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ میری الجھن اب دور ہوگئی تھی۔ یقیناً پرویز پہلے والے حملے کے بعد از حد محتاط رہا ہوگا۔ ہماری روانگی کے بعد اس نے جوجی کی ہدایت کے مطابق دوسرے حملے کے لیے خود کو ''الرٹ'' رکھا ہوگا۔

''تو پھر؟''

''میں خود کالی حویلی اپنے ساتھیوں کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔ اس کا تو تم سب کو علم ہے۔'' میں نے قدرے چالاکی سے جواب دیا۔ ساتھ ہی مجھے ڈر بھی تھا کہ یہ کمبخت کہیں دوبارہ مجھ پر فائر نہ کردے۔ میں ان سفاک لوگوں کے نرغے میں تھا اور میرا اس طرح بے بسی کے ساتھ زخمی ہوتے رہنا میرے حق میں بہرحال اچھا نہیں ہوتا۔

سجاد بیگ کو میری یہ توجیہہ کسی حد تک بامعنی لگی۔ وہ سوچنے لگا۔

''ہم..... اس کا مطلب ہے کہ اب تم ہمارے کام کے نہیں رہے۔'' سجاد جیسے خود سے بولا۔ مجھے اس کا لہجہ سرد اور عجیب ہی لگا۔ یوں جیسے وہ اب میرے بارے میں کوئی آخری اور حتمی فیصلہ کرنے والا ہو۔ میں ایک لمحے کے لیے اندر سے لرز کر رہ گیا۔

سجاد نے میڈم لجھی کی طرف دیکھا جیسے پوچھنا چاہ رہا ہو کہ ''اب اس کا کیا کریں؟''

یکلخت صورتِ حال خطرناک حد تک غیر یقینی اور نازک ہوگئی تھی۔ میرے اندر کے جنگ باز نے انگڑائی لی۔

اچھا انسان

رات کو سونے سے قبل اپنے اندر ضمیر کی عدالت لگائیں۔ روح کے وکیل سے، زبان کو مجرم بنا کر، دل کے گواہ اور آنکھوں کے تماشائی سے اپنا احتساب کروائیں۔ اپنے آپ کو ٹٹولیے۔

ایک ایک کر کے اپنے گناہوں اور غلطیوں پر غور کریں اور انہیں سدھارتے جائیں۔ دیکھیے گا، آپ بہت جلد ایک اچھے انسان بن جائیں گے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ اسلام نگر، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

www.pklibrary.com

مجھے اپنے بچاؤ کے لیے جو کچھ کرنا تھا، اپنے زخمی بازو کے ساتھ اسی وقت کرنا تھا کیونکہ ان کے انداز سے ظاہر ہونے لگا تھا کہ یہ اب مجھے مزید ''پالنے'' کا رسک نہیں لے سکتے۔

میری عقابی نظروں نے ان دونوں حواریوں کا پل بھر میں جائزہ لیا۔ وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر مستعد اور چوکس کھڑے تھے۔ ان کے پستول مضبوطی سے ان کی گرفت میں نظر آئے۔ میں ایسے میں خود کو بے بس سا محسوس کرنے لگا۔

تب ہی میری نظروں نے دیکھا کہ میڈم پچھی نے ان دو حواریوں میں سے ایک کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ اس پر جھکا پچھی نے اس کے کان میں چند لفظ ٹپکائے اور وہ سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ وہاں مجھے سفاکیت اور بے رحمی کے آثار محسوس ہوئے۔ وہ اپنے ساتھی کی طرف آنے لگا۔ وقت اور ماحول پر یکا یک جیسے سنگ دلی طاری ہوگئی تھی۔

دفعتاً میرے اندر کوئی چیخا۔ ''ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔''

پھر یہی وہ وقت تھا جب اول الذکر حواری میرے قریب سے ہوکر اپنے ساتھی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنے بازو کے زخم اور درد کی پروا کیے بغیر فرش پر لیٹے لیٹے ایک قلا بازی لگائی اور اگلے ہی لمحے میری ایک ٹانگ نے بڑا اچھا تلا ''سوپ'' کیا۔ وہ آدمی اچھل کر میرے قریب گرا۔

ٹھیک اسی وقت گولی چلی۔ میں یہی سمجھا کہ انہوں نے ہی چلائی ہوگی مگر اگلے ہی لمحے مجھے سجاد بیگ کی چیخ سنائی دی۔ سب چونک کر اس طرف دیکھنے لگے۔

میرے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ ادھر میرے شکار کے گرتے ہی پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر جیسے ہی فرش پر گرا، وہ میں نے لپک کر اچک لیا۔

ابھی پستول میرے ہاتھ میں ہی تھا کہ دوسرا فائر ہوا اور دوسرا حواری جو مجھ پر گولی چلانے کے لیے پر تول رہا تھا، کریہہ چیخ مار کر گرا اور اس کے سینے سے خون ابلنے لگا۔ سجاد بیگ کے ہاتھ میں گولی لگی تھی جس کے نتیجے میں اس کا پستول چھوٹ چکا تھا۔ اس ناگہانی افتاد پر میڈم پچھی پھرتی کے ساتھ صوفے کی آڑ میں چلی گئی اور پلک جھپکتے ہی اس کے استخوانی ہاتھ میں بھی ایک سیاہ پستول چمکنے لگا جبکہ بگا نے بہ سرعت اسی صوفے کی آڑ لی۔ وہ پہلے ہی پستول نکال چکا تھا اور جدھر سے ایک کے بعد دو فائر ہوئے تھے، وہاں تلے اوپر دو تین فائر جھونک مارے۔

میں خود اس معجزے پر حیران تھا۔ یہ اچانک کون میرا نجات دہندا بن کر ٹپک پڑا تھا۔ جگنو یا استاد جوجی ہو نہیں سکتے تھے البتہ پرویز، کبیر اور زبیر کی طرف میرا دھیان ضرور چلا گیا۔ ان میں کبیر اور زبیر انہی کے تعاقب میں گئے ہوئے تھے لہٰذا ان کی طرف سے مجھے زیادہ توقع تھی لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ معاملہ اب بھی کچھ اور ہی پراسرار سا تھا کیونکہ کبیر اور زبیر تو کافی دیر سے ان کے تعاقب میں گئے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں کسی جارحانہ کارروائی کی ہرگز تاکید نہ کی تھی۔ فقط اتنی ہدایت دی تھی کہ وہ صرف یہ دیکھ کر واپس کالی حویلی لوٹ آئیں کہ یہ لوگ اب اپنے کون سے نئے ٹھکانے پر فروکش ہوئے ہیں، وغیرہ۔

جوابی فائرنگ کے نتیجے میں نامعلوم حملہ آور کی جانب سے یکدم اسرار بھرا سکوت طاری ہوگیا تھا۔ اس دورانیے میں پچھی میری طرف سے غافل نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مجھ پر گولی چلائی۔ میں تب تک اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ستون کی آڑ میں چلا گیا تھا اور وہیں سے میں نے پچھی پر گولی چلائی۔ وہ اس کے کہیں لگی تھی جس کے سبب اس کے حلق سے بڑی کریہہ چیخ خارج ہوئی۔ بگا اپنی ''میڈم'' کی چیخ سن کر بوکھلا گیا۔

پچھی میری گولی کھا کر صوفے سے نیچے لڑھک آئی مگر بڑی سخت جان واقع ہوئی۔ اس نے زخمی ہونے کے باوجود سنبھالا لینے میں دیر نہیں لگائی اور میری جانب فائر جھونک دیا۔ گولیاں ستون سے ٹکرائیں اور سنگ ریزے اڑے۔ کچھ نے میرے چہرے پر بھی خراشیں ڈال دیں۔

یوں میرا وہاں زیادہ دیر ٹکے رہنا خطرناک نظر آنے لگا مگر اب بگا نے بھی نامعلوم حملہ آور کی خاموشی کے بعد پچھی کی تقلید شروع کردی۔

''خبردار! کھیل ختم ہوگیا۔''

اچانک ایک تیز آواز ہال میں گونجی۔ نامعلوم حملہ آور منظر عام پر آچکا تھا اور اس نے زخمی پچھی کو گن پوائنٹ پر لے لیا تھا۔

اس ''نامعلوم'' حملہ آور کو دیکھ کر میری آنکھیں ناقابلِ یقین انداز میں پھیل گئی تھیں۔ وہ جگنو اور جوجی تو تھا ہی نہیں، حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ پرویز یا کبیر اور زبیر میں سے بھی نہیں تھا بلکہ وہ ہم میں سے کسی کا ساتھی سرے سے تھا ہی نہیں..... مگر شناسا ضرور تھا۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خون ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

www.pklibrary.com

احساسِ جرم

خالد شیخ طاہری

بعض اوقات ناانصافی اور ظلم کا جواب دینے والا بھی مجرم کہلاتا ہے... اگرچہ اس کے ساتھ برا ہوا تھا مگر... وہ یہ بھول گیا کہ اس کا انتقام میں اٹھنے والا انتہائی قدم اسے گناہ اور جرم کی کس انتہا پر لے جاسکتا ہے... اور پھر اچانک وہ کچھ ہوا جس کی توقع خود اسے بھی نہ تھی۔

رشتوں کے بیچ محبت اور نفرت کی حدود مقرر کرنے والے ایک بے بس انسان کی روداد

نیم تاریک کمرے کے ایک کونے میں وہ چٹائی پر گھٹنوں میں سر دیے سسک رہا تھا۔ کمرے کے وسط میں پڑی چارپائی پر ایک پانچ سالہ بچی بیش قیمت فراک اور قیمتی جوتوں سمیت بے خبر سو رہی تھی۔ اس کا معصوم چہرہ سوتے میں کسی فرشتے کے مانند لگ رہا تھا۔ اس نے روتے روتے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور بچی کو تکنے لگا۔ یہ ندامت کے آنسو تھے، یہ شریکِ جرم کے آنسو تھے اور ایک ناکردہ گناہ کی اذیت کے آنسو تھے۔ جب سے یہ جرم ہوا تب سے وہ ایک اذیت ناک کیفیت میں مبتلا تھا۔ ایک بوجھ تھا جو وہ اپنے ضمیر پر محسوس کرتا تھا۔ جب یہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا تو اسے ہلکا کرنے کے لیے اس نے یہ قدم اٹھایا۔ وہ شہر سے ایک بچی اغوا کر کے لایا تھا۔ ہاں یہ اغوا ہی تھا۔ شہر سے دور اس نواحی گاؤں کے اس کچے مکان میں بچی کو لانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ سکون سے اپنا کام کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ وہ بچی کو شہر میں بھی رکھ سکتا تھا۔ بچی کوئی غیر نہیں تھی۔ اسے اچھی طرح جانتی اور اس پر بھروسا کرتی تھی۔ بچی کو حیرت تھی کہ اسے اتنی دور کیوں لے جایا جا رہا

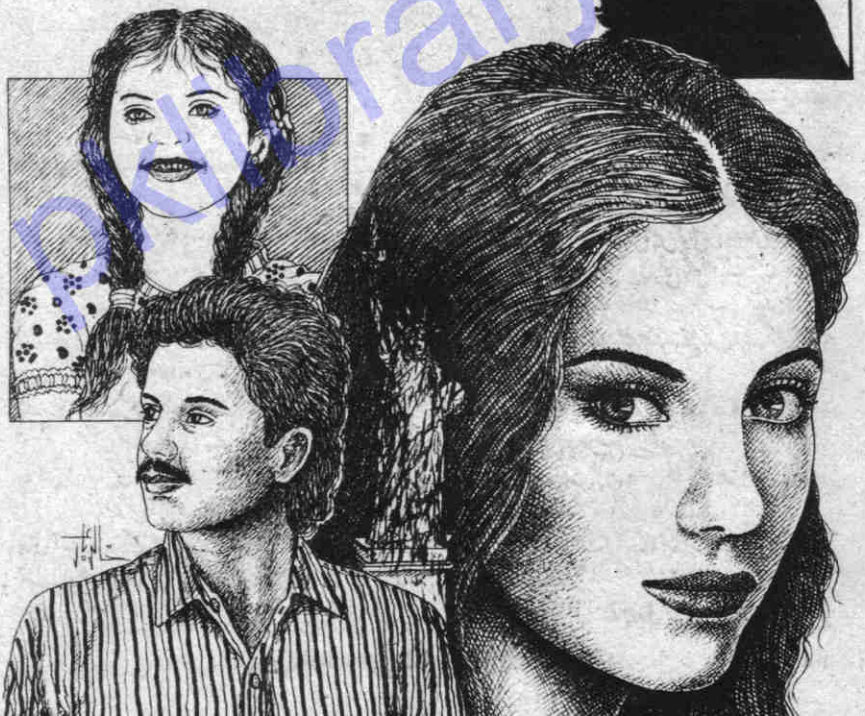

www.pklibrary.com

ہے۔ جبھی وہ بار بار پوچھ رہی تھی۔

"ماموں! ہم کہاں جا رہے ہیں؟" بس میں بیٹھتے ہی بچی نے اپنا سوال دہرایا۔

"کہا نا..... میں اپنی پیاری سی باجی کو اپنے گاؤں لے جا رہا ہوں۔ جہاں کبوتر ہوں گے، چڑیا ہوں گی اور بہت سارے طوطے بھی ہوں گے۔" اس نے پیار سے بچی کو بہلایا۔

"مجھے طوطے بہت پسند ہیں۔" بچی خوش ہوتے ہوئے بولی تھی۔ تھوڑے توقف کے بعد بولی۔ "ہم واپس گھر کب جائیں گے؟"

"ہم رات کو ہی واپس گھر پہنچ جائیں گے۔ آپ کی مما کو بتا دیا ہے کہ آج باجی میرے ساتھ گاؤں گھومنے جا رہی ہے۔" بچی نے مطمئن ہو کر اپنا سر ہلایا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

اچانک باہر کتے کے بھونکنے کی آواز سے وہ اپنی سوچوں سے نکل آیا۔ وہ اٹھا اور بچی کے پاس آ کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ چارپائی کی پائینتی میں رکھا کمبل بچی کو اچھی طرح اوڑھا کر کمرے سے نکل آیا۔ صحن میں رکھی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر جیب سے موبائل نکالا اور کال کرنے لگا۔ بات ختم کر کے اس نے ایک لمبا سانس لیا اور اپنا سر کرسی سے لگا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی جیب میں پڑا موبائل لرزنے لگا۔ اس نے آنکھیں کھول کر جلدی سے موبائل جیب سے نکالا۔ نمبر دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ چہرے پر سختی عود کر آئی۔

"اپنے بھائی کو اطلاع دی؟" اس نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

"پلیز میری بچی کو چھوڑ دو۔ تم جتنے پیسے بولو گے میں دینے کو تیار ہوں۔" ایک رقت آمیز التجائی نسوانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

ایسے حالات میں ایک ماں کا دکھ کیا ہوتا ہے، یہ سوچ کر اس کا اپنا دل بھی کانپ کر رہ گیا مگر وہ مجبور تھا۔

"میں نے پوچھا ہے..... اپنے بھائی کو اطلاع دی؟" اس نے اپنا سوال چبا چبا کر دہرایا۔

"دیکھو! میرا بھائی دبئی میں ہے۔ میں نے مطلع کر دیا ہے۔ جتنا جلدی ممکن ہوگا وہ واپس آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بس تم..... بس تم میری بچی سے دور رہنا۔ تمہیں جتنے پیسے چاہئیں، مل جائیں گے۔"

"رونا بند کرو..... اب اسی وقت فون کرنا، جب تمہارا بھائی آ جائے۔ مجھے جو چاہیے، تمہارے بھائی سے چاہیے۔ تمہارے شوہر سے میرا کوئی لینا دینا نہیں، اسے مطلع مت کرنا..... سمجھیں!" اس کے کانوں میں سسکیوں کی آواز گونجی۔

وہ تھوڑے توقف کے بعد پھر بولا۔ "پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش بھی مت کرنا۔ یہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہوگی اور جب تک تمہارا بھائی نہیں آ جاتا، میرا مطالبہ پورا نہیں کرتا اس وقت تک تمہاری بچی کو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ اگر تمہارے بھائی نے میرا مطالبہ پورا نہیں کیا تو....." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں..... نہیں، میں پولیس کو اطلاع نہیں دوں گی۔ جو تم کہو گے میرا بھائی وہ سب کرے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ پلیز میری بچی سے دور رہنا۔" نسوانی آواز اب سسکی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کال کاٹی اور موبائل کا سوئچ آف کر دیا۔

وہ اٹھا، کمرے میں آیا اور ایک نظر سوئی ہوئی بچی پر ڈال کر گھر سے نکل آیا۔ اس کا رخ بس اسٹاپ کی طرف تھا۔ اسے یقین تھا بچی دو گھنٹے سے پہلے نہیں اٹھے گی۔ جب تک وہ شہر سے اپنا کام کر کے واپس آ جاتا۔

☆☆☆

بکری کی بے قرار منمناہٹ سے رحیم کی آنکھ کھلی۔ وہ اپنے چھوٹے سے ریوڑ کو ایک ہریالے میدان میں چھوڑ کر درخت کے سائے میں سو رہا تھا۔ وہ چونک کر اٹھا اور بکری کی جانب دیکھنے لگا جو ایک طرف منہ کر کے مسلسل تیز آواز میں چلا رہی تھی۔ رحیم نے جب اس جانب نظر دوڑائی تو غصے سے اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ وہ دوڑتا ہوا اس جانب لپکا۔ اس کا ایک ہم عمر لڑکا بکری کے بچے کو گود میں اٹھائے، تیزی سے ٹیلے کے اوپر چڑھ رہا تھا۔

اوئے! رک جا!" رحیم دہاڑا۔

لڑکے نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے قدم اور تیز تیز اٹھنے لگے۔ رحیم نے اپنی رفتار بڑھا دی اور لڑکے کو جا لیا۔ جینز اور شرٹ میں ملبوس وہ کوئی شہری تھا۔ رحیم نے جس جگہ اس لڑکے کو پکڑا وہاں سے کچھ ہی دور پکی سڑک پر ایک بڑی سی گاڑی کھڑی تھی۔ جس کے کھلے ہوئے بونٹ پر ایک شخص جھکا، گاڑی کی کوئی خرابی دور کر رہا تھا۔

"پاپا! پاپا بچائیں!" رحیم کے ہاتھ کا دباؤ جیسے ہی لڑکے کی گردن پر سخت ہوا، وہ چیخ اٹھا۔

اس شخص نے تیزی سے سر اٹھا کر دیکھا اور اپنے ہاتھ کپڑے سے صاف کرتے ہوئے ان کی جانب آیا۔

"دیکھیں صاحب! آپ کا بیٹا میری بکری کا بچہ چوری کر کے بھاگ رہا تھا۔"

"نہیں پاپا! میں نے چوری نہیں کی۔ یہ مجھے اچھا لگا تو

www.pklibrary.com

اٹھالیا۔" لڑکے نے وضاحت دی۔

"نہیں بیٹے! بُری بات، کسی کی چیز بغیر اجازت نہیں اٹھاتے، چلیں واپس کریں اور سوری بولیں۔" آنے والے شخص کا لہجہ انتہائی مشفقانہ تھا۔

لڑکے نے بُرا سا منہ بنایا اور بکری کا بچہ رحیم کی گود میں دے دیا۔

"بیٹا! کیا نام ہے تمہارا؟" اس شخص نے بڑے پیار سے رحیم سے پوچھا۔ وہ شخص بڑے غور سے رحیم کو دیکھ رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ رحیم کے چہرے میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔

"میرا نام رحیم ہے۔ پاس والے گاؤں میں رہتا ہوں۔" رحیم اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

"بکری کا بچہ بیچو گے؟" وہ شخص رحیم کے پاس آ کر اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں جناب! میں نہیں بیچ سکتا۔ اس کے لیے مجھے اپنی دادی سے اجازت لینی پڑے گی۔"

"کہاں ہیں تمہاری دادی؟" اس شخص کی دلچسپی بڑھی۔

"وہ یہاں نہیں آسکتیں۔ وہ بیمار ہیں۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ ہم تمہاری دادی کے پاس چلے چلتے ہیں۔" وہ شخص مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر گاؤں کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس گاؤں میں رہتی ہیں تمہاری دادی؟"

"جی۔" رحیم نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ شخص کچھ سوچ کر اپنی گاڑی کی طرف مڑا اور لاک کر کے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر رحیم کے گاؤں کی جانب بڑھ گیا۔ مجبوراً رحیم کو بھی اپنی بکریوں سمیت ان کے پیچھے چلنا پڑا۔ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی رحیم ٹھٹک کر رک گیا۔ گھر کے دروازے پر لوگوں کا جمگھٹا سا لگا ہوا تھا۔ رحیم بھاگتا ہوا گھر کے قریب پہنچا تو اندر سے محلے کی عورتوں کے رونے کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرائیں، وہ بیقرار ہو کر لوگوں کے درمیان سے جگہ بناتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ رحیم کے ساتھ آنے والا شخص شہر کا ایک مشہور ڈاکٹر تھا۔ ڈاکٹر عرفان اور ان کا بیٹا باہر ہی لوگوں کے درمیان رک گئے۔ کچھ لوگوں نے انہیں عجیب نظروں سے دیکھا۔ رحیم نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا اس کے سامنے چارپائی پر دادی کا لاغر وجود ساکت پڑا تھا۔ چارپائی کے اطراف محلے کی عورتیں بیٹھی رو رہی تھیں۔ رحیم چیخ مار کر دادی سے لپٹ گیا۔ دو عورتیں جلدی سے اٹھیں اور رحیم کو سنبھالا اور اپنے پاس بٹھا کر تسلیاں دینے لگیں۔ کچھ دیر بعد جب دادی کو غسل دیا جانے لگا تو وہ باہر آیا۔ ڈاکٹر عرفان اور ان کے بیٹے کو دیکھتے ہی پھر سے رونے لگا۔ ڈاکٹر عرفان نے اسے سینے سے لگا کر تسلیاں دیں اور کہا۔ "بیٹا! صبر کرو۔ اللہ کی مرضی کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا۔"

ڈاکٹر عرفان جہاندیدہ شخص تھے وہ سمجھ گئے کہ محلے والے بھی اس معاملے میں زیادہ ملوث نہیں ہونا چاہتے لہٰذا انہوں نے سارے کاموں کی ذمے داری خود اٹھالی۔ وہ خود بھی چاہتے تھے کہ وہ رحیم کی دادی کی آخری رسومات اور ان پر آنے والا خرچہ اٹھائیں۔ اس سلسلے میں جب انہوں نے آس پاس کھڑے بزرگ لوگوں سے بات کی تو انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

رحیم، ڈاکٹر عرفان کے سینے سے لگا اب ہچکیوں سے رونے لگا۔ کچھ دیر بعد رحیم نے دیکھا کہ ڈاکٹر عرفان موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ دو گھنٹوں کے اندر اندر تدفین کے سب انتظام ہو گئے۔ عشا کی نماز کے بعد رحیم کی دادی کی تدفین ہو گئی۔ پورے گاؤں نے پیٹ بھر کر گوشت کی بریانی کھائی اور اپنے اپنے گھر کو ہو لیے۔ رحیم نے دیکھا۔ ڈاکٹر عرفان اس کے گھر کے صحن میں بیٹھے کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر عرفان کی گاڑی ٹھیک ہو کر رحیم کے گھر کی گلی کے کونے پر کھڑی تھی۔ دوسری گاڑی میں انہوں نے بیٹے کو ڈرائیور کے ساتھ واپس شہر بھیج دیا تھا۔ خود وہیں رک گئے۔ تدفین سے لے کر ابھی تک انہوں نے رحیم اور اس کے خاندان کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیا تھا۔ جس کی روشنی میں، انہوں نے فیصلہ کیا کہ رحیم کو اپنے ساتھ شہر لے کر جائیں گے اور اپنی زیر کفالت رکھیں گے۔

"دیکھو بیٹا! یہاں تمہارا اب کچھ بھی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ چلو۔" گھر کے اکلوتے کمرے میں ڈاکٹر عرفان اور محلے کے دو بزرگ رحیم کی جانب دیکھ رہے تھے۔ دونوں بزرگوں کو ڈاکٹر عرفان نے اعتماد میں لے لیا تھا۔

"نہیں..... میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔" رحیم نے اپنا فیصلہ سنایا تو ڈاکٹر عرفان اٹھ کر اس کے پاس آ گئے۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا، تم ابھی میرے ساتھ چلو۔ سوچ لو، چاچا احمد اور مولانا شوکت صاحب سے بھی مشورہ کر لو۔ پھر جو تمہاری مرضی ہو، فیصلہ کر لینا۔ میں اتوار کو پھر آ جاؤں گا۔"

رحیم رونے لگا تو مولانا شوکت صاحب نے ڈاکٹر عرفان کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ رحیم کے پاس سے اٹھ کر باہر آ گئے۔

"ڈاکٹر صاحب! ہم آپ کے جذبے کی قدر کرتے

www.pklibrary.com

ہیں۔ ہم بھی چاہتے ہیں وہ شہر جائے، پڑھے لکھے بڑا آدمی بنے۔ فی الحال ابھی آپ جائیں۔ ہم رحیم کو سمجھائیں گے۔ اگر اس کی مرضی ہوگئی تو آپ اس کو لے جاسکتے ہیں، ورنہ نہیں۔ ہم اس کے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتے۔'' مولانا شوکت صاحب کی بات میں وزن تھا۔ ڈاکٹر عرفان کچھ رقم رحیم کو دے کر واپس شہر آگئے۔ وہ تو بس رحیم کی شکل دیکھ کر تجسس میں پڑ گئے تھے۔ یہ تجسس ہی انہیں رحیم کے گاؤں تک لے گیا تھا۔

☆☆☆

وہی گمبھیر خاموشی اس کی منتظر تھی جو وہ گھر سے نکلتے وقت چھوڑ گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ کھانے کا سامان اور طوطوں کا پنجرہ میز پر رکھا، جس میں چار آسٹریلین طوطے اِدھر اُدھر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اس نے ایک نظر سوئی ہوئی بچی پر ڈالی اور پاس آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بچی کے چہرے کی معصومیت دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ اس نے پیار سے اس کے ماتھے پر پیار کیا اور اٹھ کر صحن میں آگیا۔ آج کے دن کا انتظار وہ پچھلے کئی سالوں سے کر رہا تھا۔ اس نے جیسا سوچا تھا ویسا تو نہیں ہوا مگر اپنے مقصد کو پالینے کا پورا یقین تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگلی کال آنے میں قریباً تین گھنٹے اور لگیں گے۔ وہ شہر سے اپنے تمام ضروری کام نمٹا کر آگیا تھا۔ اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ آج شام تک اپنا کام پورا کرکے واپس شہر چلا جائے گا۔ اب اسے بچی کی ماں کی کال کا انتظار تھا۔ اس نے اپنا موبائل جیب سے نکالا جو پچھلی کال ختم کرتے ہی بند کردیا تھا۔ وہ اٹھا کمرے میں آکر چارج پر لگا دیا۔ کیونکہ اگلی کال کافی لمبی ہونی تھی۔ اس نے جو کرنا تھا، پانچ بجے سے پہلے کرنا تھا کیونکہ گاؤں سے شہر کی آخری بس پانچ بجے نکلتی تھی۔ اگر پانچ بجے سے پہلے کام نہیں ہوتا تو دوسرے دن صبح نو بجے نکلنا پڑتا، جو وہ نہیں چاہتا تھا۔ یہ تین گھنٹے بڑے صبر آزما تھے۔ بالآخر بچی کی ماں کی کال آگئی۔

''اگر میں تمہاری بیٹی کا ریپ کروں، وہ چیخنے کے لیے منہ کھولے تو میں اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر باندھ دوں اور جب میں اپنی ہوس پوری کرکے تمہاری بیٹی کے منہ سے کپڑا نکالوں اور وہ مرچکی ہو تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کروگی؟'' اس کا استفسار سن کر دوسری طرف کچھ دیر کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔ پھر ایک غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میں تجھے جان سے ماردوں گی ذلیل انسان! اگر تُو نے میری بیٹی کو ہاتھ بھی لگایا۔'' پھر ایک سسکی سنائی دی پھر غراہٹ ابھری۔ ''اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں اگر تُو میرے سامنے آجائے تو میں اپنے ہاتھ سے تجھے شوٹ کردوں گی۔ میری بچی سے دور رہ کتے!''

وہ زیرلب مسکرایا اور کال کاٹ دی اور موبائل کا سوئچ آف کردیا۔ وہ صحن سے اٹھ کر کمرے میں آگیا جہاں بچی کھانا کھا کر طوطوں کے پنجرے کے پاس بیٹھی، انہیں دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

''کتنے پیارے طوطے ہیں نا...؟'' بچی نے اس کے اندر آنے کی آہٹ سن کر گردن گھما کر پوچھا۔

''یہ آپ کی برتھ ڈے کا گفٹ ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سچی؟'' بچی کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ پھر تھوڑے توقف کے بعد تاسف سے بولی۔ ''ماما ناراض ہو جائیں گی۔ انہیں طوطے پسند نہیں ہیں۔''

''آپ فکر مت کریں۔ میں آپ کی ماما کو منالوں گا۔'' وہ بھی پنجرے کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

''ماموں! آپ بہت اچھے ہیں۔'' بچی نے اس کے سر کو پکڑ کر اس کے گال پر بوسہ دے دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ بچی دوبارہ طوطوں سے کھیلنے لگی۔

☆☆☆

رحیم اتنے بڑے گھر کو دیکھ کر گھبرا سا گیا تھا۔ اب وہ ایک کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اتنے بڑے گھر میں تنہا کیسے رہے گا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر عرفان کے ساتھ ان کا بیٹا سلطان بھی کمرے میں داخل ہوئے۔

''بیٹا! اب اسے اپنا ہی گھر سمجھنا۔ آج سے تم یہیں، ہمارے ساتھ رہو گے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بول دینا۔'' ڈاکٹر عرفان نے آخری جملہ رحیم کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

رحیم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

مولانا شوکت اور گاؤں کے بزرگوں کے سمجھانے پر رحیم، ڈاکٹر عرفان کے ساتھ شہر آنے پر راضی ہوگیا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس کی پڑھائی کا سلسلہ بھی دوبارہ سے شروع کرادیا گیا۔ اس کا داخلہ سلطان کے ہی اسکول میں کرایا گیا۔ سلطان اس سے تین سال آگے تھا۔

کچھ دن تو رحیم گھبرایا گھبرایا سا رہا، پھر آہستہ آہستہ شہری ماحول سے مانوس ہوتا چلا گیا۔ دونوں میں بہت جلد بے تکلفی ہو گئی۔ وہ دوستوں کی طرح ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کرنے لگے۔ سلطان کی کچھ عادتیں ایسی تھیں جو بہت غیر اخلاقی تھیں۔ جس کی وجہ سے رحیم اسے سمجھاتا رہتا تھا مگر

www.pklibrary.com

سلطان اس کی نصیحتیں مذاق میں اڑا دیتا۔

"یار! یہ عمر انجوائے کرنے کی ہے۔ پھر تو بس پڑھائی پڑھائی اور بس پڑھائی ہی ہوتی رہے گی۔" ڈاکٹر عرفان سلطان کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے، وہ خود بھی یہ ہی چاہتا تھا۔ البتہ رحیم کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ جس فیلڈ میں دلچسپی رکھنا چاہے، اختیار کر سکتا ہے۔ اس کی مکمل معاونت کی جائے گی۔

ڈاکٹر عرفان کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جو میڈیکل کالج کے تیسرے سال میں تھی۔ اس کا نکاح پھوپی کے بیٹے راحیل سے ہو چکا تھا۔ وہ ایم بی بی ایس پاس کر کے شادی کے تین ماہ بعد ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لندن چلا گیا۔ شازیہ ایک سمجھ دار لڑکی تھی۔ رحیم کو اس نے کبھی بہن کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ رحیم کو پڑھائی میں جہاں کوئی بھی مشکل پیش آتی وہ شازیہ سے ہی حل کرواتا، رحیم بھی شازیہ کی بہت عزت کرتا تھا۔ ڈاکٹر عرفان، رحیم کا خیال ایک بیٹے کی طرح رکھتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محبتیں بڑھتی رہیں۔ شازیہ نے ایم بی بی ایس مکمل کر لیا تو اس کی رخصتی کر دی گئی۔ شازیہ کا سسرال ایک بلاک چھوڑ کر ہی تھا۔ راحیل کی اعلیٰ ڈگری کی وجہ سے جلد ہی اسے دبئی کے ایک میڈیکل کالج میں جاب مل گئی۔ شازیہ اگلے امتحان کی تیاری کرنے لگی۔ رحیم آٹھویں جماعت میں پہنچ چکا تھا۔ سلطان نے کالج میں پری میڈیکل میں داخلہ لے لیا۔

ماں کے نہ ہونے، باپ کے مصروف شیڈول، الگ کمرا، انٹرنیٹ کی سہولت نے سلطان کو بے فکر کر دیا تھا۔ وہ فحش ویب سائٹس کا شوقین تھا۔ اس کی یہ عادت اب پختہ ہو چکی تھی۔ اس کے موبائل میں لاتعداد غیر اخلاقی ویڈیوز موجود تھیں۔ اسے رحیم کے سمجھانے سے چڑ تھی۔ ڈاکٹر عرفان سے ملاقات تو صرف اتوار والے دن ہی ہوتی تھی۔ شازیہ اور راحیل بھی آجاتے تو ایک رونق سی لگ جاتی۔ اس تمام عرصے کے دوران سلطان اپنا موبائل کمرے میں ہی رکھ کر، سب کے ساتھ ہنستے مسکراتے ہوئے وقت گزارتا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کچھ سال بعد اس کی زندگی کتنے خوفناک دوراہے پر کھڑی ہوگی۔

☆☆☆

وہ پورے چاند کی ایک خنک آلود اور دھند میں لپٹی ہوئی رات کا آخری پہر تھا۔ دھند اور چاندنی مل کر ایک سوگوار سماں پیش کر رہی تھیں۔ چار سو گمبھیر خاموشی کے درمیان رحیم کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے سوا پوری کائنات میں کوئی نہیں ہے۔ اسے سانسوں اور دل کی دھڑکنوں کی آواز کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کمرے میں بیٹھا لان کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ لان کے دائیں جانب نیم کے درخت ایسے خاموش کھڑے تھے، جیسے وہ بھی اس بھیانک، دلسوز جرم پر شرمندہ ہیں جو کچھ دیر پہلے ہی ان کی جڑوں میں سرزد ہوا تھا۔ رحیم اپنے کمرے میں بیٹھا، احساسوں کے بوجھ تلے دبا، زار و قطار رونے لگا۔

آج شام کی بات تھی۔ شازیہ امید سے تھی۔ نواں مہینا شروع ہو چکا تھا۔ آج اس کی طبیعت دوپہر سے ہی خراب ہو رہی تھی۔ شام کو ڈاکٹر سے چیک اپ کروا کے وہ ڈاکٹر عرفان کے گھر ہی آگئی تھی۔ اس نے گھر میں کام کرنے والی ماسی خیراں کو اپنے پاس ہی روک لیا تھا۔ ماسی خیراں نے شازیہ سے اجازت لے کر اپنی پانچ سالہ بیٹی شاہدہ کو بھی اپنے شوہر کے ساتھ بلوا لیا۔ ڈاکٹر عرفان کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے۔ اس وقت گھر میں شازیہ، ماسی خیراں، رحیم اور شاہدہ ہی تھے۔ سلطان ٹیوشن سینٹر گیا ہوا تھا۔ رحیم اور شاہدہ ڈرائنگ روم میں کھیل رہے تھے۔ رحیم کو شاہدہ بہت پیاری لگتی تھی۔ وہ تھی بھی بہت پیاری سی، سانولی سی اور معصوم سے نقوش والی، توتلی زبان سے جب وہ بات کرتی تو رحیم ہنس پڑتا۔

"لالہ! میں تاں (کہاں) ہوں؟" شاہدہ نے صوفے کے پیچھے چھپ کر آواز لگائی تو رحیم ہنس پڑا۔ کیونکہ اس کا صرف منہ چھپا ہوا تھا باقی وہ پوری نظر آرہی تھی۔

"ارے میری باجی کہاں گئی بھئی، مل ہی نہیں رہی۔ ڈھونڈو بھئی اسے ڈھونڈو۔" رحیم کھڑے ہو کر ڈرائنگ روم میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"مل گئی۔" اچانک رحیم نے شاہدہ کو کمر سے پکڑ کے اٹھا لیا۔ شاہدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ماسی خیراں، شازیہ کے کمرے سے نکلی، دونوں کو کھیلتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے کچن کی جانب چلی گئی۔ شاہدہ اب رحیم کی گود میں بیٹھی اس کے کان میں انگلی گھسا رہی تھی۔ رحیم منع کرتا تو وہ زور سے ہنس دیتی۔ اسی وقت باہر سے سلطان کی موٹر سائیکل رکنے کی آواز آئی۔ وہ سینٹر سے لوٹا تھا۔ ڈرائنگ روم میں دونوں پر ایک نظر ڈالتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد موبائل کان سے لگائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ رحیم اور شاہدہ اپنے کھیل میں لگے رہے۔ سلطان بات کرتے ہوئے ان دونوں کو کھیلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ رات کے کھانے کے وقت بھی شاہدہ، رحیم کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ ماسی خیراں نے اسے لے جانا چاہا تو رحیم نے منع کر دیا۔ کھانا کھا کر وہ دونوں ڈراما دیکھنے لگے۔ سلطان اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شاہدہ ڈراما دیکھتے دیکھتے وہیں صوفے پر ہی سو گئی۔ رحیم کو بھی نیند آرہی تھی۔ وہ سونے سے پہلے واک کیا کرتا تھا۔ اس نے کمرے سے لا کر شاہدہ کو

www.pklibrary.com

کمبل اوڑھایا اور باہر نکل گیا۔ آدھے گھنٹے بعد جب واپس لوٹا تو شاہدہ صوفے پر نہیں تھی۔ وہ سمجھا ماسی خیراں اپنے پاس لے گئی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔ رات ایک بجے کا وقت تھا جب کسی نے اسے جھنجوڑ کر اٹھایا۔ اٹھانے والے کا چہرہ دیکھ کر اس کی نیند اور ہوش دونوں اڑ گئے۔

☆☆☆

سلطان کی جھنجلاہٹ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ وہ مسلسل نمبر ملا رہا تھا۔ کبھی اپنا موبائل اٹھاتا کبھی شازیہ کا، مگر مطلوبہ نمبر مسلسل بند مل رہا تھا۔ وہ دبئی سے ایک گھنٹا پہلے ہی پہنچا تھا۔ شازیہ کا رو رو کر بُرا حال ہو چکا تھا۔

''اس بات کا کس کس کو پتا ہے؟ رحیم کو بتایا ہے؟'' سلطان نے استفسار کیا۔

''نہیں، رحیم دوپہر کو آیا تھا مگر میں نے نہیں بتایا۔ اس نے سختی سے منع کیا تھا کہ کسی کو نہیں بتانا۔ وہ تمہارے آنے کا انتظار کر رہا ہے۔'' شازیہ روتے ہوئے بولی۔

''میں، سلمان انکل کو فون کر رہا ہوں۔'' سلطان، شازیہ کا موبائل رکھ کر اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے بولا۔

شازیہ نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ لیا۔

''نہیں..... اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر پولیس کو اطلاع دی تو وہ میری بیٹی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ سلمان انکل کو میں بھی فون کر سکتی تھی۔'' شازیہ نے سلطان کا موبائل اپنے قبضے میں کرتے ہوئے کہا۔

''تو کیا ایسے ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ وہ نمبر بھی نہیں کھول رہا۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟'' سلطان صوفے پر بیٹھتے ہوئے غصے سے بولا۔

''وہ صرف تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' شازیہ اپنا موبائل سیدھا کرتے ہوئے بولی۔ ''میں ٹرائی کرتی ہوں۔'' وہ کال ملانے لگی۔ اچانک اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی کیونکہ دوسری طرف موبائل کھولا جا چکا تھا۔ وہ کان سے موبائل لگائے اپنی کیفیت پر قابو پانے لگی۔

''بھائی آگیا؟'' دوسری جانب سے کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

☆☆☆

پونے پانچ ہو چکے تھے۔ پانچ بجے بس کو نکلنا تھا۔ وہ جلدی جلدی کمرے سے سامان سمیٹ رہا تھا۔ اس نے بچی کو شربت پلا کر پھر سلا دیا۔ اس کی کل سے یہ ہی کوشش تھی کہ بچی زیادہ تر سوئی رہے۔ کیونکہ اسے بچی کے سوالات کے جواب دینا مشکل ہو جاتا تھا۔ اچھی طرح بچی کو چادر میں لپیٹ کر گھر سے نکل آیا۔ بس اسٹاپ پر زیادہ رش نہیں تھا۔ وہ اپنی مطلوبہ بس میں بیٹھ گیا اور بچی کو اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا کر اس کا سر اپنی بغل میں لے لیا۔ بس چلی تو، اس نے آنکھیں بند کر کے سیٹ سے ٹیک لگا لی۔ اسے آگے کرنا کیا تھا، یہ اس نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ بس کے جھٹکوں سے جب اس کی آنکھ کھلی تو، بس شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ ایک نظر بچی پر ڈالی جو بدستور سو رہی تھی۔ اس نے اپنا بیگ اپنے قدموں سے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

''بھائی! بس یہیں روک دو۔'' باہر دیکھتے دیکھتے اچانک بولا۔ بس سڑک کے کنارے پر رک گئی۔ اس نے بچی کو اٹھایا اور بس سے اتر آیا۔ اب اس کی منزل ایک پارک تھی۔ پارک میں داخل ہو کر ایک نظر ڈالی۔ پارک میں بہت رش تھا۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ اس نے اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ منتخب کی اور پارک کے مغربی کونے میں ایک سنگی بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اسے بس ایک بات کا خدشہ تھا کہ کوئی جان پہچان والا نہ ٹکرا جائے۔ وہ اپنا کام سکون سے کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کام کے بعد ایک ہنگامہ خیز رات بلکہ اس کی ایک مشکلات بھری زندگی شروع ہونے والی تھی مگر وہ اپنے ضمیر کے بوجھ سے ہلکا ہو جاتا۔ بچی اس کے کندھے سے لگی ابھی تک سو رہی تھی۔ اس نے احتیاط سے اسے بینچ پر لٹا دیا۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا اور جیب سے موبائل نکال کر آن کر دیا۔ ابھی موبائل آن ہی کیا تھا کہ کال آنا شروع ہو گئی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''بھائی آگیا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں آگیا۔ لو اس سے بات کرو اور خدا کے لیے میری بچی سے دور رہنا.....''

''ایک منٹ! ایک منٹ! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ جب تک میری بات مکمل نہیں ہو جاتی، اپنے بھائی کو اپنے سامنے ہی بٹھا کر رکھنا۔ خبردار! جو اسپیکر کھولا۔ اب جو ہمارے درمیان بات ہو گی اسے کسی بات کا پتا نہیں چلنا چاہیے اور یاد رہے اسے اپنے پاس سے جانے بھی نہیں دینا۔ سمجھ گئیں؟'' وہ بات کاٹتے ہوئے جلدی سے بولی۔

''مگر..... تم نے تو کہا تھا کہ بھائی سے بات کرنی ہے۔ ایک منٹ ہولڈ کرو پلیز!'' دوسری طرف دونوں بہن بھائیوں کی آواز آنے لگی۔ پھر بھائی غصے میں بول کر چپ ہو گیا۔

''ہاں اب بولو!'' اس کے کانوں سے بہن کی لرزتی ہوئی آواز ٹکرائی۔

''تم نے قسم کھا کر، کہا تھا نا... ! اگر میں تمہاری بیٹی کا

www.pklibrary.com

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	سیالکوٹ	0524568440
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	میرپورAK	03460397119
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	اٹک سٹی	057210003
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	دیپالپور	03004854922
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	لیہ	03002373988
پشاور	03005930230	بہاولپور	03446804050	قصبہ ڈنگہ	03083360600
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	03006946782	عارف والا	03008758799
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	لورالائی	03023844266
راولپنڈی	03005583938	بورےوالہ	03347193958	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	جلالپور پیروالا	03338303131
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	ہری پور	03321905703
رحیم یارخان	03055872626	ڈیرہ غازی خان	03336481953	چکوال	03348761952
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	دوہا	03346383400
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	حافظ آباد	0307-6479946
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	واہ کینٹ	0301-5497007
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	ایبٹ آباد	0992335847
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	پتوکی	03454678832
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	مانسہرہ	0333-5021421

منڈی بہاؤالدین 0331-7619788 مغل آباد 0301-7681279 کوٹ رادھا کشن 03004992290
ڈسکہ 0300-9463975 سمبڑیال 0333-8604306 قصور 0300-6575020
حجرہ شاہ مقیم 03006969881 ٹوبہ ٹیک سنگھ 0315-6565459

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

www.pklibrary.com

ریپ کر کے بیدردی سے قتل کر دوں تو تم مجھے شوٹ کر دو گی؟" اس نے بلا تمہید بات شروع کی۔

"کیا، کیا مطلب؟ ہاں کہا تھا۔"

"پھر مجھے شوٹ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں آ رہا ہوں، کیوں کہ....."

☆☆☆

سلطان کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ رحیم اٹھ چکا تھا مگر وہ پھر بھی اسے جھنجوڑ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" رحیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"وہ.....وہ شاہدہ....." سلطان کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر رحیم نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹائے جو اب بھی رکھے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا شاہدہ کو؟ کہاں ہے وہ؟" رحیم نے سلطان کو اپنے بستر پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"م.....میرے کمرے... میں....." سلطان کے منہ سے بہ مشکل بس اتنا ہی نکلا۔

رحیم تیزی سے کمرے سے نکلا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو پورے گھر میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ اس نے ایک نظر شازیہ کے کمرے کی طرف دیکھا اور تیزی سے سلطان کے کمرے میں پہنچا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کے قدم جہاں تھے، وہیں جم کر رہ گئے اور آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ سلطان کے بیڈ کا منظر بہت دلخراش و بھیانک تھا۔ شاہدہ نیم برہنہ حالت میں بے ترتیب پڑی تھی۔ پاس ہی بستر پر خون کے چند دھبے تھے۔ شاہدہ کا منہ ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، جن میں تکلیف اور خوف ٹھہر سا گیا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا تو کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو سلطان کھڑا تھا۔

"میں..... یہ سب نہیں چاہتا تھا۔ بس تو بس....." سلطان سرگوشی کے انداز میں بولا اور رونے لگا۔ رحیم نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ سلطان کی حالت ایسی تھی کہ وہ کانپ رہا تھا۔ رحیم نے آگے بڑھ کر پہلے شاہدہ کو پورے کپڑے پہنائے۔ کپڑے پہناتے ہوئے اسے سلطان کی درندگی کا اندازہ ہوا۔ اس کے پورے جسم میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔

اپنی تمام تر سفاکی اور درندگی کو اپنی تاریکی میں چھپا کر وہ بھیانک رات گزر گئی۔ سحر طلوع ہوئی تو ایک ہنگامہ برپا تھا۔ شاہدہ گم ہو گئی تھی۔ ماسی خیراں کا رو رو کر برا حال تھا۔

سلطان کے جھوٹ پر رحیم حیران تھا۔ مگر احسانوں کے بوجھ تلے سب سن رہا تھا لیکن اس کے ضمیر پر جو بوجھ آن پڑا تھا اس بوجھ کی وجہ سے وہ دلبرداشتہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر عرفان کے احسان تو وہ نہیں اتار سکتا تھا مگر اپنے ضمیر کو اس بوجھ سے آزاد کرانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"جب رحیم بیرونی دروازے سے نکل چکا تو اسی وقت میں نے شاہدہ کو بیرونی دروازے سے نکلتے دیکھا تھا۔ میں نے روکنا چاہا مگر وہ لالہ، لالہ کہتی باہر نکل گئی۔ میں سمجھا، رحیم کے ساتھ ہو گی۔ اس لیے مطمئن ہو گیا اور اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔" سلطان نے یہ جھوٹا بیان پولیس کو لکھوایا جس کی وجہ سے رحیم کو شاملِ تفتیش کر لیا گیا۔ ڈاکٹر عرفان لندن سے تیسرے دن واپس لوٹے تو اپنے تعلقات استعمال کر کے رحیم کو بچایا۔ رحیم کے پاس بھی اپنی بے گناہی کا ٹھوس ثبوت تھا۔ وہ جب گھر سے نکلا تو ان کے پڑوسی ایڈووکیٹ بیگ صاحب بھی اسے راستے میں مل گئے تھے۔ دونوں ساتھ ہی واپس گھر لوٹے تھے۔ شاہدہ کے اغوا کا کیس داخل کر کے ایک ہفتے تک تو پولیس نے تندہی سے شاہدہ کی تلاش جاری رکھی۔ شاہدہ کو نہیں ملنا تھا، نہ ملی۔ وہ تو اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ گھر کے لان میں نیم کے درختوں کی جڑوں میں رات کی تاریکی میں خاموشی سے دفنا دی گئی تھی۔ اس واقعے کے پندرہ دن بعد ہی شازیہ نے ایک پیاری سی بیٹی کو جنم دیا۔ سب شاہدہ کے غم کو بھول کر آنے والی پری کی خوشیوں میں گم ہو گئے۔

☆☆☆

بیٹی کی پیدائش کی اطلاع پر شازیہ کا شوہر راحیل بھی کچھ دن کے لیے پاکستان آیا تو ڈاکٹر عرفان نے سب کو اپنے کمرے میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ رحیم بھی سلطان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر عرفان ایک پُرسکون کیفیت میں، اپنے بیڈ پر ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ ان کی نظریں رحیم کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں جن کی تپش رحیم بھی محسوس کر رہا تھا۔ سب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی خاص بات ہونے والی ہے اور وہ بات یقیناً رحیم کے متعلق ہے۔ ڈاکٹر عرفان کافی عرصے سے جگر کے عارضے میں مبتلا تھے۔ وہ لندن کسی کانفرنس میں نہیں بلکہ اپنا چیک اپ کروانے گئے تھے۔ ان کے جگر نے نوّے فیصد کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

"رحیم بیٹا! ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو۔" سب کا اندازہ درست ثابت ہوا۔

رحیم نے نظر اٹھا کر ڈاکٹر عرفان کی جانب دیکھا اور خاموشی سے ان کے پاس بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

www.pklibrary.com

ڈاکٹر عرفان نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا اور کہنا شروع کیا۔ ''بیٹا! آج میں تم سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے رکے خود کو سیدھا کیا اور رحیم کے ہاتھ چھوڑ کر اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ پھر کچھ سوچنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جو کہنا چاہ رہے ہیں، اس کے لیے انہیں الفاظ نہیں مل رہے۔ انہوں نے ایک آہ سی بھری اور گویا ہوئے۔ ''رخسانہ نہ کبھی اچھی بیٹی بن سکی تھی، نہ اچھی بیوی اور نہ ہی اچھی ماں۔''

''پاپا پلیز!'' شازیہ اچانک بولی اس کے لہجے میں التجا تھی۔ وہ ڈاکٹر عرفان کو اپنے شوہر کے سامنے یہ سب بولنے سے روکنا چاہتی تھی۔ جو اپنی بیٹی کو گود میں لیے شازیہ کے پاس بیٹھا تھا۔

''نہیں بیٹا! آج حقیقت بتانے دو۔ رحیم کے لیے یہ حقیقت جاننا بہت ضروری ہے۔ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔'' ڈاکٹر عرفان نے شازیہ کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا۔ پھر کہنا شروع کیا۔ ''رخسانہ ایک امیر کبیر باپ کی بگڑی ہوئی بیٹی تھی۔ ہماری پہلی ملاقات کانووکیشن والے دن ہوئی تھی۔ وہ اپنی دوست شمائلہ کے ساتھ بطور مہمان آئی تھی۔ وہیں سے ہماری دوستی کی ابتدا ہوئی۔ رخسانہ کچھ خاص خوبصورت نہیں تھی۔ سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پتلے سے ہونٹ، بس ناک ستواں تھی جس کی وجہ اسے قبول صورت کہا جا سکتا تھا۔ کہتے ہیں دولت ہر عیب کو چھپا لیتی ہے۔ رخسانہ بن سنور کے رہا کرتی تھی۔ سلطان کے نانا بہت بڑے بزنس مین تھے۔ دو چار ملاقاتوں میں، میں رخسانہ کے خاندان کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ یہ سب معلومات مجھے شمائلہ نے دی تھیں۔ شمائلہ کے دل میں میرے لیے کیا جذبات تھے ان سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ اگرچہ ہمارے درمیان محبت کے بارے میں کبھی گفتگو نہیں ہوئی تھی لیکن میں سب سمجھتا تھا۔ میں خود غرض بن گیا ایک سچی محبت کو ٹھکرا کر، اپنے مستقبل کو رخسانہ کی دولت سے سنوارنے کی منصوبہ بندی کر لی اور رخسانہ سے شادی کر لی۔ یہ ہی میری سب سے بڑی غلطی تھی جس کا مجھے زندگی بھر افسوس رہا۔ رخسانہ اکلوتی ہونے کی وجہ سے ماں باپ کی لاڈلی تھی۔ حد درجہ خود سر بھی، شادی کے بعد مجھ پر ایک انکشاف ہوا کہ رخسانہ شراب نوشی بھی کرتی ہے۔ یہ عادت اسے شادی سے پہلے بھی تھی اور اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ امید سے ہونے کے باوجود شراب اس کی زندگی کا حصہ بنی رہی۔ میرے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ شازیہ کی پیدائش کے بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلا گیا۔ دو سال بعد جب میں واپس لوٹا تو رخسانہ کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ وہ اب ایک پل بھی شراب کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ میرے بچے ساری زندگی ماں کی محبت کو ترستے رہے۔ رخسانہ نے کبھی انہیں ایک ماں کا پیار نہیں دیا۔ میں خود بھی اپنے بچوں کا قصوروار ہوں۔ اپنے پیشے میں مصروف ہو کر پیسے کمانے کی دھن میں لگا رہا۔'' ڈاکٹر عرفان کا لہجہ رندھ گیا۔

شازیہ جلدی سے اٹھ کر باپ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ سلطان اور راحیل بھی اب رحیم کے ساتھ آ کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر عرفان نے اشارے سے راحیل کو اپنی نواسی دینے کو کہا۔ راحیل نے بیٹی ان کی گود میں دے دی۔ انہوں نے اس کے ماتھے پر پیار کیا اور پھر گویا ہوئے۔

''رحیم بیٹا! یہ اس وقت کی بات ہے جب سلطان ایک سال کا تھا اور تم بھی اتنے ہی بڑے ہو گے۔ جب تمہارے والدین شہر میں ایک ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ جو گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھی تھی وہ رخسانہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ رخسانہ اس وقت مکمل نشے میں تھی۔ جب تمہارے والدین اور رخسانہ کو اسپتال لایا گیا، میری ڈیوٹی ایمرجنسی وارڈ میں ہی تھی۔ پولیس کی ابتدائی کارروائی کے بعد ہی ہم باقاعدہ تمہارے والدین اور رخسانہ کا علاج شروع کر سکتے تھے۔ میں نے جب معلومات حاصل کیں تو میری تمام تر ہمدردیاں تمہارے والدین کے ساتھ تھیں۔ رخسانہ کی حالت کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اب کچھ دیر کی ہی مہمان ہے۔ میری تمام تر توجہ تمہارے والدین کی طرف ہو گئی۔ ابتدائی علاج کے بعد میں نے انہیں آئی سی یو ریفر کر دیا مگر قدرت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔ رات کو تمہارے والد اور صبح تمہاری والدہ بھی اس دنیا کو چھوڑ گئے۔ بیٹا! یہ کڑوا سچ ہے کہ تمہارے ماں باپ کی قاتل رخسانہ تھی۔'' ڈاکٹر عرفان رونے لگے۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے شازیہ کی بیٹی کو سینے سے لگایا ہوا تھا اور دوسرا ہاتھ رحیم کے سر پر تھا۔ کمرے میں موجود سب اشکبار تھے۔ ڈاکٹر عرفان پھر گویا ہوئے۔

''گاؤں میں جب میں نے تمہیں دیکھا تو چونک گیا تھا کیونکہ تم بالکل اپنے والد کے ہم شکل ہو۔ تجسس مجھے تمہارے گاؤں لے گیا۔ وہاں سے جو معلومات ملیں اس سے ثابت ہو گیا کہ تم انہی بدنصیب میاں بیوی کے بیٹے ہو جس کو رخسانہ کی گاڑی نے کچل دیا تھا۔ تمہاری دادی کے چلے جانے کے بعد تم اکیلے رہ گئے تھے۔ مگر میں فیصلہ کر چکا تھا کہ تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ تم میرے بیٹے کی طرح میرے ساتھ رہو گے۔'' رحیم اب زار و قطار رو رہا تھا۔

www.pklibrary.com

شازیہ اور راحیل اسے تسلیاں دینے لگے۔ ڈاکٹر عرفان نے اسے اپنے کندھے سے لگا لیا۔ ڈاکٹر عرفان باوجود کوشش کے ایک سچ نہ بتا سکے کہ سلطان ان کا بیٹا نہیں، بلکہ رخسانہ کی بے راہ روی کا نتیجہ تھا۔ وہ بدنامی اور شازیہ کے مستقبل کی وجہ سے برداشت کر گئے۔ انہوں نے ایک جھوٹ بھی بولا کہ ایکسیڈنٹ کے بعد رخسانہ کی حالت خراب تھی۔ اگر وہ توجہ دیتے تو رخسانہ بچ سکتی تھی مگر انہوں نے رحیم کے والدین کو اہمیت دی تھی۔

☆☆☆

چھ ماہ بعد ڈاکٹر عرفان کا انتقال ہو گیا۔ مرنے سے پہلے انہوں نے سلطان، شازیہ اور رحیم میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ جائداد میں بھی رحیم کا اتنا ہی حصہ رکھا، جتنا سلطان کا تھا۔ مگر رحیم کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ شاہدہ کا معصوم چہرہ ہر لمحہ اس کی نظروں کے سامنے گھومتا رہتا تھا۔ وہ دلخراش لمحے کسی طور بھلا نہیں پاتا تھا جب اس نے اپنے ہاتھوں سے بے کفن شاہدہ کو اندھیری گور میں دبایا تھا۔ وہ ہر شام نیم کے اسی درخت کے نیچے کھڑا آنسو بہاتا رہتا، جہاں شاہدہ دفن تھی۔ اس کے دل میں سلطان سے نفرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

پانچ سال گزر گئے۔ سلطان ڈاکٹر بن گیا۔ شازیہ پھر امید سے تھی۔ رحیم نے بی بی اے کے بعد تعلیم کو خیر آباد کہہ دیا تھا۔ اسے اب کسی چیز کی فکر نہیں تھی، نہ اپنی زندگی کی، نہ مستقبل کی۔ اب اس کا ایک ہی مقصد تھا، سلطان کو اس کے کیے کی سزا دینا۔ سب اپنی اپنی زندگی میں خوش و خرم تھے۔ بس ایک ماسی خیراں تھی جسے ابھی تک صبر و قرار نہیں آیا تھا۔ وہ درد و الم کی تصویر بن کر رہ گئی تھی۔ اس کی نم آنکھوں میں رحیم نے ہمیشہ شاہدہ کا عکس دیکھا تھا۔ جیسے شاہدہ کا انتظار اس کی آنکھوں میں جم سا گیا ہو۔ اس کے ضمیر پر ناکردہ گناہ کا بوجھ بڑھ جاتا۔ اب اس بوجھ کو اتارنے کے لیے اسے صحیح وقت کا انتظار کرنا تھا اور وہ وقت آن پہنچا تھا۔ شازیہ کی بیٹی حرمین جسے سب پیار سے شہزادی پکارا کرتے تھے۔ حرمین سلطان سے زیادہ رحیم کے قریب تھی۔ رحیم جب بھی اس کے ساتھ کھیلتا، شاہدہ کو اپنے آس پاس محسوس کرتا۔ وہ شاہدہ کی طرح اس کو بھی باجی ہی بلاتا تھا۔ ایک دن اچانک حرمین گم ہو گئی۔

☆☆☆

"پھر مجھے شوٹ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں آ رہا ہوں، کیوں کہ میں یہ سب کچھ کر چکا ہوں۔" رحیم کی بات سن کر دوسری جانب خاموشی طاری ہو گئی۔

"لیکن میں نے یہ سب کیوں کیا، یہ بھی سن لیں آپی!"

رحیم اب اپنی اصلی آواز میں بولا۔

"رحیم!" دوسری طرف شازیہ کی ہلکی سی سرگوشی سنائی دی۔

"ہاں آپی میں رحیم ہی ہوں۔ یہ اسی بھیانک رات کی بات ہے، جب شاہدہ گم ہوئی تھی۔ سلطان میرے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی....." پھر رحیم بولتا چلا گیا اور شازیہ دم سادھے سنتی رہی تھی۔ جب رحیم خاموش ہوا تو شازیہ کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔

"شہزادی بالکل خیریت سے ہے۔ میں اس کو لے کر آ رہا ہوں۔" رحیم نے یہ کہہ کر کال کاٹ دی۔ اس نے جلدی سے حرمین کو اٹھایا اور پارک کے صدر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ صدر دروازے کے دائیں جانب ہی رخسانہ ولاز کی شاندار عمارت تھی۔ حرمین کو کندھے سے لگائے اس نے جیسے ہی روڈ کراس کیا، فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ لگاتار تین فائر ہوئے تھے۔ رحیم بری طرح چونک گیا کیونکہ فائرنگ کی آواز رخسانہ ولاز کی جانب سے آئی تھی۔ رحیم ... دوڑتا ہوا رخسانہ ولاز کے صدر دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ چوکیدار کو اس نے اپنے کمرے میں گھبرائے ہوئے دیکھا۔ جب تک چوکیدار پہنچتا، رحیم لان کراس کر کے گھر کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ اندر کے منظر نے رحیم کو سکتہ زدہ کر دیا مگر یہ کیفیت چند لمحوں کے لیے طاری ہوئی۔ شازیہ کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا رخ اب بھی سلطان کی جانب تھا۔ شازیہ کا چہرہ کسی سخت چٹان کے مانند پتھرایا ہوا تھا۔ ہونٹ سختی سے بند تھے اور آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ غیظ و غضب کی آندھی سی چل رہی تھی۔ سامنے صوفے پر سلطان اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کے سر، گردن اور کندھے سے خون بہہ کر سرخ قالین کو سرخ تر کر رہا تھا۔ رحیم نے جلدی سے حرمین کو دوسرے صوفے پر لٹایا اور شازیہ کے پاس پہنچا۔ شازیہ نے رحیم کو دیکھا تو بلک کر اس سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنی قسم پوری کر دی تھی۔ پستول اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ رحیم کے لیے یہ گھڑیاں فیصلے کی تھیں۔ ڈاکٹر عرفان کے احسانات کا بدلہ، اپنے ضمیر پر پڑے برسوں کے بوجھ کو ایک لمحے میں اتار دیا۔ اس نے فیصلہ کیا اور شازیہ کے ہاتھ سے پستول لے کر رومال سے صاف کر دیا اور اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا۔ اسی لمحے چوکیدار اندر داخل ہوا اور اپنی گن رحیم کی جانب سیدھی کر لی۔

"زمان خان! پولیس کو فون کرو۔" رحیم نے چوکیدار کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ شازیہ چونک کر رحیم سے الگ ہوئی اور حیرت سے دیکھنے لگی۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

جب اس بندے نے خودکشی کی، وہاں چٹان کی چوٹی پر سات افراد اور بھی موجود تھے۔ وکی کوفن اور اس کے دیگر پانچ ساتھی اپنے ساتویں ساتھی کی تلاش میں درختوں کے اندر سے ہوتے ہوئے اس چٹان کی بلندی پر پہنچے تھے اور انہیں اپنا ساتھی نظر آ گیا تھا جو پہلے سے وہاں موجود تھا۔ ان سب کی نظریں خودکشی کرنے والے شخص پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ ایک لحاتی اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر تھا۔ ایسا سنسنی خیز نظارہ انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اپنی جان لینے والے شخص نے یورپین لباس زیب تن کر رکھا تھا اور وہ ان کی جانب پشت کیے اس چٹان سے نیچے موجزن سمندر کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے قدموں کی آواز سن کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو یکا یک اس کا چہرہ خوف اور وحشت کی آماجگاہ بن گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس نے انسانوں کے بجائے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو۔ وہ اپنے خال وخط سے ملائیشین دکھائی دیتا تھا مگر بے حد ڈرا ہوا۔ قبل اس کے کہ ان میں سے کوئی اپنی زبان سے ایک

پسِ مردن

شاوزین رضوان

جرم چاہے زمین پر ہو یا سمندر کی سطح پر اور چاہے شوق میں کیا جائے یا مجبوری میں... جرم تو جرم ہی ہوتا ہے... وہ بھی اگرچہ اسی رستے پر چل پڑا تھا مگر... وحشت اسے بار بار سوچنے پر مجبور کرتی رہی کہ وہ کیوں اس راہ کا مسافر بنا... اور بالآخر ایک دن اسے فرار کا رستہ مل گیا... شاید یہ اس کی نیت کا ہی کمال تھا کہ ایک دن قدرت نے اسے یہ موقع بھی فراہم کر دیا۔

ظلم کا شکار ہونے والی ماں کا دل گداز اور پُرسوز ماجرا

www.pklibrary.com

لفظ بھی ادا کرتا، اس دہشت زدہ ملائیشین نے اپنی جیب سے ایک پستول برآمد کیا۔ آن واحد میں اس نے پستول کی نال کو اپنی کنپٹی پر رکھا اور میکانکی انداز میں ٹریگر دبا دیا۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوگیا تھا کہ ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ جب تک ان کے دماغ سوچنے اور سمجھنے کے قابل ہوتے، اس ملائیشین کا بے جان جسم چٹان کی بلندی سے نیچے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی سمت روانہ ہو چکا تھا۔ گویا یہ دہری خودکشی تھی۔

وکی کوفن کے لیے یہ ایک ہفتے میں دوسرا ذہنی جھٹکا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ حالات کی ستم ظریفی اسے گھیر گھار کر اس دور دراز جزیرے ''لومبوک'' تک پہنچا دے گی۔ یہ سب ایک خطرناک زلزلے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کی خوش قسمتی کہ لومبوک کے ساحل پر چند مچھیروں نے اسے دیکھ لیا تھا اس لیے وہ بچ گیا تھا اور اب وہ امریکی سفیر کے گھر میں محفوظ تھا۔

اسی گھر میں وکی کوفن کے ساتھ چند یورپین لوگوں نے بھی پناہ لے رکھی تھی۔ وہ سب دولت مند اور اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے افراد تھے۔ وکی کی طرح وہ بھی کسی نہ کسی مصیبت کا شکار ہو کر اس امریکی سفیر کے گھر تک پہنچے تھے اور اب ان سب کی نظروں کے سامنے ایک مقامی شخص نے خودکشی کر لی تھی۔

وہ سب کے سب گویا سکتے ایسی کیفیت میں چلے گئے تھے۔ اس خوفزدگی کی فضا میں سب سے پہلے جین نے ایک عجیب و غریب حرکت کی۔ جین ایک امیرزادی اور مسز ریڈ کی بھتیجی تھی۔ وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے اس مقام پر پہنچی جہاں سے خودکشی کرنے والا وہ ملائیشین نیچے گرا تھا۔

ایک لمحے کے لیے سب کو یہی محسوس ہوا کہ جین اس چٹان سے نیچے سمندر میں کودنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس صورتِ حال نے انہیں دم بخود کر دیا تھا اور وہ سنگی مجسمے بنے یک ٹک جین کو دیکھ رہے تھے۔

جین جب اس چٹان کے کنارے پر پہنچی تو اس کے بدن کو ایک خوفناک جھٹکا لگا۔ شاید اس کا سبب اس کا اچانک رک جانا تھا اور وہ بھی تیز رفتاری سے دوڑنے کے بعد۔ اب وہ عین اس جگہ پر تھی جہاں ایک منٹ پہلے وہ مقامی ملائیشین خودکوشوٹ کرنے سے پہلے کھڑا تھا۔

یکایک رک جانے کی وجہ سے جین کا پورا جسم تھرتھرا کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر اس کے لیے یہ اتنا آسان ثابت نہ ہوا۔ وہ اپنے زلزلہ زدہ بدن کے ساتھ آگے کو جھکی پھر اس کے دونوں گھٹنے سنگی زمین سے ٹکرائے۔ اس نے خود کو سنبھالنے کے لیے بے ساختہ اپنا ایک ہاتھ زمین پر ٹکا دیا۔ اس سہارے نے اسے چٹان سے نیچے گرنے سے بچا لیا۔ سب کی جان میں جان آئی۔

جین کا چہرہ سمندر کی جانب تھا۔ وہ تمام لوگ اس کے عقب میں تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ وہ جین کے پلٹ کر دیکھنے کا انتظار کر رہی رہے تھے کہ ایک نسوانی چیخ نے ان کی سماعت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ جین کی چیخ میں زمانے بھر کا کرب تھا۔

دو جوان العمر اسمارٹ مرد جین کی مدد کے لیے آگے بڑھے۔ ان میں سے ایک کا نام ویلفائن تھا۔ ویلفائن، امریکی سفیر کے آفس میں کام کرتا تھا جبکہ دوسرا مرد رچرڈ تھا۔ رچرڈ ایک امیر امریکی بیوہ مسز فوسٹر کا فرمانبردار بیٹا تھا۔ ویلفائن اور رچرڈ، جین کی خبرگیری کے لیے ایک ساتھ آگے بڑھے تھے لیکن جین تک پہلے ویلفائن نے رسائی حاصل کی کیونکہ وہ رچرڈ سے زیادہ متحرک اور ہوشیار تھا۔

وکی کوفن نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جین ایک نوعمر حسین و جمیل لڑکی تھی۔ وہ اس کی خوبصورتی کو پسند کرتا تھا مگر یہ پسندیدگی محبت کرنے والی نہیں تھی بلکہ اسے دلچسپی، مدحت اور ستائش کہا جا سکتا تھا۔ اسی لیے وہ جین کے معاملے کو نظر انداز کرتے ہوئے چٹان کے آخری کنارے پر پہنچ گیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ جھک کر نیچے کی صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔

خودکشی کا ارتکاب کرنے والے اس ملائیشین کی بے حس و حرکت لاش زیریں چٹانوں پر دکھائی دی۔ وہ لاش ایک مردہ جسم پر مشتمل نہیں رہی تھی بلکہ اس کے مختلف اعضا نکیلے پتھروں سے ٹکرانے کے بعد ایک دوسرے سے الگ ہو کر اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ وہ ایک بھیانک منظر تھا، دل و نظر کو افسردہ کر دینے والا۔

وکی واپس آیا تو ویلفائن، جین کو سہارا دے کر اسی طرف لاتا دکھائی دیا۔ رچرڈ کو وہاں پہنچنے میں اس لیے بھی دیر ہوگئی تھی کہ جب وہ واقعہ پیش آیا، رچرڈ اپنی والدہ مسز فوسٹر کی وہیل چیئر تھامے کھڑا تھا۔ مسز فوسٹر اتنی زیادہ موٹی تھیں کہ اپنے پاؤں سے چلنا پھرنا ان کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ ان کا زیادہ وقت وہیل چیئر پر ہی گزرتا تھا اور اس کی دیکھ بھال رچرڈ کی ذمے داری تھی۔ رچرڈ بلاشبہ ایک فرمانبردار اور ذمے دار بیٹا تھا۔

''یہ کیا حماقت تھی جین؟'' مسز ریڈ نے اپنی بھتیجی سے

www.pklibrary.com

پوچھا۔ ''تم آرام سے بھی تو ادھر جاسکتی تھیں۔''

''پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا۔'' جین اضطراری انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس بندے نے اچانک جو حرکت کی، اس نے میرے دماغ پر گہرا اثر کیا تھا اسی لیے میں بے ساختہ اسے دیکھنے کے لیے ادھر دوڑ پڑی تھی۔ اچانک رکنے سے میرا توازن بگڑ گیا اور میں گھٹنوں کے بل زمین پر گر گئی۔''

''شکر کرو کہ تم چٹان سے نیچے سمندر میں نہیں جا گریں۔'' مسز ریڈ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''یا نیچے گرتے ہوئے تم خطرناک نکیلی چٹانوں سے نہیں ٹکرائیں۔''

''جیسا کہ اس خودکشی کرنے والے مقامی شخص کے ساتھ ہوا ہے۔'' وکی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس کا مُردہ جسم چٹانوں پر، یہاں وہاں بکھرا پڑا ہے۔ میں تو اسے ڈبل خودکشی کہوں گا۔''

''تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی جین؟'' مسز فوسٹر نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

جین نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا۔'' مسز ریڈ نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''اس ملائیشین نے ایسی ہولناک اور رونگٹے کھڑے کردینے والی موت کو کیوں گلے لگایا؟''

اس مقامی کی موت کا منظر وکی کی نگاہ میں گھوم گیا۔ اسے خودکشی کرنے والے شخص کے چہرے سے جھلکتا خوف یاد آیا۔ ''میں سمجھتا ہوں.....'' وہ مسز ریڈ کے سوال کے جواب میں بولا۔ ''اچانک موت کو گلے لگانے والے اس شخص نے یکا یک کوئی ایسا دہشت ناک منظر دیکھ لیا تھا جس کی وحشت کو وہ برداشت نہیں کرسکا۔ وہ اس سچویشن کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا اسی لیے اس نے گن کو اپنی کنپٹی پر رکھا اور گولی چلادی..... قصہ ختم!''

''دہشت ناک منظر..... وحشت انگیز سچویشن.....!'' مسز ریڈ نے تذبذب بھرے انداز میں وکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر وہ تو اس وقت سمندر کی جانب رخ کیے کھڑا تھا۔ کیا اس نے ادھر پانی میں کچھ ایسا ویسا دیکھ لیا تھا؟''

''شاید۔'' وکی نے گول مول جواب دیا۔

ابھی وکی جب اس سمندری چٹان سے نیچے جھانکنے گیا تھا تو اس نے سمندر کو بالکل نارمل دیکھا تھا جیسا کہ وہ پچھلے چار روز سے تھا۔ اسے وہاں ایسا کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا جو کسی شخص کو آناً فاناً میں خودکشی کرنے پر مجبور کردے۔

ایک دوسرا امکان یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ ملائیشین ان کے گروپ کو اچانک وہاں دیکھ کر خوفزدہ ہوگیا ہو مگر ایسا کیوں؟ کیا وہ ان لوگوں کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس کررہا تھا؟ مگر کیسا خطرہ اور..... ان میں سے کس کی طرف سے؟

ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لیے وکی نے باری باری وہاں موجود ہر مرد و زن کے چہرے کو اپنی نگاہ سے ٹٹولا اور سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''کیا آپ میں سے کسی نے اس ملائی (ملائیشین) بندے کو پہلے کہیں دیکھا ہے؟''

وکی کے سوال پر مسز ریڈ ہچکچاہٹ کا شکار دکھائی دی۔ اس کا ہاتھ واکنگ اسٹک کے دستے پر اضطراری انداز میں حرکت کررہا تھا۔

''مجھے تو یہ سارے ملائیشینز ایسے ہی کھسکے ہوئے اور جنونی نظر آتے ہیں۔'' چند لمحات کی پُراسرار خاموشی کے بعد اس نے بیزار کن انداز میں کہا۔ ''میں نے اس خودکشی کرنے والے بندے کے ہاتھ میں گھاس کاٹنے والی درانتی دیکھی تھی۔ کیا تم نے بھی یہ بات نوٹ کی تھی وکی؟'' اس نے رک کر سوالیہ نظر سے وکی کو فن کی طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے سرسری لہجے میں بولی۔

''شاید وہ امریکی سفیر کے باغ میں کام کرتا تھا۔''

وکی کو حیرت ہوئی کہ خودکشی کرنے والے شخص کے ہاتھ میں اسے کوئی درانتی وغیرہ کیوں نظر نہیں آئی تھی۔ اس نے تو بس یہی دیکھا تھا کہ اس ملائیشین نے ان پر نگاہ پڑتے ہی خوفزدہ انداز میں اپنی جیب سے پستول نکال لیا تھا اور پھر پستول کی نال کو اپنی کنپٹی پر رکھ کر گولی چلادی تھی۔ فائر کی مخصوص آواز کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا تھا۔ لیکن مسز ریڈ کا اصرار تھا کہ موت کو گلے لگانے والے اس شخص کے ہاتھ میں اس نے ایک درانتی دیکھی تھی جو انہیں دیکھتے ہی اس نے اپنے ہاتھ سے نیچے گرادی تھی۔ مسز ریڈ سے کسی قسم کی بحث کرنے کے بجائے اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''بہرکیف، جب ہم واپس جائیں گے تو سب سے پہلے امریکی سفیر کو اس واقعے سے آگاہ کرنا ہوگا۔ وہ یہاں ایک طرح سے ہمارا میزبان بھی ہے۔ اسے اس ملائیشین کی خودکشی کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔''

سب نے اس تجویز پر صاد کیا۔

جین ابھی تک ویلنٹائن اور رچرڈ کے ساتھ تھی۔ وہ ہلکے ہلکے کراہ بھی رہی تھی۔ وکی جانتا تھا کہ جین کو اتنا زیادہ درد محسوس نہیں ہورہا تھا۔ وہ بیک وقت دو مردوں کی توجہ اور ہمدردی حاصل کرنے کے لیے یہ ڈراما کررہی تھی۔ چند ہی

www.pklibrary.com

روز میں وہ جین کی فطرت، مزاج اور عادات سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔

''تم دوسروں سے اتنے مختلف کیوں ہو وکی؟'' مسز ریڈ کے استفسار نے اسے چونکا دیا۔

وکی کو معلوم تھا کہ وہ وہاں موجود دو مغربی مردوں (ویلفائن اور رچرڈ) سے بہت الگ نظر آتا تھا۔ اس کی رنگت بھوری اور سر کے بال سیاہ تھے۔ یہ سب اس کی ماں کی فیملی کی وجہ سے تھا جو نیوزی لینڈ سے تعلق رکھتی تھی تاہم اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ مسز ریڈ کے اس سوال کا مطلب اور مقصد کیا تھا۔

وکی کو سوچ میں ڈوبا دیکھا تو مسز ریڈ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''تمہارے اندر میری بھتیجی کو متاثر کرنے والی ہمت اور جواں مردی نہیں ہے۔ تم صنفِ مخالف کے ساتھ اتنے نرم، مہربان اور تعاون کرنے والے بھی نہیں ہو جس کی وہ ہر مرد سے توقع کرتی ہیں۔ ذرا ادھر تو دیکھو.....!''

بات کے اختتام پر اس نے جین کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔ مسز ریڈ کے کہنے پر وکی نے جین کی طرف دیکھا جو ابھی تک ہلکی پھلکی سسکیاں لے رہی تھی۔ رچرڈ پوری طرح اس کی خوشامد درآمد میں لگا ہوا تھا۔ وکی نے دیکھا، رچرڈ نے اپنی ماں مسز فوسٹر کے گھٹنوں کے اوپر رکھے ہوئے کمبل کو کھینچ کر اتارا اور اسے لے جا کر جین کے کندھوں پر ڈال دیا۔

وکی نے سوچا، رچرڈ آج جو کچھ بھی کر رہا ہے، آخر کار ایک دن اسے اس کا پھل سود کے ساتھ ضرور ملے گا۔ اچھا یا بُرا..... اس کا فیصلہ وقت کرے گا مسز ریڈ! تاہم زبان سے اس نے کچھ اور کہا اور وہ بھی دھیمی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ۔

''مسز ریڈ! میں بھی جین کو لبھانے کے لیے وہ سب کر سکتا ہوں جو وہ رچرڈ یا ویلفائن اور یا پھر دوسرے مردوں سے توقع رکھتی ہے لیکن اس میں ایک دقت ہے۔''

''کیسی دقت؟'' مسز ریڈ نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ کی بھتیجی میری محبت اور پیار کو برداشت نہیں کر سکے گی۔'' وکی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ میری محبت سے خوفزدہ ہو کر چیخنے اور چلانے لگے گی۔''

''یہ کس قسم کی محبت ہے؟'' وہ حیرت آمیز الجھن سے اسے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''میں ماؤری قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔'' وکی کوفن نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''شاید آپ کو ماؤری قبیلے کی ایک خاصیت معلوم نہیں ہے۔''

''کون سی خاصیت؟'' مسز ریڈ نے پوچھا۔

''ہمارے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ہم آدم خور ہیں۔'' وکی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیں کہ میری آدم خور محبت آپ کی بھتیجی کا کیا حشر نشر کرے گی۔''

''اب جانے بھی دو۔'' مسز ریڈ نے مسرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''تم اس قسم کی خوفناک باتیں کر کے مجھے ڈرا نہیں سکتے۔ میں تمہارے مذاق کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں وکی کوفن!''

''ٹھیک ہے۔'' وکی نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''کسی دن میں آپ کو اپنی محبت کا تجربہ کر کے دکھا دوں گا۔''

''اس کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''ان فضول باتوں کو اپنے دماغ سے نکالو اور واپس امریکی سفارت خانے جانے کی تیاری کرو۔ ابھی ہم نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے، سفیر کو اس سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔ اگر خودکشی کرنے والا وہ ملائیشین واقعی امریکی سفیر کا ملازم تھا تو مجھے یقین ہے سفیر اس کی خودکشی کا راز جاننے کی کوشش ضرور کرے گا۔''

وکی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

وکی کو چند روز میں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ مسز ریڈ، ویلفائن کو بالکل پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس کا رجحان مسز فوسٹر کے خدمت گزار بیٹے رچرڈ کی جانب تھا اسی لیے وہ ویلفائن کے بجائے رچرڈ کی مثال دے رہی تھی۔ حالانکہ جب جین گھٹنوں کے بل گری تھی تو سب سے پہلے ویلفائن ہی اس کی خبر گیری کے لیے آگے بڑھا تھا۔

سچی اور واقعاتی بات یہ کہ مسز ریڈ، رچرڈ کو اپنی حسین بھتیجی جین کے لیے ہر لحاظ سے ایک موزوں مرد سمجھتی تھی۔

☆☆☆

وکی کوفن نگری نگری گھومنے والا ایک من موجی سیاح تھا اور سمندری سفر اس کا من پسند مشغلہ تھا۔ وہ ہمیشہ ایسی نوکری کی تلاش میں رہتا تھا جس کا تعلق سمندری جہازوں سے ہو۔ اس طرح پیسا کمانے کے علاوہ اس کا شوق بھی پورا ہو جاتا تھا۔ ان دنوں وہ ایک ایسی کمپنی میں ملازم تھا جو ملکوں ملکوں گھوم کر اپنا مال فروخت کیا کرتی تھی اور ان کا زیادہ تر سفر سمندر کے راستے ہی ہوتا تھا۔ اب کی بار ان کا روٹ نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، جاوا، سماٹرا، انڈونیشیا، بالی وغیرہ سے ہوتے ہوئے ملائیشیا تک تھا مگر زمینی زلزلوں اور سمندری طوفانوں نے ان کے پروگرام کی ایسی تیسی کر کے رکھ دی

www.pklibrary.com

تھی۔ ان کا بحری جہاز انڈونیشیا کے دو جزیروں کے قریب ہی تباہ و برباد ہوگیا تھا جس کی وجہ سے ان کا ملائیشیا تک جانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا تھا۔ دوسرے لوگوں کا تو پتا نہیں لیکن جب وکی کی آنکھ کھلی تو وہ ''لومبوک'' نامی ایک جزیرے کے ساحل پر ماہی گیروں کی پناہ میں تھا۔ لومبوک بھی بالی کی طرح کا ایک انڈونیشین جزیرہ تھا۔

وکی کوفن نے اپنی زندگی میں ایسی طوفانی بارشیں کبھی نہیں دیکھی تھیں اور اس نوعیت کے خطرناک زلزلوں سے بھی کبھی اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا زمین کا یہ گولا اپنی جگہ سے ہل گیا ہو۔ ان قدرتی آفات کی تباہ کاریاں تو اپنی جگہ انسانوں پر ستم ڈھا رہی تھیں۔ اس پر مستزاد انسانوں کے اندر بسنے والے بعض انسان نما بھیڑیا صفت لوگوں نے ظلم و بربریت اور لوٹ مار کا وہ بازار گرم کیا تھا کہ الحفیظ الامان.....!

سمندری اور زمینی قزاقوں نے جی بھر کر مصیبت زدہ افراد کو مارا، پیٹا، کاٹا اور لوٹا تھا۔ جس نے بھی مزاحمت کی کوشش کی، اس کی گردن تن سے جدا کردی گئی۔ بہرحال مقامی لوگوں کی مدد سے وکی اور اسی کی طرح کے چند زندہ بچ رہنے والے افراد کو امریکی سفارت خانے تک پہنچا دیا گیا تھا۔ جب تک ان لوگوں کے بحفاظت کہیں پہنچانے کا بندوبست نہ ہوجاتا، انہیں امریکی سفیر کے پاس بطور مہمان رہنا تھا۔

لومبوک میں تعینات وہ امریکی سفیر دلچسپ شخصیت کا مالک ایک تعمیری ذہن والا انسان تھا۔ اس نے بے مایہ مقامی لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کے لیے چھوٹے بڑے قرضے دینے کا نظام بھی قائم کر رکھا تھا۔ اس حکمتِ عملی کے نتیجے میں اس بنجر اور ویران جزیرے میں سبزیوں، پھلوں اور دیگر اناج کی کاشت کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ جزیرے کی ضرورت کو پورا کرنے کے بعد اس تمام پیداوار کو برآمد کردیا جاتا تھا۔ اسی طرح سفیر نے سفارت خانے کی عمارت کے ساتھ ہی کئی کمروں پر مشتمل ایک سرائے سی قائم کر رکھی تھی جہاں سیاح پے انگ گیسٹ کے طور پر قیام کرسکتے تھے۔ اس اضافی آمدنی کو جزیرے کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاتا تھا۔ وکی کوفن اور اس کی طرح کے دوسرے مصیبت زدہ لوگوں کو اسی گیسٹ ہاؤس میں عارضی طور پر ٹھہرایا گیا تھا۔

وکی پہلی مرتبہ جب اس گیسٹ ہاؤس کے ڈائننگ روم میں پہنچا تو اس کا خیال تھا دیگر امیر لوگ اسے نظرانداز کریں گے لیکن مسز ریڈ نے اس کی ذات میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ مسز ریڈ وسیع القلب اور کھلے ذہن کی مالک تھی۔ اس کا مرحوم شوہر کیپٹن ریڈ ایک مشہور و معروف کمانڈر تھا جس کی ڈیوٹی بحری جہازوں پر ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مسز ریڈ نے اپنے شوہر کی معیت میں لگ بھگ پوری دنیا کی سیاحت کرلی تھی۔

سیاحت کا یہی شوق وکی کوفن اور مسز ریڈ کے بیچ قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا تھا۔ دونوں کے پاس ایک دوسرے کو سنانے کے لیے لاتعداد کہانیاں تھیں۔

مسز ریڈ وہاں پناہ گزیں افراد میں صرف مسز فوسٹر اور اس کے بیٹے رچرڈ کو لفٹ کراتی تھی۔ مسز فوسٹر کی قوت سماعت بہت کمزور تھی اور وہ اس قدر موٹی تھی کہ اس پر کسی ہتھنی کا گمان ہوتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت ایک کنگ سائز وھیل چیئر کے اندر ہی گزرتا تھا۔ وکی نے اسے ایک بار بھی اپنے پاؤں پر کھڑے یا چلتے پھرتے نہیں دیکھا تھا۔ مسز فوسٹر کو اِدھر اُدھر لے جانے کی ذمے داری رچرڈ کی تھی۔ وہ اپنی ماں کی وھیل چیئر کو کھینچتے اور دھکیلتے ہوئے بُری طرح ہانپ جایا کرتا تھا۔ دیکھنے والوں کو اس پر ترس بھی آتا تھا۔

مسز ریڈ، اس کی بھتیجی جین، مسز فوسٹر اور اس کا بیٹا رچرڈ..... یہ چاروں افراد بہت زیادہ امیر تھے۔ کاروبار ان کا پیشہ تھا۔ وہ چاروں اپنے سامان کے ساتھ سنگاپور سے آبنائے سولو اور بحیرۂ فلورز کی طرف جارہے تھے کہ بالی کے نزدیک سمندری قزاقوں نے ان کے شپ پر دھاوا بول دیا تھا۔ اس طرح وہ لوگ بھی لٹ پٹ کر اپنی جانیں بچاتے ہوئے جزیرۂ لومبوک پر پہنچ گئے تھے۔ سمندری ڈاکوؤں نے ان کی نگاہوں کے سامنے درجنوں مسافروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا لیکن انہوں نے اپنے قیمتی سامان، زر و جواہر وغیرہ کی پروا نہیں کی اور اپنا سب کچھ قزاقوں کے حوالے کرنے کے بعد وہ کسی طرح لومبوک تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

اب وہ لوگ وکی کوفن کی طرح امریکی کونسل خانے کے مہمان تھے۔ کونسلر (سفیر) نے پوری طرح ان کے آرام اور کھانے پینے کا خیال رکھا ہوا تھا۔ جیسے ہی کسی بحری جہاز کا لومبوک کی طرف سے گزر ہوتا، انہیں بحفاظت روانہ کردیا جاتا۔

یہ سارے مسائل بلکہ مصائب تو اپنی جگہ چل ہی رہے تھے کہ اس مقامی شخص کی خودکشی نے ماحول میں یکایک سنسنی سی دوڑا دی تھی۔

☆☆☆

واپس آتے ہی ان لوگوں نے امریکی سفیر کو اس حادثے کے بارے میں بتا دیا تھا اور سفیر نے ان سے ڈنر کے بعد تفصیلی بات کرنے کو کہا تھا۔ اس وقت وکی اور مسز ریڈ

www.pklibrary.com

سفیر کے سامنے اس کے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے۔

سفیر نے گہری سنجیدگی اور توجہ سے دوبارہ ان کی بات سنی پھر تصدیق کرنے والے انداز میں کہا۔ ''میں نے موقع کی کارروائی کرائی ہے۔ یہ صد فیصد خودکشی کا معاملہ ہے۔''

''مگر وہ بندہ تھا کون؟'' وکی نے استفسار کیا۔

''اس کا نام شارو تھا۔'' سفیر نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''وہ کچھ عرصے سے سفارت خانے کے باغ میں ایک مالی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔''

سفیر کے لہجے میں کوئی ایسی بات موجود تھی جس سے وکی کو محسوس ہوا کہ اس آدمی کی حسرت ناک موت نے اسے اچھا خاصا ڈسٹرب کر دیا تھا۔ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شارو امریکی سفارت خانے کا ملازم تھا؟''

''وہ باقاعدہ ملازم نہیں تھا۔'' سفیر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ چند ماہ پہلے میرے پاس آیا تھا۔ اس پر کئی طرح کے قرضوں کا بوجھ لدا ہوا تھا۔ اس کی درد بھری کہانی سن کر میزادل پسیج گیا۔ میں نے اسے کچھ رقم دی اور کئی طرح کے اناج کے بیج بھی فراہم کیے تاکہ وہ دو تین مویشی اور آلاتِ زراعت خرید کر کھیتی باڑی شروع کر دے لیکن وہ بہت ہی نکما ثابت ہوا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ دوبارہ میرے پاس آیا اور مجھے بتایا کہ اس نے کوشش تو بہت کی مگر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس دوران میں اس کے قرضہ جات کی رقم مزید بڑھ گئی تھی۔ ایک بار پھر مجھے اس پر ترس آ گیا اور اسے عارضی بنیادوں پر میں نے سفارت خانے کے باغ میں بطور مالی رکھ لیا تاکہ وہ اپنی فیملی کو پال سکے۔ میں اس کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔''

''آپ نے اس کی بھلائی کے لیے بہت کچھ کیا۔'' میزریڈ نے سفیر کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''مگر اس کی بدقسمتی..... آہ!''

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں سفیر کے آفس سے نکل آئے۔ جب وہ سفارت خانے کے گارڈن کے قریب سے گزرے تو میزریڈ نے وکی سے پوچھا۔

''سفیر نے جو کچھ بتایا، کیا تم اس سے مطمئن ہو؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ ملائیشین غریب تھا یا امیر، خوش قسمت تھا یا پھر بدقسمت، یہ اتنا اہم نہیں ہے۔ اصل مسئلہ کچھ اور ہے جس کے حوالے سے سفیر نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔''

''تمہارا اشارہ کس مسئلے کی طرف ہے؟''

''اس بندے نے موت کو گلے کیوں لگایا؟'' وکی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی انسان بلاوجہ اپنی جان نہیں لیتا۔''

''میں اسے اس کا ذہنی دباؤ سمجھتی ہوں۔'' میزریڈ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بے حساب قرض کا دباؤ۔ اگرچہ ایک نہیں، دو بار سفیر نے اس کی فیملی کی گزر بسر کا انتظام کر دیا تھا مگر یہ کافی نہیں تھا۔ میں ایشیائی لوگوں کے فیملی سسٹم اور دیگر رسم و روایت کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''ان کے یہاں قرضے کے معاملات نسل در نسل چلتے ہیں۔ باپ دادا کا چھوڑا ہوا قرضہ ان کی اولادوں کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں، خودکشی کرنے والا وہ شخص اپنے خاندانی قرضے تلے اس طرح دبا ہوا تھا کہ اس کے لیے سانس لینا بھی محال ہو چکا تھا۔ جب قرض خواہوں کے مطالبات بڑھنے لگے اور اسے ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے اس مستقل ذہنی اذیت سے نجات پانے کے لیے خود کو ختم کر لیا۔''

''قرض کے بوجھ تلے دبنے والی بات سے میں مکمل اتفاق کرتا ہوں میزریڈ!'' وکی نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کی موت کا سبب کچھ اور ہی ہے۔''

''آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' میزریڈ نے الجھن بھرے انداز میں سوال کیا۔

''ہمارے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا اور اس وقت اس کے ہاتھ میں گن نہیں تھی۔'' وکی معتدل انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم جب چٹان کی چوٹی پر پہنچے تو وہ سمندر کی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔ ہم اس کی پشت پر تھے۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا تھا جیسے اس نے کوئی بھیانک اور خوفناک منظر دیکھ لیا ہو۔ مجھے اس کے چہرے اور آنکھوں میں بے پناہ وحشت اور دہشت نظر آئی تھی۔ اس کے یہ تاثرات لمحاتی تھے۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنی جیب میں سے پستول نکال کر اس کی نال کو کنپٹی پر رکھنے کے بعد گولی چلا دی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے۔'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر سنسنی خیز الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''اور وہ مطلب یہ ہے میزریڈ..... کہ اس نے ہم میں سے کسی کے پاس ایسا کچھ دیکھ لیا تھا جس کی وہ توقع نہیں کر رہا تھا اور اسی چیز نے اسے یکایک خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا

www.pklibrary.com

تھا۔ اس کے بعد ہی اس نے آناً فاناً خود کو شوٹ کر لیا تھا۔"

"تمہاری بات میں دم ہے وکی!" مسز ریڈ اسے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں بولی۔ "مگر یہ سوال ابھی تک اپنی جگہ پر کھڑا ہے کہ اس نے ہمارے پاس ایسا کیا دیکھ لیا تھا جس نے اسے خودکشی پر مجبور کر دیا؟"

"مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے۔" وکی نے سرسری لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس انداز میں بولی۔ "فی الحال تم اس موضوع پر کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ شاید تمہارا دماغ کسی نتیجے تک پہنچنے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ میں تمہاری ذہانت اور معاملہ فہمی دیکھ چکی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد اس کی خودکشی کے سبب تک رسائی حاصل کر لو گے۔"

"بعض اوقات لوگ چیزوں کو اتنی گہرائی تک نہیں دیکھتے جتنا کہ میں۔" وکی کوفن نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ میں "ماؤری" قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس قبیلے کے مرد و زن مشکلات کا سامنا کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ کوئی بھی مشکل ذہنی ہو یا جسمانی، ہم اس سے بھرپور انداز میں محظوظ ہوتے ہیں۔ زندگی ہمارے لیے کسی خطرناک مہم کے مانند ہے اور ہم اس کی خطرناکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوف و ڈر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔"

"ایک آدم خور ماؤری کو اتنا نڈر اور بے باک تو ہونا ہی چاہیے۔" مسز ریڈ نے معنی خیز اور طنزیہ نظر سے وکی کو گھورتے ہوئے کہا۔

قبل اس کے کہ وکی اس کی چوٹ کے جواب میں کچھ کہتا، مسز ریڈ کی بھتیجی جین گھنے درختوں کے عقب سے نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان بھی تھا۔ وکی اور مسز ریڈ نے فوراً پہچان لیا۔ وہ ویلنٹائن تھا۔ وہ دونوں بے تکلفی سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ایک طرف جانے لگے۔ شاید انہوں نے انہیں دیکھا نہیں تھا۔

"یہ جین کے ساتھ کون ہے؟" مسز ریڈ نے اضطراری لہجے میں کہا۔ "مم..... میرا مطلب ہے، میں اسے جانتی تو ہوں۔ وہ سفیر کا معتمدِ خاص ہے۔ اس کا نام..... ویلنٹائن ہے مگر..... یہ ہے کہاں کا رہنے والا؟"

"میرے خیال میں اس کا تعلق اٹلی سے ہے۔" وکی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے اسے جین کے ساتھ بات کرتے سنا ہے۔ اگرچہ وہ انگلش بولتا ہے مگر اس کا تلفظ اور لب و لہجہ اطالوی ہے۔"

"جین کا پرفیکٹ میچ تو رچرڈ ہی ہے۔" مسز ریڈ زور دے کر بولی۔ "یہ پاگل لڑکی پتا نہیں ویلنٹائن کے ساتھ کیوں چپکی رہتی ہے۔ میری خواہش اور دعا ہے کہ جین اور ویلنٹائن کے بیچ کچھ بھی سیریس نہ ہو۔"

اپنی بھتیجی کے مستقبل کے حوالے سے مسز ریڈ جس انداز میں سوچتی تھی، اس سے وکی کوفن اچھی طرح واقف تھا۔ وہ خود بھی ہتھنی مسز فوسٹر کے فرمانبردار بیٹے رچرڈ کو پسند کرنے لگا تھا۔ رچرڈ شاعرانہ مزاج رکھنے والا ایک نرم خو اور مہربان شخص تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے اندر خدمت گزاری کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس پر وہ بہت زیادہ دولت مند بھی تھا۔ مسز ریڈ کو یقین تھا کہ وہ جین کو بہت خوش رکھے گا۔

"رچرڈ، جین کا دیوانہ ہے۔" گیسٹ ہاؤس کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے مسز ریڈ نے خوابناک لہجے میں کہا۔ "اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں جین کو منانے کی کوشش کروں۔ وہ کہتا ہے اگر جین اسے نہیں ملی تو وہ جان دے دے گا۔ جین کے بغیر وہ زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے رچرڈ میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ میں ان دونوں کی ارینج میرج کرانے کی پوری کوشش کروں گی۔"

"ارینج میرج؟" بے ساختہ وکی کے منہ سے نکلا اور وہ الجھن زدہ نظر سے مسز ریڈ کو تکنے لگا۔

وکی کی حیرت اور الجھن کا سبب یہ تھا کہ یورپین لوگوں کے حوالے سے اس کے ذہن میں "ارینج میرج" کا تصور کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے آبائی ملک نیوزی لینڈ اور دیگر ایشیائی ممالک میں تو طے شدہ شادیوں کا رواج عام تھا مگر یورپ کے باسی.....!

"ہاں بالکل!" مسز ریڈ کے حتمی الفاظ نے اس کی سوچ کو بریک لگا دیے۔ وہ بڑے عزم کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ "میں ایسا کر کے دکھا دوں گی۔"

"گڈ لک!" وہ معتدل انداز میں بولا۔

وکی نے مسز ریڈ کو مطمئن کرنے کے لیے "گڈ لک" کہہ تو دیا تھا مگر جین اور ویلنٹائن کی بے باک پھرتیوں کے پیشِ نظر وہ پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ جلد یا بدیر مسز ریڈ کسی ذہنی صدمے سے دوچار ہونے والی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح ناشتے کے بعد وکی کوفن جزیرے کی سیر کو نکل گیا۔ لومبوک کا زیادہ تر حصہ غیر آباد تھا جس میں زرعی زمین

www.pklibrary.com

بھی شامل تھی۔ اس جزیرے پر رہنے والے لوگ زیادہ تر دو پیشوں سے وابستہ تھے۔ نمبر ایک، کھیتی باڑی اور نمبر دو، ماہی گیری۔ وہ کئی مقامی افراد سے بھی ملا اور ان سے مختلف قسم کی معلومات حاصل کیں۔

اسی ''لومبوک یاترا'' کے دوران میں وہ پوچھتے پاچھتے شارو کے گھر بھی جا پہنچا اور متاثرین سے اظہارِ تعزیت بھی کیا۔ متوفی کے گھرانے کے سبھی افراد پسماندہ اور انتہائی غریب تھے۔ ان کی صحت اور چہروں کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ محض جی رہے تھے۔ اپنی سانسیں پوری کرنے کے لیے زندہ تھے۔

وکی جب واپس گیسٹ ہاؤس کی طرف آرہا تھا تو اس نے ایک ہلکا سا زلزلہ محسوس کیا۔ چھوٹے بڑے زلزلوں کا یہ تباہ کن سلسلہ پچھلے دو ماہ سے جاری تھا جس نے جنوبی ایشیا کے ساحلی علاقوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ انہی زلزلوں کے ساتھ خوفناک طوفانی بارشوں کے باعث آنے والے سیلاب نے بھی ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کو بے گھر اور بے آسرا کردیا تھا۔ جو لوگ لقمۂ اجل بنے، ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی۔

جب وکی گیسٹ ہاؤس پہنچا تو وہاں ایک اور افتاد اس کی منتظر تھی۔ گیسٹ ہاؤس کے سامنے لگ بھگ ایک درجن افراد جمع تھے جن میں مقامی اور مہمان دونوں شامل تھے۔ وکی کے استفسار پر گیسٹ ہاؤس کے ایک ملازم نے بتایا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے جو زلزلے کا جھٹکا محسوس ہوا تھا، عین اسی وقت میں نے گیسٹ ہاؤس کے اندر فائر کی آواز سنی تھی۔ یہاں ٹھہرے ہوئے لوگوں نے بھی گولی چلنے کی آواز یقیناً سنی تھی اسی لیے ہم ایک ایک کمرے کا احوال جاننے کے لیے سرگرم ہوگئے۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''ہر کمرے میں ٹھہرے ہوئے لوگ بخیر و عافیت ہیں، سوائے ایک کے اور..... وہ کمرا اندر سے لاک ہے۔''

''تم جس کمرے کی بات کررہے ہو.....'' وکی نے سرسراتی ہوئی آواز میں ملازم سے استفسار کیا۔ ''اس میں کون ٹھہرا ہوا ہے؟''

''مسز فوسٹر کا بیٹا رچرڈ!'' ملازم نے جواب دیا۔

''تم لوگوں نے اس لاک کیے ہوئے دروازے کو کھلوانے یا کھولنے کی کوشش نہیں کی؟'' وکی نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''ہر طرح کی کوشش کرکے دیکھ لیا جناب مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آرہا۔'' ملازم نے بتایا۔ ''اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ اس کمرے کے لاکڈ دروازے کو توڑ دیا جائے مگر اس کام کے لیے ہمیں سفیر صاحب سے اجازت لینا ہوگی۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' وکی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کمرے کی ڈپلی کیٹ چابی ضرور ہوگی۔ تم اس چابی سے دروازے کا لاک کھول سکتے ہو۔''

''آپ نے بجا فرمایا۔'' ملازم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہر کمرے کی ڈپلی کیٹ چابی ہے مگر ایسی ساری چابیاں سفیر صاحب اپنے پاس رکھتے ہیں اور وہ اس وقت اپنے آفس میں اس قدر مصروف ہیں کہ انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہوگا۔''

''تم سب نے گیسٹ ہاؤس کے اندرونی حصے میں گولی چلنے کی آواز سنی ہے۔'' وکی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ایک کمرے کے سوا تم نے پورے گیسٹ ہاؤس کو چیک کرلیا ہے اور وہاں کہیں بھی تمہیں کوئی گڑبڑ دکھائی نہیں دی۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وہ گولی رچرڈ والے لاکڈ کمرے کے اندر چلائی گئی ہے۔ فائر کس نے کیا، یہ اسی وقت معلوم ہوگا جب ہم میں سے کوئی کمرے کے اندر داخل ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں رچرڈ خیریت سے نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' سفیر کے بٹلر نے تشویش بھرے لہجے میں سوال اٹھایا۔ ''سفیر صاحب کا اسسٹنٹ بھی کہیں نظر نہیں آرہا ورنہ ہم اسے آفس بھیج کر ڈپلی کیٹ چابی منگوا سکتے تھے۔''

''انتہائی فضول سوچ.....!'' بٹلر کی طرف دیکھتے ہوئے وکی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''سفیر کے اسسٹنٹ ویلنٹائن کو یہاں وہاں نظر آنے کے بجائے آفس میں موجود ہونا چاہیے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ آفس کے اسٹاف بشمول سفیر نے گولی چلنے کی آواز نہ سنی ہو۔ ان کی پراسرار خاموشی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ سفیر صاحب چاہے کتنے بھی اہم کام میں مصروف کیوں نہ ہوں، انہیں فوراً ڈسٹرب کردینا چاہیے۔ یہ ایک انسانی جان کا سوال ہے۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ مسٹر رچرڈ کمرے کے اندر موجود ہی نہ ہو۔'' بٹلر نے کہا۔ ''وہ اپنے کمرے کو لاک کرکے کہیں اِدھر اُدھر نکل گیا ہو۔''

''تب بھی یہ جاننا انتہائی ضروری ہے کہ گولی کس نے چلائی۔'' وکی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

www.pklibrary.com

''اور کس پر چلائی اور..... کیوں چلائی.....؟ ان تمام سوالات کے جوابات اسی وقت ملیں گے جب کسی بھی طرح ہم رچرڈ والے کمرے میں داخل ہونے میں کامیاب ہوں گے کیونکہ باقی کے گیسٹ ہاؤس میں تو آپ لوگوں کو کہیں بھی فائرنگ کے آثار نظر نہیں آئے۔''

وکی کی بات منطق اور دلیل سے بھرپور تھی۔ اس کے بیان پر کسی کو اعتراض جڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔ سفیر کے بٹلر نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اس معاملے کو میں اپنے ہاتھ میں لے رہا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے ایک ملازم کو کچھ سمجھانے کے بعد سفارت خانے کی جانب روانہ کر دیا۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ اس نے رچرڈ والے کمرے کی ڈپلی کیٹ چابی منگوائی تھی۔

وہاں پر موجود تمام لوگ بے حد ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔ مسز ریڈ اور وکی، بٹلر کے بہت نزدیک کھڑے تھے جبکہ مسز فوسٹر ہال وے کے دوسرے کنارے پر اپنی وھیل چیئر میں فٹ تھی تاہم اس وقت وھیل چیئر کا ہینڈل رچرڈ کے بجائے گیسٹ ہاؤس کے ایک ملازم کے ہاتھ میں تھا جو بمشکل تمام وھیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے ان کی طرف لا رہا تھا۔

مسز فوسٹر کے لامحدود جسم کو وہاں سے یہاں لانے میں اس ملازم کا خون پسینا ایک ہو رہا تھا۔

☆☆☆

سفیر کو جیسے ہی اس سانحے کی خبر ہوئی، وہ اپنے ضروری کام کو چھوڑ کر، ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے ڈپلی کیٹ چابی کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد رچرڈ کے کمرے کا دروازہ کھولنے میں کسی دقت یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

اندر کا منظر انتہائی وحشت ناک اور دل دہلا دینے والا تھا۔ رچرڈ کمرے کے فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کے سر کے قریب ہی خون کا ایک ننھا سا تالاب بن گیا تھا۔ رچرڈ کے پھیلے ہوئے دائیں ہاتھ کے نزدیک ہی ایک پستول بھی پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کمرے کی ''گیسٹ کی'' دروازے کی اندرونی جانب فرش پر پڑی تھی۔ چابیاں ٹانگنے والا مخصوص ہک اسٹینڈ دروازے کے پہلو میں دیوار پر نصب تھا۔ فوری طور پر یہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے آنے والے زلزلے کے جھٹکے نے گیسٹ کی کو اس مخصوص ہینگر سے نیچے گرا دیا ہوگا۔

کمرے کے اندر کچھ اس قسم کی ناگوار بُو... محسوس ہو رہی تھی جیسے گوشت کی کسی ڈش کو ''اوور کک'' کر دیا گیا ہو۔ سب سے اہم بات یہ کہ رچرڈ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔

مسز فوسٹر ابھی تک جائے وقوعہ سے کافی فاصلے پر تھی۔ گیسٹ ہاؤس کا ملازم جوں کی رفتار سے اس کی وھیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے اس طرف لا رہا تھا۔

سفیر نے کرائم سین کا بغور جائزہ لیا پھر اپنے بٹلر سے کہا۔ ''دروازے کو بند کر دو۔''

''بالکل..... کیوں نہیں۔'' بٹلر کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی مسز ریڈ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اب اس دروازے کو بند ہی ہو جانا چاہیے۔ کیا رچرڈ نے جین کی وجہ سے خود کو ختم کر ڈالا ہے؟'' اس نے خود کلامی والے انداز میں اپنے آپ سے سوال کیا۔ ''میں جانتی ہوں رچرڈ میری بھتیجی کو پسند کرتا تھا۔ ''پسند'' بہت چھوٹا سا لفظ ہے۔ وہ جین سے شدید محبت کرتا تھا۔ وہ جین کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا اور اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں رچرڈ نے خود مجھے بتائی تھیں لیکن جین کو اس کی ذرا سی بھی پروا نہیں تھی حالانکہ میں نے اسے سمجھانے کی کئی بار کوشش کی تھی کہ وہ رچرڈ کے پروپوزل کو قبول کر لے مگر وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ رچرڈ نے بڑے واضح الفاظ میں اس سے کہا تھا کہ اگر اس نے رچرڈ کو ٹھکرا دیا، اس کے جذبات کی قدر نہیں کی اور اس کی محبت کو محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی تو وہ..... تو وہ.....!''

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔ افراتفری کے عالم میں وہ کمرے سے باہر نکلی پھر دروازے کو زوردار انداز میں بند کرنے کے بعد ہال وے کی جانب بڑھ گئی۔

''یہ تو سیدھا سیدھا کہہ گئی ہے کہ رچرڈ نے محبت میں ناکامی کے بعد دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کر لی ہے۔'' سفیر کی بے یقینی سے لبریز سرسراتی ہوئی آواز وکی کی سماعت سے ٹکرائی۔

وکی یک ٹک فرش پر پڑے ہوئے پسٹل کو گھور رہا تھا۔ سفیر کی آواز پر وہ اس کی طرف مڑا اور جذبات سے عاری لہجے میں سوال کیا۔

''آپ کا اسسٹنٹ کہاں ہے؟''

''ویلفائن.....!'' بے ساختہ سفیر کے منہ سے نکلا۔ ''میں نے آج صبح سے اسے نہیں دیکھا۔''

وکی دوبارہ پسٹل کو دیکھنے لگا۔ اس وقت وکی کے علاوہ سفیر اور اس کا بٹلر بھی جائے واردات پر موجود تھے۔ گیسٹ

www.pklibrary.com

ہاؤس کے دیگر ملازمین باہر کوریڈور میں تھے۔ کسی فوری خیال کے تحت وکی ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ایک ملازم سے کہا۔

''تم فوراً جا کر سفیر کے معتمدِ خاص ویلفائن کو تلاش کرو اور مسز ریڈ کی نوجوان بھتیجی جین کو بھی۔''

ملازم، وکی کے حکم کی تعمیل کے لیے فوراً وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اس دوران میں مسز فوسٹر، وکی سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کے الفاظ وکی کی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ ویسے بھی ان لمحات میں اس کا ذہن کسی اور ہی گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ اس نے واپس کمرے کے اندر آکر دروازہ بند کیا تو سفیر نے افسوسناک انداز میں کہا۔

''دو خودکشی کے بھیانک واقعات اور وہ بھی ایک دن کے وقفے سے۔'' اس کی آواز سے گہرا تفکر اور اضطرار جھلک رہا تھا۔ ''کل اس مقامی شارو نے چٹان پر خود کو موت کے حوالے کر دیا اور آج یہ امیر زادہ خود کو شوٹ کر بیٹھا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس جزیرے پر آخر ہو کیا رہا ہے۔''

''کل شارو نامی اس ملائیشین نے میری آنکھوں کے سامنے اپنی کنپٹی کو گولی سے اڑا یا تھا اس لیے اس کی موت کو خودکشی ماننے میں مجھے کوئی تردد نہیں ہے سر!'' وکی نے سفیر کے چہرے پر نگاہ جما کر پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس بند کمرے میں رچرڈ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا کوئی ایک گواہ بھی موجود نہیں ہے تو.....'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر ایک بوجھل سانس خارج کرنے کے بعد اس نے امریکی سفیر سے جھجکتا ہوا سوال کیا۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ رچرڈ فوسٹر نے خودکشی کی ہے؟''

''پکا یقین ہے۔'' سفیر نے جواب دیا۔ ''رچرڈ نے کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کر رکھا تھا۔ اس کمرے کی ڈپلی کیٹ چابی میرے آفس میں رکھی تھی۔ میں نے تمہارے سامنے اسی ڈپلی کیٹ چابی سے دروازے کا لاک کھولا ہے۔ جب ہم لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو یہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا سوائے رچرڈ کی لاش کے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے فرش پر پڑی رچرڈ کی لاش کی طرف دیکھا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

''یہ سیدھا سیدھا خودکشی کا کیس ہے مسٹر وکی! اور میرا خیال ہے اس کی وجہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ تم نے مسز ریڈ کا بیان تو سنا ہوگا۔''

وکی نے سفیر کی سنی ان سنی کرتے ہوئے فرش پر پڑی ڈپلی کیٹ چابی کو دیکھا پھر اس کی نگاہ اس پستول پر چلی گئی جو رچرڈ کے دائیں ہاتھ کے قریب فرش پر موجود تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی سے آنے والی روشنی اس پسٹل پر پڑ رہی تھی۔ وکی کے ذہن میں ہلچل سی ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اس گن کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔ اگلے ہی لمحے اسے یاد آگیا کہ گزشتہ روز چٹان کی چوٹی پر جب شارو نامی اس ملائیشین بندے نے خود کو شوٹ کیا تھا تو اس کے ہاتھ میں بھی وکی کو بالکل ایسا ہی پسٹل نظر آیا تھا۔ شارو کی خودکشی کا منظر وکی کی نگاہِ تصور میں اجاگر ہوگیا۔

وہ ملائیشین ان کی جانب پشت کیے چٹان کی چوٹی پر کھڑا سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ ان کے قدموں کی آہٹ نے اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس کا چہرہ متغیر ہوگیا تھا اور اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگی تھی۔ خوف اور سراسیمگی کے عالم میں اس نے اپنے لباس میں سے ایک پسٹل نکال کر اس کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ کر گولی چلا دی تھی۔ اگلے ہی لمحے مسز ریڈ کی جوان العمر بھتیجی نے ایک خلافِ توقع حرکت کی تھی۔

شارو نے خود کو ختم کر ڈالا تھا اور اس کی لاش چٹان سے نیچے جا گری تھی اور جین دوڑتے ہوئے اس مقام پر پہنچی تھی جہاں خودکشی کرنے والے شارو کا پسٹل گرا تھا۔ جین لڑکھڑا کر عین اس جگہ پر گری تھی جہاں ایک لمحہ پہلے شارو نے خود کو شوٹ کیا تھا۔ آسان اور سمجھ میں آنے والے الفاظ میں بولیں تو جین، شارو کے پسٹل کے اوپر گری تھی۔

یہ ایک اتفاق بھی ہوسکتا تھا لیکن وکی کا ذہن ذرا ہٹ کر سوچ رہا تھا۔ اس کے خیال میں جین نے شارو کے پسٹل کو اٹھانے کے لیے ہی اپنے گرنے کا ڈراما کیا تھا۔ یقیناً اس اضطراری حرکت میں اس کے گھٹنے چھل گئے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنے مقصد میں کامیابی بھی حاصل ہوگئی تھی۔ وکی کی تھیوری کے مطابق جین نے پتھریلی زمین پر گرتے ہی مذکورہ پسٹل کو اٹھا کر اپنے اسکرٹ میں کہیں چھپا لیا ہوگا۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں وکی کے ذہن سے گزرے۔ اسی وقت وہ ملازم بھاگتے ہوئے واپس آگیا جسے وکی نے ویلفائن اور جین کو تلاش کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

''وہ دونوں.....'' ملازم نے پھولی ہوئی سانس کے درمیان بتایا۔ ''اپنے سامان کے ساتھ کہیں چلے گئے ہیں۔ کسی کو ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔''

www.pklibrary.com

ملازم کے انکشاف نے وکی کو حیران کیا اور نہ ہی پریشان کیونکہ اپنی تھیوری کی روشنی میں وہ کچھ ایسی ہی توقع کر رہا تھا۔ اس نے سفیر کی جانب دیکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رچرڈ فوسٹر کو کس نے قتل کیا ہے؟''

''قتل.....؟'' سفیر نے الجھن بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاں، بالکل!'' وکی نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''میں رچرڈ کی موت کو خودکشی نہیں مان سکتا۔ کسی بے درد انسان نے اسے شوٹ کیا ہے۔''

''یہ ممکن نہیں ہے مسٹر وکی کوفن!'' سفیر نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''اس کمرے میں آمد و شد کا واحد راستہ یہ دروازہ ہی ہے۔'' اس نے کمرے کے داخلی دروازے کی جانب اشارہ کرنے کے بعد اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس دروازے کو میں نے آپ لوگوں کے سامنے ڈپلی کیٹ چابی سے کھولا ہے۔ جب ہم اندر آئے تو یہاں رچرڈ کی لاش کے سوا اور کوئی زندہ یا مردہ شخص موجود نہیں تھا۔ اگر میں تمہاری تھیوری کو درست مان لوں مسٹر وکی.....تو مجھے بتاؤ رچرڈ کا قاتل کہاں ہے؟ کیا وہ بھاپ بن کر اس کمرے سے نکل گیا ہے؟''

''تو آپ کو ایسا لگتا ہے؟'' وکی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یہی حقیقت ہے مسٹر وکی!'' سفیر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مسز ریڈ کا بیان بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔''

''ہوں۔'' وکی نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''ہم رچرڈ کی موت پر بعد میں بھی تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ہمیں فوری طور پر مسز فوسٹر کو اس سانحے کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔ وہ بیچاری ابھی تک اپنے بیٹے کی ہلاکت سے بے خبر ہے۔''

امریکی سفیر زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا تو وکی کی نگاہ ایک مرتبہ پھر پسٹل اور ڈپلی کیٹ چابی پر جم گئی۔ ابھی تھوڑی دیر میں کسی ڈاکٹر نے وہاں آجانا تھا تاکہ رچرڈ کی لاش کا معائنہ کرنے کے بعد ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کر سکے۔

ڈاکٹر، رچرڈ کی موت کا جو بھی سبب بتائے مگر وکی کا ذہن اسے خودکشی ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

وکی اس وقت پورچ کے قریب کھڑا تھا جب مسز ریڈ نے اس کے نزدیک آکر اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

''کیا گیسٹ ہاؤس کے ملازمین نے جین کو تلاش کر لیا؟''

''وہ امریکی سفارت خانے کے کسی حصے میں موجود نہیں ہے۔'' وکی نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ''اور اس کے ساتھ ہی ویلنٹائن بھی غائب ہے۔''

''او مائی گاڈ!'' وہ پریشان لہجے میں بولی۔ ''مگر وہ کہاں جا سکتی ہے۔ وہ اس جزیرے سے بالکل واقف نہیں ہے۔''

''لیکن وہ تو یہاں کے چپے چپے سے آگاہ ہے نا۔'' وکی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''وہ کون؟'' مسز ریڈ الجھن زدہ نظر سے وکی کو دیکھنے لگی۔

''ویلنٹائن.....!'' وکی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ بندہ کافی عرصے سے امریکی سفارت خانے میں کام کر رہا ہے۔ وہ یہاں کے راستوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ انہیں اس جزیرے سے فرار ہونے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہوگا۔ وہ مقامی لوگوں کی مدد سے کوئی بھی ایسی کشتی یا بوٹ بہ آسانی حاصل کر سکتا ہے جو انہیں لومبوک سے باہر لے جا کر کسی قریبی جزیرے پر پہنچا دے جیسا کہ بالی، ڈینپاسر، سمباوا، فلورز.....وغیرہ ہم!''

''بے وقوف لڑکی!'' مسز ریڈ نے افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کے مستقبل کو شاندار بنانے کے لیے کوشاں تھی اور اس نے کیا کر ڈالا۔''

''میں سمجھتا ہوں جین کو ورغلانے میں ویلنٹائن کا ہی ہاتھ ہے۔'' وکی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اس شیطانی ذہن رکھنے والے شخص نے بڑی صفائی سے آپ کی بھتیجی کو اپنی محبت کے جال میں پھنسایا اور پھر وہ دونوں اس جزیرے سے نکل گئے.....اپنا کام مکمل کرنے کے بعد۔''

وکی کے آخری جملے نے مسز ریڈ کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ قبل اس کے کہ وہ وکی سے کوئی سوال کرتی، گیسٹ ہاؤس کے اندرونی حصے سے مسز فوسٹر کے بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یقیناً اسے رچرڈ کی لاش تک پہنچا دیا گیا تھا اور وہ اپنے بیٹے کی حسرت ناک موت پر نوحہ خوانی کر رہی تھی۔

''وہاں ادھر گیسٹ ہاؤس کے اندر کیا چل رہا ہے؟'' مسز ریڈ نے پوچھا۔ ''یہ رونے کی آواز تو رچرڈ کی ماں کی ہے۔''

''جب میں رچرڈ کے کمرے سے نکلا تو ڈاکٹر اس کی لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔'' وکی نے جواب میں بتایا۔ ''شاید ڈاکٹر نے اپنا کام کر دیا ہے اور مسز فوسٹر کو رچرڈ کی لاش کو دیکھنے کا موقع مل گیا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی موت پر آہ و

www.pklibrary.com

زاری کررہی ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں فوراً رچرڈ والے کمرے میں جانا چاہیے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" مسز ریڈ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "آؤ، چلتے ہیں۔"

جب وہ رچرڈ کے کمرے میں پہنچے تو ڈاکٹر اپنا کام کرکے جاچکا تھا۔ رچرڈ کی لاش کو بھی اس کمرے سے کہیں اور منتقل کردیا گیا تھا البتہ رچرڈ کی کھوپڑی سے خارج ہونے والا خون جوں کا توں کمرے کے فرش پر موجود تھا۔ دو ملازمین رچرڈ کے سامان کو پیک کرنے میں مصروف تھے اور مسز فوسٹر اپنی وھیل چیئر پر بیٹھی دھواں دھار انداز میں رو رہی تھی۔ اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

امریکی سفیر کے ہاتھ میں ایک کاغذ دیکھ کر وکی نے پوچھا۔ "سر! یہ کیا ہے؟"

"رچرڈ کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ!" سفیر نے بتایا۔ "ابھی ڈاکٹر مجھے دے کر گیا ہے۔ اس سرٹیفکیٹ میں ڈاکٹر نے رچرڈ کی موت کو خودکشی قرار دیا ہے۔"

"ایک دم بکواس۔" وکی زہرخند لہجے میں بولا۔ "میں نہیں مانتا۔ رچرڈ کو قتل کیا گیا ہے سر!"

"کیا تم اپنی اس تھیوری کو ثابت کرسکتے ہو؟" سفیر نے تلخی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

سفیر کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وکی سبک قدموں سے چلتے ہوئے مسز فوسٹر کی وھیل چیئر کے قریب پہنچا۔ اس نے اپنی جیب میں سے ایک خوبصورت طلائی صلیب برآمد کی۔ اس صلیب پر ہیرے اور یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک انتہائی قیمتی اور قابل دید صلیب تھی۔ وکی نے مذکورہ صلیب کو مسز فوسٹر کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

مسز فوسٹر کی نظر جیسے ہی اس صلیب پر پڑی، اس کی گریہ وزاری کو بریک لگ گئے۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور اس نے حد درجہ اضطراری لہجے میں کہا۔

"یہ کراس (صلیب) تمہیں کس نے دیا؟"

وکی کے جواب دینے سے پہلے ہی مسز فوسٹر نے دوبارہ رونا شروع کردیا اور سفیر کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اسے رچرڈ کو پیش آنے والے سانحے کا ذمے دار ٹھہرانے لگی مگر اس الزام میں کوئی وزن نہیں تھا اور نہ ہی الفاظ میں کسی قسم کی منطق یا معقولیت۔ بس وہ ایک دکھی ماں کا اظہارِ غم تھا۔

امریکی سفیر نے وکی سے استفسار کیا۔ "یہ بیش قیمت جڑاؤ طلائی صلیب تمہیں کہاں سے ملی مسٹر وکی؟"

"شارو کی فیملی نے مجھے دی ہے۔" وکی نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔ "وہ اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان پر قرضوں کا بوجھ قدرے کم ہوسکے مگر انہیں نہیں معلوم کہ اس قیمتی صلیب کو کون خریدے گا۔"

"اوہ..... تو تم شارو کی فیملی سے مل چکے ہو؟" سفیر نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں آج شارو کی المناک موت پر تعزیت کرنے ادھر گیا تھا۔" وکی اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ان لوگوں نے اپنی بساط کے مطابق میری خاطر تواضع کی اور مجھے شارو کے بارے میں کھل کر بتایا کہ وہ بندہ کس طرح اپنی فیملی کا قرض اتارنے کے لیے دن رات محنت کررہا تھا اور اس "محنت" میں وہ اچھے اور بُرے کی تمیز بھی کھو بیٹھا تھا۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا مسٹر وکی کوفن؟" امریکی سفیر نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔

"شارو کے گھر والوں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اپنی فیملی کے قرضے کو زیرو کرنے کے لیے بعض اوقات چوری، راہزنی اور ڈکیتی کی وارداتیں بھی کیا کرتا تھا۔" وکی نے جواب دیا۔ "اس کی فیملی ایسی غیر قانونی سرگرمیوں سے خوش نہیں تھی مگر وہ کسی کی نہیں سنتا تھا۔ اس پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے، اسے جلد از جلد قرض کی لعنت سے نجات حاصل کرنا ہے۔"

"تو یہ ثابت ہوگیا کہ شارو ایک ڈاکو، لٹیرا اور سمندری قزاق تھا۔" سفیر نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں..... مگر خوشی سے نہیں۔" وکی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ ایسا کرنے کے لیے مجبور ہوگیا تھا۔"

"میں سمجھتا ہوں وہ میرے پاس اسی لیے آیا تھا کہ میں اسے ایک پریشان حال شخص سمجھوں اور حتی الامکان اس کی مدد کروں تاکہ میری نگاہ میں وہ ایک مجبور اور خوددار شخص ٹھہرے۔ شرافت کے اس ٹائٹل کے پیچھے وہ اپنی مذموم کارروائیوں کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔" امریکی سفیر نے افسوس بھرے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے سہارا دینے میں کوئی کمی نہیں کی تھی مگر شاید اس کی نیت میں فتور تھا۔ اس نے میرے تعاون اور نیکی پر پانی پھیر دیا۔"

"یہ بہت ہی عجیب اور ذہن کو پریشان کردینے والا معاملہ ہے۔" مسز ریڈ نے ان کی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "بہرحال بُرے کام کا نتیجہ بھی بُرا ہی ہوتا ہے۔"

"ہوں۔" سفیر نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے

www.pklibrary.com

کہا۔ ''شارو کی موت کا سبب دراصل اس کے ضمیر کا بوجھ ہے۔ اسی بوجھ نے اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔''

''آئی ایم سوری!'' وکی نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''میں شارو کی خودکشی کو ضمیر کا بوجھ نہیں سمجھتا بلکہ اس نے اچانک کچھ ایسا دیکھ لیا تھا جس نے اسے اس قدر دہشت زدہ کر دیا کہ خودکشی کے سوا اسے کوئی راستہ ہی نظر نہیں آیا۔ ان لمحات میں، میں نے اس کی آنکھوں اور چہرے پر بے پناہ خوف دیکھا تھا۔''

''مسٹر وکی! شارو کے اس خوف کا سبب کیا تھا؟'' سفیر نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''اس نے ایسا کیا دیکھ لیا تھا۔ اس کے سامنے تو تم لوگ ہی تھے نا؟''

''میرے خیال میں شارو کی وہ جنونی حالت مسز فوسٹر کو دیکھنے کے بعد ہوئی تھی۔'' وکی نے دھیمی آواز میں کہا تاکہ مسز فوسٹر سن نہ سکے۔

''وکی بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' مسز ریڈ نے سفیر کی طرف دیکھتے ہوئے تصدیقی انداز میں کہا۔ ''یہ چیز تو میں نے بھی نوٹ کی تھی کہ مسز فوسٹر کو دیکھتے ہی شارو حد درجہ بوکھلا گیا تھا۔ اس کے بعد ہی اس نے آناً فاناً میں خود کو شوٹ کر لیا تھا اور میں اس کی بوکھلاہٹ کی وجہ بھی جانتی ہوں۔''

''ہم بھی جاننا چاہیں گے۔'' وکی نے زور دے کر کہا۔

امریکی سفیر اضطراری لہجے میں بولا۔ ''بالکل..... ضرور!''

''اب یہ تو ثابت ہو چکا کہ شارو ایک سمندری قزاق تھا۔'' مسز ریڈ معتدل انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''مسز فوسٹر نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے بحری جہاز پر سمندری ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تھا۔ مسز فوسٹر کی آنکھوں کے سامنے اس جہاز کے کیپٹن، عملے کے بعض افراد اور کئی مسافروں کو مزاحمت کرنے پر بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ ان ڈاکوؤں میں شارو بھی شامل ہو اور.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''اور کل جب چٹان کی چوٹی پر شارو نے پیچھے مڑ کر ہمارے گروپ کو دیکھا تو مسز فوسٹر پر نگاہ پڑتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہی اس نے گن کو کنپٹی پر رکھ کر گولی چلا دی تھی۔ وہ یہی سمجھا ہوگا کہ مسز فوسٹر نے اسے سمندری قزاق کی حیثیت سے پہچان لیا ہے۔ اب وہ سیدھی جا کر اپنے میزبان یعنی امریکی سفیر کو اس کے کالے کرتوتوں کے بارے میں بتائے گی جس کے بعد اس کا بچنا ممکن نہیں رہے گا۔ سو، اس نے اپنے ہاتھوں سے خود کو ختم کر لیا۔''

''تو یہ ثابت ہو گیا کہ شارو صرف ایک ڈاکو ہی نہیں بلکہ ایک قاتل بھی ہے۔'' سفیر نے حتمی لہجے میں کہا۔

''اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شارو نے واقعتاً کسی کی جان نہ لی ہو۔'' وکی نے خیال آرائی کی۔ ''ہاں، یہ ممکن ہے کہ وہ بھی اسی بحری جہاز پر موجود ہو اور اس نے مسز فوسٹر کو وہاں دیکھا ہو۔ اس جہاز پر بحری قزاقوں نے خون کی جو ہولی کھیلی تھی، وہ لرزہ خیز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھی۔ شارو یہ سمجھا ہوگا کہ مسز فوسٹر کی شکایت پر وہ کہیں کسی بڑی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ وہ صورتِ حال ایسی سنگین اور اچانک تھی کہ شارو کے دماغ نے صحیح انداز میں کام کرنا چھوڑ دیا ہوگا پھر اس کی سمجھ میں جو بھی آیا، اس نے فوراً کر ڈالا۔''

''ان تمام اندازوں اور فلسفوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے مسٹر وکی!'' سفیر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شارو نے خود کو ختم کر ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی کی کہانی بھی ختم۔ او مائی گاڈ! یکے بعد دیگرے دو خودکشی کے واقعات!'' اس نے لمحاتی توقف کر کے اپنی گردن کو دو تین بار نفی میں جھٹکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ان میں ایک سمندری قزاق تھا اور دوسرا ایک امریکی امیرزادہ اور..... وہ میری پناہ میں بھی تھا۔''

''رچرڈ فوسٹر کی موت کو خودکشی کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا سر!'' وکی کوفن نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''یہ سیدھا سیدھا قتل ہے۔''

''یہ بات تم پہلے بھی کہہ چکے ہو مسٹر وکی!'' امریکی سفیر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مگر یہاں کی صورت حال تمہارے اس دعوے کی تردید کرتی ہے۔ رچرڈ نے اپنے کمرے کو اندر سے لاک کر رکھا تھا۔ اگر کسی نے اسے شوٹ کیا ہوتا تو باہر سے دروازہ لاک کرتے ہوئے کمرے کی چابی اسی یعنی قاتل کے پاس رہ جاتی لیکن زمینی حقائق اس کے برعکس ہیں۔ جب ہم لوگ کمرے کے اندر داخل ہوئے تو ''گیسٹ کی'' ہمیں کمرے کے فرش پر پڑی ملی تھی۔ ملی تھی یا نہیں؟''

سفیر نے آخری سوالیہ جملے پر اچھا خاصا دباؤ ڈالا تھا۔ وکی نے بھی ترکی بہ ترکی اسی انداز میں جواب دیا۔ ''بالکل ملی تھی سر.....! مگر دروازے کے انتہائی قریب۔''

''تو اس سے کیا ہوتا ہے؟'' سفیر نے برہمی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''رچرڈ نے کمرے کو اندر سے لاک کرنے کے بعد چابی کو دیوار والے ہک اسٹینڈ پر لٹکا دیا ہوگا اور جب زلزلے کا جھٹکا آیا تو وہ چابی اسٹینڈ سے نکل کر فرش

www.pklibrary.com

پر گر گئی ہوگی۔ مذکورہ ہک اسٹینڈ دروازے کے نزدیک ہی دیوار پر نصب ہے۔ تم دیکھ سکتے ہو۔''

''میرے ذہن میں بھی پہلے یہی خیال آیا تھا سر!'' وکی ہک اسٹینڈ پر ایک اچٹتی سے نظر ڈالنے کے بعد امریکی سفیر سے مخاطب ہوتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا کیونکہ میرا تعلق ماؤری قبیلے سے ہے۔ ہم لوگوں کے سوچنے کا انداز دوسروں سے بالکل مختلف ہے۔ جلد ہی میرے دماغ کی بتی جل اٹھی اور میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ.....'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سنسنی خیز لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''گیسٹ کی کو..... باہر رہتے ہوئے بھی کمرے کے اندر پہنچایا جاسکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' سفیر نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''تم ایک ناممکن بات کررہے ہو مسٹر وکی!''

''ماؤری قبیلے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا سر!'' وکی فخر سے سینہ چوڑا کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جو کہا، اسے ثابت بھی کرسکتا ہوں۔''

''اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔'' مسز ریڈ جوش بھرے لہجے میں بولی۔ ''چلو، ثابت کرکے دکھاؤ۔''

سفیر نے مسز ریڈ کی طرف داری کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''وکی کوفن! تم نے ایک ناممکن کام کو ممکن بنانے کا دعویٰ کیا ہے لہٰذا بارِ ثبوت تمہارے کندھے پر ہے۔''

''اور بارِ تردید آپ کے کندھے پر مسٹر کونسلر!'' وکی بھلا کہاں چوکنے والا تھا۔ ''بولیں، منظور؟''

سفیر چٹانی لہجے میں بولا۔ ''ڈن!''

مسز ریڈ دلچسپی بھری نظر سے وکی کو تکنے لگی جیسے وہ کوئی مداری ہو اور انہیں ایک ناقابلِ یقین، حیرت انگیز کرتب دکھانے جارہا ہو۔ وہ بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ مسز فوسٹر کی گریہ وزاری مسلسل جاری تھی۔ وہ اپنی وہیل چیئر میں اس طرح پھنس کر بیٹھی ہوئی تھی کہ جیسے کبھی وہاں سے باہر نکلنے کا ارادہ نہ ہو۔ وہ کمرے میں موجود ضرور تھی مگر اپنی کمزور سماعت کے باعث ان کے بیچ ہونے والی گفتگو کو سن نہیں پارہی تھی۔ ویسے بھی اس کا سارا دھیان بہ آوازِ بلند رونے دھونے پر لگا ہوا تھا۔

''آپ سر کے ساتھ اس کمرے کے اندر موجود رہیں گی۔'' وکی نے مسز ریڈ کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں گیسٹ کی لے کر باہر جارہا ہوں۔ جب میں دستک دوں تو آپ دروازہ کھول دینا۔ میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا؟''

''میں سمجھ گئی وکی!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

امریکی سفیر پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''مسٹر وکی! آخر تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟''

''سر! میں آپ کو ایک ڈیمو دینے جارہا ہوں جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ قاتل، رچرڈ فوسٹر کو شوٹ کرنے کے بعد جب کمرے سے باہر نکلا تو اس نے دروازے کو باہر سے لاک کرنے کے بعد گیسٹ کی کو کمرے کے اندر کیسے پہنچایا ہوگا۔'' وکی نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ویسے بھی میں آپ سے کچھ چھپا کر نہیں کررہا ہوں اس لیے آپ کو پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ آپ یہ کاغذ مجھے دے دیں۔'' بات کے اختتام پر اس نے سفیر کے ہاتھ میں موجود کاغذ کی جانب اشارہ کیا۔

''یہ کوئی عام کاغذ نہیں، رچرڈ فوسٹر کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ ہے مسٹر وکی!'' سفیر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ ایک اہم دستاویز ہے۔''

''میں اس اہم مگر میری نظر میں بوگس دستاویز کی حفاظت آپ سے بڑھ کر کروں گا سر!'' وکی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں چند منٹ میں یہ دستاویز آپ کو واپس کردوں گا۔''

چند سیکنڈ کے تردد اور تذبذب کے بعد سفیر نے رچرڈ فوسٹر کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ وکی کے حوالے کردیا۔

وکی پرعزم انداز میں کمرے سے باہر نکلا۔ کمرے کے دروازے کو بند کرنے کے بعد اس نے کی ہول میں ''گیسٹ کی'' کو داخل کیا اور اس چابی کو مخصوص سمت میں گھمانے کے بعد کمرے کو باہر رہتے ہوئے لاک کردیا۔ اس کے ڈیمو کا پہلا حصہ مکمل ہوگیا۔ ایک گہری سانس لینے کے بعد وہ رکوع کے بل جھک کر ڈیمو کے دوسرے حصے پر کام کرنے لگا۔

اس نے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ رچرڈ فوسٹر کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کو دروازے کے زیریں حصے کے ساتھ جوڑ کر کوریڈور کے فرش پر بچھا دیا اور اس کے اوپر کمرے کی گیسٹ کی رکھ دی۔ تھوڑی دیر پہلے جب وہ کمرے کے اندر رچرڈ کی لاش، پستول اور گیسٹ کی کا بغور جائزہ لے رہا تھا تو اس نے دروازے کے زیریں حصے اور فرش کے درمیان کم و بیش آٹھ ملی میٹرز سائز کی درز دیکھی تھی۔

www.pklibrary.com

دروازے کی چوڑائی کے رخ پر دائیں سے بائیں موجود اس خلا پر نگاہ پڑتے ہی ایک سنسنی خیز خیال بجلی کے کوندے کے مانند اس کے ذہن میں لپکا تھا۔ اس وقت وہ اسی برقی خیال کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف تھا۔

رکوع کے بل جھکے جھکے وکی نے رچرڈ کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کو دھیرے سے سرکا کر اس خلا کے راستے کمرے کے اندر پہنچا دیا۔ اس کارروائی کے نتیجے میں اس کاغذ پر ''سوار'' گیسٹ کی بھی کمرے کے اندر پہنچ گئی۔ وکی نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کے سرے کو تھوڑا سا اوپر اٹھا کر ایک جھٹکے کے ساتھ باہر کھینچ لیا۔ نتیجتاً رچرڈ فوسٹر کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ تو باہر آ گیا لیکن اس کے اوپر رکھی ہوئی گیسٹ کی کمرے کے اندر ہی دروازے کے نزدیک گر گئی۔

وکی سیدھا کھڑا ہو گیا اور کمال اطمینان کے ساتھ اس نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ اگلے ہی لمحے مسز ریڈ نے دروازہ کھول دیا۔ وکی نے ان دونوں کی آنکھوں میں بے یقینی اور حیرت کے سمندر کو ٹھاٹھیں مارتے دیکھا۔

وکی نے رچرڈ فوسٹر کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کو امریکی سفیر کی جانب بڑھاتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ اسے چیک کر لیں۔ آپ نے یہ کاغذ جس حالت میں مجھے دیا تھا، میں اسی حالت میں لوٹا رہا ہوں اور امید کرتا ہوں.....'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سفیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی بات مکمل کر دی۔

''.....کہ رچرڈ فوسٹر نے خودکشی نہیں کی بلکہ کسی نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ اسے قتل کیا ہے۔ یہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ رچرڈ کی موت کو خودکشی کا رنگ دینے کے لیے قاتل نے کمرے کے دروازے کو باہر سے لاک کرنے کے بعد ''گیسٹ کی'' کو اندر کیسے پہنچایا ہوگا۔''

''تو اس کمینے ویلنٹائن نے رچرڈ کو قتل کیا ہے اور اس گھناؤنی سازش میں میری بھتیجی جین نے اس کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔'' مسز ریڈ نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''اب سمجھ میں آیا کہ گزشتہ روز جب چٹان کی چوٹی پر شارو نے خود کو شوٹ کیا تو جین بھاگتے ہوئے اس مقام پر کیوں پہنچی تھی جہاں کھڑے ہو کر شارو نے خودکشی کی تھی اور اس کا پسٹل ادھر ہی گر گیا تھا۔ جین نے اسی پسٹل کو حاصل کرنے کے لیے زمین پر گرنے کا ڈراما کیا تھا۔''

''کچھ بھی ہے.....'' امریکی سفیر نے بیزاری سے کہا۔ ''جین اور ویلنٹائن تو اس جزیرے سے بھاگ نکلے ہیں۔''

''ان کے بھاگ نکلنے سے قتل کا کیس خودکشی میں نہیں بدل جاتا مسٹر کونسلر!'' وکی نے اٹل لہجے میں کہا۔ ''حقیقت کھل کر آپ کے سامنے آ چکی ہے۔''

''حقیقت جو بھی ہو مگر میں ڈاکٹر کے جاری کردہ اس ڈیتھ سرٹیفکیٹ کو ہی درست اور حتمی مانتا ہوں کیونکہ میں کسی جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتا۔'' سفیر نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''میں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو بھی رچرڈ کی خودکشی کی اطلاع دے چکا ہوں۔ وہ لوگ رچرڈ کی لاش اور اس کی ماں مسز فوسٹر کو امریکا پہنچانے کے بندوبست میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ دونوں سے بھی میری درخواست ہے کہ اس معاملے میں اپنی ٹانگ اڑانے کی کوشش نہ کریں اور اس واقعے کو بھول جائیں۔ ہم سب کے لیے یہی بہتر ہوگا۔''

وکی اور مسز ریڈ نے تائیدی انداز میں گردن ہلا کر اپنے تعاون کا اظہار تو کر دیا لیکن وکی خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے سے باز نہ آیا۔

''ہم سب کے لیے بہتر نہیں مسٹر کونسلر! اس پالیسی میں تو سراسر آپ کی اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی بھلائی چھپی ہوئی ہے۔''

☆☆☆

آئندہ روز مسز ریڈ اور وکی کوفن گیسٹ ہاؤس میں بیٹھے رچرڈ کی موت، جین اور ویلنٹائن کے فرار اور اس کے مابعد اثرات پر سنجیدہ گفتگو کر رہے تھے کہ سفارت خانے سے ان کا بلاوا آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں امریکی سفیر کے کمرے میں اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

''آج سہ پہر میں ایک بحری جہاز لومبوک سے سنگاپور کے لیے روانہ ہوگا۔'' سفیر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں انہیں بتایا۔ ''میں نے رچرڈ کی لاش اور مسز فوسٹر کو اس جہاز سے سنگاپور بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہیں سنگاپور سے امریکا پہنچانے کا بندوبست اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے کر دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ بھی اسی جہاز سے سنگاپور چلے جاؤ۔ وہاں سے تمہیں اپنی منزل کے لیے آسانی سے کوئی بھی سواری مل جائے گی۔''

''میں ایک لاش کے ساتھ ہرگز ہرگز سفر نہیں کروں گی۔'' مسز ریڈ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

''اس صورت میں آپ کو اس جزیرے پر مزید کچھ دن رکنا پڑے گا۔'' سفیر نے معتدل انداز میں کہا۔ ''مسٹر وکی تو آج ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے لہٰذا بعد میں آپ کو اکیلے ہی سفر کرنا ہوگا جو کہ آپ کے لیے آسان کام نہیں ہوگا اور اس کا بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے کہ آج کے بعد

www.pklibrary.com

لومبوک سے اگلا جہاز کب روانہ ہوگا یا کہیں اور سے آنے والا جہاز کب لومبوک کے ساحل پر لنگر انداز ہوگا۔''

سفیر کی بات نے مسز ریڈ کو شش و پنج میں ڈال دیا۔ چند لمحات کی سوچ بچار کے بعد اس نے وکی سے پوچھا۔

''تمہاری منزل کون سی ہے؟''

''میں تو نگری نگری گھومنے والا ایک آزاد منش ہوں۔'' وکی نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''ایسے لوگوں کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔''

''جین میرے ساتھ تھی تو مجھے ایک سہارا ہوتا تھا۔'' مسز ریڈ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''اس کی موجودگی میں مجھے سفر کے دوران میں کبھی کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا مگر وہ تو سفیر کے اسسٹنٹ کے ساتھ کہیں بھاگ گئی ہے اور میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ میں تمہاری ذہانت اور معاملہ فہمی سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔ جب تمہارا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہے تو میرا ساتھ دو۔ اس میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔''

''میں آپ کا ساتھ دوں.....!'' وکی نے کھوجنے والی نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''مگر کس حیثیت سے؟''

''ظاہر ہے میں تمہیں کوئی چپراسی تو رکھوں گی نہیں۔'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اگر تم چاہو تو ایک مشیر کی حیثیت سے میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ تم میرے کاروبار کی نگرانی کرنا اور مجھے مفید مشورے بھی دینا۔ میں تمہیں اس جاب کا معقول معاوضہ دوں گی۔''

''مثلاً کتنا معاوضہ؟'' وکی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

مسز ریڈ نے اپنی بزنس ڈائری کھول کر کچھ حساب لگایا پھر ایک ہینڈسم اماؤنٹ کا ذکر کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''میں تمہیں ماہانہ اتنا دے سکتی ہوں۔''

''یہ پیشکش بُری نہیں ہے۔'' وکی نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر میری ایک شرط ہے۔''

''کیسی شرط؟'' مسز ریڈ نے استفسار کیا۔

''میں تین ماہ کی تنخواہ ایڈوانس میں لینا چاہوں گا۔'' وکی نے جواب دیا۔

''مجھے منظور ہے۔'' مسز ریڈ نے اپنی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر تم چاہو تو وہ جزاؤ طلائی صلیب بھی میرے ہاتھ بیچ سکتے ہو۔ اس سے شارو کی فیملی کا کچھ بھلا ہو جائے گا۔ اس طرح اس کی موت رائگاں نہیں جائے گی۔ بولو، کیا کہتے ہو؟''

''اس گولڈن کراس پر صرف مسز فوسٹر کا حق ہے۔'' وکی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس عورت نے اپنے جوان بیٹے کو کھویا ہے۔ یہ صلیب اس کا خون بہا نہیں بلکہ مسز فوسٹر کی ملکیت ہے۔ سمندری قزاقوں نے اسی کراس کے بدلے ان ماں بیٹے کی جان بخشی تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا جب میں نے اس طلائی صلیب کو اس کے ہاتھ پر رکھا تھا تو اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہوئی تھی اور اس نے یکایک رونا بند کر دیا تھا۔''

''ہاں۔ میں نے وہ منظر دیکھا تھا۔'' مسز ریڈ نے اثبات میں جواب دیا۔

امریکی سفیر تائیدی انداز میں بولا۔ ''اور میں نے بھی۔''

''میں نے وہ گولڈن کراس پچھلی رات مسز فوسٹر کے حوالے کر دیا تھا۔'' وکی نے بتایا پھر مسز ریڈ سے کہا۔ ''اگر آپ ابھی مجھے تین ماہ کی تنخواہ ایڈوانس میں دے دیں تو ہم دونوں سہ پہر والے شپ سے سنگاپور کے لیے روانہ ہو سکتے ہیں، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی مگر.....!''

وکی نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑی تو مسز ریڈ نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''مگر کیا؟''

''میں ماؤری قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں.....!'' وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ماؤری لوگ آدم خور ہوتے ہیں اور.....!''

''میں ایسی بکواس باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔'' وکی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھی۔

جواب میں وکی کی ہنسی نکل گئی۔ اس پر مسز ریڈ نے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔ امریکی سفیر بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے بعد کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے۔

''لومبوک'' کو چھوڑنے سے پہلے وکی نے مسز ریڈ سے حاصل ہونے والی تین ماہ کی تنخواہ کی خطیر رقم یہ کہہ کر شارو کی فیملی کو دے دی تھی کہ اس نے وہ طلائی جزاؤ صلیب کسی قدردان کے ہاتھ فروخت کر دی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ لوگ اپنا قرضہ ادا کر سکیں اور انہیں وکی کے احسان کا بوجھ بھی نہ اٹھانا پڑے۔ وکی کی اس ادا کو کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے۔

وکی نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ زندہ ہاتھی اگر ایک لاکھ کا ہو تو مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ زندگی میں شارو کی کوئی قیمت تھی یا نہیں، یہ الگ معاملہ ہے لیکن پس مُردن (مرنے کے بعد) وہ سوا لاکھ سے کہیں زیادہ کا ہو گیا تھا۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

مرو کے ایک خوشحال گھرانے میں سعید نامی بچے نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے باپ اسماعیل کی دولت اور اثرات کی فراوانی ہر طرف محسوس کی۔ باپ کی شفقت اور محبت نے ان کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے کئی خدمت گار متعین کر دیے

ابو عثمان حیری

ضیا تسنیم بلگرامی

نازونعم میں آنکھ کھولنے والا مدتوں آلام دنیا سے لاعلم رہا۔ اس کے اردگرد ایک ایسا حصار کھینچ دیا گیا تھا کہ وہ باہر کی دنیا سے بالکل ناواقف رہا۔ فاقہ، دکھ، بھوک، بیماری، موت، معاشرے کی اونچ نیچ، آقا اور غلام جیسی چیز سے وہ ایک عرصے تک غافل اور لاعلم رہا۔ باپ کو یہ فکر تھی کہ بچہ جوان ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ دے گا اور خود بچے کو بڑا ہو کر یہ دکھ ستانے لگا کہ آسودگی اور سکون دولت کی فراوانی میں نہیں مل رہے۔ بالآخر زندگی کا یہ سفر ایک مخصوص سمت میں رواں دواں ہو گیا۔

ایک ایک قطرہ اور ہر گزرتا لمحہ انسان کی زندگی کے حالات

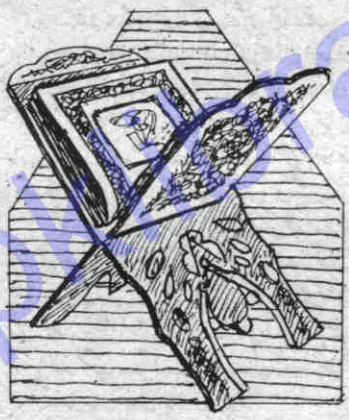

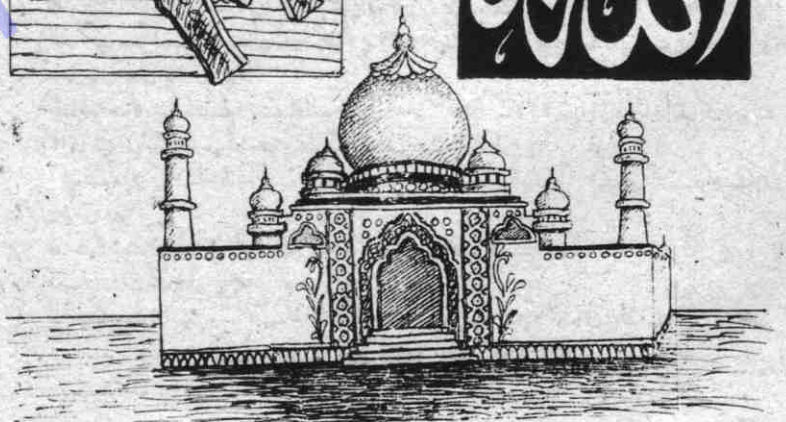

www.pklibrary.com

تھے۔ جہاں بھی جاتے، خدمت گار ساتھ ساتھ رہتے۔ سعید کا لباس ایسا ہوتا جیسے وہ کہیں کے شہزادے ہوں۔ ان کے والد اسماعیل دن رات ان کی فکر، ان کے خیال میں رہتے۔ ان کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو خدمت گار ان کو مدرسے چھوڑنے جایا کرتے۔ مدرسے جانے کا منظر بھی بڑا عجیب اور اثر انگیز ہوا کرتا تھا۔ دو خدمت گار دائیں جانب اور دو بائیں طرف۔ جسم پر اس عہد کے قیمتی کپڑے کا لباس، سر پر زربفت کا عمامہ اور ہاتھ میں سونے کی دوات۔ دوسرے لڑکے آپ کو اس کروفر سے مدرسے میں آتے جاتے دیکھتے تو رشک و حسد سے تڑپ جاتے یا پھر مرعوب ہو کر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے۔

گھر میں ناز و نعم سے پرورش پانے والا یہ بچہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا، اس کی سوچ اور فکر میں دکھ درد، پریشانی اور آزردگی کا کہیں نام و نشان تک نہ پایا جاتا تھا۔ اس کو نہیں معلوم تھا کہ فاقے کیا ہوتے ہیں، اس کو کچھ پتا نہ تھا کہ افلاس کسے کہتے ہیں، اسے ذرا بھی علم نہ تھا کہ احتیاج کیا ہوتی ہے اور اسے کچھ خبر نہ تھی کہ مجبوری کس شے کا نام ہے۔ وہ تو بس یہ جانتا تھا کہ اس کو جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہوئی، فراہم کر دی گئی۔ اس نے جس چیز کی خواہش کی، حاضر کر دی گئی۔ ماں باپ اپنے اس بچے کو غریبوں اور پریشان حالوں سے دور دور رکھتے تھے۔ خاندان میں کوئی بیمار پڑ جاتا تو سعید کو اس کے پاس نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ اس حال میں سعید نے اپنا بچپن اور پھر لڑکپن گزار دیا اور نوجوانی میں قدم رکھا۔ ان دنوں مرو، ترمذ، خراسان، بخارا، نیشاپور اور رے وغیرہ میں صوفیوں کا بڑا چرچا تھا اور ان صوفیوں کے اپنے عہد کے ماحول اور معاشرے پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ اسماعیل نے ان تارک الدنیا لوگوں کو جس حال میں دیکھا تھا، اس سے انہیں بڑی عبرت ہوتی تھی۔ معمولی غذا اور انتہائی کم لباس پر گزر بسر کرنے والے صوفی دنیا داروں کی نظر میں یا تو کوئی بہت اونچی شے ہوتے تھے یا پھر محض دیوانے اور خبطی لیکن اس عہد کی اکثریت نے ان باخدا اور مصفا انسانوں کو اپنے دلوں میں جگہ دے رکھی تھی۔ سعید کو اس ماحول اور اس معاشرے میں پال پوس کر بڑا کیا جا رہا تھا۔ چار خدمت گار جو ہر وقت سائے کی طرح ان کو اپنے حصار میں لیے رہتے تھے، انہیں ہدایت تھی کہ سعید کو ایسے راستوں سے نہ گزارا جائے جہاں کے مناظر اس کو سوچنے پر مجبور کر دیں۔ راستے میں کسی ایسے ہجوم سے دور رکھا جائے جو جنازے یا ایسے ہی کسی اور ایسے سے متعلق ہو۔ خدمت گار اس پر سختی سے عمل پیرا تھے۔

سعید ان حالات اور ماحول میں جوان ہو گئے۔ اب ان میں جستجو سی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ دنیا اور انسانوں کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ طرح طرح کے سوالات دل میں پیدا ہونے لگے تھے۔ یہ دنیا کیا ہے؟ اس میں انسان کہاں سے آ گیا؟ درخت، سبزہ، زمین، آسمان، جانور، یہ کیا ہیں اور کہاں سے نمودار ہو جاتے ہیں؟ کتابوں میں اللہ کا ذکر آیا تھا۔ احادیث، قرآن اور تفسیر سے بھی بہت کچھ معلوم ہوا تھا لیکن عملی دنیا سے دوری نے سعید کو ناتجربے کار اور دنیا کو پیچیدہ سا معما بنا رکھا تھا۔ بہت سی باتیں سمجھ ہی میں نہیں آتی تھیں۔

انہی حالات میں وہ اپنے چاروں خدمت گاروں کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ اس دن انہوں نے جو راستہ اختیار کیا تھا، وہ روزمرہ کے راستوں سے جدا تھا۔ یہیں کہیں قریب ہی کسگروں کی بستی تھی۔ کسی کسگر نے اپنے بیمار اور ناکارہ گدھے کو مرنے کے لیے ایک گڑھے میں ڈال دیا تھا۔ گدھا زخمی بھی تھا اور اس میں اتنی طاقت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ گڑھے سے نکل سکتا۔ کوّوں نے اس زخمی گدھے پر دندانِ آز تیز کر رکھے تھے اور اس کے زخموں کو نوچ نوچ کر گہرا کر دیا تھا۔ آپ نے گدھے کو اس حال میں دیکھا تو پریشان ہو گئے اور اپنے خدمت گاروں سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ گدھا یہاں کیوں پڑا ہوا ہے؟''

ایک خدمت گار نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ ''گدھا کسگروں کے کام کا نہیں رہا اور شاید کہیں کسی وجہ سے زخمی ہو گیا ہو گا اسی لیے اس کے مالک نے اسے مرنے کے لیے اس گڑھے میں ڈال دیا۔''

آپ نے کوّوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اور یہ کوّے! یہ کوّے کیا کر رہے ہیں جس سے گدھے کی پشت سے خون جاری ہے؟''

خدمت گار نے جواب دیا۔ ''یہ کوّے زخم کو نوچ نوچ کر اپنی بھوک مٹا رہے ہیں۔''

آپ کو بڑی حیرت ہوئی، پوچھا۔ ''کوّے زخم کو کیوں نوچ رہے ہیں؟''

خدمت گار نے جواب دیا۔ ''کوّے گدھے کا گوشت کھا رہے ہیں کیونکہ یہ گوشت ان کی غذا ہے۔''

www.pklibrary.com

آپ کو اور جستجو ہوئی۔ کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہ گدھے کا سارا گوشت کھا جائیں گے؟''

دوسرے خدمت گاروں نے اپنے ساتھی کو منع کیا کہ وہ آقا زادے سے ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے لیکن خدمت گار باز نہیں آیا اور سعید کو جواب دیا۔ ''ہاں، یہ اس وقت تک گدھے کو نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ یہ مر نہیں جائے گا۔''

آپ کو اور جستجو ہوئی، پوچھا۔ ''گدھا مر جائے گا؟ کیا مطلب؟ یہ کس طرح مر جائے گا؟ مر جانے سے تیرا مطلب؟''

اب خدمت گار بھی پریشانی محسوس کرنے لگا۔ جواب دیا۔ ''ہر جاندار ایک نہ ایک دن مر جائے گا یعنی بے حس و حرکت ہو جائے گا۔ جاندار کی روح جو اس کو حرکت میں رکھتی ہے، وہ جسم سے نکل جائے گی اور اس وقت جاندار اور پتھر میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ جب تک گدھے میں جان ہے، روح ہے، اس کو کوّوں کی چونچ اور پنجوں سے اذیت بھی محسوس ہو رہی ہوگی لیکن جب جان ہی نہیں رہے گی تو دکھ اور اذیت کا احساس بھی جاتا رہے گا۔''

آپ نے اپنے اندر ایک عجیب سی ہیجانی کیفیت محسوس کی۔ بے اختیار گڑھے میں اتر گئے اور اپنی دستار سر سے اتار کر گدھے کے زخم پر باندھ دی۔ کوّے اِدھر اُدھر کائیں کائیں کر کے اڑنے لگے۔ خدمت گاروں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''آقا زادے! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ باہر آجائیے۔''

آپ نے اپنے خدمت گاروں کو بھی وہیں بلا لیا اور کہا۔ ''ادھر آجاؤ میرے پاس اور میری مدد کرو۔''

خدمت گاروں کی کیا مجال تھی کہ وہ ان کے پاس نہ جاتے۔ آپ نے کہا۔ ''تم لوگ میری دستار کو اس کے زخموں پر اچھی طرح باندھ دو تاکہ کوّے اسے اور پریشان نہ کریں۔''

خدمت گاروں نے حکم کی تعمیل کی اور گدھے کے زخم پر دستار باندھ دی۔ اس کے بعد آپ نے اپنی قبا اتار کر گدھے کے جسم پر ڈال دی۔ اس طرح گدھا مکھیوں سے بھی محفوظ ہو گیا۔ اس دوران گدھا بالکل خاموش پڑا رہا۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ اب سکون سے تھا اور آپ کا شکر گزار تھا۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے اپنے خدمت گاروں سے کہا۔ ''مجھے کسگروں کی بستی میں لے چلو۔ میں گدھے کے مالک سے بات کروں گا۔''

خدمت گاروں کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ وہ آپ کو کسگروں کی بستی میں لے گئے اور وہاں گدھے کے مالک کو تلاش کر لیا۔ آپ نے اس سے کہا۔ ''تو نے اپنے گدھے کو گڑھے میں کیوں ڈلوایا ہے؟''

مالک نے جواب دیا۔ ''وہ میرے لیے بیکار ہو چکا تھا۔ میرے گھر میں اتنی جگہ کہاں کہ میں اسے گھر میں رکھتا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص! تو جانداروں پر رحم کر، اللہ عرش بریں پر تجھ پر رحم فرمائے گا۔''

آپ نے یہ بات کچھ ایسے پیرائے میں کہی تھی کہ کسگر تڑپ گیا اور سحر زدہ انسان کی طرح آپ کی بات مان لی اور بے چون و چرا گدھے کو اپنے گھر لے آیا۔ جب دستار کو گدھے کے زخموں پر اور قبا کو اس کے جسم پر دیکھا تو اور زیادہ متاثر ہوا۔

اس دن آپ بہت زیادہ اداس ہو چکے تھے۔ راستے بھر سوچ میں ڈوبے رہے۔ خدمت گار بہت خوفزدہ تھے کہ اب ان کی خیر نہیں۔ گھر پر جب یہ ساری باتیں سعید کے باپ اسماعیل کو معلوم ہوں گی تو وہ چاروں خدمت گاروں کو نکال باہر کریں گے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہیں اور کیا کریں۔

خدمت گاروں نے آپ کی خوشامد کی اور کہا۔ ''آقا زادے! اگر آپ اسی طرح خاموش رہے تو ہم سب کی شامت آجائے گی۔ خدا کے لیے روز کی طرح رہیے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرے دل و دماغ پر پہاڑ کا بوجھ رکھا ہوا ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے، اگر میں اس کو بھلانا چاہوں تب بھی نہیں بھلا سکتا۔''

رات کو باپ کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ آج سعید نے غیر معمولی سکوت اختیار کر رکھا ہے۔ باپ نے بیٹے کو اپنے پاس بلایا اور کسی تمہید کے بغیر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ''بیٹے سعید! کیا بات ہے، آج تو ہر روز سے کچھ زیادہ ہی خاموش اور غمگین نظر آرہا ہے؟''

سعید نے جواب دیا۔ ''کوئی خاص بات نہیں بابا جان! بس یونہی آج خاموش رہنے کو جی چاہا، چپ ہو گیا۔''

باپ نے جواب سے محسوس کر لیا تھا کہ بیٹا کچھ چھپا رہا ہے۔ اب اسماعیل نے باہر جا کر خدمت گاروں کو پکڑ لیا اور

www.pklibrary.com

پوچھا۔ ''دیکھو، تم لوگ مجھ کو سچ سچ بتاؤ کہ آج سعید خاموش کیوں ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ بہت زیادہ اداس اور غمگین ہے۔ آخر کیوں؟ کوئی خاص وجہ؟''

خدمت گار کانپ گئے۔ ان کی جان نکل گئی۔ آخر ایک خدمت گار نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا اور کہا۔ ''ہم نے تو اس کو منع کیا تھا کہ کنگروں کی طرف سے نہ چل لیکن یہ نہیں مانا۔ اس کے علاوہ جب آقا زادے نے سوالات کرنا شروع کر دیے تو میں نے اس وقت بھی منع کیا تھا کہ ایسا مت کرو لیکن میرا یہ ساتھی مانا ہی نہیں۔''

اسماعیل نے ان سب کو بہت ڈانٹا اور کہا۔ ''غلطی کسی ایک کی نہیں، سب کی ہے۔ میں نے تو تم سب کو منع کر رکھا تھا مگر تم مانے نہیں اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔''

خدمت گار لاجواب ہو چکے تھے۔ اسماعیل نے اندر جا کر بیٹے کو بہت سمجھایا اور کہا۔ ''بیٹے! میں جانتا ہوں کہ آج تو کیوں اداس ہے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔''

سعید نے کہا۔ ''باوا جان! ایک سوال میں آپ سے بھی کروں گا۔ امید ہے کہ آپ اس کا صحیح جواب دیں گے۔''

باپ نے جواب دیا۔ ''بالکل، میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔ کون سا سوال ہے تیرا، کر سوال۔''

بیٹے نے پوچھا۔ ''کیا یہ سب آپ کو معلوم ہے کہ ہر جاندار کو ایک نہ ایک دن مر جانا ہے؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، ایک میں ہی نہیں، پورا زمانہ یہ جانتا ہے کہ یہ دنیا اور یہاں کی ہر چیز فانی ہے۔ ہم سب ایک نہ ایک دن مر جائیں گے، فنا ہو جائیں گے۔''

بیٹے نے افسوس کا اظہار کیا۔ ''اور آپ پھر بھی دولت کا انبار لگائے چلے جا رہے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کو یہاں ہمیشہ نہیں رہنا ہے۔''

باپ نے جواب دیا۔ ''بیٹے! فضول باتوں میں وقت ضائع مت کر۔ اس دنیا میں چند ماہ، چند سال رہ یا سو سال، یہاں زندگی گزارنے کے لیے وسائل ضروری ہیں اور اگر انسان کے پاس مال و زر ہو تو اس کے ہوتے ہوئے کسی اور وسیلے کی ضرورت ہی نہیں۔''

بیٹے نے کہا۔ ''آپ کی بات اپنی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ دنیا فانی ہے۔ ہم سب فانی ہیں پھر ہم یہاں مسافر کی طرح کیوں نہیں رہتے؟ یہ ہوس، یہ طمع، یہ حل من مزید کیوں؟'' بیٹا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور باپ کو اور زیادہ فکر لگ گئی۔

باپ نے سوچا کہ جذباتی بیٹے سے اس وقت بات چیت فضول ہے۔ بیٹے سے کہا۔ ''بیٹے سعید! اس وقت تو رات ہو چکی ہے، اب آرام کرو اور فضول باتوں کو سوچ سوچ کر ہلکان اور پریشان مت ہو۔ اللہ نے چاہا تو میں کل صبح پہلا کام یہ کروں گا کہ تیرے دل و دماغ سے فضول وسوسوں کو دور کروں۔''

سعید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جو کچھ دیکھا تھا، اس کا اثر دل و دماغ پر شدید سے شدید ہوتا چلا گیا۔ باپ چلا گیا اور آپ زندگی اور دنیا کے بارے میں غور کرتے رہے۔ وہ جتنا غور کرتے، ان کا دل دنیا سے بیزار ہوتا چلا جاتا۔ وہ اس رات کو چپ چاپ خدمت گاروں کے پاس چلے گئے اور ان سے کہا۔ ''آج مجھے نیند نہیں آ رہی۔ خدا کے لیے تم لوگ میری مدد کرو۔''

تین خدمت گار تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے ہٹ گئے۔ ہاں وہ خدمت گار جس نے دن میں بھی ان سے تعاون کیا تھا، دوبارہ تیار ہو گیا۔ بولا۔ ''ہاں تو آپ جو چاہیں مجھ سے پوچھیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کے ہر سوال کا سیدھا سچا جواب دوں۔''

سعید نے پوچھا۔ ''تم مجھے یہ تو بتاؤ کہ جب انسان زندگی اور دنیا کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے تو وہ کیا کرتا ہے؟''

خدمت گار نے جواب دیا۔ ''وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا کو چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے رب کی حمد و ثنا میں مشغول ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا سے بھاگتا ہے اور دنیا اس کا پیچھا کرتی ہے۔ وہ دنیا کے وسیلوں اور مال و دولت سے نفرت کرتا ہے۔''

سعید کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، پوچھا۔ ''ایسے آدمی کہاں رہتے ہیں اور کیا کہلاتے ہیں؟''

خدمت گار نے جواب دیا۔ ''یہ اللہ والے صوفی کہلاتے ہیں اور خراسان، نیشاپور، رے، شام، بغداد اور کرمان غرض کہ بہت سے شہروں میں ملیں گے۔''

www.pklibrary.com

سعید ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گئے۔ ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہو رہے تھے اور آپ کے پاس ان کے جواب نہیں تھے۔ آخر خدمت گار سے پوچھا۔ ''دو چار کے نام تو بتا تا کہ میں ان سے ملنے کی کوشش کروں۔''

خدمت گار نے جواب دیا۔ ''نیشاپور کے محلہ حیرہ میں ابو حفص حدادؒ ہیں۔ بغداد میں جنیدی بغدادیؒ ہیں، کرمان میں شاہ شجاعؒ۔ یہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن حکومت کو چھوڑ دیا اور درویشی اختیار کر لی۔ رے میں یوسف بن حسین ہیں۔ غرض کہ کس کس کا نام لیا جائے۔''

سعید نے خدمت گار سے درخواست کی۔ ''میں مذکورہ شہروں اور وہاں تک جانے کے راستوں سے واقف نہیں ہوں۔ تُو ان میں سے کسی ایک شہر یا صوفی کے پاس تک پہنچا دے۔ میں زندگی بھر تیرا شکر گزار رہوں گا۔''

خدمت گار نے پوچھا۔ ''پھر بھی آپ کسی کا نام تو لیں۔ آپ کہاں اور کس کے پاس جانا چاہتے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''فی الحال شاہ شجاع کرمانی کے پاس کیونکہ میں ان سے پوچھوں گا کہ انہوں نے حکومت کیوں چھوڑ دی اور درویشی کیوں اختیار کی؟''

خدمت گار نے کہا۔ ''میں آپ کی یہ خواہش پوری کر دوں گا لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کی مجھے بدترین سزا بھگتنا پڑے گی۔ آپ کے نیک جذبوں کا خیال کرتے ہوئے میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ میرے کسی کام سے اللہ کے بندے ناراض ہوتے ہیں تو ہوں۔ میں تو اللہ کی خوشنودی کا طالب ہوں۔''

آپ یہ باتیں کر کے اپنے کمرے میں واپس چلے گئے۔ ہوشیار باپ اپنے بیٹے کی ذہنی اور فکری تبدیلیوں سے ذرا بھی خوش نہیں تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو کاروبارِ دنیا میں الجھانے اور پھنسانے کا ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے پرانے خدمت گاروں کو رخصت کر دیا اور ان کی جگہ نئے ملازم رکھ لیے۔ ان خدمت گاروں کو بطورِ خاص یہ ہدایت کی گئی کہ وہ بیٹے سعید کی خفیہ حرکات و سکنات پر خاص نظر رکھیں گے اور بیٹے کو کسی وقت بھی اِدھر اُدھر گھر والوں کو بتائے بغیر نہیں لے جائیں گے۔

اس کے علاوہ باپ نے مرو کے شرقی حصے کے ایک تاجر کی بیٹی سے آپ کا رشتہ طے کر دیا اور یہ رشتہ اتنی عجلت اور رازداری سے طے کیا گیا تھا کہ کسی اور کو اس کی بھنک تک نہیں پڑی پھر ایک دن سعید کو دولہا بنا دیا گیا۔ وہ انکار ہی کرتے رہے کہ ابھی نہیں۔ میں ابھی شادی نہیں کروں گا مگر ان کی سنتا کون تھا چنانچہ ان کو دولہا بنا دیا گیا۔ دولہا بنائے جانے کے بعد اظہارِ خوشی میں تالیاں بجائی گئیں۔

آپ کی شادی ہو گئی۔ خوبصورت اور نوجوان بیوی نے آپ سے پہلا سوال یہ کیا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ آپ دنیا کو پسند نہیں کرتے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''یہ بات نہیں ہے۔ کسی نے آپ کو پوری بات نہیں بتائی۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ جب پہلی بار مجھے یہ معلوم ہوا کہ مرنا کیا چیز ہے اور بیماری، آزاری اور فکر فاقے کی اذیت کسے کہتے ہیں تو واقعی میں پریشان ہو گیا۔ مجھے دنیا اچھی نہیں لگی۔''

بیوی نے کہا۔ ''آپ میری طرف دیکھیے اور بتائیے کہ اب دنیا کیسی لگتی ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تُو اچھی لگ رہی ہے لیکن دنیا کے بارے میں میری رائے نہیں بدلی۔''

بیوی کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا، بولی۔ ''تب تو مجھے آپ سے ڈرنا چاہیے، ہوشیار رہنا چاہیے۔''

''کیوں؟'' آپ نے پوچھا۔ ''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''جس شخص کو دنیا بُری لگ رہی ہو، پتا نہیں وہ دنیا کو کب خیرباد کہہ دے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''مت ڈرو۔ اگر میں دنیا کو ترک بھی کروں گا تو تجھ کو اس وقت بھی اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ تجھ کو اس وقت بھی نہیں چھوڑوں گا۔''

بیوی بظاہر تو مطمئن ہو گئی مگر اندر ایک بے چینی، ایک اضطراب تھا جو کسی طور ٹھہرتا ہی نہ تھا۔

شادی کے بعد آپ کی طبیعت میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا اور گھر میں ایک بچی بھی پیدا ہو گئی۔ باپ اپنی تدبیر میں کامیاب ہو چکا تھا اور سعید سب کو بہت خوش نظر آتے تھے لیکن بیٹی کی پیدائش کے بعد آپ کی طبیعت اور مزاج میں پھر تغیر پیدا ہو گیا۔ نومولود کی طبیعت خراب ہو گئی تو آپ کو اس کی فکر لاحق ہو گئی۔ آپ کو اپنی بیٹی سے شدید محبت تھی۔ اسے دکھ اور اذیت میں

www.pklibrary.com

دیکھ کر خود بھی دکھ اور اذیت میں مبتلا ہو گئے۔ اس عالم میں ان کے دل میں کوئی کہہ رہا تھا۔ ''اب دوسروں کی طرح تُو بھی غافل اور بے پروا ہو جائے گا۔''

آپ کو دنیا پھر بُری لگنے لگی۔ بیوی نے آپ کی خاموشی اور اداسی کو محسوس کر لیا اور پوچھا۔ ''یہ آپ پھر چپ چاپ اور اداس رہنے لگے۔ آخر کیوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''دنیا اور دنیا کی ہر شے کتنی عارضی اور ناپائیدار ہے پھر میں دوام کو کیوں نہ تلاش کروں۔ یہ عارضی اور فانی خوشیاں، میں ان میں کب تک الجھا اور پھنسا رہوں گا۔''

بیوی روہانسی ہو گئی، بولی۔ ''مت سوچیے اس طرح۔ اس سوچ میں میرا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں یہ سب سوچتا نہیں ہوں بلکہ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرا پورا وجود ہی یہ سوچ بن چکا ہے۔ میں اس سوچ کے حصار سے نکلنا بھی چاہوں تو نہیں نکل سکتا۔''

بیوی کو اپنے شوہر کی ان باتوں میں اپنا سب کچھ برباد ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے سسر کو مطلع کیا کہ وہ اس سوچ کا کوئی حل سوچیں۔

سسر نے جواب دیا۔ ''میں تو اس کا علاج کر چکا ہوں۔ اب سارا کام تیرا ہے، تیری بچی کا ہے جس سے میرا بیٹا بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔''

بیوی نے اس تجویز پر عمل کیا اور بیٹی کو اپنے شوہر کے حوالے کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''بیٹی آپ کو بہت زیادہ چاہتی ہے اس لیے اس کی تربیت اور نشوونما آپ کے ذمے کرتی ہوں۔ اب آپ ہی اسے سنبھالیں۔''

آپ نے بیٹی کو بخوشی قبول کر لیا اور اس کو اپنے پاس رکھنے لگے۔ اب وہ سوتی بھی آپ ہی کے پاس تھی۔

باپ نے اپنے بیٹے کے لیے کچھ اور مصروفیات بھی سوچ لی تھیں۔ مرو کے گرد و نواح میں ان کی زمینیں بیکار پڑی تھیں۔ ان پر صحیح کام نہیں ہو رہا تھا۔ یہ زمینیں جن کے سپرد کی گئی تھیں، وہ بے پروائی اور بددیانتی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ باپ نے ایک دن اپنے بیٹے اور بہو کو اپنے سامنے بٹھا کر سمجھانا شروع کیا۔ ''بیٹے سعید! اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرے اعصاب آہستہ آہستہ جواب دے رہے ہیں اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ دو چار سال میں اس لائق نہیں رہوں گا کہ اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کر سکوں۔ اب میری ذمے داریاں تیری ذمے داریاں بن جائیں گی اس لیے مجھ سے تربیت حاصل کرتا کہ آئندہ کسی پریشانی سے سابقہ نہ پڑے۔''

بیٹے نے بادلِ ناخواستہ جواب دیا۔ ''اگر آپ فرماتے ہیں اور آپ کی یہ خواہش ہے کہ میں آپ کی ذمے داریاں سنبھال لوں تو میں حاضر ہوں۔''

باپ نے اٹھ کر آپ کو سینے سے لگا لیا اور دیر تک اسی طرح سینے سے لگائے رہے اور جب سینے سے الگ کیا تو اپنی بہو سے کہا۔ ''بہو! میں نے اپنا کام کر دیا، اب تُو سنبھال اسے اور اس کو زمینوں پر بھیج دیا کر۔''

بہو بے حد خوش تھی کہ اس کا شوہر اس کے اختیار میں دیا جا رہا ہے، بولی۔ ''باوا جان! آپ فکر نہ کریں۔ میں انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دوں گی۔''

اس کے بعد آپ باقاعدہ گھر سے اپنی زمینوں پر جانے لگے لیکن یہاں بھی انہیں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جس سے آپ کے اندر دبی ہوئی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ حکومت کے کارندوں کی زیادتیاں اور زبردستوں کی زیردستوں پر سختیاں ان کو بے چین اور مضطرب کرتی رہیں۔ اسی دوران انہیں اپنا پرانا خدمت گار مل گیا۔ وہ خدمت گار جس کو نکال دیا گیا تھا۔ آپ نے اس کو اپنے گلے لگا لیا اور پوچھا۔ ''تُو کہاں چلا گیا تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں چلا نہیں گیا تھا بلکہ چلتا کر دیا گیا تھا۔''

آپ نے اس سے مدد چاہی۔ ''میں آج پہلے سے زیادہ پریشان ہوں۔ میرا سکون چھن چکا ہے اور اس کی جگہ بے چینی اور بے قراری نے لے لی ہے۔ میں شاہ شجاع کرمانی سے ملنا چاہتا ہوں، یہ جاننے کے لیے کہ انہوں نے حکومت کیوں چھوڑی اور درویشی کیوں اختیار کی۔ میں ان سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ فقر میں کیسی لذت ہے اور درویشی میں کس قسم کا سکون ہے۔ مجھے ان کے پاس لے چل۔''

خدمت گار نے جواب دیا۔ ''آقا زادے! یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن اب آپ شادی شدہ ہیں اور ایک بچی کے

www.pklibrary.com

باپ بھی ہیں۔ آپ کے پیچھے ان کا کیا ہوگا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں ان دونوں کو چھوڑ کر کہاں جا رہا ہوں۔ میں تو اپنی بے چینی اور بے سکونی کے علاج کی خاطر ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

خدمت گار کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہنے لگا۔ ''آج کل شاہ شجاع قریب کی ایک بستی میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور شاید دو چار دن میں نیشاپور اپنے ہم عصر صوفی ابوحفص حداد کے پاس چلے جائیں گے۔ آپ چاہیں تو ان سے مل سکتے ہیں۔''

آپ کی بے قراری عروج کو پہنچ گئی، کہنے لگے۔ ''مجھے اسی وقت ان کے پاس لے چل۔''

خدمت گار نے جواب دیا۔ ''اس وقت نہیں، کل صبح آپ یہیں اسی جگہ مل جائیے گا پھر یہیں سے شاہ شجاع کے پاس چلے چلیں گے۔''

اس روز تو آپ اپنے گھر چلے گئے لیکن اب آپ کی حالت میں نمایاں تبدیلی آ چکی تھی۔ آپ کی بے چینی اور اضطراب میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو چکا تھا۔ آپ اپنی بیوی اور بچی میں پہلے جیسی کشش نہیں محسوس کر رہے تھے۔ ماں باپ کی محبت اور عقیدت و احترام اپنی جگہ لیکن شاہ شجاع کی کشش انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

شام ہوئی اور رات آ گئی۔ نیند کا کوسوں پتا نہ تھا۔ بیوی کو فکر تھی کہ ان کے شوہر کو آج کیا ہو گیا ہے لیکن آپ نے اسے سلا دیا۔ وہ رات بھر اپنی حویلی میں اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ رات کے پچھلے پہر وہ بیوی اور بچی کے سرہانے کھڑے ہو کر تادیر ان کی صورت دیکھتے رہے اور صبح ہونے سے پہلے ہی ان سب کو چھوڑ کر خدمت گار کے پاس چلے گئے۔ خدمت گار نے آپ کی آنکھوں سے اندازہ لگا لیا کہ آپ رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں۔ پوچھا۔ ''کیا رات بھر آپ سوئے نہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، کیونکہ پھولوں کے بستر میرے لیے کانٹوں کے بستر بن گئے ہیں۔ لوگ جن چیزوں کو آرام اور آسائش کا ذریعہ سمجھتے ہیں، میرے لیے وہی چیزیں بے سکونی اور بے چینی کا سبب بن گئی ہیں۔ میں اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔''

خدمت گار کو آپ پر رحم آ رہا تھا۔ وہ آپ کو اسی وقت شاہ شجاع کے پاس لے گیا۔ وہاں شاہ شجاع کے عقیدت مندوں نے ایک حلقہ بنا رکھا تھا۔ خدمت گار نے اس حلقے کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ وہاں چلے جائیں، شاہ شجاع سے ملاقات ہو جائے گی۔''

اس وقت آپ پر ایک لرزہ، ایک خوف سا طاری تھا۔ آپ ہچکچاتے ہوئے اس حلقے میں پہنچے۔ حلقے میں سے ایک شخص باہر نکلا اور آپ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ پوچھا۔ ''کیا آپ مرو سے آئے ہیں اور آپ کا نام سعید ہے؟''

آپ کا خوف دور ہو گیا اور جواب دیا۔ ''ہاں، میں سعید ہوں اور مرو سے آیا ہوں۔''

اس شخص نے کہا۔ ''تب پھر آپ میرے ساتھ آئیں۔ پیر مرشد آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ شخص آپ کو شاہ شجاع کے پاس لے گیا۔ شاہ شجاع انہیں دیکھ کر مسکرانے لگے، فرمایا۔ ''یہاں آنے کے لیے بہت بے چین تھے؟''

آپ کو حیرت تھی کہ ان کی بے چینی کا علم شاہ شجاع کو کیونکر ہو گیا۔ آپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

شاہ شجاع نے کہا۔ ''دیکھو سعید! جو کچھ تو نے اب تک دیکھا ہے اور جس ماحول اور معاشرے سے چل کر تو یہاں تک آیا ہے، وہ ہماری اس دنیا سے مختلف ہے، بالکل مختلف۔ یہاں روح کا سکون مگر جسم کی بے سکونی کی جملہ بے اسبابیاں موجود ہیں۔ تو ایک بار پھر یہ سوچ لے کہ کیا تو ہمارے ساتھ رہ سکتا ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں اپنے پُر آسائش ماحول اور آرام دہ گھر میں ایک دن بھی چین اور سکون سے نہیں رہ سکا ہوں۔ میری روح کسی گم گشتہ شے کی تلاش میں مضطرب اور پریشان ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر میں کچھ دن اور اس ماحول یا معاشرے میں رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔''

شاہ شجاع نے فرمایا۔ ''پھر تیری مرضی۔۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔''

آپ کو محسوس ہوا کہ شاہ شجاع ان سے کچھ چھپا رہے ہیں اور انہیں جو ایک خاص قسم کی اجازت سی مل گئی تھی، اس میں والہانہ پن نہیں تھا بلکہ بدرجہ مجبوری انہیں اجازت دی جا رہی تھی۔ آپ نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ ''پیر مرشد! کیا آپ میرے یہاں آنے سے خوش نہیں ہیں؟''

www.pklibrary.com

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں تجھ کو اپنے حلقے میں دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ کیا تُو حقوق العباد پورے کر کے یہاں آیا ہے؟''

آپ نے پوچھا۔ ''حقوق العباد! کیسے حقوق العباد؟ کون سے حقوق العباد؟''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''تجھ پر تیرے ماں باپ کا حق ہے۔ تجھ پر تیری بیوی اور بچی کا حق ہے۔ کیا تُو یہاں میرے حلقے میں بیٹھ کر ان کے حقوق ادا کر سکتا ہے؟''

آپ ایک بار پھر پریشان ہو گئے۔ کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں میں اس ماحول اور معاشرے کا آدمی ہی نہیں۔ میرے باپ کی حویلی ہے اور وہاں ضروریاتِ زندگی کی ہر شے موجود ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری حویلی اور میرے گھر میں اتنا کچھ موجود ہے کہ میری عدم موجودگی کا وہاں کے مکینوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''

شاہ شجاع نے فرمایا۔ ''دیکھ سعید! مجھے تیری بابت عرصے سے بتایا جا رہا ہے اور میں یہاں تیرا انتظار کر رہا تھا لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تیری ایک بیوی ہے، ایک بچی ہے تو میں کانپ گیا، لرز گیا۔ میں نے سوچا کہ تُو دنیا کو کس طرح چھوڑے گا۔''

آپ نے عاجزی سے عرض کیا۔ ''میں وہاں نہیں رہ سکتا۔ میں وہاں مر جاؤں گا۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''خیر، تُو رہ میرے پاس لیکن اس شرط پر کہ تُو اپنی بیوی اور بچی کے پاس بھی آتا جاتا رہے گا۔''

آپ نے آہستہ سے سوال کیا۔ ''مگر اس طرح تو میں بیک وقت دو گھوڑوں کی سواری کا مرتکب ٹھہروں گا اور کیا یہ میرے لیے نقصان دہ نہیں ہوگا؟''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''میں نے تیرے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے، وہی بہتر ہے۔ میں کل قیامت کے دن تیری بیوی، تیری بچی، تیرے والدین کو کیا جواب دوں گا؟ وہ تو میرا گریبان، میرا دامن پکڑ لیں گے اور میرا راستہ روک لیں گے۔ اس وقت میں کیا کہوں گا؟''

اب آپ لاجواب ہو گئے اور کچھ دیر بعد زچ ہو کر پوچھا۔ ''پھر میں کیا کروں؟''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''وہی جو میں کہہ رہا ہوں۔ تُو اپنی بیوی، بچی اور والدین کا خیال رکھ کر درویشی میں داخل ہو سکتا ہے، اس کے بغیر نہیں۔ اس کی اجازت نہ تو میں دے سکتا ہوں اور نہ ہمارا خدا۔''

جب آپ مجبور ہو گئے تو پوچھا۔ ''پھر میں آپ کے پاس کیونکر رہوں گا؟''

جواب دیا گیا۔ ''اس طرح سے میرے پاس رہ کہ تزکیۂ نفس اور مجاہدے کے جو طریقے میں بتاؤں، ان پر عمل کر لیکن اس کے ساتھ ہی تُو اپنے گھر بھی جاتا رہ اور اپنے والدین کی خدمت اور بیوی بچی کی نگہداشت بھی کرتا رہ۔ اس سے خدا اور خوش اور راضی ہو جائے گا تجھ سے۔''

آپ اس پر راضی ہو گئے۔ شاہ شجاع نے آپ کو اپنے پاس ایک ہفتہ روک کر گھر جانے کی اجازت دے دی۔ ماں باپ خوش ہو گئے اور بیوی اور بچی بھی بہت خوش ہوئے۔ دریافت کیا۔ ''آپ کہاں چلے گئے تھے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں بیمار تھا۔ معالج کی تلاش میں نکل گیا تھا۔''

بیوی نے کہا۔ ''لیکن مجھے تو آپ اچھے خاصے صحت مند نظر آتے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں بظاہر، لیکن میری روح بیمار تھی اور ہے جبکہ جسم کو کوئی مرض لاحق نہیں۔''

بیوی نے کہا۔ ''لیکن اب آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ میرے پاس، میرے ساتھ رہیں گے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''مجھ پر اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق واجب الادا ہیں۔ اب اگر میں بندوں کے حقوق تو ادا کرتا رہوں اور حقوق اللہ کو فراموش کر دوں تو میں اپنی ذات پر ظلم کروں گا، بہت بڑا ظلم۔''

بیوی رونے لگی۔ آپ نے ایسا انتظام کر دیا کہ بیوی اور بچی کا خیال بھی رکھتے اور شاہ شجاع کرمانی کے پاس بھی جاتے رہتے۔ یہاں انہیں جو کچھ بتایا گیا، اس سے وہ پہلے واقف نہیں تھے اور باتوں ہی سے سکون ملنے لگا۔ شاہ شجاع نیشا پور جا رہے تھے۔ آپ نے اصرار کیا کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔

چنانچہ انہیں بھی ساتھ لے لیا گیا۔ نیشا پور کے محلہ حیری میں ابوحفص حداد کا قیام تھا۔ یہ پیشے کے اعتبار سے لوہار تھے

www.pklibrary.com

اس لیے ان کے نام کے ساتھ حداد لگا ہوا ہے۔ حداد کے معنی ہیں لوہار۔ ابوحفص نے شاہ شجاع کے ساتھ سعید کو دیکھا تو پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''یہ سعید ہے۔ مرو کے ایک خوشحال گھرانے کا چشم و چراغ لیکن اسے بھی یہی شکایت ہے کہ دولت نے اس کو مضطرب اور بے چین تو کیا ہے لیکن سکون نہیں دیا۔ اب یہ روحانی سکون کی تلاش میں ہمارے پاس آیا ہے۔''

ابوحفص نے انہیں مخاطب کیا۔ ''اے سعید! ذرا ادھر تو آؤ۔ میں بھی تو تمہیں غور سے دیکھ لوں۔''

سعید ان کے پاس ادب سے کھڑے ہو گئے۔ ابوحفص نے انہیں دل میں اتر جانے والی نظروں سے دیکھا اور شاہ شجاع سے کہا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو انہیں کچھ دن کے لیے میرے پاس چھوڑ دیں کیونکہ یہ ایک بابرکت انسان ہیں۔''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ سعید سے بھی پوچھ لیں کیونکہ یہ اپنی مرضی اور جستجو سے میرے پاس آئے ہیں۔ میں ان کی مرضی کے بغیر آپ کے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔''

اب آپ سے پوچھا گیا۔ ''اے سعید! کیا آپ ابوحفص کے پاس رہنا پسند کریں گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، کیونکہ میں اس در پر بھی طمانیت محسوس کر رہا ہوں۔''

ابوحفص نے شاہ شجاع سے کہا۔ ''یہ میرے پاس آپ کے ذریعے آئے ہیں اس لیے آپ کا نام ان سے ہمیشہ منسوب رہے گا۔''

سعید نے ابوحفص سے درخواست کی۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں شاہ شجاع کی بھی خدمت کر لیا کروں؟''

ابوحفص نے جواب دیا۔ ''تم آزاد ہو۔ چاہو تو شاہ شجاع کے پاس رہو یا میرے پاس۔ میں نے تمہیں شاہ شجاع کے ذریعے پایا ہے۔''

آپ شاہ شجاع کی خدمت میں رہنے لگے۔ شاہ شجاع نے انہیں جو نصیحتیں کیں، وہ بڑی معنی خیز اور پُراثر تھیں۔ شاہ شجاع نے آپ سے کہا۔ ''سعید! تم مجھ سے سوال کرو۔ میں ان کے جواب دوں گا پھر یہی سوال جواب تم اپنے پاس محفوظ کر لو گے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''آپ کا فقر کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''فقر خدا کا ایک راز ہے۔ فقراء اس کو پوشیدہ رکھتے ہیں کیونکہ وہ فقر کے امین ہوتے ہیں لیکن جب یہ فقر کو افشا کر دیتے ہیں تو فقر ان سے سلب کر لیا جاتا ہے۔''

آپ نے دوسرا سوال کیا۔ ''صدق کے بارے میں آپ کیا بتائیں گے؟''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''صدق کی تین علامتیں ہوتی ہیں۔ اول دنیا سے نفرت کا اظہار، دوم مخلوق سے دوری، سوم خواہشات پر غلبہ حاصل کرنا۔''

اس کے بعد شاہ شجاع نے سرد آہ بھری اور کہا۔ ''اے سعید! تم نے جس راہ پر قدم رکھا ہے، وہ آسان نہیں ہے۔ مجھ ہی کو دیکھو۔ میری مثال اس زندہ مرغ جیسی ہے جس کو سیخ لگا کر آگ پر رکھ دیا جائے اور پھر چاروں طرف سے آگ دہکا دی جائے۔''

شاہ شجاع چند دن یہاں رہے پھر انہیں ابوحفص کے حوالے کر کے آگے روانہ ہو گئے۔ اب آپ کا واسطہ ابوحفص حداد سے تھا۔ ابوحفص نے پوچھا۔ ''تمہاری بیوی اور بچے کہاں ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''مرو میں۔ بیوی اور ایک بچی ہے۔''

ابوحفص نے دوسرا سوال کیا۔ ''اور والدین؟''

جواب دیا۔ ''زندہ ہیں لیکن وہ خوشحال ہیں اور نوکر چاکر ہیں۔ اللہ نے انہیں بہت کچھ دے رکھا ہے۔''

ابوحفص مطمئن نہیں تھے۔ تیسرا سوال کیا۔ ''اگر تم نیشاپور میں میرے پاس رہو گے تو یہاں تمہیں پریشانیاں اٹھانا پڑیں گی۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں۔ میں تیار ہوں۔ میں نے اپنی خوشی سے عیش و نعم کی زندگی چھوڑی ہے۔''

www.pklibrary.com

ابوحفص نے سب سے زیادہ تشویش ناک سوال کیا۔ ''اور تمہاری بیوی؟ کیا وہ بھی تمہارا ساتھ دے گی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ساتھ دینا تو چاہیے۔ اگر ساتھ نہیں دے گی تو میں اس کو اپنے والدین ہی کے پاس چھوڑ دوں گا۔''

ابوحفص نے ہدایت کی۔ ''اے سعید! یہ بہت دشوار منزل ہے۔ اگر تم نے یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ اب اس راستے کو نہیں بدلو گے اور اسی پر چلو گے تو مرو واپس جاؤ اور بیوی سے بات کرلو۔ اگر وہ ساتھ آنے پر آمادہ ہو تو اس کو اپنے ساتھ لے آنا ورنہ اس کا مناسب بندوبست کر دینا کیونکہ حقوق العباد کی کوتاہی راہ کو کھوٹا کر دے گی۔''

آپ نے دوسرے دن علی الصباح مرو کے لیے کوچ کیا۔ مرو میں بیوی بہت پریشان تھی لیکن ماں باپ اس کے لیے آمادہ ہو چکے تھے کیونکہ انہیں جس بات کا اندیشہ تھا، وہ پورا ہو چکا تھا اور انہیں بھی اس نیک زندگی سے اختلاف نہیں تھا۔

مرو میں بیوی نے اپنے شوہر کو اچانک اپنے سامنے جو دیکھا تو خوشی سے پاگل سی ہو گئی لیکن اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ مرو واپس کیوں آئے ہیں؟

بیوی نے روتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ نے مجھے اور اپنی بچی کو چھوڑ دیا تو اس طرح آپ، ہمارے آپ پر جو حقوق ہیں ان سے غفلت اور کوتاہی اختیار کریں گے اور خدا کو یہ بات پسند نہیں آئے گی اس لیے آپ یہیں رہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اللہ کی بندی! تو میرا ساتھ دے اور میرے ساتھ نیشاپور چل۔ جس زندگی کو لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے، اس میں شرمندگی اور ندامت کے ہزاروں سامان موجود ہیں لیکن طمانیت اور نجات یہاں عنقا ہے۔ میرے ساتھ چل اور اپنی عاقبت بنالے۔''

بیوی نے پوچھا۔ ''اور وہاں گزر اوقات کیسے ہوگی؟ ذریعۂ معاش کیا ہوگا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''بیوی! جس خدا نے ماں کے شکم میں، پتھر کے اندر کیڑے کو رزق پہنچایا ہے، وہی نیشاپور میں بھی رزق دے گا۔''

بیوی سوچ میں پڑ گئی۔ ایک طرف مرو تھا جہاں آرام و آسائش کے جملہ وسائل موجود تھے اور دوسری طرف نیشاپور تھا جہاں ہر روز کنواں کھودنا اور پانی پینا پڑے گا۔ ایک طرف سب کچھ تھا مگر شوہر نہیں تھا اور دوسری طرف شوہر تھا مگر کچھ اور نہیں تھا۔ آخر بیوی نے شوہر کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا، بولی۔ ''میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

آپ اس فیصلے سے بہت خوش ہوئے، فرمایا۔ ''مرحبا، جزاک اللہ۔ خدا تجھ کو خوش و خرم رکھے اور تیری عاقبت سدھارے۔''

آپ نے اپنے اور اپنی بیوی کے اس فیصلے سے اپنے والدین کو مطلع کیا۔ ماں کو بہت تکلیف پہنچی لیکن باپ نے انہیں سمجھایا۔ ''شریف عورت! مت پریشان ہو۔ میں نے تو اس دن کا بہت دنوں پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا بیٹا جس راہ پر چل نکلا ہے، وہ خدا شناسی تک جاتی ہے۔ جب عارفوں کا ذکر آئے گا تو ان میں میرے بیٹے کا بھی ذکر موجود ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ قیامت کے دن میرا یہ بیٹا ہم دونوں کی نجات اور شفاعت کا ذریعہ بن جائے۔''

آپ بھی رونے لگے پھر اسی حال میں آپ اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ نیشاپور روانہ ہو گئے۔

نیشاپور کے محلہ حیری میں ابوحفص حداد نے انہیں مکان فراہم کر دیا اور آپ بھی لوہاری کا کام کرنے لگے۔ آمدنی قلیل تھی جس سے گزر بسر بہ مشکل ہی ہوتی تھی۔ یہیں آپ کے گھر بیٹے کی ولادت ہوئی۔ ابوحفص نے نومولود کا نام عثمان رکھا اور اسی نسبت سے آپ ابوعثمان بن گئے۔

(جاری ہے)

ماخذات

نفحات الانس، مولانا عبدالرحمٰن جامی۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فریدالدین عطار۔
طبقات الاولیاء، علامہ عبدالوہاب اشعری۔ جنید بغداد، ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر۔
حکایاتِ شیریں، مرتبہ مدیر مجلہ آئینہ، لاہور

www.pklibrary.com

شاکا

چھٹا حصہ

نازیہ کامران کاشف

جب ڈاکٹر وینزو کافز نامی جزیرے پر پراسرار اموات کی وجہ جاننے کے لیے آیا تو اس کا سامنا کئی عفریتوں سے ہوا... جن کے خاتمے کے لیے شاکا جیسی پراسرار طاقت نے ایک دنیا سے دوسری دنیا کا سفر کیا... چار صدیوں پر پھیلی یہ کہانی بار بار دہرائی جاتی رہی جس کے بعد چند سائنس دانوں کی ایک بھیانک غلطی نے اس دنیا کو ایک بہت بڑے خطرے سے دوچار کر دیا مگر... اس بار کوئی پراسرار طاقت ان کی مدد کے لیے ان کے ساتھ نہ تھی اور انہیں ایک بار پھر شاکا جیسی اسرار بھری ہستی کو ڈھونڈنا تھا چاہے کتنا ہی مشکل سفر ہو جاتا... گزشتہ عہد کے ڈاکٹر وینزو کی ڈائری میں لکھے تحیر انگیز راز انہیں دوسری دنیا کا رستہ دکھا رہے تھے لیکن شاکا تک پہنچنا اب اتنا آسان بھی نہ تھا...

سترہویں صدی کی اندھیری راتوں سے جنم لینے والی

ایک لرزہ خیز داستان.....

www.pklibrary.com

Year 2020

Kubinka Air base - Moscow Russia

بورس، آرمی کے میڈیکل اسٹاف کے ساتھ لیب میں موجود تھا۔ یہ ایک عام طرز کی لیب تھی۔ ائربیس میں ویسے بھی جدید لیب کا تصور ناممکن تھا۔ بورس کے سامنے اس کا لیپ ٹاپ کھلا تھا اور وہ واسٹوک کے سائنس دانوں کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ لیپ ٹاپ کے ایک طرف جیکال کا دیا ہوا باکس بھی رکھا تھا۔ بورس نے اسے کھول کر دیکھا مگر اس میں پرانی شیشیوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسٹیو، جیکال، شمشیر اور ہیری کے ہمراہ لیب میں داخل ہوا۔

اسٹیو کا معاملے کی تہ تک پہنچنا ضروری تھا اس لیے اس نے خود بھی اس ریسرچ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ تینوں تازہ دم ہو چکے تھے اور کام کرنے کے لیے تیار تھے۔

جیکال، جوشوا کا باکس وہاں رکھا دیکھ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے باکس کھول کر دیکھا۔ تمام شیشیاں صحیح سلامت موجود تھیں۔ اس نے شکر ادا کیا۔

''ان شیشیوں میں کیا ہے؟'' بورس جو اسے ہی دیکھ رہا تھا، پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''یہی وہ ڈی این اے کے سیمپلز ہیں جن کی مدد سے جوشوا نے یہ ویکسین تیار کی ہے۔'' جیکال نے بالآخر اس باکس کا راز کھولنے کا فیصلہ کیا۔

بورس اٹھ کر باکس کے پاس چلا آیا۔

''یہ کن جانداروں کے ڈی این اے سیمپلز ہیں؟'' وہ شیشیاں اٹھا کر دیکھنے لگا۔ یہ دیکھنے سے ہی کافی پرانی معلوم ہوتی تھیں۔

اسٹیو بھی ان کے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ کسی جاندار کا ڈی این اے نہیں ہے بلکہ یہ خوفناک بلاؤں کے ڈی این اے سیمپلز ہیں۔'' جیکال بولا۔

''اور تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' بورس حیرانی سے بولا۔

''جوشوا نے اپنے آپ پر ویکسین کا تجربہ کرنے سے پہلے ہمیں کہا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو ہمیں ساری تفصیلات اس کی ڈائری میں ملیں گی جو اس کی لیب کی سیف میں موجود تھی۔ جوشوا نے ہوش میں آنے کے بعد اپنی سیف کا لاک تبدیل کر دیا تھا مگر جب ہم اس لیب میں قید ہوئے تو ہیری نے اس لاک کو کھول لیا۔ یہ ڈائری اور باکس ہمیں اسی سیف سے ملے۔'' جیکال نے اپنے لباس کے اندر محفوظ ڈائری نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔

اسٹیو نے وہ ڈائری اٹھالی۔ اس نے چند صفحے پلٹے۔ ڈائری میں عجیب سے خاکے بنے ہوئے تھے۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اس طرح کے خاکے تو اس نے بورس کے لیکچر کے دوران بھی دیکھے تھے۔ اس نے ایک صفحہ کھول کر بورس کے سامنے کر دیا۔ بورس جو باکس سے شیشیاں اٹھا کر دیکھنے میں مصروف تھا اچانک بری طرح اچھلا۔

''اوہ یہ..... یہ تو.....'' وہ بولنے ہی لگا تھا کہ جیکال نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ڈاکٹر رینزو ٹیوس کی ڈائری ہے۔'' جیکال نے دھماکا کیا۔

وہ ہیلی کاپٹر میں بورس کے منہ سے ڈاکٹر رینزو کا نام سن چکا تھا۔ یقیناً بورس کو اس رینزو کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ معلوم تھا۔

بورس نے اسٹیو کے ہاتھ سے وہ ڈائری لے لی۔ وہ تیزی سے ڈائری کے صفحات پلٹنے لگا۔ صفحے پلٹنے کے ساتھ ہی اس کے چہرے کے رنگ بھی تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ جیکال اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

اسٹیو بھی جیکال کو دیکھتا اور کبھی بورس کو لیکن خاموش کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد بورس نے وہ ڈائری بند کر دی۔

''یہ تو ان کا اوریجنل مینو اسکرپٹ ہے۔'' وہ شاک کی کیفیت میں بولا۔

جیکال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مگر اس کا جوشوا کی ویکسین سے کیا تعلق ہے؟'' اسٹیو بولا۔

جیکال نے باکس اپنے سامنے کھسکایا اور ایک شیشی اٹھالی۔ شیشی آدھی خالی تھی۔ اس نے اس شیشی کے ڈھکن پر موجود نمبر کو دیکھا اور ڈائری کے صفحے پلٹنے لگا۔

''چوپاکابرا..... خون کے نمونے، شیشی نمبر گیارہ۔'' جیکال نے یہ الفاظ دہرا کر ڈائری بورس اور اسٹیو کے سامنے کر دی۔

انہوں نے ایک نظر ڈائری کے اس صفحے پر ڈالی اور پھر جیکال کے ہاتھ میں پکڑی شیشے کے ڈھکن پر گیارہ کا ہندسہ دیکھ کر وہ اچھل پڑے۔

''اوہ نہیں۔ تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ جوشوا نے یہ ویکسین ان ڈی این ایز کی مدد سے تیار کی ہے؟'' بورس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ یعنی یہ وہی ڈی این اے سیمپلز تھے جن کا ذکر بورس نے ڈاکٹر رینزو کے ریسرچ پیپرز میں پڑھا تھا۔

www.pklibrary.com

''یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے اس بلا کی خصوصیات انسان میں منتقل کر دی ہیں؟'' اسٹیو نے سوال کیا۔

''صرف اسی کی نہیں، اگر آپ غور کریں تو اس ڈبے میں کافی شیشیاں ایسی ہیں جو آدھی خالی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جوشوا نے کسی ایک ڈی این اے پر کام نہیں کیا۔ یہ بات اس نے مجھے خود بھی کہی تھی کہ وہ مختلف ڈی این ایز کو ملا کر یہ ویکسین تیار کر رہا ہے۔'' جیکال نے مزید خوفناک انکشافات کیے۔

بورس بے یقینی سے سر ہلانے لگا۔ اسٹیو نے ان سب کو دیکھا۔ شمشیر اور ہیری اب تک خاموش کھڑے تھے۔

''تو اب ہمارا لائحہ عمل کیا ہوگا؟ ہم ان کا خاتمہ کیسے کر سکتے ہیں؟'' اسٹیو کو ان کی خاموشی کھلی۔

''خاتمہ؟ سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ جوشوا نے ان میں سے کن بلاؤں کا ڈی این اے استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد ہم ان کی خصوصیات پر غور کریں گے۔ اس کے بعد ہی ہم کوئی لائحہ عمل ترتیب دے سکتے ہیں لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ہم اتنے کم وقت میں اس مصیبت کا کوئی حل نکال پائیں گے۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک جدید لیب کی ضرورت پڑے گی کیونکہ یہ کام اس لیب میں نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں اپنی لیب استعمال کرنا چاہوں گا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک جدید اور مکمل لیب ہے۔ آپ آفیشلز سے اجازت لے لیں تاکہ ہم جلد از جلد اس پر کام شروع کر سکیں۔'' بورس سنجیدگی سے بولا۔

''آرمی چیف اس بات کی اجازت نہیں دیں گے۔'' اسٹیو بولا۔ بورس نے مایوسی سے کندھے اچکا دیے۔ جو باتیں اسے جیکال نے بتائی تھیں اس نے بورس کے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔

''سب سے پہلے تو ہم ان شیشیوں کی مدد سے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ جوشوا نے ویکسین بنانے کے لیے کن عفریت کے ڈی این اے استعمال کیے تھے۔'' شمشیر بولا۔

''میں تو ڈاکٹر ریزو کی ریسرچ پر کتاب شائع کرنے والا تھا۔ آج کل میں انہی کی ریسرچ سے متعلقہ پرجاتیوں پر کام رہا تھا۔ مجھے ڈاکٹر ریزو کے ریسرچ پیپرز کروشیا کی ایک لائبریری سے ملے تھے۔ میں ان ڈی این ایز کے بارے میں پڑھ کر سوچتا تھا کہ کیا واقعی انہوں نے ان پرجاتیوں کے ڈی این ایز جمع کیے تھے یا یہ محض ایک مفروضہ ہے اور آج میرے سامنے یہ سیمپلز موجود ہیں لیکن یہ کتنی بڑی تباہی اپنے ساتھ لائے ہیں۔'' بورس نے افسوس سے سر ہلایا۔

''میں یہ بھی سوچتا تھا کہ ڈاکٹر ریزو کا نام تاریخ سے کیوں غائب ہے مگر اب میں سمجھ گیا ہوں۔ میں بھی اس کتاب کو شائع نہیں کروں گا۔'' بورس کا دکھ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

شمشیر سر ہلا کر کتاب کے صفحے پلٹنے لگا۔ وہ تحریروں کو شیشیوں کے ہندسوں سے ملا رہا تھا۔ بورس کا دکھ بعد میں بھی بانٹا جاسکتا تھا۔ فی الحال ان سب کی جان پر بنی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جوشوا نے چوپا کابرا، لیمیا، وینڈیگو اور مانا نانگل کے ڈی این ایز کا استعمال کیا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں چار شیشیاں اور بھی ملی تھیں جن میں انسانی خون جیسا مائع تھا مگر وہ انسانی خون سے زیادہ گاڑھا اور گہرے رنگ کا تھا۔ ان شیشوں پر کوئی ہندسہ تحریر نہیں تھا لہٰذا ان کی تفصیلات ڈائری میں ڈھونڈنا مشکل تھی۔ ان چار شیشوں میں سے بھی تین آدھی خالی تھیں۔

''یہ کس بلا کے خون کا سیمپل ہوسکتا ہے؟'' بورس نے جیکال سے پوچھا۔ جیکال نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

ڈائری میں مزید عفریتوں کا ذکر بھی تھا لیکن ان کے خون کے نمونوں کے بارے میں کوئی تفصیلات موجود نہیں تھیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ ان بغیر ہندسوں والی شیشیوں میں ان میں سے کسی ایک عفریت کے خون کا نمونہ بھی موجود ہے جسے ڈاکٹر ریزو ڈائری میں لکھنا بھول گئے ہیں۔'' بورس نے اندازہ لگایا۔

''اب آگے کیا کرنا ہے؟'' ہیری پوچھنے لگا۔

''شمشیر! میں چاہتا ہوں کہ تم ان سیمپلز پر مختلف کیمیکلز کا ٹیسٹ کرو جو ان کے خلیات کو کمزور کرنے میں ہماری مدد کرے۔ اینٹی ویکسین تیار کرنا وقت کا زیاں ہے۔ ہم ان کو پکڑ کر تو یہ ویکسین نہیں لگا سکتے مگر انہیں وقتی طور پر کمزور کر کے ان پر قابو ضرور پا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ شیشیاں جن پر کوئی ہندسہ درج نہیں ان کا بھی جائزہ لو۔ ہیری! تم شمشیر کی مدد کرو۔'' بورس نے لائحہ عمل ترتیب دینا شروع کیا۔

ہیری، شمشیر کے ساتھ مل کر خردبینوں کو سیٹ کر کے ان نمونوں کا جائزہ لینے کی تیاری کرنے لگا۔ جیکال، جوشوا کی بنائی گئی ویکسین کے چند سیمپلز اٹھا کر ایک اور خردبین کی طرف بڑھ گیا۔ اسے اس ویکسین کا بھی جائزہ لینا تھا جو جوشوا نے تیار کی تھی جبکہ بورس، ریزو کی ڈائری اٹھا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس کا مطالعہ بھی بے حد ضروری تھا۔ اس لیب میں

www.pklibrary.com

یہی ممکن ہوسکتا تھا۔

اسٹیو کنٹرول روم میں جاچکا تھا۔ اسے واسٹوک کے حالات پر بھی نظر رکھنا تھی۔ وہ ٹرانسمیٹر پر مسلسل ہیڈ کوارٹر سے رابطے میں تھا۔ بورس ڈائری میں موجود دیگر تفصیلات پر بھی غور کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ ڈاکٹر رینزو کو ڈائری لکھنے کی عادت تھی اور وہ ہر اہم واقعہ حرف بہ حرف اپنی ڈائری میں تحریر کرتے تھے۔ اس نے ڈائری پڑھنا شروع کی۔ ڈاکٹر رینزو نے کسی کافز نامی علاقے میں اپنے سفر کی روداد تحریر کی ہوئی تھی۔ بورس اگلا صفحہ پلٹتے ہی چونکا۔ ڈاکٹر رینزو کے کافز کی طرف سفر کرنے کی وجہ یہ عفریت ہی تھے۔

بورس نے تجسس سے آگے کے صفحے پلٹے تھے اور پھر جیسے جیسے وہ پڑھتا گیا اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ ڈاکٹر رینزو نے سترھویں صدی میں دوسری دنیا سے آنے والے کسی جنگجو کا ذکر کیا تھا جو بہت طاقتور تھا۔ وہ ان عفریتوں کو ختم کرنے کے تمام طریقے جانتا تھا۔ رینزو نے اس کی تعریفوں میں زمین آسمان ایک کیا ہوا تھا۔ اگر ڈاکٹر رینزو کے بنائے گئے ان عفریت کے خاکوں میں حقیقت تھی تو یقیناً یہ کردار بھی خیالی نہیں تھا۔ ڈاکٹر رینزو جیسے سائنس دان کا ان عفریتوں کو شکست دینا ناممکن تھا۔ انہیں دوسری دنیا سے یہ مدد حاصل ہوئی تھی۔

اس نے چند صفحے مزید پلٹے۔ ڈاکٹر رینزو نے کسی لورین سے اپنی محبت کا ذکر کر رکھا تھا۔ اسے یہ پڑھنا غیر ضروری لگا، وہ آگے بڑھ گیا۔ ڈاکٹر رینزو کی شادی کا دن تھا اور وہ بہت خوش تھا۔ بورس نے سر جھٹک کر اگلا صفحہ پلٹا اور پہلی سطر نے ہی اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

''لورین ہی وہ شیطان تھی جس نے بدکال کا دروازہ کھولا تھا۔ کل اس کا خاتمہ ہوگیا۔ شاکا واپس جا رہا ہے۔ کاش کہ میں اس دھوکوں بھری دنیا کو چھوڑ کر اس کے ساتھ جاسکتا۔''

اچانک بورس کے ذہن کے پردے پر ایک تصویر ابھری۔ ایک دلہن، جنگل سے حملہ کرتی وہ بلا۔

بورس نے سر جھٹکا۔

''نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔'' وہ بڑبڑایا۔ اس نے تیزی سے کچھ اور صفحے پلٹے۔

یہاں ڈاکٹر رینزو نے ایک الگ ہی تھیوری پیش کی تھی۔

''انسانوں کی دنیا سے اوپر شاکا کی دنیا ہے اور اس سے اوپر بدکال ہے۔ یہ سارے عفریت کافز میں بدکال کا دروازہ کھلنے کی وجہ سے آئے تھے۔ اور یہ دروازہ لورین نے کھولا تھا۔ لورین شیطان صفت عورت تھی۔ وہ ان عفریتوں کے ذریعے زمین پر قابض ہونا چاہتی تھی۔ وہ اپنی فوج بنا رہی تھی۔ ناقابلِ شکست فوج..... مگر شاکا نے اس کی ساری تدبیریں ناکام کر دیں۔ شاکا واپس چلا گیا مگر رینزو کو اپنی دنیا کا راستہ دکھا گیا۔

''کوئی اس کے سامنے پشت کیے کھڑا تھا۔ وہ اس اڑتی ہوئی بلا کو گلے سے دبوچ اسے زمین پر پٹخ رہا تھا۔ بلا زمین پر گر کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی۔ وہ شخص اس کی طرف پلٹا اور ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا۔ اس کا حلیہ جنگلیوں جیسا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، اس کی ہتھیلی پر ایک دائرہ بنا تھا جس میں عجیب سے نقوش تحریر تھے۔ بورس نے اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ دائرہ اب بورس کے ہاتھ پر نمودار ہوگیا تھا۔ اچانک آسمان پر روشنی کا ہالہ نمودار ہوا تھا۔ وہ شخص ایک جست لگا کر اس ہالے میں غائب ہوگیا۔'' بورس کے ذہن کے پردے پر ایک فلم چلنا شروع ہوگئی۔ اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ایک اور صفحہ پلٹا۔

''اس پر کسی انسان کا خاکہ بنا تھا۔ اس کے چہرے کے خدوخال واضح نہیں تھے لیکن دیکھنے میں وہ کوئی جنگجو معلوم ہوتا تھا۔''

''شاکا۔'' بورس کے دماغ میں جھماکا ہوا۔

''وہ اسے کالی چٹان کے اوپر کھڑا نظر آیا۔ اس کے وجود سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ تیز ہوا سے اڑتے اس کے وہ لمبے بال جنہیں وہ چوٹیوں کی شکل میں قید رکھتا تھا۔ وہ بورس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور روشنی کے ہالے میں غائب ہوگیا۔''

بورس کی طبیعت تیزی سے خراب ہونا شروع ہوئی۔ اچانک اسے زور کا چکر آیا اور وہ نیچے گر کر بے ہوش ہوگیا۔

☆☆☆

Year 1732

Capiz-Philippines

رینزو نے شاکا کو آواز دی تو وہ بغیر پلٹے اپنی جگہ رک گیا۔ رینزو دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔

''میرے ساتھ چلو۔ میں تمہارے بازو سے یہ گولی نکالوں گا ورنہ خون زیادہ بہہ جائے گا۔'' رینزو اس کے زخم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں خود نکال لوں گا۔'' شاکا آگے بڑھنے لگا۔

''میری بات مانو۔ میرے ساتھ چلو۔'' وہ زور دے کر بولا۔

www.pklibrary.com

شاکا نے سر ہلا دیا۔

وہ شاکا کو لے کر اپنی ڈسپنسری میں آ گیا۔ شاکا زخمی تھا اور اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ ریزو نے شاکا کے بازو سے گولی نکالی اور اس کا زخم سینا شروع کیا۔ شاکا ہونٹ بھینچے خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے منہ سے ایک دفعہ بھی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔

اسی دوران لوئس بھی ڈسپنسری میں داخل ہوا۔ اس نے مانا نانگل کا اوپری دھڑ تھام رکھا تھا جسے اس نے اسٹریچر پر لٹا دیا۔ ریزو کو شدید غصہ آیا مگر اس نے خاموشی سے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ زخم سینے کے بعد اس نے شاکا کا بازو صاف کر کے اس پر پٹی باندھ دی۔

''ہو گیا۔'' ریزو میز پر پھیلا سامان سمیٹنے لگا۔ وہ شاکا سے نظریں چرا رہا تھا۔

شاکا نے ایک نظر مانا نانگل کے بے جان وجود پر ڈالی اور ریزو سے مخاطب ہوا۔

''میں آج رات بدکال کا دروازہ بند کر کے صبح کی پہلی کرن کے ساتھ یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم اسے اپنا ساتھی بنا رہے تھے اور تم اس وقت تکلیف میں ہو مگر اس کا خاتمہ بہت ضروری تھا۔ تمہیں اچھا ساتھی ضرور ملے گا۔ اپنی تلاش جاری رکھنا۔'' شاکا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''یہ باقیوں کی طرح راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کیوں نہیں ہوئی؟'' ریزو کو اس کا جسم دیکھ کر وحشت ہو رہی تھی۔ کاش یہ بھی راکھ کا ڈھیر بن جاتی۔

''یہ ان کی سردار تھی۔ اس نے کئی سال جنگلوں میں بیٹھ کر شیطان کی عبادت کی ہے۔ اس کے بعد ہی اس کو یہ طاقتیں حاصل ہوئی تھیں اس لیے یہ ان سب سے الگ تھی۔ اس کے ختم ہوتے ہی روحوں نے مجھ پر بدکال کا دروازہ ظاہر کر دیا ہے ورنہ اس نے بدکال کے دروازے پر سایہ کر رکھا تھا۔ کافز عفریتوں سے پاک ہو چکا ہے۔ تم جب چاہو جا سکتے ہو۔ یہاں رکنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔'' شاکا یہ کہہ کر ڈسپنسری سے باہر نکل گیا۔

ریزو کچھ دیر وہیں کھڑا مانا نانگل کو دیکھتا رہا۔ اس کے لیے اس سچائی کو جلد از جلد قبول کرنا بہت ضروری تھا ورنہ وہ پاگل ہو جاتا۔ اس نے خود کو ہمت دلائی اور ڈسپنسری سے باہر نکل آیا۔ شاکا جا چکا تھا۔

گاؤں والے اب تک اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ لوئس بھی کنوئیں کے پاس خاموش بیٹھا تھا۔

وہ چوک پر پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ ''گاؤں والو! میری بات غور سے سنو۔ کافز ہر نحوست سے آزاد ہو چکا ہے۔ لورین ہی وہ شیطان تھی جس نے ان عفریتوں کو یہاں کا راستہ دکھایا تھا۔ لورین کے خاتمے کے ساتھ ہی ان عفریتوں کے یہاں آنے کا راستہ بھی بند ہو چکا ہے۔ کافز کے ساحل اور جنگلات خوف کی قید سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اب تم لوگ یہاں بے خوف ہو کر شکار کر سکتے ہو۔ جن کے گھر والے ان عفریتوں کا نوالہ بنے، میں ان کے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔ میں صبح ہوتے ہی یہاں سے واپس دارالحکومت جانے کے لیے نکل جاؤں گا۔'' وہ اپنی بات ختم کر کے خاموش کھڑا ہو گیا۔

اس کا اعلان سنتے ہی گاؤں والے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ فلپس لڑکھڑاتا ہوا چرچ سے باہر آیا اور چرچ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر رونے لگا۔ گاؤں والے اسے تسلی دینے کے لیے اس کے اردگرد جمع ہونے لگے۔ لوئس نے ریزو کا کاندھا تھپتھپا کر اسے تسلی دی۔

''اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم ڈسپنسری سے سارا سامان سمیٹ لو۔ ہم صبح ہوتے ہی نکل جائیں گے۔'' ریزو سنجیدگی سے بولا۔

''اور وہ بلا جو اسٹریچر پر موجود ہے، اس کا کیا کروں؟'' لوئس ہچکچایا۔

''تم اس کے خون کے نمونے اکٹھے کر کے شیشیوں میں بھر لینا۔ شیشوں پر نمبر ڈال دینا۔ میں آج کی رات ڈسپنسری میں ہی گزارنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اپنا دل سخت کر لیا۔ اسے لوئس کی بات سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس نے ہی تو لوئس کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ ہر بلا کو اسٹریچر تک پہنچانا لوئس کی ذمے داری ہے۔ ریزو دوبارہ لورین کے گھر میں قدم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اسے آج کی رات ڈسپنسری میں گزار کر اگلے دن دارالحکومت روانہ ہو جانا تھا۔

☆☆☆

ریزو سورج نکلنے سے پہلے ہی جنگل کی طرف آ گیا۔ وہ شاکا کو الوداع کہنا چاہتا تھا۔ لوئس نے رات کو ہی سارا سامان باندھ لیا تھا اور وہ ریزو کے جنگل کی طرف جاتے ہی سامان کو کشتی میں منتقل کرنے لگا۔ لوئس جان چکا تھا کہ ریزو جنگل میں شاکا سے ملنے جاتا ہے۔ وہ گاؤں والوں کے سامنے ظاہر ہو کر بھی پوشیدہ رہنا چاہتا تھا۔ لوئس اس کی طاقت اور رفتار دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ وہ بھی اس انوکھے

www.pklibrary.com

انسان سے دوستی کا خواہشمند تھا مگر ریزو اکیلے ہی اس سے ملنے چلا جاتا تھا۔ لوئس کے دل میں اس جیسا بننے کی خواہش زور پکڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر ریزو کہتے تھے کہ عفریتوں کے خون کے نمونے دوا بنانے کے کام آسکتے ہیں۔ جیسے عام لوگوں کی قوت مدافعت بڑھانا وغیرہ۔ تو کیا شاکا کا خون بھی اسے یہ طاقتیں دے سکتا تھا؟ اور پھر اسے قدرت نے خود ہی یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ شاکا زخمی ہوا تو اس نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا مگر یہ بات ریزو سے پوشیدہ رکھی تھی۔

وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ریزو ان عفریتوں کے خون کو کس طرح کارآمد بناتا ہے اور پھر وہ بھی شاکا کے خون کو اسی طرح استعمال کر لیتا اور اس جیسا بن جاتا اور اب اسے وہ وقت قریب آتا محسوس ہو رہا تھا۔

ریزو کے لوٹتے ہی انہیں دارالحکومت روانہ ہو جانا تھا۔ لوئس بہت خوش تھا۔ اسے دارالحکومت کی بھاگتی دوڑتی، پُررونق زندگی بہت یاد آ رہی تھی۔

لوئس نے مانا نانگل کے خون کے نمونے اکٹھے کرنے کے بعد لورین کا جسم فلپس کے حوالے کر دیا۔ ریزو اس دوران آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا۔ وہ خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فلپس نے اس عفریت کو گاؤں والوں کے ساتھ مل کر جلا دیا تھا۔ وہ بھی بالآخر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ فلپس کو اپنی بیٹی کے مرنے کا دکھ تھا مگر لورین کی وجہ سے گاؤں کے بہت سارے بے گناہ لوگوں کی اموات ہوئی تھیں۔ یہ بلا کہیں سے بھی اس کی بیٹی نہیں ہو سکتی تھی۔

ریزو نے جنگل میں پہنچ کر شاکا کو آواز لگائی تو وہ تھوڑی دیر کے بعد ایک درخت پر نمودار ہو گیا۔

''کیا ہوا؟ یہاں کیوں آئے ہو؟'' شاکا حیران ہوا۔

''میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ تمہیں الوداع کہنا چاہتا تھا اور ساتھ ہی تمہارا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتا تھا۔ تم نے صرف کافز کو ہی نہیں بلکہ اس دنیا کو ان عفریتوں سے نجات دلائی ہے۔ تم ایک عظیم سردار ہو۔ میں تم پر ایک کتاب لکھوں گا۔'' اس کے لہجے میں عقیدت تھی۔

شاکا مسکرا دیا۔

''تمہاری بات پر کوئی بھی یقین نہیں کرے گا مگر تم کوشش کر سکتے ہو۔'' وہ درخت سے نیچے اتر آیا۔

''تمہارا زخم دیکھ سکتا ہوں؟'' وہ اس کے بازو پر بندھی پٹی دیکھ کر بولا۔

''مجھے اب درد محسوس نہیں ہو رہا اور ویسے بھی میں اب جانے والا ہوں۔ تمہاری دنیا کی یہ پٹی میں یہیں چھوڑ کر جاؤں گا۔'' اس نے اپنے بازو سے وہ پٹی کھینچ کر اتار دی۔

ریزو نے دیکھا کہ اس کا زخم بھر چکا تھا۔ یہ واقعی حیرت انگیز تھا مگر وہ شاکا کی کس کس بات پر حیرت کا اظہار کرتا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' وہ اسے اپنے زخم کی طرف متوجہ دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''تم حیرت انگیز ہو۔ کیا تمہاری دنیا میں باقی سب بھی تمہاری طرح ہی ہیں؟ کاش میں بھی کبھی تمہاری دنیا کا سفر کر سکتا۔ تم سے ملنے آسکتا۔ تمہارے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ ایک دن گزارتا۔'' وہ حسرت سے بولا۔

''کچھ چیزوں پر قدرت نے پردہ ڈالا ہوتا ہے۔ اسے پوشیدہ رہنے دو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ وہ میری دنیا ہے۔ میں وہاں کا سردار ہوں، مجھے کوئی روک نہیں سکتا مگر انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے حال سے بہتر چیز دیکھ لے تو اس کی تمنا کر بیٹھتا ہے۔ یہ تمہاری دنیا ہے۔ تم یہاں کے لیے بنائے گئے ہو۔ تمہاری جسمانی ساخت سے لے کر تمہاری خواہشات تک سب کچھ اس دنیا کے لحاظ سے تخلیق کیا گیا ہے۔ تم وہاں نہیں رہ پاؤ گے۔'' شاکا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں بھی آج ہی دارالحکومت روانہ ہو رہا ہوں۔ شاید ہم کبھی اس زندگی میں دوبارہ مل نہیں پائیں گے مگر ریزو تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھے گا۔'' وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرایا۔

شاکا نے اسے گلے لگا لیا۔

''تم کیسے جاؤ گے؟ کیا تمہیں کوئی لینے آئے گا؟'' ریزو پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''کالی چٹانوں کے پار میری دنیا کا راستہ کھلتا ہے۔ ہمیں سفر کرنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہم بس وہ تعددار تعاش (Frequency) تلاش کرتے ہیں جو وہ راستہ بہ آسانی کھول دے۔'' وہ اسے کیسے سمجھاتا۔

''کیا مطلب؟ کیا میں وہاں تک تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں؟'' ریزو کو اس کی باتیں سمجھ نہیں آئیں۔

شاکا نے ایک گہری سانس لی۔

''یہ میری دنیا کی طرف جانے والا تعددار تعاش ہے۔'' شاکا نے اپنے ہاتھ ہوا میں لہرائے۔ ریزو کے سامنے روشنیوں سے بنا ایک دائرہ نمودار ہوا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''اگر کبھی میری ضرورت پڑے تو اس کی مدد سے

www.pklibrary.com

میری دنیا میں آجانا۔'' وہ مسکرایا۔ دائرہ غائب ہوگیا۔

''وہ کیسے؟'' رینزو کو سب کچھ جاننا تھا۔

''ضرورت پڑنے پر تمہیں خود سارے راستے نظر آئیں گے۔ یہ نقش تمہارے لاشعور میں محفوظ رہے گا اور وقت پڑنے پر خود ہی ظاہر ہوجائے گا۔ اس سے پہلے نہ تم اسے مکمل کر پاؤ گے اور نہ ہی استعمال۔'' شاکا نے اسے سب کچھ بتا کر بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

''میرے جانے کا وقت قریب ہے۔ وہ راستہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ کھلتا ہے۔ تم اپنے گھوڑے پر سوار ہوجاؤ۔ میری رفتار بہت تیز ہے۔ تم میری رفتار کی برابری نہیں کر پاؤ گے۔'' شاکا یہ کہہ کر مشرق کی سمت میں چلنے لگا۔

رینزو اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ اس کو گھوڑے پر سوار ہوتا دیکھ کر شاکا نے دوڑنا شروع کردیا مگر رینزو کا گھوڑا ابھی اس کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر پایا تھا۔ شاکا کافی آگے نکل گیا تھا۔

رینزو کالی چٹانوں کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ اس نے شاکا کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ شاکا کے آواز لگانے پر اس نے اوپر کی طرف دیکھا۔ شاکا چٹانوں کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ رینزو کے لیے وہاں تک پہنچنا ناممکن تھا۔

شاکا نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھالیے۔ رینزو نے دیکھا چٹانوں پر سورج کی پہلی کرن پڑی تھی۔ اچانک شاکا کے سامنے روشنی کا ایک ہالہ سا نمودار ہوا۔ رینزو سانس روکے یہ حیرت انگیز منظر دیکھ رہا تھا۔ شاکا نے ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہا اور ایک ہی جست میں اس ہالے میں داخل ہوگیا۔ سورج کی دوسری کرن کے ساتھ ہی وہ ہالہ وہاں سے غائب ہوگیا۔

شاکا جاچکا تھا۔ اس دنیا سے ان عفریتوں کا خاتمہ کرکے وہ واپس اپنی دنیا میں، اپنے قبیلے میں پہنچ چکا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی رینزو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسے پہلی بار کسی کو الوداع کہنے پر اتنا دکھ ہوا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے واپس اپنے گھوڑے کی طرف آیا اور اس پر سوار ہوکر کافز کی طرف روانہ ہوگیا۔ ابھی اسے ایک اور مشکل مرحلے سے گزرنا تھا۔

اور وہ تھا لورین کی یادوں کے ساتھ کافز سے دارالحکومت تک کا سفر۔

☆☆☆

وہ گاؤں واپس لوٹا تو صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ لوئس تمام ضروری سامان بگھی میں رکھ چکا تھا۔ رینزو نے گھوڑا اصطبل میں باندھا اور ڈسپنسری میں داخل ہوگیا۔ ڈسپنسری خالی تھی۔ اس کا دل گھبرایا تو وہ فوراً ڈسپنسری سے باہر نکل آیا۔ گاؤں والے بگھی کے قریب جمع ہورہے تھے۔

فلپس گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ رینزو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے گھر کے اندر داخل ہوا اور سیدھا اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کہیں اور دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ فلپس اپنے کمرے میں ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ رینزو اس کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا۔ فلپس نے سر اٹھا کر رینزو کی طرف دیکھا اور اٹھ کر اس کے گلے لگ گیا۔ وہ بے تحاشا رو رہا تھا۔

آج کے دن تو اس کی بیٹی کو رینزو کے ساتھ دارالحکومت چلے جانا تھا۔ وہ باپ تھا۔ اس کا دکھ سب سے بڑا تھا۔ رینزو کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ کتنا ضبط کرتا؟ کتنا روکتا خود کو؟ رونے سے اس کا دل بھی ہلکا ہوا تھا۔ رینزو، فلپس کو کافی دیر تسلی دیتا رہا اور اسے ساتھ لے کر باہر آگیا۔ گاؤں والے بھی اشکبار آنکھوں کے ساتھ بگھی کے پاس جمع تھے۔ وہ اسے مختلف تحفے تھما رہے تھے۔

وہ آہستگی سے ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بگھی میں سوار ہوگیا۔ اس نے بگھی سے سر نکال کر کافز پر الوداعی نظر ڈالی۔ لوئس نے گھوڑوں کو چابک مارا۔ بگھی جنگل کے کچے پکے راستے پر دوڑنے لگی۔ وہ بالآخر دارالحکومت روانہ ہوچکے تھے۔

رینزو سارا راستہ لورین اور شاکا کو یاد کرتا رہا اور یہ یادیں اس کی ڈائری میں لفظ بن کر محفوظ ہوتی گئیں۔

☆☆☆

دو دن کے اس طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ دارالحکومت پہنچ گئے۔ اس نے گورنر کو کافز کے حوالے سے تحریری رپورٹ جمع کروائی۔ رینزو کو حکومت کی طرف سے انعام سے نوازا گیا۔

رینزو نے لوئس کو اپنا مددگار رکھ لیا تھا۔ دارالحکومت کی پُررونق زندگی نے لورین کی یادوں کو دھندلا کرنا شروع کردیا۔

رینزو نے اپنی ڈائری میں موجود وہ ساری ریسرچ الگ سے تحریری صورت میں محفوظ کرلی تھی جس میں عفریتوں کے حوالے سے معلومات درج تھیں۔ شاکا اور لورین کی باتیں بس اس کی ڈائری تک ہی محدود رہیں۔ ان صفحات کی نقل تیار کرنے اور ان کو موم سے محفوظ کرنے میں اسے دو مہینے لگے۔ اس نے ان کاغذات کو مختلف ممالک کی

www.pklibrary.com

حکومتوں کو بھجوا دیا اور اپنی محنت کے پھل کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔

اسے ایک ماہ بعد اٹلی سے بلاوا آیا۔ اس کی تحقیق کی تعریف کے ساتھ ہی اسے وہاں لیکچرر شپ آفر کی گئی تھی۔ فلپائن چھوڑنے کا وقت آ پہنچا تھا۔ اس کا دنیا گھومنے کا خواب پورا ہونے والا تھا۔ اس نے گورنر کے پاس اپنا استعفا جمع کرا دیا اور اب وہ لوئس کے ساتھ اٹلی کے سفر کی تیاری کر رہا تھا۔ لوئس پر وہ بہت بھروسا کرنے لگا تھا لہٰذا اسے اپنے ساتھ ہی اٹلی لے جانا چاہتا تھا۔ لوئس بھی خوشی سے تیاری کر رہا تھا۔

انہیں بحری جہاز کے ذریعے اٹلی تک کا سفر طے کرنا تھا۔ اسے سمندر کے سفر سے خوف آتا تھا مگر اس وقت تیز ترین سفر کا یہی ذریعہ میسر تھا۔ سفر کا دن آ پہنچا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ دارالحکومت سے جہاز میں سوار ہوئے اور جہاز نے اپنا سفر شروع کر دیا۔ دو دن گزر چکے تھے اور مزید دو دن کا سفر باقی تھا۔ رینزو کا خوف ختم ہو چکا تھا۔ وہ جہاز میں بھی رات دیر تک کام کرتا رہتا تھا اور اس رات بھی یہی ہوا تھا۔ کام ختم کر کے اس نے پاس رکھی اپنی ڈائری اٹھائی اور اس کے صفحے پلٹنے لگا۔ اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔ پچھلی کچھ راتوں سے اس کے دماغ میں ایک خیال جنم لیتا تھا جسے وہ تھپکی دے کر سلا دیتا تھا مگر آج اس خیال نے زور پکڑ لیا تھا۔ وہ مصمم ارادے کے ساتھ اٹھا اور اپنے بیگ سے لکڑی کا وہ ڈبا نکال کر اس چھوٹے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

لوئس کی آنکھ اس کی کھٹ پٹ سے ہی کھلی تھی۔ وہ اسے باکس نکالتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بھی اس کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ اسے ڈیک پر کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں وہ باکس تھا جس میں ان عفریتوں کے خون کے نمونے موجود تھے۔

''ڈاکٹر رینزو! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' وہ اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ رینزو اس کی آواز پر چونک پڑا۔

''میں یہ باکس سمندر کی نذر کر رہا ہوں۔ میں ان کو ضائع کر دینا چاہتا ہوں۔ میں انہیں اپنی تحریروں تک ہی محدود رکھوں گا۔'' رینزو نے مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے باکس کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری مہینوں کی محنت ہے۔'' وہ غصے سے بولا۔

رینزو کو اس کے گستاخانہ لہجے پر حیرت ہوئی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا لوئس نے وہ باکس اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟ واپس کرو یہ باکس مجھے۔'' رینزو کو اس پر شدید غصہ آیا۔

لوئس نے لمحے کی دیر کیے بغیر ہی رینزو کو جہاز سے دھکا دے دیا۔ زوردار چھپاکا ہوا اور وہ سمندر میں جا گرا۔ سمندر میں گرتے ہی وہ بری طرح ہاتھ پیر چلانے لگا۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا۔

لوئس اسے دیکھ کر مسکراتا رہا اور بالآخر اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ اس اندھیرے سمندر کی تہ میں اترتا چلا گیا۔ جہاز آگے نکل گیا تھا۔

لوئس نے رینزو کے ڈوبتے ہی چلا کر لوگوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا مگر وہ رینزو کو تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ وہ رات اور وہ سمندر رینزو کو نگل چکے تھے۔

اب وہ باکس اور وہ ڈائری لوئس کے پاس تھی۔ اس نے اس باکس کے اندر وہ شیشیاں بھی رکھ لی تھیں جو اس نے شاکا کے خون سے بھری تھیں اور اب وہ اٹلی میں ڈاکٹر لوئس کے نام سے اپنی ریسرچ شروع کرنے والا تھا۔ رینزو کا پتا رکھنے والا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ نہ دارالحکومت میں اور نہ اٹلی میں۔ رینزو اٹلی کبھی پہنچا ہی نہیں تھا۔ اس کی تحقیق اس کے انتظار میں پرانے کاغذوں کے نیچے دبتی چلی گئی۔

اور وہ بے نام و نشان ہی مٹ گیا تھا۔

☆☆☆

Year 2020

Russia News-Moscow

نیوز چینل پر صوفیہ کی گمشدگی کی سلائڈز چلنا شروع ہو گئی تھیں اور ساتھ ہی جیک کا فون بھی تواتر سے بج رہا تھا۔ اسے مختلف اداروں سے کالز موصول ہو رہی تھیں۔ وہ اس خبر کو مزید بڑھاوا دینے کے لیے صوفیہ کے اغوا کی خبر بھی چلوا رہا تھا۔ اینڈریو جیک کے آفس میں بیٹھا بے تابی سے صوفیہ کی کال کا منتظر تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ صوفیہ اس خبر کو دیکھتے ہی ان سے رابطہ کرے گی۔

مگر آدھا دن گزرنے کے بعد بھی صوفیہ نے چینل سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ البتہ صوفیہ کے والد نے جیک کو کال کر کے یہ خبر بند کرنے کا کہا تھا مگر جیک نے ان کی بات بھی ان سنی کر دی تھی۔

اگر صوفیہ کے والد کو پتا تھا کہ وہ کہاں ہے تو وہ اس کا پتا کیوں نہیں دے رہے تھے؟ یا وہ صوفیہ سے رابطہ کیوں نہیں کر پا رہے تھے؟ اور یہی بات اینڈریو کو بھی پریشان کر

www.pklibrary.com

رہی تھی۔

وہ جیک کے آفس میں ہی موجود تھا جب اس کے موبائل پر کسی پرائیویٹ نمبر سے کال آنا شروع ہوئی۔

''یس!'' جیک نے کال اٹھائی۔

''مسٹر جیک؟'' دوسری طرف سے بھاری مردانہ آواز گونجی۔

''جی بات کر رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

''میرا نام لیفٹیننٹ کرنل اسٹیو ہے اور میں آرمی چیف کے حکم کے مطابق آپ کو مس صوفیہ کے اغوا کی خبر بند کرنے کی ہدایت دیتا ہوں۔ اس ہدایت پر فوراً عمل کیا جائے اور اب صوفیہ کے نام پر مزید کوئی خبر نہیں چلنی چاہیے۔'' وہ سختی سے بولا۔

''لیکن فوج کا اس معاملے سے کیا لینا دینا؟'' جیک حیرانی سے بولا۔

اینڈریو اس کی بات سن کر چونک گیا۔

''مسٹر جیک! میں دوبارہ اپنی بات نہیں دہراؤں گا۔'' اس کے لہجے میں مزید سختی در آئی۔

اس سے پہلے کہ جیک کوئی جواب دیتا دوسری طرف سے کال منقطع کر دی گئی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔

''کیا ہوا ہے؟'' اینڈریو بے چینی سے بولا۔

''مجھے فوج کے ہیڈ کوارٹر سے کال آئی تھی۔ وہ ہمیں صوفیہ کے بارے میں چلائی جانے والی خبر کو بند کرنے کے آرڈر دے رہے ہیں۔'' وہ پریشانی سے بولا۔

''فوج؟ اس کا مطلب ہے صوفیہ کسی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔'' اینڈریو پریشانی میں اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہمیں فوراً اس خبر کو بند کرنا ہوگا ورنہ ہم مشکل میں پھنس سکتے ہیں۔ تم نیوز روم کو آرڈر دے دو کہ وہ اس خبر کو چلانا بند کر دیں۔'' جیک نے اپنے سامنے رکھی فائل اٹھا کر دوبارہ میز پر پٹخی۔ پہلے ہی وہ صوفیہ کی گمشدگی کی وجہ سے بہت نقصان اٹھا چکا تھا اور اب یہ فوج نازل ہو گئی تھی۔

اینڈریو اس کا موڈ خراب ہوتا دیکھ کر خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل آیا مگر اب وہ صوفیہ کی طرف سے اور زیادہ فکرمند ہو گیا تھا۔ آخر فوج اور صوفیہ کا کیا تعلق تھا؟ وہ کہاں تھی؟ اور کیا وہ زندہ بھی تھی یا.....؟ اسے یہ سوچ کر ہی جھرجھری آ گئی۔

اس نے کنٹرول روم کو جیک کے احکامات کے بارے میں مطلع کیا اور خود اپنی گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل آیا۔ اب اسے صوفیہ کو ذاتی طور پر تلاش کرنا تھا۔ وہ صوفیہ کو اس طرح بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

اس نے اپنی گاڑی ڈیوڈ کے فلیٹ کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دی۔ ڈیوڈ ایک جانا مانا سٹیلائٹ ہیکر تھا۔ وہ ڈیوڈ کی مدد سے صوفیہ کے فون کی لوکیشن معلوم کر کے بہ آسانی اس تک پہنچ سکتا تھا۔ خبر رساں ادارے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کو اکثر ڈیوڈ کی مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔

بیس منٹ بعد کے اس کی گاڑی شہر کی ایک مصروف شاہراہ پر رکی۔ وہ کار سے اتر کر فلیٹ کی بلڈنگ میں داخل ہو گیا۔ ڈیوڈ اکیلا رہتا تھا۔

اینڈریو جانتا تھا کہ وہ گھر پر ہی ملے گا کیونکہ وہ کوئی نوکری نہیں کرتا تھا بلکہ ہیکنگ ہی اس کا ذریعۂ معاش تھا۔ اینڈریو نے دروازے کے سامنے پہنچ کر اس کے فلیٹ کی بیل بجائی۔ تھوڑی دیر بعد ڈیوڈ آنکھیں ملتا ہوا دروازے پر نمودار ہوا۔

''اینڈریو! خیریت تو ہے؟ آج میری یاد کیسے آ گئی؟'' وہ جمائی لیتے ہوئے بولا۔ اینڈریو بغیر کوئی جواب دیے فلیٹ میں داخل ہو گیا۔

''مجھے تم سے ایک ضروری کام آ پڑا ہے۔'' وہ کندھے اچکا کر سیدھا مطلب پر آیا۔

''کیسا کام؟'' اس نے داخلی دروازے کے ساتھ رکھا فریج کھول کر دو بیئر کی بوتلیں نکالیں اور ان میں سے ایک اینڈریو کی طرف اچھال دی۔ اینڈریو نے اسے ہوا میں ہی پکڑ لیا۔

''بتاتا ہوں۔'' وہ بیئر کا ڈھکن کھولتے ہوئے بولا اور پھر اس نے ڈیوڈ کو ساری بات تفصیل سے بتا دی۔

''اوہ، یعنی اس معاملے میں فوج بھی شامل ہے۔ یہ تو بہت خطرے والا کام ہے۔ اس کے ڈبل پیسے لگیں گے۔'' وہ اپنے پاؤں صوفے کے اوپر رکھتے ہوئے بیزاری سے بولا۔

''مجھے منظور ہے لیکن یہ کام تم ابھی کرو گے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ اپنی بیئر لے کر ہیکنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس کمرے میں جدید قسم کے کمپیوٹرز اور اسکرینز لگی ہوئی تھیں۔ اینڈریو بھی اس کے ساتھ آ بیٹھا۔

وہ اینڈریو کی مہیا کردہ معلومات کے مطابق اپنا کام شروع کر چکا تھا۔ اینڈریو بے چینی سے ناخن چباتے ہوئے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

www.pklibrary.com

''صوفیہ کا موبائل آف ہے شاید۔'' وہ بڑبڑایا۔

''کوئی اور طریقہ نہیں؟'' اینڈریو پریشانی سے بولا۔

''بالکل ہے۔ انتظار کرو ذرا۔'' وہ اس کی بے چینی دیکھ کر بولا۔ اینڈریو خاموش ہوگیا۔

اینڈریو نے ڈیوڈ کو اچانک چونکتے دیکھا۔ وہ اپنی کرسی پر سیدھا ہو بیٹھا۔

''کیا ہوا، کچھ معلوم ہوا؟'' اینڈریو کی پریشانی بڑھتی چلی جارہی تھی۔

''صوفیہ کا فون واسٹوک آرمی ہیڈ کوارٹر کی لوکیشن دکھا رہا ہے مگر حیرت کی بات تو یہ ہے کہ صوفیہ کو وہاں جانے کی ضرورت کیوں پڑی؟ یہ تو سب سے ویران آرمی ہیڈ کوارٹر ہے اور اس برفانی علاقے میں تو وہاں کے فوجی بھی مشکل سے ہی گزارہ کرتے ہوں گے۔'' وہ اندازے لگانے لگا۔

''کیا تم کسی طرح وہاں کے حالات کا جائزہ لے سکتے ہو؟'' اینڈریو اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں واسٹوک کے سیٹلائٹ تک رسائی لینے کی کوشش کرتا ہوں۔'' ڈیوڈ کو خود بھی تجسس ہو رہا تھا۔

تقریباً چالیس منٹ بعد وہ واسٹوک کے سیٹلائٹ سے کنیکٹ ہوچکا تھا۔ وہ اسکرین کو زوم کرنے لگا۔ واسٹوک آرمی ہیڈ کوارٹر کی باہری عمارت نظر آنا شروع ہوگئی تھی۔ اس سے زیادہ اس کی رسائی نہیں تھی۔

اچانک وہ اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ اسکرین کو آخری بار زوم کرنے کے بعد جو تصویر اسکرین پر نظر آئی تھی، وہ اس کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھی۔ اینڈریو بھی اسکرین پر نظر پڑتے ہی خوف سے گنگ رہ گیا۔ اینڈریو کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے اسکرین کو دوبارہ زوم آؤٹ کیا۔

واسٹوک آرمی ہیڈ کوارٹر کے آس پاس انتہائی خوفناک قسم کی مخلوق گھومتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ زوم کرنے پر وہ چہرے مزید بھیانک ہوجاتے تھے اور وہ ازبھی رہی تھیں۔

''یہ..... یہ کیا بلا ہے؟'' ڈیوڈ سے بولا نہیں جارہا تھا۔

''تمہیں یقین ہے کہ صوفیہ کا موبائل یہیں موجود ہے؟'' اینڈریو خوفزدہ لہجے میں پوچھنے لگا۔

''اس کا فون وہیں موجود ہے۔ اس کا مطلب وہ بھی وہیں ہے مگر ان بلاؤں کو دیکھ کر مجھے نہیں لگتا کہ واسٹوک میں کوئی زندہ بچا ہوگا۔ شاید فوج بھی یہ بات چھپانا چاہ رہی ہے۔'' وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔

''اوہ صوفیہ! تم کس مصیبت میں پھنس گئی ہو۔''

اینڈریو اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''صوفیہ کے ساتھ تو جو ہونا تھا، وہ ہوگیا۔ تم یہ سوچو کہ اگر یہ شہروں تک آگئے تو ہمارا کیا ہوگا؟'' ڈیوڈ کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''کیا یہ ممکن ہے؟'' اینڈریو پریشان لہجے میں بولا۔

''تم دیکھو ان کے پر کتنے بڑے ہیں۔ یہ اڑ کر واسٹوک کے قریبی شہروں میں بہ آسانی داخل ہوسکتے ہیں۔ نہ جانے یہ کیا بلا ہیں اور کتنی تعداد میں موجود ہیں۔ اگر انہوں نے ہم پر حملہ کردیا تو ہمارا کیا ہوگا؟ ہمارا ملک اس خوفناک بلا کے حملے کی زد میں ہے اور فوج یہ سب چھپا رہی ہے۔'' اس کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔

''مجھے یہ بات جیک کو فوراً بتانا ہوگی۔ حکومت اور فوج اس خطرے کو ہم سے کیوں چھپانا چاہتے ہیں؟ انہیں لوگوں کو بتانا چاہیے تاکہ عوام اپنی حفاظت کے انتظامات کرے اور اپنے گھروں سے باہر نہ نکلے۔ تم مجھے کسی طرح ان بلاؤں کی تصاویر کے پرنٹ دے سکتے ہو؟'' وہ تیز لہجے میں بولا۔

ڈیوڈ نے اثبات میں سر ہلا کر کچھ بٹن پریس کیے تو پاس رکھے پرنٹر سے ان بلاؤں کی تصویریں پرنٹ ہوکر باہر نکلنے لگیں۔

اینڈریو تیزی سے پرنٹر کی طرف بڑھا۔ اس نے ان تصویروں کو ہاتھ میں لے کر ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ اس نے آج تک ایسی خوفناک مخلوق نہیں دیکھی تھی۔ اسے جھرجھری آگئی۔

''میں یہ تصویریں لے کر جارہا ہوں۔ پیسے تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردوں گا۔'' وہ بھاگتا ہوا اس کے فلیٹ سے باہر نکل آیا اور اب اس کی گاڑی تیزی سے رشین نیوز آفس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے جلد از جلد جیک کو یہ تصاویر دکھانا تھیں تاکہ وہ عوام کو اس خطرے سے آگاہ کرسکیں۔ اسے اب فوج کا ڈر بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ صوفیہ کی قربانی کو رائگاں نہیں جانے دے گا۔

☆☆☆

Year 2020

Vostok Army Headquarters-Russia

جوشوا واسٹوک آرمی ہیڈ کوارٹر کی چھت پر اترا اور وہاں سے نیچے چھلانگ لگائی۔ وہ علاقہ اس کے بھاری قدموں کی دھمک سے گونج اٹھا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کے

www.pklibrary.com

تیار کیے گئے وہ عفریت بھی واسٹوک کی چھت پر اترنے لگے۔ ان کے پروقت کے ساتھ مضبوط اور بڑے ہوتے جارہے تھے۔ ہرگزرتا لمحہ ان کی طاقت میں اضافہ کررہا تھا۔ اب وہ اڑ سکتے تھے۔ جوشوا کو اسی وقت کا انتظار تھا۔ وہ اڑنے کی طاقت حاصل کرتے ہی اپنی فوج کے ساتھ واسٹوک آرمی ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہوگیا تھا اور اب یہاں سے وہ باقی کی آرمی کے ساتھ شہروں کی طرف روانہ ہوجاتا۔

اس نے زمین پر قدم رکھتے ہی عجیب سی غراہٹ میں ان سب کو پکارا اور وہ مختلف سمتوں سے نکل کر اس کے سامنے اکٹھے ہونے لگے۔

''اب ہمیں شہروں کی طرف بڑھنا ہے۔ تم سب کمزور کی موت اور طاقتور کی امید بنو گے۔ شہروں سے طاقتور لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنا اور کمزوروں کو اپنی غذا بنانا تمہارا کام ہے۔'' وہ بولا تو اس کی آواز میں جانوروں جیسی غراہٹ تھی۔

وہ لوئس کا خون تھا۔ اسی کی طرح شاطر اور دھوکے باز۔ لوئس نے ان نمونوں پر برسوں کام کیا تھا مگر اسے کامیابی حاصل نہ ہوسکی تھی۔ وہ اسے اپنی نسلوں میں منتقل کرتا گیا۔ ہر وہ شخص جس کے پاس یہ ڈائری اور خون کے نمونے پہنچتے، اسے لوئس کی وصیت کے مطابق وہ معلومات فراہم کردی جاتی تھیں۔ لوئس کا خاندان اس ریسرچ کو آگے بڑھاتا گیا اور یہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا اور بالآخر جوشوا کامیاب ہوگیا تھا۔

اپنے آباؤ اجداد کی طرح اسے بھی پہلے سے معلوم تھا کہ شاکا کا خون کن شیشیوں میں محفوظ ہے۔ وہ شاکا جو آج سے صدیوں پہلے اس دنیا میں آیا تھا۔ وہ انسان جو ان عفریتوں سے بھی زیادہ خوفناک اور طاقتور تھا۔ وہ اس ڈائری میں لکھی ایک ایک بات پر من وعن یقین رکھتا تھا۔ اس کی نسلیں اس تحقیق کے پیچھے ختم ہوگئی تھیں۔

اور پھر اس نے شاکا کے خون کو بھی اس ویکسین کے ساتھ اپنے جسم میں اتار لیا تھا۔ اس لیے وہ سب سے الگ تھا۔ لوئس کا شاکا کی طرح طاقتور بننے کا خواب پورا ہوچکا تھا اور ساتھ ہی لورین کے دنیا پر قبضہ کرنے والے خواب کی بھی تکمیل کردی گئی تھی۔

جوشوا نے اس ڈائری کو بہت غور سے پڑھا تھا۔

ریزو کا مقابلہ ایک ہی وقت میں بہت سی خواہشات کے ساتھ تھا۔ لورین کی دنیا پر قبضے کی خواہش، شاکا کی بدکال کا دروازہ بند کرنے کی خواہش اور لوئس کی طاقتور بننے کی خواہش۔

ریزو کہاں غائب ہوگیا اور یہ ڈائری لوئس کے پاس کہاں سے آئی یہ جاننے کی اسے خواہش ہی نہیں رہی تھی۔ وہ جنگل دال کا راستہ ڈھونڈنے فلپائن بھی گیا تھا۔ ریزو کی تحریر کے مطابق وہ کالی چٹانوں میں غائب ہوگیا تھا۔ کافر بہت بدل چکا تھا۔ وہاں پہلے جیسا کچھ نہ تھا۔ اس نے ان کالی چٹانوں پر بہت سی راتیں گزاریں اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ جنگل دال کا دروازہ کھلنے کا انتظار بھی کیا مگر وہاں ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ ڈائری میں بدکال کے دروازے کی تفصیلات بھی نہیں تھیں یا شاید ریزو نے جان بوجھ کر نہیں لکھی تھیں۔

طاقت حاصل کرنے کی خواہش اب حکومت کرنے کی خواہش میں تبدیل ہوچکی تھی کیونکہ حکومت کے ساتھ طاقت تحفے میں ملتی تھی مگر اسے لورین کی طرح کمزور حکمران نہیں بننا تھا۔ اس نے فلپائن سے لوٹ کر اپنی شہرت پھیلانا شروع کی اور پھر اس نے حکومت کے سامنے آبِ حیات کا فارمولا رکھ دیا تھا۔

دشمن کا خوف اور اسے زیر کرنے کی خواہش والا فارمولا یہاں بھی کام آیا تھا۔ اسے وہ سارے ذرائع اور لوگ فراہم کردیے گئے تھے جن کی تلاش میں اسے عمر لگ جاتی تھی اور وہ بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح یہ معلومات آگے منتقل کرکے اس دنیا سے رخصت ہوجاتا۔

اور اب وہ ناقابلِ تسخیر تھا۔ اس کے پاس طاقت تھی، فوج تھی اور حکومت بھی آنے والی تھی۔ یہ صدی شاکا نہیں پیدا کرسکتی تھی کیونکہ اس نے جوشوا پیدا کردیا تھا۔

جوشوا کے کچھ فوجی ویکسین کے باکس لے کر واسٹوک آرمی ہیڈ کوارٹر میں اترے تھے اور اب وہ یہ زہر لے کر شہروں کی طرف جانے والے تھے۔ وہ شہر کے ہر طاقتور انسان کو اپنی فوج میں شامل کرنے کی تیاری کررہا تھا اور اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

Year 2020

Kubinka Air base-Moscow

وہ اندھیرے جنگل میں بھرمار بندوق لیے کھڑا تھا۔

اچانک وہ ایک طرف کو دوڑنے لگا۔ کوئی اس کا پیچھا کررہا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے جھیل کے کنارے پہنچ گیا۔ جھیل کے کنارے کوئی اس کی طرف پشت کیے بیٹھا تھا اور وائلن بجارہا تھا۔ وہ آہستگی سے چلتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے وائلن بجانے والے کا کاندھا ہلایا مگر اس کے

www.pklibrary.com

مڑتے ہی وہ ڈر کر پیچھے ہٹا۔ وہ ایک گلی سڑی لاش تھی۔ اس لاش نے اپنا منہ کھولا اور اس پر سیاہ گاڑھے سیال کی برسات کردی۔ وہ بھاگتا ہوا دوبارہ جنگل میں داخل ہوگیا۔ جھاڑیوں سے عجیب سی بلائیں اس پر حملہ کرنے لگیں۔ وہ ان کی سانپ جیسی زبانوں سے بچتا بچاتا ایک گاؤں کے چوراہے پر پہنچ چکا تھا۔ گاؤں خالی پڑا تھا۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ گاؤں کا جائزہ لینے لگا۔ گاؤں کے چھوٹے سے چرچ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں سے مدھم روشنی باہر نکل رہی تھی۔ وہ بے اختیار ہی چرچ کی طرف بڑھ گیا۔ چرچ کے اندر گاؤں کے لوگ کرسیوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر کھڑے ہونے لگے۔ اس کی نظر سامنے پڑی۔ فادر کے ساتھ سفید گاؤن میں ایک دلہن کھڑی تھی۔ وہ فادر کی طرف بڑھ گیا۔ فادر نے دلہن کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے دلہن کے چہرے پر پڑا وہ سفید پردہ اٹھایا۔

اس کی دلہن بہت حسین تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ وہ دلہن کو لے کر چرچ سے باہر نکل آیا۔

دلہن اسے لے کر ایک گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

اچانک جنگل سے ایک خوفناک بلا نمودار ہوئی۔ اس کا اوپری دھڑ اس کے نچلے دھڑ سے الگ ہوگیا۔ وہ ایک خون آشام بلا بن کر اڑنے لگی۔

وہ خوف سے پیچھے ہٹا مگر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ وہ بلا چنگھاڑتی ہوئی اس پر حملہ آور ہوئی۔

اس نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے کان میں بلا کی خوفناک چیخیں گونجنے لگیں۔

اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ کوئی اس کے سامنے پشت کیے کھڑا تھا۔ وہ اس اڑتی ہوئی بلا کو گلے سے دبوچ اسے زمین پر پٹخ رہا تھا۔

بلا زمین پر گر کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی۔

وہ شخص اس کی طرف پلٹا اور ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا۔ اس کا حلیہ جنگلیوں جیسا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، اس کی ہتھیلی پر ایک دائرہ بنا تھا جس میں عجیب سے نقوش تحریر تھے۔ بورس نے اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ دائرہ اب بورس کے ہاتھ پر نمودار ہوگیا تھا۔

اچانک آسمان پر روشنی کا ہالہ نمودار ہوا۔ وہ شخص ایک جست لگا کر اس ہالے میں غائب ہوگیا۔

بورس حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اسے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی تھی، وہ پلٹا تو وہاں ایک نوجوان کھڑا تھا۔ وہ نوجوان اس کے گلے آلگا مگر اس نوجوان کے گلے لگتے ہی بورس کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ بورس پانی کے اندر ڈوب رہا تھا۔ اس کے پھیپھڑوں میں پانی بھرنے لگا۔ نوجوان کا ہنستا ہوا چہرہ غائب ہوگیا تھا۔ اب چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ بورس تڑپتے ہوئے چلانے لگا۔

''بورس..... بورس! آنکھیں کھولو۔'' اسے جیکال کی آواز سنائی دی۔

بورس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔ وہ بُری طرح کھانسنا شروع ہوا۔ اس بار خواب کی جزئیات اتنی واضح تھیں کہ اسے اپنے پھیپھڑوں میں شدید تکلیف محسوس ہورہی تھی۔

وہ سب اس کے اردگرد کھڑے اسے حیرت سے تک رہے تھے۔ وہ کھانستے ہوئے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''ڈاکٹر بورس! کیا آپ ٹھیک ہیں؟'' شمشیر کو اس کی حالت ٹھیک نہیں لگی۔

وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا مگر بُری طرح لڑکھڑایا۔ جیکال نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی مگر اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا اور دیوار کا سہارا لیتے ہوئے لیب میں لگے واش بیسن تک پہنچ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھومنے لگا۔ وہ ڈوب رہا تھا۔ رو رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جلن شروع ہوگئی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

وہ سب جو اسے ہی دیکھ رہے تھے اس کے اس طرح رونے پر تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

''ڈاکٹر بورس..... ڈاکٹر بورس! کیا ہوا آپ کو؟'' ہیری اسے سہارا دینے لگا۔ وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

وہ ڈائری پڑھتے ہوئے اچانک ہی بے ہوش ہوکر گر گیا تھا اور وہ سب پچھلے پندرہ منٹ سے اسے ہوش دلانے کی کوشش کررہے تھے مگر ہوش میں آتے ہی اس کی یہ حالت ہوگئی تھی۔

''لوئس..... لوئس! یہ کیا کیا تم نے۔'' وہ اپنا سر پکڑ کر رونے لگا۔ جیکال نے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بورس کسی جذباتی لمحے سے گزر رہا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اسے دل کھول کر رونے دیا جاتا۔

وہ اس کے سنبھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ اسٹیوا اچانک لیب میں داخل ہوا۔ جیکال نے اسے بات کرنے سے

www.pklibrary.com

روکا۔ وہ حیرت سے بورس کو روتے ہوئے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سنبھل گیا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور دوبارہ منہ دھونے لگا۔

شمشیر نے اسے پانی کا گلاس پکڑایا جسے وہ ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ پانی پینے کے بعد اس کے حواس بحال ہوئے۔ اس نے ان سب کو مشکور نظروں سے دیکھا جو کافی دیر سے خاموش کھڑے اس کا پاگل پن برداشت کر رہے تھے۔

''کیا ہوا تھا آپ کو ڈاکٹر بورس؟'' اسٹیو پر ویسے ہی بہت دباؤ تھا اور اوپر سے یہ سائنس دان کام کرنے کے بجائے رونا دھونا مچانے میں لگے تھے۔ وہ فوجی تھا اور اس کی سوچ کے مطابق جذبات کی انسانی زندگی میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اس کی نظر میں انسان کی سب سے بڑی کمزوری اس کے جذبات تھے۔

''مجھے جوشوا کی ویکسین کا توڑ مل گیا ہے۔'' اس نے دھماکا کیا۔ وہ سارے اچھل پڑے۔

''کیا؟ مگر کیسے؟'' اسٹیو کو یقین نہیں آیا تھا۔ رونے سے بورس کو کیا حل مل سکتا تھا۔

''مجھے ڈاکٹر رینزو کے ریسرچ پیپرز ملنا کوئی اتفاق نہیں تھا۔ قدرت اسے مجھ تک پہنچانا چاہ رہی تھی۔ مجھے بچپن سے ایک خواب تواتر سے آتا ہے۔'' بورس نے انہیں اپنے خواب کی جزئیات بتانا شروع کیں۔

''تو اس خواب کا جوشوا کی ویکسین سے کیا تعلق ہے؟'' جیکال بولا۔

''ڈاکٹر رینزو کی ڈائری میں لکھی گئی ساری باتیں میرے خواب کا حصہ ہیں۔ مجھے وہ چہرے، وہ راستے اور وہ دھوکا، سب کچھ یاد ہے۔ میں اس تکلیف کو محسوس کر سکتا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ تم رینزو ٹیوس ہو؟'' جیکال کو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''کیا بکواس ہے؟ ہمارے پاس ان فضولیات کے لیے وقت نہیں ہے۔'' اسٹیو کو غصہ آیا۔

بورس نے انہیں کافر میں پیش آنے والے واقعات سنانا شروع کیے۔

''تم نے یہ ڈائری پڑھ لی ہے اور اب تم وہی باتیں کرو گے جو اس میں لکھی ہیں۔ ہم کیسے سچ اور جھوٹ کا فرق معلوم کر سکتے ہیں؟ اور اگر تم واقعی ڈاکٹر رینزو ہو تو دیکھو، تمہاری یہ خونی ریسرچ کیا تباہی لے کر آئی ہے۔'' ہیری اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں جو باتیں بتا رہا ہوں وہ اس ڈائری میں نہیں لکھیں اور یہ ریسرچ لوئس نے چرالی تھی۔ اس نے مجھے سمندر میں دھکا دے کر مار ڈالا تھا۔ لوئس اور جوشوا کا یقیناً کوئی نہ کوئی رشتہ ہے۔ یہ باتیں اس ڈائری میں تحریر نہیں ہیں۔'' وہ انہیں چاہ کر بھی نہیں سمجھا پا رہا تھا۔

''اچھا یہ سب چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ کہ اس ویکسین کا توڑ کیا ہے؟'' اسٹیو کو مطلب کی بات سے غرض تھا۔ وہ یہاں بیٹھ کر تاریخی کہانیاں نہیں سن سکتا تھا۔

''شاکا! وہ اس وقت بھی میری مدد کے لیے آیا تھا۔ ہم اسے یہاں لے کر آئیں گے۔ وہ ان عفریتوں کا خاتمہ کر دے گا۔'' بورس نے ڈائری کھول کر ان کے سامنے شاکا کا خاکہ لہرایا۔

''کیا؟ کون شاکا؟ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟ مجھے لگتا ہے تمہارا دماغ الٹ گیا ہے۔ سترھویں صدی کے کسی پاگل ڈاکٹر کی لکھی گئی اس جھوٹی کہانی کا فرضی کردار؟ تمہیں لگتا ہے کہ وہ ہماری مدد کے لیے آسمان سے اترے گا اور تم اسے اپنی کہانی بتا کر ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو؟ میں تو تمہیں بہت عقل مند سمجھتا تھا۔ یہ ان فضول باتوں کا وقت نہیں ہے۔'' اسٹیو کا دل چاہا کہ بورس کو اٹھا کر پٹخ دے۔

''اس ڈائری کی تحریر ایک سچائی ہے جسے تم فرضی کہانی کا نام دے رہے ہو۔ اسی پر عمل کرتے ہوئے جوشوا نے یہ ویکسین تیار کی ہے اور یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے۔ شاکا کو یہاں لے کر آنا ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی بھی ان کا خاتمہ نہیں کر سکتا۔ وہ فرضی کردار نہیں ہے، میرا یقین کرو۔'' بورس اپنی بات پر زور دے کر بولا۔

''چلو ہم مان لیتے ہیں کہ تم سچ کہہ رہے ہو مگر اس آدمی کو تم کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤ گے اور تمہیں لگتا ہے کہ وہ اب تک زندہ ہوگا؟ چار سو سال پرانی بات ہے یہ۔'' جیکال کو اس کی منطق سمجھ نہیں آئی۔

''شاکا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جسم بدلتا ہے مگر اس کی روح ہزاروں سال سے زندہ ہے۔ وہ آج بھی جنگل ال میں موجود ہوگا۔ ہمیں جنگل ال سے اسے یہاں لے کر آنا ہوگا۔'' بورس کے لہجے میں امید تھی۔

''یہ جنگل ال کیا ہے اور کہاں ہے؟ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔'' اسٹیو کو یقین ہو گیا تھا کہ بورس پاگل ہو چکا ہے۔

''ٹھیک ہے۔ تو آپ لوگ بنالیں ویکسین اور جوشوا کے فوجیوں کو پکڑ پکڑ کر لگائیں۔ بلکہ ایک کیمپ لگالیں جہاں

www.pklibrary.com

جوشوا ان سب کی ویکسینیشن کے لیے بہ آسانی پہنچ سکے یا پھر انجینئر بلا کر جدید ہتھیاروں پر کام کریں۔ نئی قسم کی اسنائپر یا بم جس سے شہر کو بھی اڑا دیا جائے۔ اب آپ کہیں گے کہ اتنی جلدی ہتھیار بنانا ناممکن ہے تو آپ کا سارا زور سائنس دانوں پر چل رہا ہے۔ ویکسین بنانا بھی اتنا آسان نہیں۔ یہ چار پانچ دوائیں ملانے سے تیار نہیں ہوجاتی۔ جس ویکسین کو بنانے میں جوشوا کو ڈیڑھ سال لگا، اس کی اینٹی ویکسین آدھے دن میں تیار نہیں ہوسکتی اور اگر ہو بھی گئی تو آپ انہیں لگائیں گے کیسے؟'' بورس کو شدید غصہ آیا تھا۔ اسٹیو لاجواب ہوگیا۔ بورس نے ان سب کی طرف دیکھا۔

''میں جانتا ہوں کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے اس لیے ہم شاکا کو یہاں لے کر آئیں گے۔ ورنہ یہ عفریت ہم سب کو ختم کرکے اس دنیا پر قبضہ کرلیں گے۔ آج سے صدیوں پہلے رونما ہونے والا یہ خونی کھیل دوبارہ دہرایا جارہا ہے اور اسے صرف شاکا ہی ختم کرسکتا ہے۔ میں اس تک پہنچنے کا راستہ جانتا ہوں۔ اگر تمہیں اس ڈائری پر یقین نہیں ہے تو مجھ پر یقین کرو۔ میں تمہیں وہاں تک لے کر جاؤں گا۔ ہم نے باقی طریقوں کو آزما لیا۔ اب شاکا کو آزمانے کا وقت ہے۔ وہ ان پر قہر بن کر ٹوٹے گا۔'' اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

''کیا کرنا ہوگا ہمیں؟'' اسٹیو نے ہار مان لی۔

''میری لیب تک جانے کی اجازت لینا ہوگی۔ وہاں میں نے ایک وارم پورٹل کھولنے کی تیاری کر رکھی ہے۔ ہم اسی کے ذریعے جنگدال کا سفر کریں گے۔'' بورس نے آنکھیں بند کیں اور شاکا کا بنایا ہوا وہ تعددار تعاش اس کے ذہن کے پردے پر مکمل ہوکر واضح ہوگیا تھا۔

اسٹیو، آرمی چیف سے اجازت لینے کے لیے لیب سے باہر نکل گیا۔ وہ سب عجیب سی کیفیات کا شکار تھے۔

بورس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ''میں آرہا ہوں شاکا۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

Year 2020

Jungdaal-Parallel Universe

رات سے برستی بارش صبح ہونے تک تھم چکی تھی۔ جنگدال کا پتا پتا دھل کر سرسبز و شاداب ہوچکا تھا۔

وہ جنگل کے بیچ تیزی سے دوڑتا ہوا آبشار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے مخملی سبزے کی ٹھنڈک پیروں سے دماغ تک جاتی محسوس ہورہی تھی۔ وہ ساتوں ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ ہی تھے۔ بارش نے جنگدال کو ایک نئی تازگی بخشی تھی اور وہ اس تازگی کو محسوس کرنے کے لیے بادلوں سے نکلتی اس آبشار کے دامن کو چھونا چاہتا تھا۔ وہ آبشار کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ بادلوں اور کالی چٹانوں سے نکلتی یہ آبشار آج بھی اتنی ہی عظیم تھی۔

اس کا اور اس آبشار کا ہزاروں سال کا ساتھ تھا۔

''شاکا! اوپر چلنا ہے؟'' جفل بولا۔

''مقابلہ ہوجائے؟'' وہ بادلوں کو دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

وہ ساتوں جانتے تھے کہ اس سے جیتنا ناممکن ہے لیکن مقابلہ کرنا ان کی فطرت تھی۔ وہ ان چٹانوں پر پھسلتے، ٹہنیوں سے لٹکتے اوپر چڑھنے لگے۔ کبھی شاکا کسی چٹان پر رک کر آبشار کی تیز دھار کے نیچے کھڑا ہوجاتا، کبھی درختوں کی شاخوں کو پکڑ کر اوپر چڑھنے لگتا۔ وہ آدھا راستہ چڑھتے، نیچے گرتے اور دوبارہ اوپر چڑھنے لگتے۔ ان کی آوازیں دور تک سنی جاسکتی تھیں۔ شاکا ان کے قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سفید بادلوں میں گھری چٹانوں پر بیٹھے جنگدال کا جائزہ لے رہے تھے۔ آبشار ان کے قدموں سے نکل کر نیچے گر رہی تھی۔ دور تک پھیلے جنگلات، جھیلیں، کھیت، جانوروں اور پرندوں کی آوازیں، یہ شاکا کا جنگدال تھا۔

دو سال پہلے اس کے بابا روحوں سے جا ملے تھے۔ اس کی ماں بھی شاکا کو سرداری کے تخت پر بٹھا کر اس دنیا کو خیر باد کہہ گئی تھی۔ انہیں سرداری تو مل جاتی تھی مگر اس جسم کو شاکا کے لائق بنانا اس کی ذمے داری تھی۔ بچپن سے ہی جس طرح ان کی تربیت کی جاتی تھی وہ جنگدال میں کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

صبح و شام اس آبشار پر چڑھنا اترنا، تیندوؤں کے ساتھ دوڑنا، بھیڑیوں سے لڑنا، پرندوں اور جانوروں کی بولیاں سیکھنا، درختوں کے اوپر سفر کرنا، کھیتوں میں جانوروں کی جگہ خود ہل چلانا اور نشانہ بازی سے لے کر ہاتھوں کو مضبوط کرنے کی مشقیں کرنا۔

وہ اسی طرح جوان ہوتے تھے لیکن روحوں کا سایہ صرف شاکا پر ہوتا تھا۔ غفراش صرف شاکا کے بازو پر سوار ہوتا تھا۔

جب سے اس نے سرداری سنبھالی تھی جنگدال پُرسکون تھا لیکن اسے ایک ساتھی کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔

''شاکا! تمہارا ساتھی چننے کا وقت قریب آرہا ہے۔

www.pklibrary.com

جنگل ال میں بڑا جشن کریں گے۔'' اچانک غاز بولا۔ شاکا مسکرانے لگا۔

اس کے لیے جیون ساتھی ہمیشہ چاند نے چنا تھا اور اس نے ہمیشہ اس فیصلے کے آگے سر جھکایا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' یاگا اسے خاموش دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''بہت دن ہو گئے شکار نہیں کیا۔'' وہ بادلوں سے جھانکتے سورج کی تپش کو جذب کرتے ہوئے بولا۔

''روز تو شکار کرتے ہیں۔'' یاگا کو حیرت ہوئی۔

''اس طرح کا شکار نہیں۔ کافی عرصہ ہو گیا جنگل ال سے کسی عفریت کا گزر نہیں ہوا۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اوہ، تمہیں بابا کے قصے یاد آ رہے ہیں۔'' خرگ کو ساری کہانیاں زبانی یاد تھیں۔ وہ لوگ اکثر رات ہوتے ہی الاؤ کے ارد گرد بیٹھ جایا کرتے تھے اور شاکا اپنے بیٹوں کو روحوں کے پاس چلے جانے والے شاکا کے قصے سنایا کرتا تھا۔ کبھی وہ اپنی کہانی سناتا، کبھی آباؤ اجداد کی مگر نام ہمیشہ شاکا کا ہی استعمال ہوتا تھا۔

''میرے پاس اپنے بیٹوں کو سنانے کے لیے کوئی قصہ ہونا چاہیے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''تم حکم کرو۔ ہم بدکال سے عفریت پکڑ لاتے ہیں۔'' خرگ جذباتی ہو گیا۔

شاکا ہنس پڑا۔

''نہیں، ایسے نہیں۔ وہ خود آئیں مقابلے کے لیے۔'' وہ کندھے اچکا کر بولا۔

''بدکال نے یہاں کھلنے والے راستے پر پہرا بٹھا دیا ہے۔ وہ ڈرتے ہیں تم سے۔ تم عفریتوں کے خواب میں انہیں ڈراتے ہو۔'' خرگ بولا تو وہ سارے ہنسنے لگے۔

''چلو واپس شاکال چلیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' شاکا نیچے اترنے کے لیے ٹہنی کا سہارا ڈھونڈنے لگا۔

وہ سب بھی اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اب ایک بار پھر وہ جنگل کے بیچ دوڑتے ہوئے شاکال کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اچانک درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ میں اضافہ ہوا۔ وہ بھاگتے ہوئے رکا۔ وہ سب بھی رک کر آس پاس دیکھنے لگے۔ اچانک غفراش درختوں کے بیچ سے اڑتا ہوا اس کے بازو پر آ بیٹھا۔

''غفراش!'' شاکا نے اس کے پروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حیرت سے اپنے بھائیوں کی طرف دیکھا۔

غفراش کا آنا اس بات کا اشارہ تھا کہ شاکا کی سرداری کو آزمانے کا وقت آ پہنچا تھا۔ لگتا ہے روحوں نے اس کی خواہش سن لی تھی۔ اسے عجیب سے اطمینان نے گھیرا۔ اس کی خواہش جلد پوری ہونے والی تھی۔ وہ بھی اپنے بیٹے کے پیدا ہونے سے پہلے ہی مقابلے کے لیے چنا جا چکا تھا۔ وہ دوبارہ شاکال کی طرف دوڑنے لگا۔ غفراش پرواز بھر کر اپنے سردار کے ساتھ ساتھ اڑنے لگا۔

شاکا ہر مقابلے کے لیے تیار تھا۔ اسے برسوں سے تیار کیا جا رہا تھا مگر وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اس بار اس کا مقابلہ جس سے ہونے والا تھا اس کی رگوں میں شاکا کا خون بھی دوڑ رہا تھا اور ایسا مقابلہ اس سے پہلے گزرنے والے کسی بھی شاکا کے حصے میں نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

Year 2020

Kubinka Airbase - Moscow Russia

بورس اس وقت میٹنگ روم میں موجود تھا۔ اس کے سامنے آرمی چیف، کرنل جنرل، ڈیفنس منسٹر اور اہم حکومتی افسران بھی موجود تھے۔ وہ سارے اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ اسٹیو نے انہیں اطلاع دی تھی کہ بورس بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے اور آرمی چیف نے خود ان باتوں کو سننے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر اب انہیں افسوس ہو رہا تھا کہ کاش وہ یہ سب نہ سنتے۔

جوشوا کو یہ پروجیکٹ دینے کے بعد سے لے کر اب تک بورس فوج کی نگرانی میں تھا۔ یہ بات شاید بورس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی مگر اسے جوشوا کے نعم البدل کے طور پر نظر میں رکھا گیا تھا۔ اگر پروجیکٹ کے دوران جوشوا کو کچھ ہو جاتا تو بورس کو اس کی جگہ تعینات کیا جاتا۔

فوج نے اپنا ہوم ورک مکمل کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ واسٹوک میں گڑبڑ ہوتے ہی اسٹیو کو بورس سے ملاقات کے لیے کہا گیا تھا۔ انہیں پوری امید تھی کہ بورس اس گڑبڑ کو سلجھانے میں فوج کی مدد کرے گا مگر بورس کی باتیں سن کر انہیں شدید مایوسی ہوئی تھی۔ وہ تو خود کو ڈاکٹر ریتز و سمجھ کر دوسری دنیا میں جانے کی بات کر رہا تھا۔

اور اب جبکہ جوشوا کی آرمی شہروں کی طرف رخ کرنے والی تھی، ان حالات میں بورس کی دماغی حالت نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ جوشوا کے ساتھ کام کرنے والے سائنس دان بھی ہر بات سے لاعلمی کا اظہار کر رہے تھے۔

www.pklibrary.com

شاید اب جوشوا کا ہتھیاروں سے مقابلہ کرنا ہی بہتر تھا مگر اس طرح تو یہ بات پھیل جاتی اور ملک میں افراتفری مچ جاتی۔ مزید یہ کہ ہتھیاروں سے شہریوں کو بھی نقصان پہنچتا۔

''آپ مزید کچھ کہنا چاہتے ہیں؟'' آرمی چیف نے کرسی سے ٹیک لگا کر افسوس سے سر ہلایا۔

''میرا یقین کریں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' اس کا دل چاہا کہ اپنے بال نوچ لے۔ وہ سارے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''آپ باہر انتظار کریں۔'' آرمی چیف نے بورس کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

''اب کیا کریں؟'' ڈیفنس منسٹر نے میز پر ہاتھ مارا۔

''ہمارے پاس ابھی کافی وقت ہے۔ کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔'' کرنل جنرل سیم بولا۔

''اسٹیو! تم ان سائنس دانوں کو یہاں لاؤ اور ڈاکٹر بورس کو ان کے گھر ڈراپ کروادو۔ یہ ہمارے کسی کام کا نہیں رہا اور ہاں، واسٹوک کی حالیہ صورتِ حال چیک کرو فوراً۔'' آرمی چیف کے چہرے پر گہری سوچ تھی۔

اسٹیو سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

''ڈاکٹر بورس! آپ میرے ساتھ آئیں۔'' اسٹیو اسے لے کر راہداری کی طرف بڑھ گیا۔

''کہاں جا رہے ہیں ہم؟'' بورس بولا۔

''آپ کے گھر۔ اب اس مشن پر آپ کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔'' اسٹیو بولا۔

''لیفٹیننٹ اسٹیو! آپ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے؟'' وہ بولنے ہی لگا تھا کہ اسٹیو نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کروا دیا۔

''ڈاکٹر بورس! یہ آرمی چیف کے فائنل آرڈرز ہیں لہٰذا آپ کو یہاں سے جانا ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس مشن کی خفیہ نوعیت کا خیال کرتے ہوئے رازداری برقرار رکھیں گے۔'' وہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔

بورس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

راہداری میں اچانک ہی صوفیہ نمودار ہوئی۔ وہ ان دونوں کو وہاں کھڑا دیکھ کر ان کی طرف چلی آئی۔

''لیفٹیننٹ اسٹیو! مجھے یہاں سے جانے کی اجازت چاہیے۔ آپ لوگوں نے مجھے یہاں بیکار میں رکھا ہوا ہے۔ میں کمرے میں بیٹھ کر انتظار نہیں کر سکتی۔ میں درخواست کرتی ہوں کہ مجھے جانے دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہاں کی کوئی بات لیک نہیں ہوگی۔'' وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

''ڈاکٹر بورس! آپ اپنی ضروری چیزیں سمیٹ لیں۔ پندرہ منٹ بعد آپ یہاں سے نکل جائیں گے اور مس صوفیہ! آپ انتظار کریں۔ میں آرمی چیف سے بات کر کے آپ کے جانے کا بھی انتظام کرواتا ہوں۔'' اسٹیو کی نظر میں ائربیس کو غیر متعلقہ لوگوں سے بھرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لہٰذا وہ آرمی چیف سے بات کر کے صوفیہ سے بھی جان چھڑانے کا سوچ رہا تھا۔

''سر! کنٹرول روم میں آپ کی ضرورت ہے۔'' اچانک ایک فوجی راہداری میں داخل ہوا۔ وہ ان دونوں کو وہاں سے جانے کا اشارہ کر کے اس فوجی کے ساتھ چل دیا۔

''ڈاکٹر بورس! آپ تو اس مشن کا اہم حصہ ہیں۔ آپ کو کیوں واپس بھیجا جا رہا ہے؟'' صوفیہ حیران تھی۔

''میں نے ایک حل بتایا ہے لیکن ان لوگوں کو میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا اور یہ مجھے پاگل سمجھ کر یہاں سے روانہ کر رہے ہیں۔'' وہ اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ میرے کمرے میں چلیں۔ ہم وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' صوفیہ کو اچانک ہی اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ کافی دیر سے سن گن لینے کی کوششوں میں تھی۔ اس کی تجسس طبیعت نے ہی اسے کمرے سے باہر نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ ہیری جب سے آرمی لیب میں داخل ہوا تھا، اس کی بھی کوئی خبر نہیں تھی مگر ڈاکٹر بورس کی صورت میں اسے خبر حاصل کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

صوفیہ نے اپنے کمرے میں پہنچ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

''مجھے بتائیں کیا حالات ہیں باہر کے اور آپ نے کیا حل نکالا؟'' وہ رازداری سے بولی۔

''مس صوفیہ! آپ کو میری بات پر یقین نہیں آئے گا اور آپ بھی ان لوگوں کی طرح مجھے پاگل سمجھنے لگیں گی۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''بالکل نہیں۔ میں ان سب کی طرح نہیں سوچتی۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی مشکل چیز کا آسان سا حل ہمارے سامنے موجود ہوتا ہے مگر انسانی فطرت ہے کہ وہ آسان راستے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور مشکلوں کو گلے لگا لیتا ہے۔ آپ اگر مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو ضرور بتائیے۔ میں اور آپ موت کو بہت قریب سے دیکھ کر واپس لوٹے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ ان حالات میں آپ نے جو بھی حل نکالا ہوگا، وہ یقیناً منطقی ہوگا۔'' وہ واقعی جاننا چاہتی تھی۔

www.pklibrary.com

''میرے پاس وقت بہت کم ہے کیونکہ مجھے کچھ ہی دیر میں یہاں سے نکلنا ہے۔ آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت مل جائے تو آپ میری لیب میں آجائیں۔ میں آپ کو پتا سمجھا دیتا ہوں۔ وہاں مجھے اپنی بات سمجھانے میں زیادہ آسانی ہوگی۔'' بورس اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''کیا آپ مجھے مختصراً بتا سکتے ہیں؟'' صوفیہ بے چینی سے بولی۔

''اسٹیو اور فوج اس معاملے کو خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔'' بورس ہچکچایا۔

''آپ کو لگتا ہے کہ یہ بات خفیہ رہے گی؟ اگر جوشوا شہروں میں داخل ہوگیا تو یہ لوگ اس بات کو چھپانے کے لیے دوڑیں گے یا عوام کی حفاظت کرنے کے لیے؟ اب سے کچھ گھنٹوں بعد یہ بات پوری دنیا میں پھیل جائے گی۔'' صوفیہ تیز لہجے میں بولی۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ بورس اس کی سمجھ داری سے متاثر ہوا اور ویسے بھی فوج نے اسے پاگل تصور کرلیا تھا۔ اگر صوفیہ اس کی تھیوری پر یقین کرلیتی تو اسے اپنی ریسرچ کو دنیا تک پہنچانے کے لیے نیوز چینل جیسا بڑا ذریعہ مل جاتا۔ ریز و کی یہی تو خواہش تھی۔

''میں وارم پورٹل کے ذریعے ایک ایسے جنگجو کو یہاں لانا چاہتا ہوں جو جوشوا کا مقابلہ کرسکتا ہے۔'' بورس بولا۔

''وارم پورٹل..... مگر کیسے؟'' صوفیہ کی آنکھیں حیرانی سے پھیل گئیں۔

''میں اپنی لیب میں اس پورٹل کو کھولنے کے لیے کافی عرصے سے کوششیں کررہا تھا اور مجھے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ باقی تفصیلات ابھی نہیں بتا سکتا۔'' وہ محتاط لہجے میں بولا۔

یہ تو اس سال کی سب سے بڑی خبر ہونے والی تھی۔ صوفیہ کے سامنے ایک ایسا سائنس دان بیٹھا تھا جو وارم پورٹل کھولنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ یعنی دوسری کائنات کا راستہ۔ ڈاکٹر بورس کی یہ تحقیق اس کے کیریئر کے لیے نئی اونچائی فراہم کرنے والی تھی۔

''اب آپ کو بھی میں پاگل لگنے لگا ہوں۔ ہے نا؟'' بورس اسے سوچ میں گم بیٹھا دیکھ کر بولا۔

''مجھے آپ کی بات پر یقین ہے ڈاکٹر بورس! میں بھی آپ کے ساتھ اس تحقیق میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے۔ لیب میں ملتے ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر اس کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

صوفیہ بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اسے اسٹیو کی طرف سے اجازت ملنے کا انتظار تھا۔ اس کے بعد وہ یہاں سے نکل کر اس سال کی سب سے بڑی خبر کی کوریج کرنے والی تھی۔

☆☆☆

آرمی چیف، جیکال اور اس کی ٹیم کے ساتھ بات شروع کرنے ہی والے تھے کہ اچانک اسٹیو عجلت میں میٹنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

''سر! میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔'' اس نے یہ کہہ کر میز پر پڑا ریموٹ اٹھایا اور میٹنگ روم میں لگی اسکرین کو آن کردیا۔ وہ مختلف چینلز آگے بڑھاتے ہوئے رشیا نیوز چینل پر آکر رک گیا۔ خبریں شروع ہورہی تھیں۔

آرمی چیف کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ آخر اسٹیو اس وقت خبریں کیوں دیکھنا چاہتا تھا؟ اچانک میٹنگ روم میں بیٹھے تمام افراد ہی چونک پڑے۔ چینل پر اہم خبر اور ریڈ الرٹ کی سرخیوں کے ساتھ سیٹلائٹ سے لی گئی دھندلی سی تصویریں نظر آرہی تھیں اور پھر نیوز رپورٹر کا چہرہ اسکرین پر ابھرا۔

''میں ہوں آپ کا رپورٹر اینڈریو ہاک..... ناظرین! اسکرین پر نظر آنے والی یہ بلائیں کسی فلم کا حصہ نہیں ہیں بلکہ یہ تصاویر واسٹوک آرمی ہیڈ کوارٹرز سے لی گئی ہیں۔ ہم اپنے چینل کے توسط سے پورے ملک کو مطلع کررہے ہیں کہ ہمارے ملک پر ان خوفناک بلاؤں کا حملہ ہوچکا ہے جو واسٹوک میں بلاخوف و خطر گھوم رہی ہیں۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ خون آشام بلائیں خوفناک ہونے کے ساتھ ساتھ اڑنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔ یہ بلائیں کسی بھی وقت واسٹوک کے قریبی شہروں میں داخل ہوسکتی ہیں۔ ہماری رپورٹر صوفیہ اس خبر کو آپ تک پہنچانے کے لیے اپنی جان گنوا بیٹھی ہے۔ فوج اور حکومتی ادارے یہ بات خفیہ رکھنا چاہتے ہیں لہٰذا لوگوں کو اپنی مدد آپ کے تحت حفاظتی اقدامات کرنے ہوں گے۔ واسٹوک کے قریبی شہروں میں رہنے والے اپنے گھروں سے نکلنے سے پرہیز کریں۔ اپنے ساتھ ہتھیار رکھیں اور کھانے پینے کا سامان وافر مقدار میں جمع کرلیں۔ یاد رہے کہ یہ خبر سب سے پہلے رشیا نیوز چینل پر سنائی گئی ہے۔ مزید خبروں کے لیے ہمارے چینل سے جڑے رہیں۔''

اینکر زور و شور سے مسالا لگا کر اس خبر کو پیش کررہا تھا۔ آرمی چیف غصے سے اپنی کرسی سے کھڑے ہوگئے۔

www.pklibrary.com

''کون ہے یہ پاگل؟'' ڈیفنس منسٹر کو بھی غصہ آیا۔

''سر! یہ مس صوفیہ کا نیوز چینل ہے اور یہ اسے ڈھونڈنے کے چکر میں اس طرح کی باتیں پھیلا رہے ہیں۔'' اسٹیو بولا۔

''باتیں پھیلا رہے ہیں؟ کیا تم سیٹلائٹ کی تصاویر نہیں دیکھ سکتے؟ اور یہ ان بلاؤں کی اڑنے والی صلاحیت کے بارے میں تو تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اب یہ بات پورے ملک میں آگ کی طرح پھیل جائے گی۔ ہمارے اوپر دباؤ بڑھ جائے گا۔ ہم ابھی تک اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ فوج کو تمام علاقوں میں الرٹ کردو۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو بھی الرٹ پر رکھو۔ واسٹوک کے قریبی شہروں کے تمام اسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ کردو۔ شہروں سے نقل و حرکت بند ہوجانا چاہیے ورنہ لوگ افراتفری میں بڑے شہروں کا رخ کریں گے اور راستے بلاک ہوجائیں گے۔'' آرمی چیف نے تیز لہجے میں آرڈر دیے۔

اچانک اس کے سامنے رکھا فون بجنے لگا۔ آرمی چیف نے فون کان سے لگایا اور دوسری طرف کی بات سننے کے بعد فون رکھ دیا۔

''پرائم منسٹر چاہتے ہیں کہ اس خبر کو فوری طور پر رکوایا جائے۔ اس آدمی کو یہاں لے کر آؤ، میں اس سے بات کرتا ہوں۔'' آرمی چیف نے اسٹیو کو اشارہ کیا تو وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسٹیو کے باہر نکلتے ہی آرمی چیف جیکال سے مخاطب ہوا۔

''ڈاکٹر جیکال! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ڈاکٹر بورس کی دماغی حالت آپ سب کے سامنے ہے اور اب یہ خبر نیوز چینل پر چلنے کے بعد پورے ملک میں افراتفری پھیل جائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمیں ان کی کوئی ایسی کمزوری بتائیں جو آپ کی نظروں سے گزری ہو اور ان پر قابو پانے میں ہماری مدد کرسکے۔ کوئی ایک ایسی بات جو آپ نے جوشوا کے منہ سے سنی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ فوری طور پر کوئی ویکسین تیار نہیں کی جاسکتی لیکن وقتی طور پر ان پر قابو پانے کے لیے ہم کیا کرسکتے ہیں؟'' وہ جیکال کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

اچانک شمشیر چونکا اور اس کا چونکنا آرمی چیف کی تیز نظروں سے چھپا نہ رہ سکا۔

''آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں ڈاکٹر شمشیر؟'' آرمی چیف نے اسے مخاطب کیا۔

''جی ہاں۔ مجھے کچھ یاد آیا ہے۔ جوشوا نے خود پر تجربے سے پہلے یہ تجربہ ایک بندر پر کیا تھا۔ اس بندر کو ہم نے کلوروفارم کے ذریعے تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش کیا تھا تاکہ ہم اس کے جسم سے سیمپل لے سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر بے ہوشی کی دوا اثر کرتی ہے مگر اس دوا سے بھی وہ بندر مکمل طور پر بے ہوش نہیں ہوا تھا بلکہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ اگر ہم بڑے پیمانے پر کلوروفارم اسپرے کریں تو انہیں اس حد تک کمزور ضرور کرسکتے ہیں کہ ان پر قابو پایا جاسکے۔ ابھی ان کی تعداد کم ہے تو انہیں نیم بے ہوشی کے دوران قید کرسکتے ہیں۔'' شمشیر بولا۔ آرمی چیف کو امید کی کرن نظر آئی۔

''کلوروفارم کا انتظام کرو۔ ہمیں زیادہ مقدار میں اس دوا کا ذخیرہ چاہیے۔ اگر یہ بلائیں شہروں میں آگئیں تو ہمیں ہیلی کاپٹرز کے ذریعے بڑے پیمانے پر کلوروفارم کا اسپرے کرنا ہوگا۔ جلدی کرو۔'' آرمی چیف نے جیکال کے پیچھے کھڑے آرمی آفیسر کو آرڈرز دیے اور وہ اسے سیلیوٹ کرکے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''آپ لوگ جاسکتے ہیں۔'' آرمی چیف جیکال سے مخاطب ہوا اور وہ لوگ بھی میٹنگ روم سے باہر نکل گئے۔

''کیا سوچا ہے آپ نے؟'' ڈیفنس منسٹر اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر بولا۔

''یہی کہ بند کمروں میں بیٹھ کر میٹنگ کرنے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ میں خود فورس کے ساتھ لاڈی واسٹوک روانہ ہورہا ہوں۔ اب باتیں کرنے کا نہیں بلکہ مقابلے کا وقت ہے۔'' آرمی چیف نے رشیا نیوز چینل پر چلتی اس تصویر پر نظر ڈالی۔ جوشوا کا سامنا کرنے کا وقت آپہنچا تھا۔

☆☆☆

اینڈریو کو زبردستی اٹھا کر کوبنکا ائربیس لایا گیا۔ جیک بلاؤں کی خبر چلانے کے حق میں نہیں تھا۔ اینڈریو نے اسے چینل کی ریٹنگ کی لالچ دی تھی تو وہ راضی ہوگیا تھا مگر اسٹیو کو دیکھتے ہی اس کی سٹی گم ہوگئی تھی۔ خبر چلنا بند ہوچکی تھی لیکن اب یہ خبر رشیا نیوز چینل کے توسط سے عوام تک پہنچ چکی تھی۔ ملک میں افراتفری اور خوف و ہراس پھیلانے کے نتائج ان سب کو بھگتنے تھے۔

اسٹیو، اینڈریو کو ایک خالی کمرے میں بٹھا کر وہاں سے غائب ہوچکا تھا۔ اینڈریو بے چینی سے اس کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا

www.pklibrary.com

اور اسٹیو، آرمی چیف کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

''آپ کسی صحافی کو اس طرح سے قید نہیں کر سکتے۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں نے لوگوں تک وہ سچائی پہنچائی ہے جو فوج اور حکومت لوگوں سے چھپا کر ان کی جانوں کو خطرے میں ڈال رہی تھی۔'' اینڈریو تیز لہجے میں بولا۔ پہلے ہی وہ صوفیہ کی وجہ سے غمزدہ تھا۔

''کس سچائی بات کی بات کر رہے ہیں آپ؟ ہم نے عوام سے کچھ نہیں چھپایا؟ ایسی کسی بلا کا کوئی وجود نہیں جس کی تشہیر آپ اپنے چینل پر کر رہے ہیں۔'' آرمی چیف ٹھنڈے اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''میری دوست صوفیہ اس رپورٹ کو کور کرنے کے چکر میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ اس بلا کا کوئی وجود ہی نہیں۔'' وہ ان کی ڈھٹائی پر حیران ہوا۔

''آپ کو کس نے کہا کہ مس صوفیہ اس بلا پر رپورٹ تیار کرنے کے لیے گئی تھیں؟'' وہ اینڈریو تک یہ خبر پہنچانے والے کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا۔

''میں نے اس کی موبائل لوکیشن معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اس کا موبائل واسٹوک میں تھا اور تب ہی میں نے سیٹلائٹ امیجز نکلوائے تھے۔ صوفیہ اس بلا کے ہاتھوں ماری جا چکی ہے۔'' وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا۔

آرمی چیف نے اس کی بات سن کر شکر کا سانس لیا۔ اینڈریو تک یہ خبر پہنچانے والا کوئی بیرونی ایجنٹ بھی ہو سکتا تھا مگر اسے اطمینان ہوا کہ یہ کسی مقامی ہیکر کا کام تھا اور بات ملک کی سرحدوں سے باہر نہیں نکلی تھی ورنہ واسٹوک میں اس خفیہ فارمولے کی تیاری کا راز کھلنا ان کے لیے مزید مسائل کھڑے کر سکتا تھا۔

صوفیہ کا موبائل چیکنگ پروٹوکول کے دوران ہیڈ کوارٹر پر روک لیا جاتا تھا اور اینڈریو اس ہیکر کے ذریعے بس وہیں تک رسائی حاصل کر سکا تھا۔ نیوز چینل اکثر ہی ہیکرز کی مدد لیتے تھے لہٰذا معاملہ اتنا سنگین نہیں تھا۔

آرمی چیف نے اینڈریو کو جواب دیے بغیر اسٹیو کو سر سے اشارہ کیا تو اسٹیو گردن کو ہلکا سا خم دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

''کوئی وضاحت پیش کرنا چاہیں گے آپ؟'' اینڈریو بولا۔

''انتظار کریں میرے جواب کا۔'' آرمی چیف یہ بول کر خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسٹیو، صوفیہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو اینڈریو اچھل پڑا۔

''صوفیہ.....! اوہ.....صوفیہ تم زندہ ہو؟ شکر ہے خدا کا!'' وہ حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیات سے دوچار ہوا۔

صوفیہ اسے وہاں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''مس صوفیہ! آپ کا چینل جھوٹی خبریں پھیلانے میں ماہر ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ غلطی دوبارہ نہیں دہرائی جائے گی۔ آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت ہے۔ یہاں رک کر میرے آرڈرز کا انتظار کریں۔'' آرمی چیف اینڈریو کی طرف دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں بولا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسٹیو نے بھی ان دونوں پر ایک سخت نگاہ ڈالی اور آرمی چیف کے پیچھے باہر نکل گیا۔

''اینڈریو! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' صوفیہ تیز لہجے میں بولی۔

جواباً اینڈریو نے اسے ساری روداد کہہ سنائی۔

''اینڈریو تم بھی نا..... حد سے آگے نکل جاتے ہو۔ اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ اس پر غصہ کرنے لگی۔

''مجھے لگا کہ میں تمہیں کھو چکا ہوں لیکن اگر تم یہاں ہو تو تمہارا موبائل واسٹوک میں کیا کر رہا تھا؟'' اینڈریو اب تک حیران تھا۔

''وہ سب میں نہیں جانتی۔ تم ان معاملات میں مت پڑو۔ ہمیں یہاں سے جانے کے آرڈرز مل چکے ہیں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد تم اس قصے کو بھول جاؤ گے۔'' صوفیہ اپنی بات پر زور دے کر بولی۔

آرمی چیف جو اس کمرے میں لگے خفیہ کیمرے کی مدد سے ان کی تمام باتیں دیکھ اور سن رہا تھا... اسٹیو کی طرف پلٹا۔

''یہ رپورٹر اینڈریو، صوفیہ کو بھی وہی کہانی سنا رہا ہے جو اس نے ہمیں سنائی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اسے زیادہ معلومات حاصل نہیں۔ ان دونوں کو ہیڈ کوارٹر میں رکھنا بیکار ہے۔ ان کے چینل کی وجہ سے اب یہ بات تیزی سے پھیلے گی۔ صوفیہ کو بھی اسی رپورٹر کے ساتھ یہاں سے روانہ کر دو اور لاڈی واسٹوک چلنے کی تیاری کرو۔'' آرمی چیف بولا تو اسٹیو اس کے احکامات کی تعمیل کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔

(جاری ہے)

www.pklibrary.com

کبھی حبس کے صحرا میں..... کبھی ہجر کے کانٹوں میں.....

دھنک رنگ موسموں کو تلاش کرنے والے دیوانوں کی داستان

گھٹن یادوں کی ہو یا حال کے حوالے سے جذبات و احساسات کا ادراک... یا پھر مستقبل کے خوابوں اور امیدوں میں بے بسی اور آس نراش کے لرزتے سائے کی جھلک نظر آتی ہو... دل کی دھڑکن کبھی رک رک جاتی ہے اور کبھی بے ترتیب انداز میں دھمال ڈال دیتی ہے... ایسے میں انسان کو اپنی بے وقعتی کا احساس رلا دیتا ہے... وہ جو یادوں کے زندان میں قید تھا اس کے باوجود اس کی آنکھیں آسمان کی وسعت میں جانے کس ستارے کو تلاش کرتی تھیں... اس کے لہو میں جو آباؤ اجداد سے جڑے رہنے کا احساس دوڑتا تھا... بہت کوشش کے باوجود بھی وہ بہت سی روایتوں سے دامن نہ بچا سکا۔ وہ جو صبح و شام جیتی جاگتی زندگیوں کو تسخیر کرکے آگے بڑھ جانے کا عادی تھا... اپنی نسل کو اس زہر سے چاہنے کے باوجود نہ بچا سکا... لیکن ان سب سے ہٹ کر وہ زندگی کی آخری شام سے پہلے یادوں کے اوراق پر محبت کی نئی کہانی رقم کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت جنہیں اپنے لیے منتخب کرلیتی ہے، وہ لوگ کبھی نہیں مرتے۔ طوفانی موسم ہو یا دکھ بھری مسافت... کسی کی محبت کا احساس ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔

آخری شام سے پہلے

طاہر جاوید مغل

چوتھا حصہ

www.pklibrary.com

pklibrary.com

www.pklibrary.com

اچانک داجے فضل کریم نے جذباتی انداز میں صالح کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ان کی بوڑھی ہوتی ہوئی نیلگوں آنکھوں میں ایک التجا تھی، ایک نمناک سی خواہش تھی، بولے۔ ”صالح پتر! مجھے اپنا بڑا اور اپنا ہمدرد سمجھ کر ایک بات مان لو۔ یہ سب جھمیلے چھوڑ کر اللہ کا حکم پورا کرو، تم شادی کرلو۔ تم دیکھنا سارے مسئلے تمہارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔“

وہ زور سے ہنسا۔ قریب سے گزرتی ہوئی ہیڈ ملازمہ صادقہ نے چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھا پھر تندور کی طرف چلی گئی جہاں روٹیاں لگانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

صالح نے بہکے ہوئے سے انداز میں کہا۔ ”آپ نے کیسی بات کردی ہے داجے! شادی میرے مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ہو ہی نہیں سکتی۔ اس شادی کا انجام بھی وہی ہوگا جو پہلی کا ہوا۔ شادی تو سالم بندے کی ہوتی ہے۔ میں سالم کہاں ہوں داجے.....! میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا ہوں۔ کوئی بیوی قسم کی چیز مجھے برداشت نہیں کر پائے گی۔ میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں وہ حیا سے بھی پہلے بھاگ جائے گی۔“

فضل کریم نے بڑے دکھ سے اس کی جانب دیکھا پھر آہ بھر کر بولے۔ ”ضروری نہیں صالح کہ ہر مرتبہ ایسا ہو۔ میں تو اس شادی کے حق میں ہی نہیں تھا۔ حیا کی بلکہ تم دونوں کی عمریں بہت چھوٹی تھیں۔ پھر تم نے نشہ بھی شروع کردیا۔ جس طرح کا سلوک تم نے اس کے ساتھ روا رکھا، وہ کوشش کے باوجود تمہارے ساتھ نباہ نہ کرسکی۔“

”تو اب میں کون سا بدل گیا ہوں داجے! اور بھی بُرا ہو چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کوئی عورت بھی میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔“

وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

”تو پھر تم کیوں ہوا ایسے؟“ وہ جیسے کراہ کر بولے۔ ”کیوں عورتوں کو کھلونا سمجھتے ہو اور توڑ پھوڑ کر پھینک دیتے ہو؟“

”میں نے تو خود آپ سے ایک بار یہ سوال پوچھا تھا کہ میں کیوں ہوں ایسا؟ کیوں ہر طرح کی محبت اور خوشبو مجھ سے دور ہوگئی ہے اور ہر طرح کی نفرت اور بُو میرے اندر بھری گئی ہے اور سچ کہتا ہوں داجے! اپنا یہ رویہ خود مجھے بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا۔ میں جانتا ہوں ..... اور آپ بھی یہی کہتے ہیں کہ عورت کو اللہ نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ اس سے پیار کیا جائے مگر میں نہیں کرسکتا پیار۔ اسے دکھ تکلیف دے کر ہی مجھے اچھا لگتا ہے۔“

”اپنے اس سوال کا جواب تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے صالح! تم بس ایک سے ہی محبت کرسکتے تھے اور وہ تمہارے پاس نہیں رہی مگر کسی محرومی کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ اپنی ساری زندگی ہی آگ میں جھونک دی جائے۔ سیانے تو یہ بھی کہتے ہیں صالح کہ اگر پیار محبت کے معاملے میں کسی عورت ذات کی وجہ سے کسی مرد کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو قدرت اس دکھ کا مداوا کسی دوسری عورت سے اس طرح کرا دیتی ہے کہ سب زخم بھر جاتے ہیں۔“

”تو ہو رہا ہے نا میرا مداوا دوسری عورت سے..... بلکہ عورتوں سے۔ بس یہی مداوا ٹھیک ہے میرے لیے۔“

”خدا کے لیے صالح! کچھ سوچو، خود کو سنبھالو۔ دیکھو تمہاری صحت بھی خراب ہو رہی ہے۔ ہڈیاں نکل رہی ہیں۔ کسی وقت رنگ پیلا پھٹک نظر آنے لگتا ہے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ.....“

داجے کی بات ادھوری رہ گئی۔ صالح کے بابا شاہنواز کی طبیعت شاید پھر خراب ہو رہی تھی۔ اندرونی کمرے سے ان کی ”ہائے ہائے“ کی گونجدار آواز ابھر رہی تھی۔ فضل کریم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”ڈاکٹر کھوکھر شاید بیٹھک میں ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”میں اسے بلا کر لاتا ہوں۔“

ان کے جانے کے بعد صالح تنہا، گنگناتے آبشار کے پاس بیٹھا رہا۔ اس کا دماغ کھول رہا تھا۔ شادی کا لفظ اس کی سماعت پر ہمیشہ ایک ہتھوڑے کی طرح لگتا تھا اور اس ضرب سے خانۂ دل میں تادیر شور برپا رہتا تھا۔ اب بھی شور تھا۔ باپ کی ہائے ہائے کی مدھم آواز کانوں تک تو پہنچ رہی تھی، سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ جھنجلایا ہوا سا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ قمیص کی بغلی جیب سے وہسکی کی کوارٹر بوتل نکال کر اس نے منہ سے لگائی اور تین چوتھائی خالی کر ڈالی۔ سیال آگ ذرا سی دیر میں پورے جسم میں پھیل گئی۔ وہ رہائشی حصے کی طرف بڑھا۔ اسے سنہری بالوں والی کال گرل کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی تھی مگر یکایک اسے یاد آیا کہ وہ دونوں پیشہ ور لڑکیاں تو نیلم بائی کے پاس واپس جا چکی ہیں۔ وہ کچھ اور جھنجلا گیا۔ اس نے رخ پھیرا اور باغ کی طرف بڑھا۔ بلی کے ایک بچے سے اس کا پاؤں الجھا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ جھنجلا کر اس نے اتنے زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ بیچارہ اڑتا ہوا سا ایک پتھریلے گملے سے جا ٹکرایا پھر کربناک انداز میں چلاتا ہوا ایک طرف گم ہوگیا۔ صالح باغ میں پہنچا، لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ گھنے درختوں کی دوسری جانب سفیدے کا ملائم پنڈے والا خمیدہ تنا تھا۔ اس نے

www.pklibrary.com

چھڑی اٹھائی اور اندھا دھند اسے پیٹنے لگا۔ درخت سسکیاں لینے لگا، رونے اور ہائے ہائے کرنے لگا مگر درخت تو روتے نہیں ہیں۔ ہائے وائے بھی نہیں کرتے تو پھر یہ کون تھا؟ صالح نے سوچا۔ شاید یہ وہی ملائیشیا سے آئی ہوئی ملازمہ رتابہ تھی جسے بابا نے اس بھری برسات میں اسی جگہ چھڑی سے بُری طرح پیٹا تھا۔

اخترے کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ مدھم چاندنی میں کھڑا ذرا حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے ''صالح سرکار'' کہہ کر پکارا تھا۔

صالح نے شرمندہ ہوئے بغیر چھڑی ایک طرف پھینکی اور بولا۔ ''کیا بات ہے؟''

''صالح سرکار! ایک بڑی خاص اور پکی خبر ہے آپ کے لیے۔'' وہ بولا۔

صالح ڈگمگاتا ہوا سا اس کے ساتھ وہیں ایک پتھریلے بینچ پر بیٹھ گیا۔ اخترے نے سرگوشی میں کہا۔ ''وکی صاحب..... اور پرنس شاہد بابڑ والی ٹینشن بڑے اُچّے لیول پر پہنچی ہوئی ہے۔''

''اوئے وہ تو پتا ہے..... آگے کی بات کر۔'' صالح بدستور ابتر موڈ میں تھا۔

اخترے نے آواز کچھ مزید دھیمی کی۔ ''آپ کو پتا ہی ہے پہلے ہفتے وکی بدلہ چکانے کے لیے پرنس کو ڈھونڈتا پھرتا تھا..... اگر وہ چاہے تو آج بڑا سپر موقع ہے اس کے لیے۔''

''وہ کیسے؟''

''مجھے پتا چلا ہے کہ پرنس نہر پار والے گاؤں ''ڈھیرو'' میں آیا ہوا ہے۔ گارڈ شارڈ بھی نہیں ہیں۔ بس ایک دوست ہے ساتھ۔ وہاں کسی پہلوان سے کوئی ڈاچی (اونٹنی) خریدنے آیا ہے۔''

''ڈاچی..... کوئی خاص ڈاچی ہے؟'' صالح نے پوچھا۔

جواب میں اخترے نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ وہ کوئی خوبصورت قیمتی ڈاچی ہے جو اس پہلوان کو بہاولپور کے کسی وڈیرے نے انعام میں دی ہے۔ وہ اسے بیچنا چاہتا ہے۔ وہ پہلوان بھی دراصل پہلوان نہیں، کبڈی کا ایک کھلاڑی تھا اور غالباً اس نے کسی مقابلے میں وڈیرے کو خوش کیا تھا۔

صالح جانتا تھا کہ وکی نے اپنی ٹانگ کے بدلے پرنس کی کم از کم ایک ٹانگ توڑنے کا پکا ارادہ کیا ہوا ہے۔ دو ہفتے پہلے سرباز ابھی دونوں میں کچھ مارا ماری ہو چکی تھی۔

صالح نے ساری صورتِ حال جاننے کے فوراً بعد وکی کو سرگودھا میں فون کیا اور اسے ''ڈھیرو'' گاؤں میں پرنس شاہد کی خفیہ آمد کے بارے میں بتایا۔ وکی سرتاپا تپا ہوا تھا۔ اس نے اسی وقت مار دھاڑ کرنے والے تین ڈشکرے ساتھ لیے اور پرنس سے حساب برابر کرنے کے لیے اپنی ویگنور جیپ پر سرگودھا سے چل پڑا۔ صالح نے اسے بتایا کہ وہ بھی موقع پر پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

صالح سرخاب منزل سے بس بیس پچیس منٹ میں ڈھیرو گاؤں پہنچ سکتا تھا مگر وہ اتنی جلدی پہنچنا نہیں چاہتا تھا کہ براہِ راست اس پھڈے میں ملوث ہو جائے۔ اس نے وہاں پہنچتے پہنچتے قریباً ایک گھنٹا لگا دیا۔ اخترا بھی جیپ میں اس کے ساتھ تھا۔ ابھی وہ ڈھیرو گاؤں سے دور ہی تھے کہ انہیں اوپر تلے آٹھ ایم ایم رائفل کے فائر سنائی دیے۔ یہ تین چار گولیاں ڈھیرو گاؤں میں ہی چلی تھیں۔ وہ دونوں وہیں پر رک گئے۔ دو تین منٹ بعد ہی انہیں کھیتوں کے درمیان نیم پختہ راستے پر دو گاڑیوں کی اچھلتی کودتی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ ہلکی چاندنی میں مناظر کافی دور تک نظر آ رہے تھے پھر یوں محسوس ہوا کہ ایک گاڑی نے دوسری کو سائڈ ماری ہے اور گاڑی درخت سے ٹکرا کر پہلو کی طرف الٹ گئی ہے۔

صالح نے چند لمحے سوچنے کے بعد اپنی جیپ کو آگے بڑھایا اور قریباً ایک فرلانگ دور جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ الٹی ہوئی کار پرنس شاہد کی تھی۔ وہ اس کے اندر زخمی حالت میں پھنسا ہوا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا دوسری گاڑی وقار (وکی) والی ویگنور جیپ تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت راہِ فرار اختیار کر چکا تھا۔

صالح کے اشارے پر اخترے نے احتیاطاً اپنا ماؤزر نکال لیا تھا۔ زخمی پرنس نے صالح اور اخترے کو پہچان لیا اور اخترے کے ہاتھ میں ماؤزر بھی دیکھ لیا۔ اس کے لہولہان چہرے پر خوف کے آثار نظر آئے۔

صالح نے اخترے کو اشارہ کیا تو اس نے ماؤزر کی نال جھکالی۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' صالح نے پرنس کو مخاطب کر کے کہا۔ ''ہم تمہیں نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

گاڑی کا دروازہ بُری طرح پھنس چکا تھا۔ صالح اور اخترے نے سخت کوشش کر کے اسے کھولا اور پھر بہ مشکل کھینچ کر پرنس کو باہر نکالا۔ پیٹرول کی بو آ رہی تھی۔ کار میں آگ بھڑکنے کا اندیشہ بھی تھا۔ پرنس کا ایک پاؤں زمین پر نہیں لگ رہا تھا۔ صالح اور اخترے اسے دونوں طرف سے سہارا دے کر کار سے دور لے گئے۔ اسی دوران میں دور سے کچھ

www.pklibrary.com

اور روشنیاں نظر آنے لگیں۔ یہ دو تین موٹر سائیکلیں اور ایک پک اپ تھی۔ یقیناً یہ لوگ ڈھیرو سے نکل کر وکی اور پرنس کے پیچھے آئے تھے۔

کار میں آگ بھڑکنا شروع ہوگئی تھی۔ آنے والوں میں سے کچھ نے اس تھوڑی سی آگ پر مٹی وغیرہ ڈال کر اسے بجھانے کی کوشش شروع کردی۔ کچھ لوگ زخمی پرنس اور صالح کی طرف آگئے۔ اگلے چند لمحوں میں صالح پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ کچھ ہی دیر پہلے وکی اور پرنس میں جو ٹاکرا ہوا ہے، اس میں ایک بندہ قتل ہوگیا ہے اور اس قتل کا ذمے دار وقار (وکی) موقع سے فرار ہوگیا ہے۔ صالح حیرت زدہ تھا۔ اسے ایسے سنگین نتیجے کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

..... صالح نے پرنس کو یہی بتایا کہ ایک کارندے نے اسے اطلاع دی تھی کہ پرنس کوئی جانور خریدنے کے لیے ڈھیرو گاؤں میں موجود ہے اور وہاں وکی کے ساتھ اس کا ٹکراؤ ہوسکتا ہے۔ وہ اس ٹکراؤ کو روکنے کی فکر میں یہاں آیا تھا۔

اختر نے صالح کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”صالح سرکار! کچھ بھی ہے، ہمیں زیادہ دیر یہاں رکنا نہیں چاہیے۔ مزید لوگ بھی آرہے ہیں۔“

اسی اثنا میں اچانک بھک بھک کی آوازوں کے ساتھ پرنس شاہد بابڑ کی پوری گاڑی آگ کی لپیٹ میں آگئی۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ صالح اور اختر اپنی جیپ کے قریب ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے وہاں سے نکل آنا ہی مناسب سمجھا۔

☆☆☆

سارے کام انسان کے ارادے اور پروگرام کے مطابق ہی تو نہیں ہوتے۔ وکی وہاں ڈھیرو گاؤں میں پرنس شاہد کو سبق سکھانے آیا تھا۔ اسے پھنل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر جب لڑائی بڑھی تو اسلحہ نکل آیا۔ آٹومیٹک رائفل کی کھینچا تانی میں گولی چل گئی اور ایک گولی پرنس شاہد کے ملازم کا تالو چیر کر دماغ میں گھس گئی۔

اب اس نہایت سنگین واقعے کو دو ہفتے گزر گئے تھے۔ وکی تاحال مفرور تھا۔ اندازہ یہی تھا کہ وکی کے باپ سیف اللہ نے لمبی چوڑی رقم خرچ کرکے اسے فوری طور پر بیرونِ ملک نکال دیا ہے۔

انکل سیف، ان کے اہلِ خانہ اور قریبی دوست پوری طرح زیرِ تفتیش تھے۔ پولیس تین چار مرتبہ سرخاب منزل بھی آچکی تھی اور صالح سے پوچھ گچھ کرچکی تھی۔ بظاہر اس جھگڑے میں صالح کسی طور ملوث نہیں پایا جاتا تھا بلکہ یہ بات اس کے حق میں بھی جاتی تھی کہ جھگڑے کے بعد وہ موقع پر پہنچا اور اس نے بابڑوں سے دشمنی کے باوجود زخمی شاہد بابڑ کی مدد کی۔

.....وکی اور اس کے پورے خاندان پر یہ ابتلا کے دن تھے۔ روپیہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا، بدنامی الگ ہورہی تھی۔ کاروبار کی چمک دمک بھی مسلسل ماند پڑتی جارہی تھی۔ یہ وہی کاروبار تھا جس کے لیے انکل سیف اور کافی حد تک اس کے بیٹے نے بھی سرخاب منزل سے رقابت نبھائی تھی۔ یہ سب کچھ صالح کے اندر کی آگ بجھا تو نہیں سکتا تھا مگر اس آگ پر پانی کے تسلی بخش چھینٹے ضرور پڑ رہے تھے۔ وہ وکی کے باپ کو سخت پریشان حال دیکھ رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست بنتے ہوئے کبھی بھی زیادہ دیر نہیں لگتی۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہورہا تھا۔ وکی جو چند سال سے اس کا لنگوٹیا دوست اور رازدار تھا، صالح کے دل میں ایک بدترین دشمن اور رقیب کے طور پر جگہ بنا چکا تھا۔ دوسری طرف شاہد بابڑ جو دشمن فیملی کا تھا، حیران کن طور پر اس کے قریب آرہا تھا۔ بے شک بابڑ فیملی سے ان لوگوں کی دشمنی اتنی جلدی ختم نہ ہوسکتی تھی مگر کم از کم پرنس شاہد اور صالح رائے کی حد تک کافی برف پگھل گئی تھی۔ اس دن تو صالح کو خاصی حیرت ہوئی جب ایک دوپہر شاہد بابڑ نے فون کرکے اسے بڑی رازداری سے اپنے ڈیرے پر بلایا اور اس کی خاطر تواضع کی۔ وہ اس بات پر مشکور تھا کہ صالح نے مشکل لمحات میں اس کی مدد کی۔ وہ کافی حد تک صالح کی اس بات پر اعتماد کررہا تھا کہ صالح ڈھیرو گاؤں والے جھگڑے سے الگ تھلگ تھا۔

ڈیرے پر ہی وہ شاندار ڈاچی بھی کھڑی تھی جسے خریدنے کے لیے شاہد بابڑ اس چاندنی رات میں ڈھیرو گاؤں گیا تھا۔ سفید رنگ کا ایک نر اونٹ بھی وہاں موجود تھا۔ پرنس نے صالح کو بڑی دلچسپی سے خوبصورت ڈاچی کو دیکھتے ہوئے پایا تو بولا۔ ”لگتا ہے کہ اچھی لگی ہے تمہیں؟“

”چیز ہی اچھی لگنے والی ہے۔“ صالح نے کہا۔

ڈاچی کی اون کو تراش کر اس کے جسم پر دلکش نقش و نگار بنائے گئے تھے اور وہ آرائشی چیزوں سے سجی ہوئی تھی۔

”اچھی لگ رہی ہے تو تم رکھ لو۔“ پرنس نے کہا۔

”اچھی تو لگ رہی ہے پر تم اتنے شوق سے لے کر آئے ہو۔ نہیں نہیں..... یہ ٹھیک نہیں۔“

www.pklibrary.com

"نورے..... او نورے!" شاہد بابڑ نے مخمور انداز میں اپنے کمدار کو آواز دی۔

سندھی ٹوپی پہنے ایک لمبا تڑنگا شخص جلدی سے اندر آ گیا۔ شاہد بابڑ نے کہا۔ "نورے! یہ ڈاچی ہمارے مہمان کو پسند آ گئی ہے۔ یہ مہمان کے ساتھ جائے گی۔"

"کیا کر رہے ہو شاہد!"

وہ مسکرایا۔ "جو کہہ دیا، وہ کہہ دیا۔"

صالح نے بہت انکار کیا مگر پرنس شاہد اپنی سی کر کے رہا۔ ڈاچی، صالح کے ساتھ ہی سرخاب منزل آ گئی۔

..... اگلے دو تین ہفتے میں صالح اور شاہد بابڑ کی قربت مزید بڑھی۔ حاکم بدر دین بابڑ یعنی شاہد کا والد اس قربت سے خوش نہیں تھا مگر فی الحال اس نے کوئی زیادہ سخت موقف اختیار نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف صالح کے بابا تو اب اس قابل ہی نہیں تھے کہ ایسے معاملات میں کوئی دخل دے سکتے۔

ایک رات جب صالح بابڑوں کے گاؤں میں تھا اور شاہد بابڑ کے ساتھ پی پلا رہا تھا، شاہد نے نشے کی ترنگ میں صالح کے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولا۔ "وہ اس غفورے والے معاملے میں تو اب افسوس ہونے لگا ہے۔ ایویں خوامخواہ تم لوگوں کو مشکل میں ڈالا.... وہ کمینہ شاید قابل ہی نہیں تھا اس عورت کے۔" (عورت سے اس کی مراد روزینہ تھی)۔

"کیوں، کیا ہوا؟"

"بھاگ گیا ذلیل شوہر واپس کویت..... اسی بنگالن کی بغل میں جا گھسا ہوگا۔ تم بس اس کیس کو ختم ہی سمجھو۔ جب پیروی کرنے والا ہی بکری بن گیا ہے۔"

"اور وہ روزینہ..... وہ کہاں ہے؟"

"یہیں ہے حویلی میں، ہمارے پاس۔ جب تم سے بھاگی تو سیدھا یہاں پہنچی۔ پندرہ بیس دن غفورا ساتھ رہا اس کے۔ اس کے ساتھ ایک کمرے میں سوتا رہا پھر بھاگ گیا۔ جاتے جاتے دو لاکھ روپیہ لے گیا مجھ سے۔ یوں سمجھو کہ دو لاکھ میں دستبردار ہو گیا اس سے۔"

"تمہاری حویلی میں اب کیا کرتی ہے؟"

"کھانا شانا پکاتی ہے۔ اچھا پکا لیتی ہے۔"

"کھانا شانا پکاتی ہے..... یا کچھ اور بھی؟" صالح نے زیر لب مسکرا کر نیم باز آنکھوں سے شاہد بابڑ کو دیکھا۔

وہ سر پیچھے کی طرف پھینک کر بلند آواز میں ہنسا۔ مخمور آواز میں بولا۔ "عمر تھوڑی زیادہ ہے لیکن ہے چکھنے والی چیز..... ویسے ابھی چکھا نہیں۔ کوئی بات نہیں گھڑے کی مچھلی ہے۔" پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ "اوئے ہاں یار! تمہیں بھی تو چکما دے کر نکل گئی تھی۔ تھوڑی سزا تو ملنی چاہیے اسے۔ کہو تو حاضر کروں اسے؟"

صالح گہری سوچ میں پڑ گیا۔ تب ایک اور تلخ بدبودار گھونٹ بھر کر بولا۔ "آ جائے گی؟"

"اس کا باپ بھی آئے گا۔" وہ پھنکارا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے خاص ملازم کو آواز دی۔ "اوئے نورے!"

نورا انگوٹھی کے جن کی طرح حاضر تھا۔ شاہد بابڑ اسے بتانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

صرف ایک گھنٹے بعد ڈیرے کے ائرکنڈیشنڈ کمرے میں جہازی سائز کے صوفے پر صالح پھیل کر بیٹھا تھا۔ شیشے کی تپائی پر سگریٹ، بوتل وغیرہ موجود تھے۔ اس کے سامنے روزینہ کھڑی تھی۔ پھولوں والی کالی قمیص، کالی شلوار اور لہریے دار دوپٹا، ناک میں کوکے کی چمک تھی۔ اس کی پلکیں جھکی تھیں اور بالوں کی لٹیں دودھیا چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ واضح طور پر ڈری سہمی تھی۔

"کیا سمجھا تھا تم نے..... بھاگ جاؤ گی..... ہماری مخالف فیملی کے پاس پناہ لے کر ہمیں تھانوں کچہریوں میں رولو گی اور غفورے کے ساتھ گھر بساؤ گی اپنا؟" روزینہ کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ کچھ بول نہ سکی۔

"تمہارے جیسی عورتوں کے گھر نہیں بستے۔ وہ دربدر رہتی ہیں۔ کبھی ایک بستر پر، کبھی دوسرے پر۔"

وہ پاؤں کے انگوٹھے سے پختہ فرش کو کھرچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"بچی کہاں ہے تمہاری؟" صالح نے پوچھا۔

"اسے حویلی چھوڑ آئی ہوں، ماسی کے پاس۔"

"پھر اب کیا چاہتی ہو؟" وہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے معنی خیز انداز میں بولا۔

اس نے خاموشی سے دوپٹا اتار کر ایک طرف صوفے پر ڈال دیا۔ پھر ذرا توقف کے ساتھ قمیص کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" صالح نے پوچھا۔

"جج..... جی!"

صالح اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

وہ حیران نظروں سے صالح کو دیکھنے لگی۔

اس نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ "میں ایک بار جس سے منہ موڑتا ہوں پھر اسے منہ نہیں لگاتا۔ جو فارغ ہو گیا، وہ ہو گیا..... چلو اٹھاؤ اپنے کپڑے۔"

"مم..... معاف کر دیں سرکار!" اس نے دونوں بازو موڑ کر اپنے سامنے رکھے ہوئے تھے۔

www.pklibrary.com

"کر دیا نا..... چلو پہنو کپڑے۔"

وہ رخ پھیر کر کھڑکی کے پاس گیا اور اس کا پردہ سرکایا۔ دور نیم تاریکی میں آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھنے لگا۔ پتا نہیں یہ وصف بھی اسے اپنے بڑوں سے ملا تھا۔ اسے پتا چلا تھا کہ اس کے بابا بھی کراچی میں جس عورت کے پاس ایک بار رہ لیتے تھے پھر دوسری مرتبہ نہیں رہتے تھے۔

نشے کے ہلکے سے سرور میں وہ بہت دھیمی آواز میں گنگنانے لگا۔

مغرور ہمیں کہتی ہے تو کہتی رہے دنیا
ہم مڑ کے کسی شخص کو دیکھا نہیں کرتے

☆☆☆

صالح ایک دن کے لیے بابڑ پورہ آیا تھا مگر بابڑوں کی حویلی کا ماحول اتنا مست تھا کہ وہ دو دن مزید رک گیا۔ حویلی سرخاب منزل جتنی بڑی تو نہیں تھی اور نہ ہی بابڑوں کی زمینیں رائے فیملی جتنی تھیں پھر بھی اپنے علاقے میں ان کی پگڑی کا شملہ اردگرد کی پگڑیوں سے اونچا تھا۔ شاہد بابڑ کو اگر پرنس کہا جاتا تھا تو اس کا باپ بدر دین کنگ سے کم نہیں تھا۔ حد درجہ آزاد خیال اور رنگ باز تھا۔ اپنے بچوں اور بھائیوں سے بھی کھلی ڈلی باتیں کرتا تھا۔ ادھیڑ عمر خاندانی بیوی تو بس نام کی بیوی تھی۔ اس کی اصل ضرورتیں دائیں بائیں کی عورتیں یا طوائفیں پورا کرتی تھیں۔

یوں تو ولایتی مشروبات بھی بابڑ حویلی میں آتے رہتے تھے مگر یہاں کے مکینوں کی اصل پیاس مقامی طور پر تیار کی گئی خاص شراب سے ہی بجھتی تھی۔ اس میں کیکر کی چھال اور گڑ وغیرہ کا استعمال خاص طریقے سے ہوتا تھا۔ بابڑوں کو گھوڑوں کے علاوہ اونٹ وغیرہ پالنے کا بھی خصوصی شوق تھا۔

وہ اتوار کا ایک روشن روشن دن تھا۔ پرنس شاہد اور صالح حویلی کے وسیع لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ موضوع وقار وکی ہی تھا جو ڈھیر و گاؤں والے قتل کے بعد منظر سے ایسے غائب ہوا تھا کہ بس اوجھل ہو کر رہ گیا تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ وقوعے کے فوراً بعد وہ بیرونِ ملک نکل گیا ہے۔ فی الوقت اس کا والد سیف اللہ بھی کہیں دائیں بائیں ہو چکا تھا۔ صالح، پرنس وغیرہ کے سامنے ظاہر یہی کرتا تھا کہ وہ وکی اور پرنس والے جھگڑے کے خاتمے کا خواہاں ہے مگر اندر سے وہ خوش تھا۔ اس جھگڑے کے سبب وکی کی فیملی اور ان کے کاروبار پر جو بداثرات پڑے تھے، وہ صالح کی خواہش کے عین مطابق تھے۔

گفتگو کے دوران میں پرنس کے والد کی کال آئی۔ انہوں نے اسے کسی کام سے حویلی کے اندر بلایا تھا۔ صالح وہیں بیٹھا اپنے موبائل کے اندر جھانکتا رہا۔

جو اونٹنی پرنس نے اسے دی تھی، اس کی درجنوں تصویریں صالح کے موبائل میں موجود تھیں۔ اسے کوئی جانور کم ہی اتنا پیار لگا تھا جتنی وہ اونٹنی لگی تھی۔ اونٹنی کا نام اس نے سوہنی رکھا تھا اور وہ واقعی رج کے سوہنی بھی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں صالح اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ وہ سیکھی سکھائی رقاصہ تھی۔ جھانجریں وغیرہ پہن کر جب وہ سرخاب منزل کے مردانے میں ناچتی تھی تو دیکھنے والے مبہوت رہ جاتے تھے۔ چار پانچ ماہ بعد موسم بہار میں میانوالی کی ایک مویشی منڈی میں اونٹوں کی خوبصورتی اور رقص کا ایک بڑا مقابلہ ہونے والا تھا۔ صالح کا پکا ارادہ تھا کہ سوہنی کو وہاں لے کر جائے گا۔ اس کے لیے ابھی سے تیاری بھی شروع کر دی گئی تھی۔

موبائل پر تصویریں دیکھتے ہوئے صالح مگن تھا جب اسے چھن چھن کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور چند لمحے کے لیے مبہوت رہ گیا۔ حویلی میں کھڑی ایک لینڈ کروزر جیپ کے عقب سے ایک حسینہ دلنواز لاچے کرتے میں ملبوس قلانچیں بھرتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ وہ جس جانور کے پیچھے بھاگ رہی تھی، وہ بکری کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ جو بھاگی آ رہی تھی، اس کی سب سے خاص بات اس کے غیر معمولی طور پر لمبے سیاہ بال تھے۔ وہ اس کے ٹخنوں تک جاتے محسوس ہوتے تھے۔ جسم یوں جیسے ہریالی کے پس منظر میں بجلی سی چمک رہی ہو۔ یہ وہی آفتِ جاں طوائف زادی نازو تھی جس کی وجہ سے پرنس اور وقار عرف وکی میں ٹاکرا ہوا تھا اور اس ٹاکرے کے نتیجے میں بالآخر ایک قتل ہو گیا تھا۔

دراز گیسو والی لڑکی صالح کی نگاہوں سے بے خبر بکری کے بھیگے ہوئے بچے کے پیچھے لپکتی چلی گئی پھر اسے دبوچا اور واپس پلٹی۔ اپنے گیلے بال اس نے پلٹ کر اپنے سامنے کر لیے تھے جو بہ آسانی اس کے گھٹنوں تک پہنچ رہے تھے۔ لڑکی کے دلکش جسمانی خطوط نے صالح کی بصارت کو چندھیا ڈالا تھا۔ وہ دور سے صالح پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالتی ہوئی حویلی کی اندرونی دیوار کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔

وہ اوجھل تو ہو گئی مگر صالح کے سینے میں ایک آگ سی بھڑکا گئی۔ اس نے نازو کے بارے میں پہلے وکی اور پھر پرنس شاہد سے بھی کافی کچھ سنا تھا۔ مگر آج اسے سرتاپا پہلی

www.pklibrary.com

بار دیکھ رہا تھا۔ ایکا ایکی اسے پرنس شاہد سے حسد محسوس ہونے لگا۔ ایسی توبہ شکن حسینہ شاہد کے پاس تھی..... اور بلاشرکت غیرے۔ شاہد کے باپ نے اپنے بیٹے کے لیے خود اس کی نتھ اتروائی تھی اور اب وہ پوری کی پوری پرنس شاہد کے تصرف میں تھی۔

☆☆☆

ایک رات مزید بابڑ حویلی میں رہ کر صالح واپس سرخاب منزل تو آ گیا مگر اس کی آنکھیں جیسے وہاں حویلی میں ہی رہ گئی تھیں۔ وہ کیسا لمحہ تھا جو تیر کی طرح صالح کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا تھا۔ بعد ازاں پرنس سے ہی اسے پتا چلا تھا کہ نازو اپنے اس مہینے کو تالاب میں نہلانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ بھاگ نکلا تھا۔ لمحے اور وقت کے ٹکڑے ایسے ہی تیروں کا روپ اختیار کر کے نگاہوں کے راستے دل میں ترازو ہوتے ہیں۔ صالح کے اندر نرم گرم لمس کا وہی وسیع و عریض خلا پیدا ہو گیا تھا جو اسے اردگرد کی ہر شے سے بیگانہ کر دیتا تھا۔ چند ہی دنوں میں ان لمبے بالوں سے اسے بیر سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بال یا تو اس کے تکیے پر منتشر ہوں یا پھر وہ انہیں قینچی کے ساتھ اتنے بھونڈے طریقے سے کاٹے کہ بس برباد کر کے رکھ دے۔ یہ نہ جانے کیسی تخریب نمو پا چکی تھی اس کے اندر۔ وہ ہر خوبصورتی اور موزونیت کو بے ترتیب اور برباد کرنے پر تل جاتا تھا۔ ہر دلکشی کو مشکل میں دیکھ کر راحت محسوس کرتا تھا۔

بابڑ حویلی سے سرخاب منزل واپس آ کر وہ نازو کے سراپا میں اتنا الجھا رہا کہ اپنے اس پسندیدہ ترین جانور کی خبر گیری بھی نہ کر سکا جو آج کل اس کے حواس پر چھایا ہوا تھا بلکہ چھائی ہوئی تھی۔ سفید رنگت، کالی آنکھوں اور نازک لمبی گردن والی وہ ڈاچی جو ناچتی تھی تو سب کچھ رقصاں اور مست حال ہو جاتا تھا۔ اصطبل کی طرف ڈاچی نے بھی شاید صالح کی آمد کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے مسلسل صالح کو پکارنا شروع کر دیا۔ مجبوراً اسے چند منٹ کے لیے اس کے پاس جانا پڑا۔

..... اگلے دس پندرہ روز صالح نے عجب کیفیت میں گزارے۔ لمبے نم بال اس کے اردگرد چکراتے رہے اور اسے اپنے حصار میں جکڑتے رہے۔ تلوار سا چمکیلا بدن اسے اندر سے کاٹتا رہا۔

وہ اس لمحے کو کوس رہا تھا جب اس نے اچانک اس آفت جاں کو دیکھ لیا تھا۔ اب اس کی قربت کی بے مہار طلب اسے بے حال کر رہی تھی۔ یہ تو وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ پرنس شاہد اس طوائف زادی کو صرف جسمانی تعلق کے لیے حویلی میں رکھے ہوئے ہے۔ کوئی بہت پائیدار رشتہ تو ان دونوں کے درمیان نہیں تھا۔ وہ کھلونا تھی اور کھلونے سے تو پرخلوص بچوں کا دل بھی جلد ہی بھر جاتا ہے۔

ایک روز صالح نے فیصلہ کیا اور اپنی نئی ٹویوٹا جیپ پر بابڑ حویلی جا پہنچا۔ نومبر کی خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ پرنس شاہد اپنے پسندیدہ اونٹ ''لاڈلے'' کی ہیئر کٹنگ چولستان سے آئے ہوئے ایک اسپیشلسٹ کاریگر سے کروا رہا تھا۔ وہ صالح کو دیکھ کر خوش ہوا۔ دونوں حویلی کے ماڈرن انداز میں سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد دونوں کیکر کی چھال والی اسپیشل شراب کی ترنگ میں آ گئے تو صالح اپنا مدعا زبان پر لے آیا۔ اس نے طوائف زادی نازو کی تعریف اس انداز میں کی کہ شاہد اس کا بین السطور سمجھ جائے مگر یا تو نشہ اتنا زیادہ تھا کہ وہ سمجھا ہی نہیں یا پھر سمجھ کر بھی انجان بنا رہا۔ دونوں دیر تک مست ماحول میں رہے پھر پرنس کے باپ بدر نے دخل اندازی کی اور پرنس کو بتایا کہ تھیٹر والے کیس کے سلسلے میں سینئر وکیل حویلی آیا ہے، اس کے ساتھ ڈسکس کرنا ہے۔

صالح بھی سرخاب منزل واپس آ گیا۔ اس نے پہلی فرصت میں اپنے جہاندیدہ منیجر افراسیاب کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ کل بابڑ پورہ جائے اور پرنس شاہد بابڑ سے ملے۔ اس سے نازو کی حوالگی کے بارے میں بات کرے۔

افراسیاب نے پوری بات سننے کے بعد مسکراتی ہوئی معنی خیز نظروں سے صالح کو دیکھا اور بولا۔ ''چھوٹے سرکار! میں اس ساری صورت حال کو سمجھ گیا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ پرنس کے باپ نے ابھی تھوڑا ہی عرصہ پہلے اس لڑکی کے لیے کئی لاکھ روپیہ اور دس مرلے کا ایک گھر نتھ اتروائی میں دیا ہے۔ ابھی پرنس چھ مہینے سال تو اس کو اپنے پاس رکھنا چاہے گا۔''

''کہنا کیا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔''

وہ پھر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہمیں اس معاملے میں کچھ لو، کچھ دو کے اصول پر عمل کرنا ہوگا۔''

''تمہارا مطلب ہے..... پیسے وغیرہ؟''

''نہیں جی۔ ایک ہیرا آپ اپنے دوست سے لے رہے ہیں، ایک ہیرا اسے دے دیں۔''

جلد ہی صالح سمجھ گیا کہ افراسیاب کیا کہنا چاہتا ہے۔ کچھ ہفتے پہلے صالح نے سرگودھا میں جو پُرتعیش شب و روز گزارے تھے، ان میں انجم شہزادی نامی ایک نوخیز طوائف صالح کو بہت پسند آئی تھی۔ وہ ماڈل گرل بھی تھی۔ اس کے

www.pklibrary.com

لیے صالح نے نائیکا گوہر بائی کو منہ مانگے دام دیے تھے۔ پچاس لاکھ نقد اور دس پندرہ لاکھ کے تحائف کے عوض اسے چھ ماہ کے لیے اپنا پابند کرلیا تھا۔ ابھی صرف دو ماہ ہوئے تھے اور وہ ایک دو بار ہی اس کے پاس سرگودھا جاسکا تھا۔ منیجر افراسیاب کا مطلب یہ تھا کہ پرنس کے ساتھ ادلا بدلی کی جائے۔

صالح جانتا تھا کہ لین دین اور سودے بازی کا ماہر افراسیاب اپنا مدعا بڑے اچھے طریقے سے شاہد کے سامنے رکھ سکے گا۔

افراسیاب کو بابڑ پورہ بھیجنے کے بعد اس نے بڑی بے قراری سے اس کی واپسی کا انتظار کیا۔ وہ بار بار اپنے جہازی سائز کے کمرے میں جہازی سائز کے بستر کو دیکھتا اور تصور میں وہاں دراز گیسوؤں والی آفت جاں کو رونق افروز پاتا رہا۔

افراسیاب رات گئے سرخاب منزل واپس آیا۔ اس نے مدعا بڑے اچھے طریقے سے شاہد کے سامنے بیان کردیا تھا تاہم اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا تھا۔

''انجم شہزادی کی تصویریں وغیرہ تم نے دکھادیں اسے؟''

''ہاں جی! انہیں پسند آئی ہیں۔ وہ کسی کمرشل ایڈ میں اسے دیکھ بھی چکے ہیں مگر انہوں نے فوری طور پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔''

اگلے آٹھ دس روز عجیب بوجھل سی خاموشی میں گزر گئے۔ پرنس شاہد کی طرف سے کسی طرح کا کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ دوسری طرف یہاں صالح بے طرح تڑپ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ خوشبو آرہی ہو مگر کھانا دور ہو تو بھوک تو بڑھتی ہی ہے۔

لگتا تھا کہ پرنس تذبذب میں ہے۔ ایک طرف وہ طاقتور مخدوم رائے فیملی سے پیدا ہونے والے نوزائدہ تعلقات کا گلا گھونٹنا بھی نہیں چاہتا تھا، دوسری طرف اپنی پسندیدہ ترین ڈش کو بھی اپنے ''دسترخوان'' سے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔

خاموشی طویل ہوتی گئی اور سرخاب منزل میں صالح کی بیتابی بڑھتی گئی۔ کسی وقت وہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دیتا کہ شاید پرنس شاہد اپنی منظورِ نظر نازو کو سرخاب منزل بھیجنے سے پہلے کچھ دن اور اس کے ساتھ بسر کرنا چاہتا ہے۔ اپنی بے چینی کو کم کرنے کے لیے اس نے اپنی ڈاچی سوہنی کی طرف توجہ دینا شروع کردی۔ اونٹوں اور گھوڑوں کے مقابلۂ حسن کی تاریخ دن بدن قریب آرہی تھی۔ اس نے بھی پرنس کی طرح بھاری معاوضے پر چولستان سے ایک ماسٹر شتربان کو بلایا تاکہ وہ سوہنی کی دلکشی اور رقص میں اس کی مہارت میں اضافہ کرسکے۔ دیکھنے والے یہی کہہ رہے تھے کہ اس مقابلے میں سوہنی کوئی بڑی پوزیشن حاصل کرکے رہے گی۔ اس کی روزانہ ٹریننگ ہوتی تھی۔ بادام، گھی، مربا جات اور پتا نہیں کیا کیا کھلایا جاتا تھا۔

مسلسل خاموشی اور لمبے بالوں سے اپنی مسلسل دوری سے بے کل ہوکر صالح نے اپنے کارندۂ خاص اختر کو بابڑ پورہ بھیجا۔ بابڑ حویلی میں اختر کا ایک پرانا گرائیں صدیق شاہ نامی بھی رہتا تھا۔ اس سے ملنے کے بہانے اختر وہاں جاسکتا تھا اور ایک دو دن رہ بھی سکتا تھا۔ صالح کے بابا کی مسلسل بیماری اور سرخاب منزل پر صالح کی گرفت مضبوط ہونے کے بعد اختر کے رنگ ڈھنگ بھی بدل چکے تھے۔ اب کھٹارا موٹر سائیکل کی جگہ اس کے پاس 125 ہنڈا تھی۔ اس کا لباس اچھا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی پینٹ شرٹ بھی پہنتا تھا۔ تیل میں چپڑے رہنے والے بال ذرا اسٹائل میں آگئے تھے۔ بھرا ہوا لائسنس یافتہ ٹی ٹی پستول ہر وقت اس کے کپڑوں میں ہوتا تھا۔

حسب توقع اختر ادو دن بابڑ حویلی میں اپنے گرائیں صدیق شاہ کے پاس رہا۔ واپس آکر اس نے صالح کو گرانقدر اطلاعات دیں۔ اس نے بتایا کہ بڑے بابڑ بدر صاحب، پرنس شاہد اور صالح کی دوستی سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں اور ایک طرح سے وہی ان دونوں کے درمیان فاصلہ بھی پیدا کررہے ہیں۔ اختر نے بتایا کہ نازو اور ماڈل گرل انجم شہزادی کے تبادلے کی جو آفر سرخاب منزل سے بابڑ حویلی گئی تھی، اس سے بدر صاحب بھی پوری طرح آگاہ ہیں۔

''کیا کہتا ہے بدر بابڑا؟'' صالح نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''صالح سرکار! جو کچھ مجھے ٹوہ لگی ہے اس کے مطابق پرنس شاہد کا خیال ہے کہ آپ نے اس سے ایک قیمتی چیز مانگی ہے اور جو کچھ آپ اسے بدلے میں دے رہے ہیں، وہ آپ کے لیے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ آپ نے تو ایک ڈیڑھ ماہ سے اس انجم شہزادی کو دیکھا بھی نہیں جبکہ پرنس نے نازو کو اپنے گھر رکھا ہوا ہے۔ میرا اندازہ ہے..... بلکہ یقین ہے کہ پرنس کے دماغ میں یہ باتیں اس کے باپ بدر صاحب نے ہی ڈالی ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے ان کے گھر کا ماحول بڑا کھلا ڈلا ہے۔''

اختر چند سیکنڈ خاموش رہا پھر ٹھہرے لہجے میں گویا

www.pklibrary.com

ہوا۔ ''صالح سرکار! صدیق شاہ کے مطابق بدر صاحب نے ایک اور بات پرنس شاہد کے دماغ میں ڈالی ہے اور میرا اندازہ ہے کہ یہی اس مسئلے کی کنجی ہے۔''

''کھل کر بات کرو۔'' صالح ذرا جھنجلایا۔

''آپ کو پتا ہی ہوگا پرنس شاہد کے پاس ایک اونٹ ''لاڈلا'' نام کا بھی ہے۔''

''ہاں، میں نے اسے دیکھا ہے۔''

''دراصل یہ جو ہماری اونٹنی سوہنی ہے، یہ پرنس نے اسی اونٹ کا جوڑا بنانے کے لیے خریدی تھی پھر یہ ہوا کہ یہ آپ کو پسند آگئی اور جوش میں آکر پرنس شاہد نے یہ آپ کو دے بھی دی۔ یہ جوڑا بنتے بنتے رہ گیا۔ اب کچھ عجیب بات یہ ہوئی کہ اس اونٹ کا جوڑا کسی اور سے بن ہی نہیں رہا۔ شاید آپ نے بھی سنا ہو وہ عجیب آواز میں بلبلاتا رہتا ہے۔ بدر صاحب نے بیٹے کو یہی پٹی پڑھائی ہے کہ اگر شاہنواز رائے کے بیٹے نے تم سے تمہاری کوئی قیمتی شے مانگی ہے تو تم بھی کوئی ایسی شے مانگو جو دینے میں اسے بھی تکلیف محسوس ہو۔ تم اس سے نازو کے بدلے میں سوہنی مانگو۔''

صالح حیرت سے اخترے کی باتیں سن رہا تھا۔

''تو..... اس بارے میں شاہد کیا کہتا ہے؟''

''ٹھیک ٹھیک تو پتا نہیں مگر صدیق کا خیال بھی یہی ہے کہ پرنس، سوہنی کی واپسی والی بات اپنی زبان پر نہیں لا رہا۔ یقیناً سوچتا ہوگا کہ ایک چیز خود آپ کو دے کر واپس کیسے مانگے۔''

تھوڑے ہی عرصے میں ڈاچی سوہنی اسے بہت عزیز ہو چکی تھی۔ وہ اس کی نگہداشت اور تربیت پر کافی روپیہ بھی خرچ کر چکا تھا۔ مزید کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر دوسری طرف یہ بھی تھا کہ غیر معمولی دراز زلفیں اور تراشیدہ پیکر اس کے سینے میں کچوکے لگاتے رہتے تھے۔ وہ دو دن ایک دوراہے پر رہا پھر پالتو جانور کی محبت پر ہم جنس کے پیکر کی دیوانی بھوک غالب آتی چلی گئی۔ دو مختلف جنس کے جاندار تھے مگر صورتِ حال شاید ایک جیسی ہی ہوگئی تھی۔ بابڑ حویلی میں پرنس کے اونٹ ''لاڈلے'' کو سوہنی چاہیے تھی اور یہاں صالح کو دراز گیسو نازو درکار تھی۔

پھر یوں ہوا کہ بہار کی اس سرمئی شام کو جب سبز کھیتوں پر درختوں کے سائے طویل ہو رہے تھے، صالح بجی سجائی سوہنی کو لے کر خود بابڑ حویلی پہنچ گیا۔ جب سوہنی ٹرک سے اتر کر حویلی میں داخل ہوئی تو پرنس شاہد اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ سوہنی اپنی طویل گردن کے آخری سرے پر اپنی کالی کالی آنکھیں گھما کر گرد و پیش کو دیکھ رہی تھی۔ یہی وقت تھا جب شاید لاڈلے نے اس کی بو پالی تھی۔ کسی گوشے سے اس نے عجیب آواز میں بلبلانا شروع کر دیا تھا۔

''یہ..... یہ کیا ہے صالح؟'' پرنس نے ششدر لہجے میں کہا۔

''تمہاری ڈاچی..... تمہارے لاڈلے کی بچھڑی ہوئی مادہ!'' صالح مسکرایا۔

اس رات حویلی کے مہمان خانے میں صالح اور پرنس کے درمیان سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ صالح نے پرنس کو بتایا کہ اسے پتا چل چکا ہے کہ سوہنی کو لاڈلے کے ساتھ جوڑا بنانے کے لیے خریدا گیا تھا اور یہ جوڑا ٹوٹنے سے بابڑ حویلی میں پریشانی پائی جاتی ہے۔

صالح نے پرنس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''..... اور یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ اس معاملے کا نازو والے معاملے سے کوئی تعلق ہے۔ نازو کی جگہ اگر تمہیں وہ انجم شہزادی قبول ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس معاملے کو ختم ہی سمجھو۔''

پرنس نے وہسکی کا ایک چھوٹا گھونٹ لینے کے بعد کچھ کہنا چاہا مگر صالح نے فوراً اس کے الکحل زدہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بس..... میں اب اس بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ سوہنی اب یہیں رہے گی۔''

''..... اور وہ جو تم نے مقابلے کے لیے اس کی تیاری کر رکھی تھی؟''

''تیری خوشی کے لیے ایسے سو مقابلے قربان..... اور بس اب اس بات کو فل اسٹاپ لگاؤ۔ اس سرائیکی گلوکار کو بلاؤ جس نے پچھلی مرتبہ عیسیٰ خیلوی والا گانا سنایا تھا۔''

دونوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں جب نیم گنجے سر اور کلف دار نیلی شلوار قمیص والا بدر بابڑ وارد ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے اور صالح کو اکٹھے بیٹھے دیکھا اور اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکن آگئی۔ وہ اونٹنی کی واپسی والی بات سے آگاہ ہو چکا تھا تاہم اس نے اس حوالے سے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ رسمی انداز میں صالح کے والد کا حال احوال دریافت کیا۔

صالح نے کہا۔ ''ان کا ایک اور چھوٹا سا آپریشن ہونے والا ہے۔ اسی سلسلے میں لاہور گئے ہوئے ہیں۔''

''میرے خیال میں آٹھ دس آپریشن تو ہو چکے ہوں گے اس کے؟'' بدر بابڑ کے لہجے کی تہ میں ہلکا سا طنز تھا۔

''خیر، اتنے تو نہیں..... تین ہوئے ہیں، یہ چوتھا ہے۔''

''چلو، نیک بندہ ہے۔ اوپر والا اس کے لیے چنگا ہی کرے گا۔'' بدر نے کہا پھر ایک دم موضوع بدل کر اور بیٹے

www.pklibrary.com

سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''شاہد! اس خبیث سیف کے پتر کی کو ہلاکت لینا۔ وہ مفرور تو ہے مگر ضروری نہیں کہ باہر ہی بھاگ گیا ہو۔ پاکستان میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی آنکھ میں سؤر کا بال ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے وہ۔''

''بے فکر رہیں اباجی!'' پرنس شاہد نے کہا۔ ''اس مرتبہ آیا تو لاش بن کر ہی جائے گا۔''

بدر بابڑا نے بیٹے کے سگریٹ سے سگریٹ سلگایا۔ اسی اثنا میں اس کے قیمتی موبائل پر کسی ذیل کی کال آ گئی اور وہ سنتا ہوا باہر نکل گیا۔

کچھ ہی دیر میں سرائیکی گلوکار حاضر تھا اور گا رہا تھا..... قیس تیری کالی..... نی سوہنے پھلاں والی۔

مویشی خانے کے کسی گوشے سے گاہے بگاہے لاڈلے کی آواز ابھرتی تھی۔ بہار کی اس رات میں وہ کافی مسرور محسوس ہوتا تھا۔

☆☆☆

ڈاچی بابڑ حویلی چلی گئی اور صرف تین روز بعد مہناز عرف نازو سرخاب منزل آ گئی۔ یہ چودھریوں، وڈیروں اور امیر زادوں کا وہی انداز تھا جس میں کبھی کبھی عورت کی حیثیت بھی پالتو اور زرخرید جانوروں جیسی ہو جاتی ہے۔ نازو کی آمد اور اس کے غیر معمولی لمبے گیسوؤں کے لہراؤ نے صالح کو سرشار کر ڈالا۔ اسی سرشاری اور خوشی میں اس نے فوراً اپنی سرگودھا والی رکھیل، ماڈل گرل انجم شہزادی کو بابڑ حویلی روانہ کر دیا۔ اسے بابڑ حویلی بھیجنے کے لیے صالح کو قریباً دس لاکھ کا اضافی خرچہ بھی کرنا پڑا مگر اسے روپے پیسے کی پروا اب کہاں تھی۔ امپورٹڈ لکڑی کا کاروبار اب نارمل چل رہا تھا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انکل سیف فی الحال کاروبار سے تقریباً آؤٹ تھے تاہم لکڑی کا کاروبار سرے سے نہ ہوتا تو بھی زمینوں سے اتنی آمدن آ رہی تھی کہ سرخاب منزل کے وارے نیارے تھے اور صالح یہاں کا اکلوتا ''راج کمار'' تھا۔

جس دن نازو سرخاب منزل پہنچی، داجے فضل بھی بابا جانی کے ساتھ لاہور میں تھے۔ صالح جانتا تھا کہ جب داجے، بابا کے آپریشن کے بعد سرخاب منزل پہنچیں گے تو نازو کو دیکھ کر ان کا پارا ساتویں آسمان کو چھو جائے گا۔ داجے فضل اس شرط پر سرخاب منزل واپس آئے تھے کہ صالح کم از کم حویلی میں کسی عورت کو لے کر نہیں آئے گا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر داجے زیادہ بگڑے تو وہ بی پلان پر عمل کرے گا اور نازو کو سرگودھا کی کسی کوٹھی میں رکھ لے گا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ صورتِ حال اس کی توقع سے کہیں زیادہ بگڑنے والی ہے۔

وہ شب اس کے لیے بڑی دلنشین تھی۔ وہ دراز تر ریشمی سیاہ زلفیں جو کئی شب و روز سے اس کے دل و دماغ پر چھائی تھیں، اس کے بستر پر منتشر تھیں۔ جنس کا دیو اس کے اندر چنگھاڑتا تھا۔ اس کے ڈی این اے میں نسل در نسل سفر کرنے والی وحشت اس کے بالوں بھرے جسم میں سرسراتی تھی اور اسے ہوش سے بیگانہ کرتی تھی۔ برسوں پہلے ساون کی پہلی بارش میں معصوم اٹھکیلیاں کرتے ہوئے اس ''یادگار دن'' کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

کیا واقعی کہیں نام و نشان نہ تھا؟

تین دن بعد داجے فضل، صالح کے بابا کو لے کر سرخاب منزل واپس آ گئے۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ جونہی داجے فضل کو طوائف زادی کی موجودگی کا پتا چلا، وہ آگ بگولا ہو گئے مگر صالح کے نکتۂ نظر سے ایک بات اس سے بھی زیادہ تشویشناک تھی۔ اپنی سلامت ٹانگ کی ایک چھوٹی سی سرجری کے بعد بابا شاہنواز کی طبیعت کچھ سنبھلی ہوئی نظر آئی۔ وہ نہ صرف ہوش میں تھے بلکہ نقاہت آمیز انداز میں تھوڑی بہت بات بھی کر رہے تھے۔

جونہی ان کی طبیعت کچھ بہتر ہوتی تھی، وہ سرخاب منزل کے معاملات پر گہری نظر ڈالنا شروع کر دیتے تھے۔ اس مرتبہ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اپنے کمرے کی ایک کھڑکی میں سے ان کی نظر نازو پر پڑ گئی جو اچھل اچھل کر سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ رہی تھی۔ وہ سخت غصے میں نظر آئے۔ انہوں نے فوراً ہیڈ خادمہ صادقہ کو بلایا اور اس سے نازو کے بارے میں پوچھا۔ اس نے ٹال مٹول کی کوشش کی تو شاہنواز رائے پھٹ پڑے۔ صادقہ ان کا غیظ و غضب نہ سہہ سکی۔ اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں انہیں بتا دیا کہ یہ لڑکی چھوٹے سرکار کی وجہ سے حویلی میں موجود ہے۔

حویلی کے بدلے ہوئے حالات دیکھ کر جو انگارے مہینوں سے مخدوم شاہنواز رائے کے سینے میں دہک رہے تھے، وہ ایکا ایکی شعلوں کا روپ دھار گئے۔ انہوں نے فوراً صالح کی آیا ماماں بی اور ماسی نصیبن کو بھی بلا لیا۔ جب تک داجے فضل پہنچتے، شاہنواز رائے ملازماؤں سے تفتیش مکمل کر چکے تھے۔

حسبِ اندیشہ تھوڑی ہی دیر بعد صالح کو والد کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ وہ ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ فرطِ غضب سے ہونٹ کانپ رہے

www.pklibrary.com

تھے۔ داجے فضل ایک جانب سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ''یقین نہیں آرہا کہ تم میرے بیٹے ہو..... یقین نہیں آرہا۔''

صالح نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو وہ ہاتھ اٹھا کر گرجے۔ ''شام سے پہلے پہلے اس ناپاک لڑکی کو حویلی سے نکالو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''لیکن بابا جانی.....!''

''مت کہو اپنی گندی زبان سے مجھے بابا..... تمہارے پاس صرف اور صرف بارہ گھنٹے کی مہلت ہے۔'' انہوں نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں کھانسی کا دورہ پڑا۔ ایک دو منٹ بعد کچھ سنبھلے تو پھنسی پھنسی آواز میں دوبارہ دہاڑے۔ ''میں مرا نہیں ہوں۔ زندہ ہوں ابھی اور اندھا بھی نہیں ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں جو نحوستیں تم اس حویلی میں پھیلا رہے ہو۔ باز نہیں آؤ گے تو کوڑی کوڑی کو محتاج کردوں گا۔ اس جائداد کا ایک ایک انچ کسی ادارے کو دے دوں گا۔ آخرت سنوار لوں گا۔'' فرطِ طیش سے ان کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

صالح آج تک اپنے باپ کے سامنے بولا نہیں تھا۔ کوشش کر رہا تھا کہ آج بھی نہ بولے مگر وہ اس کی خاموشی کو بھی انکار ہی سمجھ رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بلند آواز میں پکارا۔ ''مرادے..... مرادے..... اندر آؤ۔''

چند سیکنڈ بعد لمبا تڑنگا مراد اندر آگیا۔ اس کے بال لمبے اور کانوں میں مُرکیاں تھیں۔ وہ بابا شاہنواز کا ذاتی گارڈ تھا۔ اس نے فارغ ہوجانے والے جالے نوری کی جگہ لی تھی۔ صالح دیکھ رہا تھا کہ حد درجہ نقاہت کے باوجود بابا کا رنگ سرخی مائل ہونے لگا ہے۔ انہوں نے انگلیوں میں گردش کرتی ہوئی چھوٹی تسبیح ایک طرف رکھی اور مرادے کو مخاطب کرکے فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ ''اپنے ساتھیوں کو بلاؤ۔ ابھی اسی وقت اس حرامزادی کو بالوں سے گھسیٹ کر حویلی سے باہر پھینکو۔ اسی وقت، ابھی۔''

مسلح مراد نے سر جھکایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''رک جاؤ۔'' داجے فضل نے مداخلت کی۔

''میں کہہ رہا ہوں جاؤ۔'' شاہنواز رائے دہاڑے۔

داجے فضل نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''شاہنواز! تم نے شام تک کی مہلت دی ہے نا۔ شام سے پہلے ہی دفع ہوجائے گی وہ۔''

''میں ایک منٹ..... ایک منٹ اسے یہاں برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ گھر ہے میرا، کنجر خانہ نہیں ہے..... عیاشی کا اڈہ نہیں ہے۔''

انہوں نے پھر مرادے کو ہدایت پر عمل کرنے کا کہا۔

صالح نے کہا۔ ''بابا جانی! آپ.....''

''بکواس بند کر۔'' انہوں نے اس کی بات کاٹی۔ اس کے ساتھ ہی اپنا داپاں ہاتھ نیچے لٹکا کر اپنی اکلوتی جوتی اٹھائی اور صالح پر کھینچ ماری۔ جوتی اس کی ٹھوڑی پر لگ کر گردن سے ٹکرائی۔ صالح کے اندر ایک لہر سی اچھلی البتہ وہ بولا اب بھی کچھ نہیں۔ خود کو سنبھالتا ہوا گھوما اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ فیصلہ کرچکا تھا کہ نازو اب یہیں رہے گی۔

.....شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو داجے فضل کا فون پھر آگیا۔ ''صالح! تمہارا باپ بہت غصے میں ہے۔ وہ تمہیں اور وقت نہیں دے گا۔ بات کو مت بڑھاؤ۔''

''نہیں بڑھا رہا۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''بلکہ بات ختم کردی ہے۔ اب وہ یہیں رہے گی۔ میں اسے یہاں رکھنے کا حق دار ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''داجے! میں نے نازو سے باقاعدہ نکاح کرلیا ہے۔ اب وہ میری جائز بیوی ہے۔ میرے ساتھ رہ سکتی ہے۔''

''کک..... کیا بول رہے ہو تم..... کب ہوا ہے نکاح؟''

''ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے..... اور ہوا میں بات نہیں کر رہا۔ نکاح نامے کی نقل اختر کے ہاتھ مردانے میں بھجوادی ہے۔ آپ اسے دیکھ لیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کردیا۔

حویلی میں ایک گمبھیر بوجھل خاموشی طاری ہوگئی۔ یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی جیسی تھی۔

.....قریباً ایک گھنٹے بعد لرزتی کانپتی آیا ماماں بی صالح کے پاس آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے صالح کو اپنے بچوں کی طرح پالا تھا، اس کا ہر دکھ سکھ دیکھا تھا۔ اس نے صالح کا ماتھا چوما پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ''صالح! تیرے باپ نے تجھے بلایا ہے۔ وہ بہت غصے میں ہیں۔ تمہیں پتا ہی ہے ان کے غصے کا۔ اس وقت ان کے سامنے بولو گے تو بڑا نقصان ہوجائے گا۔ بس چپ ہی رہنا۔'' پھر آنسوؤں کا گھونٹ بھر کر بولی۔ ''دیکھ نا..... جب آندھیاں آتی ہیں تو درخت بھی جھک جاتے ہیں۔ ٹوٹنے سے بچ جاتے ہیں۔''

''ماماں بی! اب کسی کو مجھ پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اب کوئی گناہ نہیں ہے۔ دو بول پڑھوائے ہیں اس سے۔''

''جو بھی ہے۔ بس کہہ رہی ہوں نا۔ ابھی ان کے سامنے

www.pklibrary.com

کچھ نہ بولنا۔" ماماں بی نے پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

اتنے میں اختر ابھی آ گیا۔ اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "صالح سرکار! بڑے سرکار آپ کو بلا رہے ہیں۔"

صالح، بابا کے کمرے میں پہنچا تو وہ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ داجے فضل بھی قریبی صوفے پر موجود تھے اور بالکل گم صم تھے۔

"جی بابا!" صالح نے جھکے سر کے ساتھ پوچھا۔

"یہ کیا ہے..... یہ کیا ہو رہا ہے میرے گھر میں؟" بابا شاہنواز کے لہجے میں شعلے لپک رہے تھے۔

"بابا! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے باقاعدہ نکاح کیا ہے اس سے۔ بڑے امام خدا بخش صاحب نے خود پڑھایا ہے نکاح....."

"بکواس بند کرو اپنی۔" وہ اپنے پھیپھڑوں میں موجود ساری طاقت صرف کر کے بولے۔ "تم نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ ہمارے سروں میں گوبر بھرا ہوا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں نکاح..... اس طرح ہوتے ہیں؟"

زندگی میں شاید پہلی بار صالح نے سر اٹھا کر اپنے بابا کی آنکھوں میں دیکھا۔ ایک دیرینہ چنگاری تھی جو بھک سے شعلہ بن گئی۔ وہ باغی لہجے میں بولا۔ "بالکل بابا..... ایسے بھی ہوتے ہیں نکاح..... لوگ کرتے ہیں..... کرتے ہیں لوگ پھر بعد میں ختم بھی کر دیتے ہیں۔"

یکا یک مخدوم شاہنواز رائے کے چہرے پر ہلدی کا رنگ پھیل گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صالح کی طرف دیکھتے چلے گئے۔ جسم سکتہ زدہ تھا۔ وہ بات کی گہرائی تک پہنچ چکے تھے۔ اس گہرائی نے انہیں لاجواب کر دیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد گہری زردی کی جگہ ایک سانولی سی سرخی نے لے لی۔ ان کے بستر پر جیسے کانٹے نکل آئے تھے۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھے پھر زور سے چلائے۔ "مرادے..... مرادے!"

مرادا انگوٹھی کے جن کی طرح حاضر ہوا۔ "جی سرکار!" اس نے ناف پر ہاتھ باندھ کر کہا۔

"وکیل اکبر شیخ کو بلاؤ۔ فوراً..... اسی وقت، ابھی..... اور تھانیدار آغا کو بھی۔"

مراد نے سوالیہ نظروں سے داجے فضل کریم کی طرف دیکھا۔

شاہنواز رائے پھر چنگھاڑے۔ "الو کے پٹھے! اس کی طرف کیا دیکھ رہا ہے۔ میری طرف دیکھ۔ بلا ان دونوں کو اسی وقت..... میں عاق کر رہا ہوں اس کو..... یہ کچھ نہیں لگتا میرا..... کچھ نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی انہوں نے بستر سے اترنے کی کوشش کی۔ جیسے نیچے اترتے ہی صالح پر تھپڑوں کی بارش کرنا چاہتے ہوں۔ داجے نے انہیں بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"چھوڑ دے مجھے..... میں کہتا ہوں چھوڑ دے۔ تُو نے بھی اس کی بربادیوں میں حصہ ڈالا ہے۔ کیوں آیا تھا تُو یہاں؟ کیوں چمٹا ہوا ہے اس گھر سے؟" انہوں نے فرطِ غضب میں فضل کریم کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن پھر یکا یک وہ ایک طرف جھکتے چلے گئے۔ ان کا سرخی مائل رنگ لمحوں میں پھر زردی مائل ہو گیا۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ گر رہے تھے۔

صالح لپک کر باہر گیا۔ ڈاکٹر کھوکھر کے لیے حویلی میں کمرا مخصوص تھا۔ وہ کمرے میں تھے۔ اس نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ "انکل کھوکھر..... باہر آؤ، جلدی کرو۔"

ڈاکٹر کھوکھر اور صالح جب واپس پہنچے، صالح کے بابا مکمل طور پر بے ہوش ہو چکے تھے۔ ان پر فالج کا ایک اور شدید حملہ ہوا تھا۔ شاید اسی دوران میں ان کے کپڑے بھی خراب ہو گئے تھے۔ کمرے میں مخصوص بدبو تھی۔

☆☆☆

...گرمیاں اپنے جوبن پر آ رہی تھیں۔ کھیتوں کھلیانوں میں لو چلنا شروع ہو گئی تھی، گندم کٹ چکی تھی۔ نئی بوائی کی تیاری تھی۔ وکی اور اس کی فیملی بدستور مشکلات کا شکار تھی۔ وکی بیرونِ ملک مفرور تھا۔ کم از کم کہا تو یہی جا رہا تھا۔

شاہنواز رائے پر فالج کا دوسرا اٹیک ہوئے ایک مہینے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ وہ مسلسل لاہور کے اسپتال میں تھے۔ ڈاکٹروں نے اب ان کی طرف سے مایوسی کا اظہار کر دیا تھا تاہم کسی نہ کسی طرح وہ جیے جا رہے تھے۔ صالح آٹھ دس روز لاہور میں ان کے پاس رہنے کے بعد واپس سرخاب منزل آ گیا تھا۔ یوں تو لاہور میں بھی اس کے لیے عیاشی کا سامان فراہم ہو سکتا تھا۔ بازارِ حسن کی ایک دو تتلیوں سے رابطہ ہو گیا تھا تاہم آج کل اسے لگ رہا تھا کہ وہ سرخاب منزل سے اور اپنے کمرے سے دور رہ ہی نہیں سکتا۔ اس کمرے میں نازو اس کی تنہائیوں کو چمکاتی تھی۔ ہر روز سرِ شام ہی اسے اپنے جسم میں وسیع خلا محسوس ہونے لگتا تھا۔ جسم کے اس خلا کو ایک نازک اندام کا جسم ہی بھر سکتا تھا اور وہ شاندار زلفوں والی نازو کا جسم ہی تھا۔

وہ صبح دیر تک بیڈ روم میں رہتا اور رات کو بہت جلد بیڈ روم میں بند ہو جاتا۔ اس کے باوجود کسی وقت اسے تشنگی سی محسوس ہوتی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ ایک صحت مند، سرگرم مرد کے لیے کیا ایک عورت کافی ہے؟ اسے اپنے

www.pklibrary.com

بڑوں کی روایات یاد آتیں۔ وہ سب کے سب کثیر الازواج تھے۔ اسے اپنے بڑے تایا کے بارے میں ایک دلچسپ بات یاد تھی۔ کہا جاتا تھا کہ ان کی ازدواجی سرگرمی سے گھبرا کر ان کی چہیتی بیوی نے انہیں خوراک میں کچھ ایسی چیز دینا شروع کر دی تھی جو ان کے مزاج کو معتدل رکھے۔ بعد ازاں یہ راز کھل گیا۔ نوبت طلاق تک پہنچنے لگی تو چہیتی بیوی نے ہتھیار ڈال دیے اور بڑے تایا کو ایک مزید شادی بلکہ شادیاں کرنے کی اجازت دے دی۔

سخت گرمی کے بعد آندھی کے ساتھ ہلکی بارش ہوئی تھی۔ موسم کچھ بہتر تھا۔ اس شب نازو کو بخار تھا۔ اس نے اپنے طویل بالوں کو لپیٹ لپاٹ کر جوڑے کی شکل میں کس کر باندھا ہوا تھا۔ دونوں بیڈروم میں تھے۔ وہ اپنی بیزاری کو مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے بولی۔ ''کیا آج چھٹی نہیں مل سکتی؟''

''کیوں ایسی بات کر کے ذبح کر دیتی ہو۔'' وہ اس کے بالوں کی گھٹا میں چہرہ چھپاتے ہوئے بولا۔ ''کل کا دن اور ہے پھر مجھے دوبارہ لاہور جانا پڑے گا۔''

وہ حسبِ معمول اس میں اور الکحل میں گم ہوتا چلا گیا۔ دھیرے دھیرے سرکنے والی رات سرپٹ بھاگتی رہی۔

اگلے روز نازو کا بخار 104 کو چھونے لگا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ ڈاکٹر کھوکھر حویلی کا مستقل مکین تھا ورنہ لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ سہ پہر تک وہ بہ مشکل نازو کو سنبھال سکا۔

داجے فضل سرخاب منزل کے ہر کونے کھدرے کی صورتِ حال سے باخبر رہتے تھے۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ نازو کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ شام کو جب وہ سرخاب منزل کے عقبی قبرستان میں دعا مانگ کر واپس آئے تو صالح برآمدے میں بیٹھا قہوہ پی رہا تھا۔ اس نے انہیں دیکھ لیا اور پاس ہی بلا لیا۔ داجے فضل نے اپنے لیے دودھ پتی منگوائی۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔

داجے فضل آج پھر اسے سمجھانے والے موڈ میں تھے۔ ''دیکھو صالح! میانہ روی اور اعتدال سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز نہیں اور مجھے لگتا ہے کہ تم ہر معاملے میں اعتدال سے دور ہوتے جا رہے ہو۔''

وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔ ''آپ میری خوش خوراکی کی بات کرتے ہیں تو میں کھانا پینا کم کر دیتا ہوں۔''

''تمہیں پتا ہے میں کچھ اور کہہ رہا ہوں۔''

وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔ ''آپ کو بھی پتا ہے کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ میں جانتا ہوں آپ بابا کو بھی روکتے رہے ہیں لیکن کیا ان سے یہ سب کچھ ہو سکا؟''

''تو..... اس کا حال بھی تو تم اب دیکھ رہے ہو نا۔'' وہ بڑے کرب سے بولے۔ کچھ دیر تک ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دکھ زدہ بیٹھے رہے پھر کہنے لگے۔ ''مجھے لگتا ہے صالح کہ تم ایک دلدل میں دھنستے جا رہے ہو۔''

''اور مجھے اس دلدل میں گرانے والا کون ہے؟ آپ لوگ ہی تو ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں نے اور سب سے بڑھ کر بابا نے مجھ سے میرا ''پیار'' چھینا اور مجھے اس گندے گڑھے میں گرا دیا جس کو آپ جیسے لوگ جنس کا گڑھا کہتے ہیں۔ اب میں گر چکا ہوں، باہر نہیں آ سکتا۔'' اس نے بے خیالی میں گلاب کے ایک پھول کو بے طرح مسل کر کیاری میں پھینک دیا۔

''صالح! کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ تمہارا احساس ہی مرتا جا رہا ہے۔ دیکھو اس طوائف زادی کی وجہ سے کیا گزری تمہارے بیمار باپ پر..... اور وہ اب بھی اسی چھت کے نیچے موجود ہے۔''

''تو ٹھیک ہے داجے!'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''آپ کہتے ہیں تو ایک دو ہفتوں میں اسے نکال دیتا ہوں یہاں سے۔ طلاق دے دیتا ہوں۔''

''کچھ شرم کرو صالح! اپنے بڑوں کو کتنی ڈھٹائی سے بیوقوف بنا رہے ہو۔ وہ حرامزادی نکلے گی تو اس کی جگہ دو اور آ جائیں گی.....''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے، ملازم مراد تیز قدموں سے آتا دکھائی دیا۔ چہرے پر اضطراب تھا۔ آتے ہی بولا۔ ''فضل صاحب! لاہور سے ڈاکٹر کھوکھر کے ساتھی فہد صاحب کا فون آیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ رات سے بڑے سرکار کی طبیعت پھر زیادہ خراب ہے۔ انہوں نے آپ کو اور چھوٹے سرکار کو بلایا ہے۔''

رات نو بجے کے لگ بھگ صالح اور اس کے داجے فضل لاہور کے ایک مہنگے پرائیویٹ اسپتال میں شاہنواز رائے کے بستر کے پاس موجود تھے۔ اسپتال سے باہر شاہنواز رائے کے بہت سے مریدین جمع تھے۔ شاہنواز رائے کی بڑی بہن اور صالح کی پھپھو خدیجہ اپنے بھائی کے قریب موجود تھیں۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی اور چہرہ غم کی تصویر تھا۔ ان کے بیٹے عبداللہ نے صالح کو بتایا کہ وہ لوگ ابھی سات کالے بکروں کی قربانی دے کر اور غرباء میں کھانا تقسیم کر کے یہاں پہنچے ہیں۔

اس ایک ڈیڑھ ماہ میں ہی صالح کے بابا شاہنواز

www.pklibrary.com

سوکھ کر کانٹا ہو چکے تھے۔ پتا نہیں کہ کس طرح ان کے سانس کی ڈور برقرار تھی۔ انہوں نے اپنی اندر دھنسی ہوئی سفید آنکھوں کو حرکت دی اور صالح کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ ان کی منشا سمجھتے ہوئے پھپھو خدیجہ اور دادے فضل سمیت باقی لوگ باہر چلے گئے۔ صالح نے دیکھا اس کے بابا جانی کی آنکھوں سے نمی رس کر ان کے استخوانی رخساروں پر رینگ گئی تھی۔

صالح نے اپنا کان ان کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ ایک نحیف آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ وہی توانا آواز تھی جس کی گرج سے سرخاب منزل کے در و دیوار لرز جاتے تھے۔

''صالح! میری جان..... اس طرح..... نہیں نکلے گی..... مجھے اس سے معافی مانگنے دو۔ میں نے عاصمہ کا دل دکھایا..... اس کا حق مارا..... بلکہ دونوں بہنوں کا.....'' وہ فقرہ پورا نہ کر سکے۔ سانس الجھ گئی۔

کچھ دیر بعد سنبھلے تو اسی نحیف ٹوٹی ہوئی آواز میں بولے۔ ''میں..... عاصمہ سے..... ملنا چاہتا ہوں..... اسے میرے پاس لے آؤ..... ابھی روانہ ہو جاؤ..... ابھی۔''

اس نے ذرا حیرت سے اپنے بابا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنے استخوانی ہاتھ کو حرکت دے کر اپنے تکیے کے نیچے بمشکل پہنچایا اور ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر صالح کو دیا۔ صالح نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کاغذ پر پھپھو عاصمہ کا ایڈریس درج تھا۔

''ہیون ونڈو آرٹ گیلری، ڈی لاس روڈ، بارنی پیرس.....''

یہ ایڈریس بابا جانی کے پاس کیسے آیا..... کس نے دیا..... یہ کب سے ان کے پاس موجود ہے؟ ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا اور نہ ہی بابا جانی اس قابل تھے کہ جواب دے سکیں۔ صالح سکتہ زدہ نظروں سے ایڈریس کو دیکھتا رہا پھر اس نے لرزاں لہجے میں تسلی کے چند بول اپنے بابا کے کانوں تک پہنچائے اور ان کے اکلوتے پاؤں کو چھوتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اور یہ پیرس تھا۔ رنگوں، خوشبوؤں اور دلکش مناظر کا شہر..... اور یہ پیرس کی شام تھی جس کا شہرہ پوری دنیا میں ہے۔ البتہ اس شہر کی خوشنمائی اور مسحور کن کیفیت صالح سے کوسوں دور تھی۔ وہ ایک طویل اور ہیجان خیز سفر کے بعد آج سہ پہر ہی پاکستان سے یہاں پہنچا تھا۔ ہیون ونڈو آرٹ گیلری ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اگلے چند منٹوں میں اس کی ملاقات اس ہستی سے ہو سکتی تھی جسے چھ سات سال پہلے اس نے کھویا تھا۔ اسے یاد رکھا تھا لیکن بھول گیا تھا۔ بھول گیا تھا لیکن یاد رکھا تھا۔

یہ زیادہ بڑی عمارت نہیں تھی تاہم بہت صاف ستھری تھی۔ وہ گرے نائٹ کی سیاہ سیڑھیاں چڑھ کر بلند چھت والے ایک آفس میں داخل ہوا۔ ایک کاؤنٹر کے عقب میں درمیانی عمر کی ایک نفیس سی عینک پوش پاکستانی خاتون بیٹھی تھی۔ صالح نے اس سے اپنا مختصر تعارف کرایا اور گیلری کے اونر کے بارے میں پوچھا۔ نوال نامی اس خاتون نے جو جواب دیا، اس نے صالح کی دھڑکنوں کو اور بھی سرپٹ کر دیا۔ وہ بولی۔ ''میڈم عاصمہ ماجد ہیں مگر اس وقت وہ آؤٹ آف سٹی ہیں۔ وہ کنٹری سائڈ پر ہیں۔ وہاں انہیں کال بھی نہ ہو سکے گی۔''

''کوئی اور ذمے دار؟''

''ان کی بیٹی آفرین ہیں۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آجاتی ہیں۔''

یہ ایسا جواب تھا جسے سننے کے بعد صالح کو یوں لگا کہ دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وہ کتنی ہی دیر کچھ نہ بول سکا۔ اس استقبالیہ کاؤنٹر کی ایک سائڈ پر ٹی وی آن تھا۔ یہ کورونا کے بالکل آغاز کا دور تھا اور ٹی وی پر آنے والی زیادہ تر خبریں اسی حوالے سے تھیں۔ شہریوں کے اس شہر پیرس میں بھی بہت زیادہ رونق نظر نہیں آتی تھی۔ اکثر لوگ ماسک وغیرہ لگائے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے صالح نے خاتون نوال سے پوچھا۔ ''آفرین صاحبہ کے ہسبینڈ بھی یہاں ان کے ساتھ ہی ہوتے ہیں؟''

''کیا؟'' وہ عینک کے پیچھے اپنی آنکھیں پھاڑ کر بولی پھر ہنسنے لگی۔

''آ..... آپ ہنس کیوں رہی ہیں؟''

''بھئی ایک عدد ہسبینڈ کے لیے ایک عدد شادی کرنا ضروری ہوتا ہے۔''

وہ چکرا سا گیا۔ کتنی ہی دیر کچھ بول نہ سکا۔ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لگتا ہے کہ آپ قریبی رشتے دار ہونے کے باوجود کافی عرصے بعد میم اور مس آفرین سے ملنے آئے ہیں۔''

صالح کا گلا خشک اور کان سائیں سائیں کر رہے

www.pklibrary.com

تھے۔ صحیح کیا تھا، غلط کیا..... اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کیا اس نے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھنا شروع کردیا تھا۔ قریباً پانچ برس پہلے آفرین کی شادی ہوچکی تھی۔ پھپھو خدیجہ، دادے فضل اور بابا جانی سب جانتے تھے۔ اس کی تصدیق ''ملاکا'' شہر میں رہنے والے عاطر حسن نے کی تھی اور شادی کی تصویر بھی بھیجی تھی۔ کیا وہ سب جھوٹ تھا یا پھر یہاں آفرین اور پھپھو وغیرہ ایک جھوٹ کے ساتھ رہ رہی تھیں؟ گزر جانے والے سات برسوں پر ایک تاریک پردہ پڑا ہوا تھا اور صالح کو کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کی لاعلمی میں کیا کچھ ہوچکا ہے اور ہو رہا ہے۔

''کیا..... واقعی ابھی تک ان کی شادی نہیں ہوئی؟'' صالح نے خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، ابھی تک تو نہیں ہوئی لیکن ہوجائے تو پتا نہیں۔ ویسے اکثر بڑے آرٹسٹ یہی کہتے ہیں کہ ان کی شادی آرٹ سے ہوچکی ہے۔''

''آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ... وہ خود بھی تصویریں بناتی ہیں؟''

''مسٹر صالح! بھئی آپ تو بالکل ہی بے خبر ثابت ہورہے ہیں۔ جن مس آفرین کو آپ اپنی کزن بتا رہے ہیں، وہ ایک معروف پینٹر ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی پیرس میں اور پیرس سے باہر بھی مانگ ہے۔ یہ دیکھیں، یہ میرے عقب میں جو انعام یافتہ پینٹنگ لگی ہے، یہ انہی کی بنائی ہوئی ہے۔''

صالح نے غور سے دیکھا۔ یہ ایک لینڈ اسکیپ تھا۔ تیز ہوا میں چند درخت رکوع کے بل جھکے ہوئے تھے۔ تصویر کے رنگ نگاہ کو اپنے اندر جذب کرتے تھے۔

وہ تصویر پر نگاہ مرکوز کیے ہوئے تھا جب ہلکا سا شور سنائی دیا۔ اس نے رخ پھیر کر دیکھا..... وہ آرہی تھی..... ہاں وہی جو برسوں پہلے گلابی جاڑے کی ایک عید سے چند دن پہلے اپنی آخری جھلک دکھا کر اوجھل ہوگئی تھی۔ وہ خوشنما لانگ جیکٹ اور جینز میں ملبوس اپنا موبائل فون کان سے لگائے تیزی سے چلی آرہی تھی۔ اس کے عقب میں تین چار مردوزن مؤدب انداز میں آرہے تھے۔ اس کا چہرہ ہمیشہ سے دلکش تھا مگر بھرپور شباب نے اس کی دلکشی میں غیر معمولی اضافہ کردیا تھا۔ صالح کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اردگرد بے مثال کشش کا ایک روشن ہالہ سا ہے جو اس کے ساتھ ہی حرکت کرتا ہوا استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہا ہے۔

قریب ہی بیٹھے صالح کو دیکھے بغیر وہ ریسپشنسٹ نوال سے مخاطب ہوئی اور اس سے فون وغیرہ کے بارے میں اپ ڈیٹس لیں۔ تب تیزی سے واپس جانے کے لیے مڑی اور یہی وقت تھا جب اس کی نگاہ صالح پر پڑی۔ چند لمحوں کے لیے گردشِ دوراں جیسے تھم گئی تھی۔ صالح بھی اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا تھا اور بت بنا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ لمحے تھے مگر ان میں صدیوں جیسی طویل حیرتیں سمٹ آئی تھیں۔ تب اچانک وہ واپس مڑی اور اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک کرتی ہوئی ایک کوریڈور میں اوجھل ہوگئی۔ اردگرد موجود تمام افراد نے ان لمحات کی ڈرامائی کیفیت کو محسوس کیا تھا مگر خاموش تھے۔

دو تین منٹ کے توقف کے بعد صالح بھی اس کے پیچھے کوریڈور میں چلا گیا۔ نوال سے اسے معلوم ہوچکا تھا کہ مس آفرین کس روم میں گئی ہوگی۔ صالح کا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ منہ خشک ہوچکا تھا۔ اس نے دروازے پر ناک کی۔ دو بار، تین بار پھر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو دروازہ کھل گیا۔ وہ قالین پوش فرش پر سامنے ہی قد آدم لیمپ کے پاس کھڑی تھی۔ آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ صالح اندر داخل ہوا۔ ڈور کلوزر نے دروازہ بند کردیا۔ صالح کی اپنی آنکھوں کے کنارے بھی جلنے لگے تھے۔ یکایک وہ تیزی سے آگے بڑھی اور صالح سے لپٹ گئی۔ اس کی سموری جیکٹ کی گرمی نے اسے ڈھانپ لیا۔ دونوں دیر تک اسی طرح ایک دوسرے سے بغلگیر رہے پھر آفرین کی بھیگی ہوئی آواز صالح کے کانوں سے ٹکرائی۔

''تم کیسے آگئے یہاں؟ مجھے یقین نہیں آرہا..... بالکل نہیں آرہا۔'' پھر وہ صالح سے جدا ہوئی اور سر کو تھوڑا سا پیچھے ہٹا کر غور سے صالح کو دیکھنے لگی جیسے اپنی نگاہوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کررہی ہو کہ اس کے سامنے وہی برسوں پہلے والا صالح ہی ہے جو اب اسے بھول چکا تھا..... جو اب کسی اور کا ہوچکا تھا۔

پیرس کی وہ اداس شام کسی اور ہی رنگ میں ڈھل چکی تھی۔ اسی کمرے میں ڈنر کرنے کے بعد آفرین اور صالح آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بار بار کسی اندرونی جذبے کے تحت آفرین کی حسین آنکھوں میں نمی چمک جاتی تھی۔ صالح نے ابھی تک آفرین کو بس اتنا بتایا تھا کہ اتنے برسوں بعد اس کا ایڈریس صرف چار دن پہلے اسے اپنے بابا جانی سے ملا ہے۔ صالح نے ابھی آفرین کو بابا کی ناگفتہ بہ حالت کے بارے میں بھی تفصیل سے نہیں بتایا تھا۔ صرف اتنا کہا تھا کہ وہ بہت بیمار ہیں اور اپنی بہن سے ملنا چاہتے ہیں۔ پھپھو عاصمہ کے بارے میں صالح کو آفرین سے یہ پتا چلا تھا کہ وہ معمر لوگوں کے ایک گروپ کے ساتھ کیمپنگ کے لیے پیرس

www.pklibrary.com

کے مضافات میں ''پروونس'' نامی علاقے میں گئی ہوئی ہیں۔ انہیں کل شام تک لوٹنا تھا۔

یکا یک صالح نے آفرین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دلگیر لہجے میں کہا۔ ''یہ نہ پوچھو گی کہ میں نے ایک دم تمہیں خط لکھنے کیوں بند کردیے؟ کیوں اتنا بڑا دھوکا دیا تمہیں؟''

''جو بیت گیا، سو بیت گیا۔ اب دہرانے سے کیا حاصل۔ اس سے تکلیف ہی ہوگی۔ اس تکلیف سے بچنے کے لیے ہی تو میں نے اور ممی نے سب ناتے توڑے تھے۔''

''لیکن میں چاہتا ہوں آفری کہ تم پوچھو.....!''

''تمہاری زندگی کیسی جارہی ہے۔ تمہاری شادی تو ہوچکی ہوگی؟'' آفرین نے پوچھا۔

''وہ بھی سب بتاؤں گا۔ پہلے..... مجھ سے پوچھو آفری..... کہ میں نے تمہیں خط لکھنے کیوں بند کردیے؟''

اس نے پلکیں جھکا کر اپنے بے پناہ کرب کو چھپایا اور پوچھا۔ ''کیوں بند کردیے؟''

''اس لیے آفری..... کہ مجھے وہ تمہارے درجنوں خط ملے ہی نہیں جو تم نے لکھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی نہ ملا۔''

وہ بے پناہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے بعد صالح نے جو کچھ اسے بتایا، اس نے اسے حیرت اور دکھ کے سمندر میں ڈبو دیا۔ اس بے مہر بارشی رات کی ساری کتھا صالح نے کہہ ڈالی جو اس نے برسوں پہلے وکی کے گھر گزاری تھی اور اس کی الماری کے چور خانے سے اپنی بدنصیبی کے ثبوت نکالے تھے۔ صالح نے ان گمشدہ خطوط کے عکس بھی آفرین کو دکھائے جو اس نے اپنے موبائل میں محفوظ کرلیے تھے۔ یہ دوست نما دشمن کی دلدوز کتھا تھی۔

.....اور پھر ان دونوں پر ایک دوسرا انکشاف ہوا جو پہلے انکشاف سے بھی زیادہ تہلکہ خیز و کربناک تھا۔ خاص طور سے آفرین کے لیے۔ جب صالح نے آفرین کو اپنے موبائل کی اسکرین پر ''آستین کے سانپ'' وقار وکی کی تصویر دکھائی تو وہ دنگ رہ گئی۔ اس پر عقدہ کھلا کہ یہ وقار وکی ہی تھا جو مصباح عزیز بن کر اسے پاکستان سے خطوط لکھتا تھا اور محبت کا اظہار کرتا تھا۔

جب آفرین اس کی تصویر دیکھ کر چونکی تو صالح اس سے زیادہ چونکا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا وہ شک بھی شاید درست تھا جو برسوں سے اس کے ذہن میں موجود تھا۔ وہ بولا۔ ''آفرین! کیا تم اسے صورت سے بھی پہچانتی ہو؟''

وہ ایک دم گم صم ہوگئی۔ اس کے دل و دماغ کے نازک ریشوں کو جیسے ایک بڑا پتھر کچلتا ہوا چلا جارہا تھا۔ ایک لمبے توقف کے بعد وہ جیسے کراہ کر کہنے لگی۔ ''صالح! شاید تمہارے علم میں نہیں کہ تمہارا یہ دوست جسے دوست کہنا بھی نہیں چاہیے، میرے لیے وہاں کوالالمپور بھی پہنچا تھا۔ اس نے..... بھی مجھے شبہ تک نہیں ہونے دیا کہ وہ تمہارا دوست ہے۔ جیسا کہ تمہیں اس کے لکھے ہوئے خط سے بھی معلوم ہوچکا ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک ایک جھوٹ تھا۔ اس نے مجھے یہی باور کرا رکھا تھا کہ اس نے مجھے پہلی بار سرگودھا ائرپورٹ پر دیکھا اور وہیں پر اسے میرا نام اور ایڈریس وغیرہ معلوم ہوا۔'' وہ ایک دم چپ ہوگئی پھر روہانسی سی ہوکر بولی۔

''شاید تمہیں معلوم نہیں صالح کہ وہ ہاتھ دھوکر میرے پیچھے پڑ چکا تھا۔ اس کی نیت کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اس سے خط کتابت ختم کردی تھی۔ میں اس وقت ہکا بکا رہ گئی تھی جب دو تین ماہ بعد وہ میرے پیچھے کوالالمپور جا پہنچا۔ جب کوالالمپور کی ایک سڑک پر وہ سرِراہ مجھے ملا اور اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مصباح عزیز ہے تو میں پتھرا کر رہ گئی تھی۔''

کھڑکی سے باہر پیرس کی یخ بستہ رات تھی۔ روشنیاں چمکتی تھیں اور ٹریفک کا ہلکا سا شور تھا۔ کمرے کی خوشگوار حرارت میں آفرین اور صالح آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایل ای ڈی کی روشنی میں آفرین کے رخساروں کا ''سرخی مائل سنگِ مرمر'' دمک رہا تھا۔ اس کے بال جو پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوچکے تھے، اس کے شانوں تک پہنچ رہے تھے۔ وہ آج ایک نامور آرٹسٹ تھی، اس کے سامنے بیٹھی تھی اور ایک انکشاف انگیز رات نے انہیں اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔

صالح نے اچانک دلفگار لہجے میں پوچھا۔ ''آفری.....! اور تمہاری شادی؟''

وہ پلکیں جھکائے جھکائے بولی۔ ''تم سے کس نے کہا تھا میری شادی ہوئی؟''

''پھپھو خدیجہ اور دادا جے فضل وغیرہ نے بتایا تھا۔''

اس نے صالح کی طرف دیکھے بغیر نفی میں سر ہلایا۔ ''انہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ شادی ہونے والی تھی لیکن میں نے انکار کردیا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ میں اذلان کے ساتھ یہ رشتہ نہ نبھا سکوں گی۔ اذلان میرے منگیتر کا نام تھا۔''

''آفری! میں نے تمہاری شادی کی تصویر دیکھی تھی۔''

''جو شادی ہوئی ہی نہیں، تم نے اس کی تصویر کیسے دیکھ لی؟'' وہ پیشانی پر ہلکا سا بل ڈال کر بولی۔

صالح نے ذرا توقف کے بعد اپنے موبائل میں موجود آفرین اور اذلان نامی اس لڑکے کی تصویر آفرین کو دکھائی۔

www.pklibrary.com

"کہیں یہ تصویر بھی تو تمہارے "سچے دوست" نے ہی تم تک نہیں پہنچائی تھی؟"

صالح اثباتی انداز میں خاموش رہا۔

"صالح! یہ میری شادی کی نہیں، منگنی کی تصویر ہے..... منگنی جو ٹوٹ گئی تھی۔"

صالح نے ایک بار پھر سوچا..... کیا وہ کوئی سپنا دیکھ رہا ہے؟ یہ کیسی حقیقتیں تھیں جو اس کے سامنے آرہی تھیں۔

وہ کراہ کر بولا۔ "اور وکی کا کیا ہوا آفرین..... وہ کوالالمپور میں کتنے عرصے رہا؟"

"وہ ایک بار نہیں، دو بار میرے پاس پہنچا۔ ایک بار کوالالمپور میں، دوسری بار فلپائن کے شہر ویگان میں۔ جب میں، ممی جان اور ڈیڈی وہاں "ویگان" نامی شہر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ وہ کسی طرح میرا پیچھا چھوڑنے میں نہیں آرہا تھا۔ وہ بہت ہوشیار تھا صالح..... اس نے مجھے کبھی شبہ تک نہیں ہونے دیا کہ وہ تمہارا دوست ہے۔"

"..... اور اسی نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ میں نے تم سے خط۔ کتابت اس لیے بند کر دی ہے کہ میں کسی اور لڑکی میں "انوالو" ہو چکا ہوں؟"

"ہاں، یہی کہنا تھا اس کا۔" آفرین نے نم پلکیں جھکا لیں۔

"اور تم نے یقین کر لیا؟"

"میں تھک گئی تھی..... ہار گئی تھی تمہارے جواب کا انتظار کرتے کرتے..... اور تم نے بھی تو یقین کر لیا نا کہ میں نے سب کچھ ختم کر دیا ہے۔"

"اس موذی نے ہم دونوں کو لوٹا اور بری طرح لوٹا آفری! افسوس یہ ہے کہ میں نے بھی تب اس کو جانا جب سب کچھ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میری معلومات کے مطابق تمہاری شادی ہو چکی تھی اور پھپھو سمیت تمہاری فیملی کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔"

"ممی، ماموں جان سے بہت زیادہ ناراض تھیں۔ وہ ماضی سے اپنا ہر ناتا توڑ لینا چاہتی تھیں اور مجھے بھی یہی بہتر لگتا تھا..... اور سچ بات یہ ہے کہ میں اس زمانے میں اس بہروپیے سے بھی کچھ خوفزدہ ہو گئی تھی۔" آفرین کا اشارہ وکی کی طرف تھا۔

وکی کے بارے میں جو مزید تفصیل آفرین نے افسردہ لہجے میں بتائی، اس سے پتا چلا کہ وکی واقعی ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ چکا تھا۔ وہ اس سے عشق کا دعویدار بنتا تھا۔ ملائیشیا پہنچ کر اس نے اپنے دوست کے دوست عاطر حسن کو

مقابلہ

الیکٹرک شیور فروخت کرنے والے دو دکانداروں میں قیمتیں کم کرنے کے لیے مسابقت کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ قیمتیں کم ہوتے ہوتے ایک دن نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دکاندار نے قیمتِ خرید ہی پر الیکٹرک شیور فروخت کرنے کا بورڈ لگا دیا۔ اس طرح وہ ایک الیکٹرک شیور فقط 15 ڈالرز ہی میں فروخت کرنے لگا۔

اگلے دن اس نے دیکھا کہ دوسری دکان پر بورڈ لگا ہوا ہے۔

"15 ڈالر والے الیکٹرک شیور ہم سے ٹھیک کروائیے۔"

(مرسلہ: عاصم منیر، سرگودھا)

طفلیات

"امی! کیا ہم لوگ بندروں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں؟"

"پتا نہیں۔ میں آج تک اپنے سسرال والوں سے نہیں ملی۔"

☆☆☆

"تم تاریخ میں بہت کمزور ہو۔" استاد نے بچے سے کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ تم یہ فقرہ بیس مرتبہ لکھو کہ ہمایوں کے باپ کا نام بابر تھا لیکن تم نے فقط دس مرتبہ لکھا ہے۔"

"سر! میں گنتی میں بھی کمزور ہوں۔" بچے نے سر جھکا کر جواب دیا۔

☆☆☆

"تم اپنا منہ کیوں نہیں دھوتے؟" ٹیچر نے بچے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری شکل دیکھ کر بتا سکتی ہوں کہ تم نے ناشتے میں کیا کھایا تھا۔"

"اچھا، تو بتائیے آج میں نے کیا کھایا تھا؟" بچہ بولا۔

"انڈا۔" ٹیچر نے جواب دیا۔

"غلط۔" بچہ بولا۔ "انڈا تو میں نے کل کھایا تھا۔"

(مرسلہ: عاصم منیر، سرگودھا)

www.pklibrary.com

اپنے ساتھ ملالیا تھا اور ایک روز سرِراہ آفرین کے سامنے آگیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ پاکستان سے کچھ تحائف بھی آفرین کے لیے لے کر گیا تھا جنہیں آفرین نے لینے سے صاف انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ وہ اسے ایک بھائی اور اچھے دوست کی حیثیت سے دیکھتی ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ وہی دن تھے جب وہاں آفرین کی منگنی ہونے والی تھی۔ وکی اپنے مقامی دوست سمیت کوالالمپور کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور مسلسل اس سے ملنے پر اصرار کررہا تھا۔ آخر ایک روز وہ ہوٹل میں ہی اس سے ملی تھی اور صاف لفظوں میں اسے بتایا تھا کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے، وہ نہیں ہوسکتا۔ وہ واپس تو چلا گیا تھا مگر آفرین کو خدشہ تھا کہ یہ معاملہ اتنی جلدی ختم نہیں ہوگا..... اور پھر یہی ہوا تھا۔ کچھ عرصے بعد جب آفرین کے انکار کے بعد اذلان کے ساتھ اس کا رشتہ ختم ہوگیا اور وہ اپنے ممی پاپا کے ساتھ فلپائن کے شہر ویگان میں شفٹ ہوگئی تو ایک روز وہ وہاں بھی آدھمکا۔ درحقیقت اس نے اپنے مقامی دوست عاطر کو مسلسل اس کے پیچھے لگایا ہوا تھا۔

اس مرتبہ وکی نے خود کو مکمل طور پر مجنوں ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی شیو بڑھا رکھی تھی اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ آفرین کے پاپا تو ان دنوں ان کے ساتھ نہیں تھے، وہ انگلینڈ گئے ہوئے تھے۔ اس نے آفرین کی ممی سے بھی رابطہ کرلیا اور انہیں بتایا کہ وہ صرف آفرین کے لیے دو بار پاکستان سے یہاں آچکا ہے اور اس کو اپنانا چاہتا ہے۔ آفرین کی ممی کیسے مان سکتی تھیں۔ ویسے بھی وہ پاکستان سے اور ماضی سے ہر ناتا توڑ لینا چاہتی تھیں۔ ایک روز وہ پی پلا کر دوبارہ آفرین کے گھر میں گھس آیا۔ پہلے عاجزی دکھاتا رہا پھر آگ بگولا ہوگیا۔ ٹانگ مار کر ایک آئینہ توڑ دیا پھر اسی کے ٹکڑے کو گلے پر پھیرنے کی کوشش کی اور کچھ زخمی بھی ہوا۔ ایک دو روز بعد جب بات اسے پولیس تک پہنچتی محسوس ہوئی تو غائب ہوگیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ پاکستان لوٹ گیا ہے۔

صالح نے آفرین کی یہ ساری روداد عجب کرب کے عالم میں سنی۔ وکی کی دو چہروں والی شخصیت بار بار اس کی نگاہوں میں گھوم جاتی تھی۔ گلے پر شیشے کا ٹکڑا پھیرنے والی بات پر صالح کو وکی کے گلے پر کٹ کا وہ پرانا نشان بھی یاد آیا جس کے بارے میں اس نے وضاحت کی تھی کہ وہ کیمیکل ڈور کے سبب آیا ہے۔

آفرین کی آواز نے اسے خیالات سے چونکایا۔

''اب میرے سوال کا جواب بھی دے دو۔''

صالح دلگیر لہجے میں بولا۔ ''آفری! کافی عرصہ پہلے بابا جانی اور داجے نے مجھے زبردستی شادی کے بندھن میں باندھنے کی کوشش کی تھی اور میں بندھ بھی گیا تھا مگر یہ شادی تین چار ماہ سے زیادہ نہیں چل سکی۔ حقیقت یہ ہے آفری کہ.....'' اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ ذرا توقف کرکے دوبارہ گویا ہوا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ تمہارے بعد میں وہ صالح رہا ہی نہیں جو کبھی تھا۔ میں کسی کے ساتھ نباہ کیسے کرسکتا تھا۔ میں تو خود اپنے ساتھ نباہ نہیں کرپاتا۔'' اس نے سر جھکا لیا اور قالین کے گل بوٹوں کی طرف بے وجہ دیکھتا چلا گیا۔ کھڑکیوں سے باہر سردی بڑھ چکی تھی اور پیرس دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں جارہا تھا۔

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر اسی دوران میں آفرین کے موبائل پر کال آگئی۔ آفرین کے گال دہک گئے۔ ''ہیلو ممی! کہاں تھیں آپ؟ سگنل ہی نہیں پہنچ رہے تھے۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جس کے بعد آفرین بولی۔ ''چلیں ٹھیک ہے۔ شام سے پہلے پہنچ جایئے گا۔ یہاں آپ کے لیے ایک سرپرائز بھی ہے..... نہیں نہیں..... ایسے نہیں بتاؤں گی۔ بس آپ آجائیں۔''

اس نے فون بند کردیا اور صالح کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ جب یوں دیکھتی تھی تو صالح کے اندر ایک عجیب سنسناہٹ دوڑ جاتی تھی۔ کچھ بھولے بسرے سپنے نگاہوں کے سامنے ستاروں کی طرح جگمگا جاتے تھے..... پھر ایک دم بابا کی ناگفتہ بہ حالت صالح کے تصور میں آگئی۔ اس نے آفرین سے پوچھا۔ ''وہ کل شام سے پہلے پہنچ جائیں گی نا؟''

''امید تو یہی ہے کہ آفٹر نون تک پہنچ جائیں۔'' آفرین نے کہا۔

آفرین اسے اپنی خوش رنگ اسپارٹی کار پر اپنے گھر لے گئی جو گیلری سے زیادہ دور نہیں تھا۔ آفرین اسے بتا چکی تھی کہ پاپا کام کے سلسلے میں بھائی فرحان کے پاس گئے ہوئے ہیں۔ فرحان آج کل ساؤتھ افریقا میں مقیم تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح الگ تھلگ رہنے والا شخص تھا۔ آفرین کا گھر زیادہ بڑا نہیں تھا مگر نہایت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ دو تین جگہ آفرین کی اپنی بنائی ہوئی شاندار پینٹنگز بھی آویزاں تھیں۔ یہ لینڈ اسکیپ ہی تھے اور زیادہ تر پاکستانی مناظر و کھیت کھلیان ہی دکھاتے تھے یا کچھ مناظر ملائیشیا کے ہوں گے۔

اس نیم گرم آرام دہ کمرے میں صالح دیر تک جاگتا رہا اور حالات کی اس کروٹ پر حیرانی سے غور کرتا رہا۔ اس

www.pklibrary.com

کے سینے کی گہرائی میں کہیں بے نام آس کے شگوفے سے کھلنے لگے تھے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی آفرین نے اسے جگا دیا۔ وہ سفید پتلون اور گرے جرسی میں تھی۔ پاؤں میں جوگرز تھے۔ چمکدار دن کی روپہلی کرنوں میں وہ اتنی دلکش نظر آئی کہ صالح بہ مشکل اس سے نظر ہٹا پایا۔ وہ صالح کو اردگرد کے علاقے میں گھمانا چاہتی تھی۔ خاص طور پر قریب ہی واقع شانزے لیزے روڈ پر لے جانا چاہتی تھی لیکن پھر پتا چلا کہ کورونا کے پھیلاؤ کے سبب لاک ڈاؤن کا سین بن رہا ہے۔ پروگرام ملتوی ہوگیا۔

شام سے پہلے ہی صالح کی پھپھو عاصمہ گھر واپس پہنچ گئیں۔ شروع میں وہ صالح کو پہچان ہی نہ سکیں۔ وہ بھی پہچان نہ سکا۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ ہوچکی تھیں۔ بال بھی اب زیادہ لمبے نہیں تھے اور سامنے سے سفید ہوگئے تھے۔ انہوں نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر اسکارف تھا۔

صالح کو پہچان لینے کے بعد وہ کتنی ہی دیر سکتہ زدہ سی رہیں پھر اسے گلے سے لگایا اور ہچکیوں سے رونے لگیں۔ صالح بھی آبدیدہ ہوگیا۔

کچھ ہی دیر بعد جب وہ کچھ سنبھل گئیں تو وہ گھر کی نشست گاہ میں آن بیٹھے۔ آفرین کی طرح وہ بھی حیران ہوئی تھیں کہ صالح کو ان کی آرٹ گیلری کا کھوج کیسے ملا۔

صالح نے کہا۔ ''پھپھو! جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے، سال ڈیڑھ سال پہلے بابا جانی کے کسی کاروباری دوست نے یہاں آرٹ گیلری میں آفری کو دیکھا اور پہچانا۔ بعد میں اس نے بابا کو انفارم کردیا۔''

''.....اور انہوں نے تمہیں سال ڈیڑھ سال تک بتانا ضروری ہی نہ سمجھا۔'' پھپھو نے عجب دل گرفتگی کے ساتھ کہا۔

اب صالح نے ضروری جانا کہ وہ پھپھو اور آفرین کو بابا کی اصل صورتِ حال سے آگاہ کردے۔ انہیں بتادے کہ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں اور کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا ہے۔

.....بہن پھر بہن ہی ہوتی ہے۔ جب صالح کی پھپھو کو بھائی کی اصل حالت کا پتا چلا تو ان کا رنگ کورے لٹھے کی طرح سفید ہوگیا۔ انہوں نے کلیجا تھاما اور جسم میں لرزش نمودار ہوگئی۔

''پھپھو! آپ سمجھیں کہ وہ جان کنی کی حالت میں ہیں۔ آخری بار آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' صالح کے لہجے میں التجا تھی۔

صالح کی پھپھو نے رونا شروع کردیا۔ دیر تک آنسو بہاتی رہیں پھر صالح سے بولیں۔ ''تم ابھی پاکستان ویڈیو کال کرو۔ میں بھائی جان کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

پھر وہ آفرین سے مخاطب ہوکر بولیں۔ ''آفرین! تم میرے ٹکٹ کا انتظام کرو..... بلکہ اپنا ٹکٹ بھی لو۔ تم بھی چلو۔''

صالح نے کہا۔ ''آپ اس کی فکر نہ کریں۔ یہ سب ہوجائے گا اور میں بابا سے آپ کی بات کرانے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔''

اس نے موبائل پر پاکستان رابطہ کیا۔ یہ ویڈیو کال تھی تاہم اسے ڈاکٹر کھوکھر نے بتایا کہ فی الحال وہ غشی کی سی کیفیت میں ہیں۔ دو چار گھنٹے میں شاید کچھ سنبھل جائیں پھر بات کرسکیں گے۔

آفرین کا چہرہ بھی اب غم کی تصویر نظر آنے لگا تھا۔ اس نے ایک دو جگہ فون کیا۔ پتا چلا کہ وہ ٹکٹ کے بارے میں بات کررہی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے مایوسی کے عالم میں بتایا کہ لاک ڈاؤن ہوگیا ہے اور پروازیں فی الحال منسوخ ہیں۔

☆☆☆

جس رکاوٹ کو صالح اور آفرین وغیرہ عارضی سمجھ رہے تھے، وہ کافی سخت اور مستقل ثابت ہوئی۔ تین چار دن گزرنے کے باوجود بھی پروازیں بحال ہونے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے۔

پھر ایک دن ویڈیو لنک پر بابا جانی سے پھپھو عاصمہ کی بات بھی ہوگئی۔ وہ ہوش کے وقفے میں تھے۔ اپنی روتی ہوئی بہن کے ساتھ ان کی گفتگو کافی طویل اور سسکیوں، آنسوؤں میں لپٹی ہوئی تھی۔ بابا جانی کی حالت دیکھ کر صالح کا اپنا دل بھی رونے لگا تھا۔ ان کی جان جیسے ہڈیوں کے ایک شکستہ پنجر میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ سر بیٹھ رہی تھی مگر ٹھہر پا رہی تھی نہ نکل پا رہی تھی۔ اسپتال کے اس کمرے میں ایک مائیک لیپ ٹاپ سے اینچ کرکے ان کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا گیا تھا تاکہ ان کی نہایت کمزور آواز سنی جاسکے۔ وہ بار بار اپنی بہن سے معافی مانگ رہے تھے پھر انہوں نے اپنے استخوانی ہاتھ کو حرکت دے کر کچھ کاغذات کی جھلک بہن کو دکھائی اور بولے۔

''عاصمہ! پتا نہیں کہ توبہ کا دروازہ بند ہے یا کھلا ہے۔ میں نے کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پراپرٹی میں تم دونوں بہنوں کا جو حصہ بنتا تھا، یہ اس سے کچھ زیادہ ہی

www.pklibrary.com

ہے۔ تم میرے لیے بس بہتری کی دعا کرو۔"

پھپھو عاصمہ نے بلک کر کہا۔ "آپ بھی مجھے معاف کردیں بھائی..... مجھے بس آپ کی صحت چاہیے۔ میں ایک بار پھر آپ کو ویسا ہی تندرست دیکھنا چاہتی ہوں جیسا چھوڑ کر آئی تھی۔"

"بس تم نے کہہ دیا نا..... اب سب اچھا ہوجائے گا۔" ان کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آرہی تھی۔

اور پھر واقعی سب کچھ اچھا ہوگیا۔ اگلے روز پھپھو اور آفرین کے اصرار پر جب صالح نے پاکستان میں آڈیو کال کی تو دوسری طرف سے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آئیں۔ صالح کے بابا جانی صرف پندرہ بیس منٹ پہلے اپنی تکلیف دہ زندگی کی قید سے آزاد ہوچکے تھے۔

☆☆☆

صالح کے بابا جانی کو سرخاب منزل کے عقبی قبرستان میں ابدی نیند سوئے تین ہفتے ہوچکے تھے۔ صالح کو دکھ تھا کہ وہ پاکستان جاکر باپ کے جنازے کو کندھا نہ دے سکا۔ پھپھو عاصمہ اور آفرین بھی پاکستان نہ جاسکنے کی وجہ سے افسردہ تھیں۔ بس ان تینوں کو اس بات پر کچھ تسلی تھی کہ آنکھیں بند ہونے سے ایک دن پہلے انہوں نے تفصیل سے بات کرلی، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیا اور شاید زندگی کا بوجھ بھی۔

مہلک وبا نے دیگر خطوں کی طرح یورپ کو بھی اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ کہیں مکمل اور کہیں جزوی لاک ڈاؤن لگادیے گئے تھے۔ فضائی، زمینی اور آبی راستے بند تھے۔ جو جہاں تھا، وہیں پھنس کر رہ گیا تھا۔ آفرین اور پھپھو عاصمہ، صالح کی دلی کیفیت کو سمجھ رہی تھیں۔ آفرین اس کا بہت خیال رکھ رہی تھی۔ کسی وقت وہ اصرار کرکے اسے باہر بھی لے جاتی تھی۔ پیرس کی صبحوں اور شاموں میں وہ پہلے جیسی رعنائی تو نہیں تھی پھر بھی اکتائے ہوئے لوگ حفاظتی تدابیر کے ساتھ گھروں سے نکلنا شروع ہوگئے تھے۔ خدشات کے مہیب سایوں کے باوجود نارمل زندگی اپنے راستے ڈھونڈنے کی کوشش کررہی تھی۔ وبا کے زیادہ اثرات بڑی عمر کے لوگوں پر تھے لہٰذا آفرین نے اپنی ممی پر باہر نکلنے کے حوالے سے مکمل پابندی عائد کردی تھی۔

تفریح گاہوں میں صالح کے ساتھ گھومتے پھرتے آفرین کسی وقت ایک دم گم صم سی ہوجاتی تھی جیسے صالح سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو اور کہہ بھی نہ پارہی ہو۔ کسی وقت صالح بے خیالی میں ایک دم آفرین کا دلکش چہرہ دیکھنا شروع کردیتا جیسے کھوج لگانے کی کوشش کررہا ہو کہ وہ پرانی محبت اب بھی اس کے دل کے نہاں خانوں میں موجود ہے یا پھر موسم بدل چکے ہیں۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پارہا تھا۔

ایک روز جب وہ مشہور زمانہ ایفل ٹاور کے نزدیک سبزہ زاروں میں گھوم رہے تھے، نوجوان مقامی لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی نے آفرین کو گھیر لیا۔ انہوں نے آفرین کو بطور مصور پہچان لیا تھا۔ انہوں نے آفرین کے ساتھ تصویریں بنوائیں اور آٹوگراف وغیرہ لیے۔ دو دن پہلے بھی شانزے لیزے روڈ پر اسی طرح ایک دو فینز نے آفرین کو پہچانا تھا۔ بطور آرٹسٹ آفرین کی یہ کامیابی صالح کے لیے متاثر کن تھی۔

ایک روز وہ گھوم پھر کر گھر کی خوشگوار حرارت میں پہنچے تو کچن کی طرف باربی کیو کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مقامی لوگوں کی پسندیدہ ڈش ٹرکی روسٹ ہورہی تھی۔ ایک نوجوان کے علاوہ دو لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ یہ تینوں پاکستانی ہی تھے۔ نوجوان کا نام ایاز شیرازی معلوم ہوا۔ وہ بھی ایک پینٹر تھا۔ یہاں پاکستانی "ٹرک آرٹ" کو فروغ دے رہا تھا۔ اس آرٹ کے حوالے سے ایک تربیتی ادارہ بھی چلا رہا تھا۔ اچھی شکل وصورت کا خوش مزاج شخص تھا۔ ایک لڑکی اس کی بہن تھی دوسری کزن۔ یہ لوگ بھی پیرس کے اسی علاقے میں رہتے تھے۔ دونوں فیملیز کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا اور بے تکلفی موجود تھی۔

سب نے اکٹھے ہی کھانا کھایا۔ پہلے کورونا کے پھیلاؤ کی باتیں ہوتی رہیں پھر آرٹ کا موضوع شروع ہوگیا۔ یہ موضوع صالح کے لیے زیادہ دلچسپ نہیں تھا لہٰذا وہ خاموش ہی بیٹھا رہا۔

ایک دو بار صالح کی گفتگو اپنے پھوپی زاد فرحان سے بھی ہوچکی تھی۔ طویل عرصے بعد ایک دوسرے کی آواز سن کر دونوں کو ہی اچھا لگا تھا۔ اگلے روز اس نے پھر ساؤتھ افریقا کے شہر کیپ ٹاؤن سے ویڈیو لنک پر صالح سے بات کی۔ باتوں کے دوران فرحان نے کہا۔ "صالح! تمہیں ایاز بھائی کیسے لگے؟"

"اچھے ہیں یار! ہینڈسم ہیں اور خوش باش بھی۔ پاکستانی ٹرک آرٹ میں کافی کامیاب جارہے ہیں۔"

"ان کے بارے میں تمہیں کچھ اور بھی بتایا ممی نے..... یا آفرین نے؟"

"نہیں تو۔" صالح ذرا چونکا۔

"یار! شادی ہورہی ہے ان کی آفرین سے..... کافی عرصے سے بات چل رہی تھی۔ خیر، اب تو سب کچھ طے

www.pklibrary.com

ہو چکا ہے۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں فنکشن تھا مگر اب اس کورونا کی وجہ سے مختصر تقریب ہی کرنا پڑے گی۔"

وہ سکتہ زدہ رہ گیا۔ دوسری طرف سے "ہیلو ہیلو" کی آواز آتی رہی۔ آخر خود کو بہ مشکل سنبھال کر بولا۔ "ن..... نہیں۔ مجھے تو نہیں بتایا کسی نے۔"

وہ ہنسا۔ "آفرین تو شاید شرما رہی ہوگی۔ ویسے مجھے لگتا نہیں کہ تم اتنی جلدی پاکستان لوٹ سکو گے۔ ہوسکتا ہے کہ تم بھی آفرین کی شادی دیکھ لو۔"

کچھ دیر فرحان سے گفتگو تو ہوتی رہی مگر صالح ٹھیک سے کچھ بول پایا نہ سن سکا۔ کال ختم ہونے کے بعد اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ آس امید کا جو محل پچھلے چند روز میں کھڑا ہوا تھا اور صالح کے تصور میں جگمگایا تھا، دھڑام سے نیچے آ گرا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس نے اپنے ہوش و حواس میں سنا ہے۔ نہ ہی یہ یقین آیا کہ قدرت اتنی نامہربان بھی ہوسکتی ہے۔ اتنے عرصے بعد ان دونوں کو ملایا گیا تھا اور پھر ایک لامتناہی فاصلے پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

مگر جوں جوں وہ سوچتا گیا، اسے یقین ہوتا گیا کہ یہ حقیقت ہے اور حقائق ایسے ہی تلخ ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے بچھڑنے اور دوبارہ ملنے میں کوئی چند ہفتوں یا مہینوں کا وقفہ نہیں تھا۔ یہ برسوں کا فاصلہ تھا۔ دونوں طرف سے سب کچھ ختم کیا جا چکا تھا اور زندگی [illegible] ڈگر پر چلتی ہی رہتی ہے۔ [illegible] اپنی اپنی طرح اپنے بہاؤ کے راستے ڈھونڈ لیتی ہے۔ بالآخر آفرین کی زندگی نے بھی ڈھونڈ لیا تھا۔ فرحان کی گفتگو سے صالح کو یہی اندازہ ہوا تھا کہ آفرین کی زندگی کو نئے راستے پر ڈالنے کے لیے اس کے اہلِ خانہ نے بھی کوشش کی اور آخر کار وہ اس راستے پر چل پڑی تھی۔ ایاز اور آفرین میں پہلے انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہوئی پھر دوستی بڑھی اور بات شادی تک پہنچ گئی۔ اب وہ دونوں اس نئے سفر کے لیے تیار تھے۔

صالح سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ کیسے انکشاف انگیز شب و روز تھے۔ اس پر اوپر تلے کئی عقدے کھلے تھے۔ چند ہی روز پہلے معلوم ہوا تھا کہ وہ حقیقت، افسانہ تھی کہ پانچ برس پہلے آفرین کی شادی ہو چکی ہے اور اب یہ پتا چل رہا تھا کہ وہ شادی کے بندھن میں بندھ رہی ہے۔ صالح کے دماغ میں آندھی سی چلنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں چکرانے لگا..... نہیں، نہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں آفرین کو دوسری بار نہیں بچھڑنے دوں گا۔ وہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ وہی میری زندگی کو مکمل بربادی سے بچا سکتی ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ میں آج بھی اس سے محبت کرتا ہوں اور یقیناً وہ بھی اس انمول جذبے کو بھولی نہیں ہوگی۔ اسے کہوں گا کہ محبت صرف ایک بار ہوتی ہے۔ بعد میں صرف سمجھوتے ہوتے ہیں..... صرف سمجھوتے۔

وہ رات کو دیر تک جاگا تھا اس لیے اگلے روز دس گیارہ بجے تک سویا۔ اٹھ کر اس نے کھڑکی کے پردے وا کیے۔ ایک ٹھٹھری ہوئی سی دھوپ مختصر لان کو روشن کر رہی تھی۔ اس نے ایک ایسا منظر دیکھا جو جاگتے ساتھ ہی اس کو کچھ اور مجروح کر گیا۔ ایاز شاید ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا تھا اور آفرین سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑے سائز کی کتاب نما شے تھی۔ کچھ دیر بعد صالح کو اندازہ ہوا کہ وہ ایک البم تھا جس میں جیولری وغیرہ کی تصویریں تھیں۔

آفرین دھیان سے دیکھنے لگی۔ وہ کسی کسی تصویر پر انگلی بھی رکھتی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے دلکش چہرے پر شرم کا ہلکا سا رنگ لہرا جاتا پھر ایاز نے کوئی بات کہی اور بلند آواز میں ہنسا۔ آفرین نے بھی اس ہنسی میں تھوڑا بہت اس کا ساتھ دیا۔

صالح کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ سب شادی کی تیاری کے سلسلے میں ہو رہا ہے۔ کچھ دیر کے لیے تو اس کا دل چاہا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا جائے۔ اگر پاکستان واپس نہیں جا سکتا تو پیرس میں ہی کہیں گم ہو جائے۔ وہ دیر تک بہت سنجیدگی سے اس بارے میں سوچتا رہا مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ کم از کم ایک بار تو اس بارے میں آفرین سے کھل کر بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ حیرت بھی ہو رہی تھی کہ آفرین نے ابھی تک اسے اس نئی صورتِ حال کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔ شاید وہ بھی تذبذب کے کسی دوراہے پر کھڑی تھی۔ یقیناً برسوں بعد صالح نے اچانک نمودار ہو کر اس کی زندگی کو اتھل پتھل کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں صالح کو یقین سا ہونے لگا کہ اب وہ آسانی سے اس اتھل پتھل کو نظر انداز نہیں کر پائے گی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ صالح نے دروازہ کھولا۔ سامنے آفرین کھڑی تھی۔ اسے ذرا ڈانٹ کر بولی۔ "کل بھی اتنی دیر سوئے پڑے رہے۔ ناشتا مس کر رہے ہو۔ اب دیکھو یہاں کے رواج کے مطابق لنچ کا ٹائم ہونے والا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے، لنچ ہی سہی۔"

"یعنی برنچ..... تو چلو پھر جلدی سے فریش ہو جاؤ۔

www.pklibrary.com

ایاز بھی آئے ہوئے ہیں۔ تم سے ملنے کے لیے بیتاب ہو رہے ہیں۔ بہت تعریف کر رہے تھے تمہاری۔'' آفرین نے آخری جملہ پلکیں جھکائے جھکائے کہا۔

ایاز کے ساتھ صالح کی نشست بہت اچھی رہی۔ صالح کو پتا چلا کہ ایاز کافی پڑھا لکھا بھی ہے۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی تاہم اچھی صحت کے سبب اپنی عمر سے چار پانچ برس چھوٹا نظر آتا تھا۔ سات آٹھ برس پہلے اس کی شادی ایک فرنچ لڑکی سے ہی ہوئی تھی لیکن دونوں میں نبھ نہ سکی اور خوش اسلوبی سے ہی طلاق ہوگئی۔ اب پچھلے قریباً چھ سات برس سے وہ تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ گفتگو کے دوران میں ایاز کی نگاہ جب بھی قریب بیٹھی آفرین پر پڑتی تھی، اس کی آنکھوں میں آفرین کے لیے رنگ سے بکھر جاتے تھے۔

☆☆☆

آفرین اور اس کی ممی عاصمہ کمرے میں اکیلی بیٹھی تھیں۔ باہر پھر ہلکی برف باری شروع ہوگئی تھی۔ ابھی شام ہوئی تھی مگر تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ آفرین کا موبائل فون بار بار کال کے سگنل دے رہا تھا۔ آخر اس نے کال ریسیو کرلی۔ دوسری طرف ایک مقامی ٹی وی چینل کا نمائندہ تھا۔ وہ ایک ابھرتی ہوئی مقبول آرٹسٹ کی حیثیت سے آفرین کا انٹرویو کرنا چاہ رہا تھا۔ آفرین عجیب سے موڈ میں تھی۔ اس نے مناسب الفاظ میں معذرت کرلی اور فون بند کردیا۔

گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کر اس نے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائی اور پھر سوچ میں گم ہوگئی۔ عاصمہ نے بیٹی کے چہرے سے بالوں کی لٹ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''قدرت کے کام ایسے ہی نرالے ہوتے ہیں۔ دیکھو، وہ آیا بھی تو کس وقت آیا۔ میں اس کی طرف دیکھتی ہوں تو دل کٹنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی بچپن کی یادیں بسی ہوئی ہیں۔ ہر ہر بات اس کے دل و دماغ پر نقش ہے۔ وہ کچھ بھی بھول نہیں پایا۔''

''چلیں اچھا ہی ہوا..... بھائی فرحان نے اسے حالات سے آگاہ کردیا ہے۔'' وہ اداسی سے بولی۔

''مگر یہ سب کچھ جھیلنا اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔'' عاصمہ نے کہا۔

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے ممی؟'' آفرین کی آواز بھرا گئی۔ ''آپ بھی جانتی ہیں کہ سب رابطے ختم ہو چکے تھے۔ رابطوں کے یوں ختم ہوجانے سے جو کچھ میرے دل پر گزرتی رہی ہے، وہ بھی آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں نے خود کو بہت مشکلوں سے سنبھالا اور جب میں کچھ سنبھل گئی تو آپ اور پاپا ہی تھے جنہوں نے مجھے نئے راستوں پر قدم رکھنے کے لیے مجبور کیا۔''

''تم نے اب تک صالح سے اس بارے میں کوئی بات کی؟''

''نہیں، ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب کروں گی۔''

''کیا کہو گی؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں ممی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ مجھے لگتا ہے کہ اتنے برسوں بعد صالح سے مل کر میرا ذہن دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک حصے میں کچھ اور چل رہا ہے، دوسرے میں کچھ اور لیکن..... ایک بات تو میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں..... اور شاید آپ بھی سمجھ رہی ہیں۔ اب اس مرحلے میں ایاز جیسے اچھے انسان کو راستے میں چھوڑ دینا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ اب ہمیں آگے بڑھنا ہوگا۔ اب واپسی کیسے ہوسکتی ہے؟''

☆☆☆

آج پھر وہ دونوں دریائے سین کے کنارے کنارے چلتے جا رہے تھے۔ سہ پہر کی دھوپ چمکیلی برف سے منعکس ہوکر مرد و زن کے چہروں کو روشن کر رہی تھی۔ لاک ڈاؤن میں تھوڑی سی نرمی ہوئی تھی۔ دریا کے کناروں پر قدرے رونق نظر آتی تھی۔ صالح اور آفرین دونوں کی آنکھوں میں غم کے سائے تھے۔

صالح نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''آفری! قصور ہم دونوں میں سے کسی کا نہیں۔ ہمیں بس حالات نے لوٹا ہے لیکن ایک بات پورے یقین کے ساتھ سن لو۔ میں آج بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں..... میں تمہیں دوبارہ کھونے کے تصور سے ہی کانپ جاتا ہوں آفری!''

''مگر میں کیا کروں صالح..... ! دو ماہ بعد ہماری شادی ہے۔ ہم نے..... ہم نے عہد و پیماں کیے ہیں۔ فیوچر کے کچھ تصورات سجائے ہیں اپنی آنکھوں میں۔''

''اور جو تصورات ہم نے سجائے تھے آفری! کیا تم انہیں کبھی بھول سکتی ہو؟ کیا میں بھول سکتا ہوں؟ کیا ہم دونوں آئندہ جھوٹی زندگیاں جیتے رہیں گے؟ بولو نا۔''

''پلیز صالح! جب ہم ایسی باتیں کرتے ہیں تو میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ کیوں تکلیف دیتے ہو مجھے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم اچھے دوست بنے رہیں۔ ایک دوسرے کے لیے اچھی خواہشات رکھیں اور.....''

''اس سوال کا جواب تم اپنے دل میں جھانک کر

www.pklibrary.com

پوچھو۔'' صالح نے اس کی بات کاٹی۔ ''کیا ایسا ہو سکے گا؟ کیا شادی کے بندھن میں بندھ کر تم مجھ سے دوستی برقرار رکھ پاؤ گی؟ یہ سب کتابی باتیں ہیں آفری! پلیز..... پلیز! ایسا مت کرو آفری! قدرت نے اگر ہمیں اتنے برسوں بعد اس طرح ملایا ہے تو پھر اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔''

وہ ایک دم گم صم سی ہوگئی جیسے اس موضوع پر فی الحال کوئی بات نہ کرنا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھیں نم اور ناک کی چونچ سرخ نظر آئی۔ وہ بھی خاموش ہوگیا۔ دونوں پیرس کی برفیلی ہوا میں گہرے نیلے آسمان تلے دریا کے کنارے کنارے چلتے رہے مگر گفتگو کئی قدم پیچھے وہیں رکی رہی جہاں رکی تھی۔

..... یہ دو روز بعد کی بات ہے۔ پیرس میں موسم یخ بستہ ہونے کے باوجود قدرے صاف تھا۔ ہلکی دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی۔ دو ڈھائی ماہ بعد موسم بہار میں یہاں کوئی تصویری مقابلہ تھا۔ اس کے لیے لینڈ اسکیپ بنانے کے لیے آفرین اپنے دو ہم کاروں کے ساتھ پیرس کے مضافات میں گئی ہوئی تھی۔ واپسی پر اسے اور ایاز کو کچھ شاپنگ بھی کرنا تھی۔ یہ سب شادی کی تیاری کے حوالے سے تھا۔ صالح کی پھوپھو عاصمہ نے بھائی کی موت کا بہت غم کیا تھا اور کئی دن بیمار رہی تھیں۔ اب کچھ بہتر تھیں اور ایک پاکستانی ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے قریبی کلینک گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں صالح اکیلا تھا۔ پتا نہیں کیوں اب اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ جیسے بھی ہو، پاکستان واپس چلا جائے۔ وہ آفرین کے بدل جانے والے رویے کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ دل گواہی دینے لگا تھا کہ وہ اسے پاتے پاتے پھر کھو چکا ہے۔ حالات کی بساط پر وقت نے اسے مات دے دی تھی۔

زینے چڑھ کر وہ بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ یہاں دور ایفل ٹاور کا بالائی حصہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ محویت سے اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ محبتوں کے اس شہر میں نامہرباں وقت کتنا بڑا زخم دے رہا تھا اسے۔ اتنے میں ایک سیاہ فام ملازمہ صفائی کے لیے آگئی۔ بالائی منزل پر تین کمرے تھے۔ ملازمہ نے صفائی کرنے کے لیے ایک کمرے کا قفل کھولا تو صالح یونہی کمرا دیکھنے کے لیے اندر چلا گیا۔ یہاں دیواروں پر آفرین کی بنائی ہوئی بہت سی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ سارے لینڈ اسکیپ تھے۔ پاکستانی کھیت کھلیانوں اور باغ باغیچوں کے مناظر۔ کچھ تصویروں کے پس منظر میں سرخاب منزل جیسی کوئی نہ کوئی عمارت بھی دکھائی دیتی تھی۔ ایک چیز ان سب پینٹنگز میں مشترک تھی اور بڑی حیران کن بھی۔ یہ سب بارش کے مناظر تھے۔ صالح نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بات کر کے سیاہ فام ملازمہ کو اس کمرے کی صفائی سے روک دیا اور کہا کہ وہ پہلے دوسرے کمروں کو دیکھ لے۔ ملازمہ کے جانے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور عجیب کیفیت میں ان پینٹنگز کو دیکھنے لگا۔ صالح کو اندازہ ہوا کہ یہ پینٹنگز دو تین سال پہلے بنائی گئی ہوں گی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ یہ بارش کے اسی یادگار دن کی عکاسی ہے جو کبھی ان دونوں نے بتایا تھا..... اور وہ خوشیوں سے بھرا بے مثال دن ایک انمٹ یاد بن کر ان دونوں کے ذہنوں میں نقش ہوگیا تھا۔ چاہت، بے پایاں مسرت، معصوم مستی، دیوانگی، بے مثل آسودگی، سب کچھ ان رنگوں میں اور بارش میں سمو دیا گیا تھا۔ ایک دو تصویریں تو بالکل واضح تھیں۔ وہی سرخاب منزل کا باغ تھا جو اب تقریباً ناپید ہو چکا تھا۔ اس باغ میں گہرے سیاہ بادلوں کے نیچے فواروں کے قریب پانی کے موتی تابڑ توڑ برستے تھے اور دو سائے محوِ رقص تھے۔ یہ دو بچوں کے سائے تھے۔

نیگرو ملازمہ کی آواز نے صالح کو خیالوں سے چونکایا۔ وہ اب اس کمرے میں صفائی کرنا چاہ رہی تھی۔ صالح نے اپنی شکستہ انگلش میں ملازمہ سے پوچھا۔ ''یہ تصویریں کس نے بنائی ہیں؟''

وہ مسکرائی۔ ''آپ کی میزبان نے۔ وہ بڑی آرٹسٹ ہیں۔ ان کی تصویریں مہنگے داموں بکتی ہیں۔''

''اور یہ کیوں نہیں بکیں؟'' صالح نے کہا۔

''یہ وہ بیچتی ہی نہیں ہیں۔ اپنے پاس رکھنا چاہتی ہیں۔'' عورت نے مختصر جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

اس دن صالح نے سوچا کہ پیرس چھوڑنے سے پہلے اسے مزید ایک بار آفرین سے بات کرنی چاہیے۔ شاید.....

☆☆☆

کل رات شروع ہونے والی برف باری آج تھم چکی تھی تاہم ایفل ٹاور نے ہلکی سی سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ لاک ڈاؤن میں نمی تھی۔ ماسک لگائے لوگ اِدھر اُدھر گھومتے نظر آرہے تھے۔ رومانی جوڑوں کی اٹکھیلیاں بھی کہیں کہیں دکھائی دیتی تھیں۔ ان جوڑوں میں صالح اور آفرین بھی شامل تھے..... مگر وہ رومانس سے بہت دور تھے۔

صالح نے کہا۔ ''آفری! کئی دن سے سوچ رہا ہوں کاش..... کاش تم مجھے دوبارہ ملی ہی نہ ہوتیں۔ میری زندگی

www.pklibrary.com

کی سب سے بڑی امید اس طرح بندھ کر تو نہ ٹوٹتی۔"

"وقت پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہوتا صالح! بس سمجھ لو کہ اس "وقت" نے ایک اور دکھ دیا جو جھیلنا پڑے گا۔" وہ نگاہیں جھکائے جھکائے بولی۔

پیرس کی یخ بستہ ہوا نے سموری ٹوپی کے نیچے سے آفرین کی لٹیں اس کے چہرے پر بکھیریں۔ اس نے اپنے اجلے ہاتھ فرنچ جیکٹ کی جیبوں میں گھسائے اور پتھریلی سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔

"آفری! تمہیں پتا ہے، یہاں سے بہت دور سرخاب منزل کے در و دیوار تمہیں اب بھی یاد کرتے ہیں۔ وہاں کے کھیت کھلیان، پگڈنڈیاں، راستے، درخت، موسم اور وہ سب کچھ جو تم ایک خوشیوں بھری عید سے چند دن پہلے چھوڑ آئی تھیں۔"

وہ خاموشی سے سڑک کے کنارے کو دیکھتی رہی جہاں ایک فرانسیسی گٹار بجا رہا تھا۔ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں پھر بولا۔ "تمہیں تو وہ سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا۔ مکھن کا پیڑا، چاٹی کی لسی، ساگ، مکئی کی روٹی، چاولوں کی پنیاں اور باداموں والا گڑ..... پھر لمبی راتیں اور آپا ماماں بی کی لمبی کہانیاں..... کیا تمہیں ان میں سے کچھ بھی یاد نہیں؟"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "ہاں..... صالح.....! اب کچھ بھی یاد نہیں..... اور جو کچھ یاد ہے، وہ میرے دل کے اندر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ بس اسے ویسا ہی رہنے دو پلیز!"

"میرا قصور تو بتا دو آفری!" اس کی آواز بھرا گئی۔

"اور تم میرا قصور بتا دو صالح! میں نے بہت انتظار کیا تھا تمہارا..... تمہارے خطوط کا۔ مدت تک روتی رہی تھی تمہارے جواب کے لیے۔"

"اب تم جان چکی ہو کہ وہ سب کیوں ہوا۔"

"..... تو وہ تمہارا ہی دوست تھا نا..... میرا تو یہ کبھی نہیں لگتا تھا صالح.....! دیکھو، تمہارے گھر سے ممی اور میں کتنے دنوں ہوئے نکلے تھے۔ ممی کسی کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ میں نے پھر بھی تم سے رابطہ کیا۔ اس رابطے کی سزا یہ ملی کہ تم اس بات کو بھی راز نہ رکھ پائے۔ مجھے آج بھی یاد ہے پاکستان سے ماموں جان نے فون پر ممی کو کتنا برا بھلا کہا تھا۔" اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر ذرا سنبھل کر بولی۔ "خیر، اب یہ باتیں پرانی ہو چکیں۔ کوئی فائدہ نہیں دہرانے کا۔"

"پلیز آفری..... پلیز.....! میں تمہیں دوبارہ پا کر کھونا نہیں چاہتا۔" وہ سراپا عجز نظر آیا۔

"تم اسے دوبارہ پانا نہ کہو صالح!" آفرین کی پیشانی پر ہلکا سا بل آ گیا۔ "بس سمجھو کہ یہ بدلے ہوئے حالات میں ایک ملاقات تھی ہماری جو ماموں جان کی بیماری کے سبب اتفاقاً ہو گئی۔"

آفرین کی خوبرو پیشانی پر نمودار ہونے والے بل نے صالح کے سینے میں کوئی چیز چھناکے سے توڑ ڈالی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس بل کے پیچھے ایک مصمم ارادہ ہے اور وہ تعلق ہے جو عنقریب ایاز شیرازی سے قائم ہونے جا رہا ہے۔ پیشانی کے اس بل کے پیچھے کھلا انکار، دوٹوک الفاظ، مکمل بے رخی، بہت کچھ ہو سکتا تھا اور وہ یہ سب کچھ جھیلنا نہیں چاہتا تھا۔

صالح نے سامنے دیکھا۔ دریائے سین کے پہلو میں محبتوں کا علمبردار تقریباً 1080 فٹ بلند ایفل ٹاور برف کی ہلکی سی تہ اوڑھے کھڑا تھا۔ یہاں بچھڑے ہوئے ملتے تھے، ٹوٹے ہوئے دل جڑتے تھے مگر ہمیشہ تو ایسا نہیں ہوتا۔ آنے والے اپنا اپنا نصیب لے کر آتے ہیں اور اگر نصیب خراب ہو تو پھر ایفل ٹاور، دریائے سین یا تاج محل، کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

☆☆☆

دس دن بعد صالح بڑی خاموشی سے پاکستان لوٹ آیا تھا۔ وبا کے باعث فلائٹ کے حصول کے لیے اسے سخت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ پھپھو عاصمہ نے اسے چند روز مزید روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر جس نے کوشش کرنا تھی جب وہی نہیں کر رہی تھی تو پھر رکنے کا فائدہ۔ وہ اپنے آنسو پلکوں کے پیچھے چھپا کر انہیں الوداع کہہ آیا تھا۔

...کئی روز تک وہ یکسر گم صم رہا۔ سرخاب منزل سے کہیں نکلا بھی نہیں۔ بس ایک بار سرخاب منزل کے عقبی قبرستان میں بابا اور ماں کی قبر تک گیا جہاں ایک چھوٹی سی قبر اس کی بہن کی بھی تھی۔

ایک دن داجے فضل نے اسے بتایا کہ آج اسے لازماً تاریخ پر جانا ہے۔ یہ وہی "ڈینگی ٹیم" والی لڑکی کا کیس تھا جو اب تک لٹکا چلا آ رہا تھا۔

وہ جب اپنے ملازم خاص اخترے اور داجے فضل کریم کے ساتھ عدالت میں پیش ہونے سرگودھا پہنچا تو اسی سڑک سے گزرا جس پر آگے جا کر انکل سیف اور دغا باز وکی کی رہائش گاہ تھی۔ ایک بار پھر اس کا دل غم و غصے سے بھر گیا۔ وکی کے حوالے سے اس کے بدترین اندیشے بھی حقیقت ہی نکلے تھے۔ وہ آفرین سے خط... کتابت شروع کرنے کے بعد اس کے پیچھے کوالالمپور تک گیا تھا۔ کسی بھی

www.pklibrary.com

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات

دنیا بھر میں

خدمات

اور مصنوعات

کی مؤثر تشہیر کے لیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

عالمی ادب سے شاہکار کہانیوں، افسانوں اور معلومات کے خزانوں کا انتخاب

جنہیں ہر برِاعظم کے لاکھوں قارئین ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں

جہاں جہاں اردو پڑھی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں یہ رسائل باقاعدگی سے پہنچتے ہیں

C-63 فیز ٹو ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

فون نمبر: 35804200, 35802552 (92-21) فیکس: 35802551 (92-21) ای میل: group@hotmail.com

www.pklibrary.com

طرح آفرین کو اپنے شکنجے میں لانے کی اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی..... اور اب ایک قاتل کی حیثیت سے وہ مفرور تھا۔

صالح نے اس بارے میں داجے فضل سے پوچھا تو انہوں نے بالکل غیر متوقع جواب دیا۔ ''شاید تمہیں نہیں معلوم کہ وہ پاکستان واپس آچکا ہے۔ لگتا ہے اس کے باپ نے ٹھیک ٹھاک پیسا لٹایا ہے اس پر..... وکیل بھی چوٹی کا کیا تھا۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''وہ صرف چار ہفتے ہی جیل میں رہا ہے۔ اب اس کی ضمانت ہوگئی ہے۔ کیس چلتا رہے گا اور قانونی ہتھکنڈے استعمال ہوتے رہیں گے۔''

صالح کے سینے کی چنگاریاں ایک دم بھڑک کر الاؤ بن گئیں۔ اس کا جی چاہا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اختر کے کو فوراً گاڑی کا رخ وکی کے گھر کی طرف موڑنے کو کہے مگر داجے فضل کریم ساتھ تھے اور وہ تاریخ پر جا رہا تھا۔

تاریخ بھگت کر وہ واپس سرخاب منزل پہنچ گیا اور رات دیر تک جاگتا رہا۔ اس کے اندر ایک لاوا سا پک رہا تھا۔ اختر کے کی معلومات کے مطابق وکی آج کل سرگودھا میں ہی تھا اور اس کا والد سیف کراچی میں اپنے تباہ شدہ کاروبار کو سنبھالا دینے کی کوششیں کر رہا تھا۔

یہ اگلی شب کا ذکر ہے۔ صالح اپنے دستِ راست اختر کے ساتھ سرگودھا میں موجود تھا۔ بند کمرے میں صالح اور وکی ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ صالح کا چہرہ تیز اثر وہسکی کے سبب تمتمایا ہوا تھا۔ وکی بھی اپنے گلاس سے ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہا تھا۔ وکی کے بال ہمیشہ کی طرح اسپائس کی شکل میں تھے۔ گلے میں سونے کی موٹی چین تھی۔ اس نے بس دو چار فقروں میں ہی صالح کے والد کی رحلت کا افسوس کیا تھا اور اب خاموش تھا۔

صالح نے اس کے گلے میں سونے کی زنجیر کو دیکھا۔ زنجیر سے ذرا اوپر گلے پر کٹ کا پرانا نشان تھا۔ ''تمہیں یہ زخم کیمیکل ڈور کی وجہ سے لگا تھا نا؟'' صالح نے اچانک سوال کیا۔

''کیوں، کوئی شک ہے یارم؟'' وکی نے ذرا چونک کر کہا۔

''شک تو ہے۔'' صالح نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''اور شک تو اور بھی بہت سے ہیں۔ جیسے مجھ بیوقوف کو ایک شک یہ بھی ہے کہ سات برس پہلے کوالالمپور سے آفرین کے خط آتے تو تھے لیکن مجھ تک پہنچ نہیں پاتے تھے..... اور ایک شک یہ بھی ہے کہ کسی ''بدنیت'' نے آفرین کو میری طرف سے بدظن کیا تھا اور کہا تھا کہ میں ایک اور لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں اور پھر وہی بدنیت دغاباز..... میری آفرین کو تسلی دینے اور اس کے آنسو پونچھنے کے لیے خاموشی سے کوالالمپور جا پہنچا تھا۔''

وکی کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ وہ کھلی کھلی آنکھوں سے صالح کو دیکھنے لگا۔ یقیناً یہ بات اس کی سمجھ میں آنا شروع ہوگئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح صالح کی ملاقات آفرین یا اس کی والدہ وغیرہ سے ہو چکی ہے۔

''میں..... کچھ سمجھ نہیں پا رہا یارم!'' وکی کی آواز میں لرزش تھی۔

''مت کہو مجھے یار..... اور یارم!'' صالح زور سے دہاڑا اور وہسکی کا گلاس وکی پر دے مارا۔ وہ اس کی ٹھوڑی سے ٹکراتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور چکنا چور ہوگیا۔ صالح نے اس کا گریبان دبوچ لیا اور اسے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

''تم نے برباد کر دیا مجھے۔ تم دوستی کے نام پر بدنما داغ ہو۔ لعنت ہے تم پر اور تمہارے پیدا کرنے والوں پر۔''

وکی اب سنبھل چکا تھا۔ انگلی اٹھا کر خطرناک لہجے میں بولا۔ ''زبان سنبھال کر بات کرو۔ میرے گھر میں ہو ورنہ ابھی تمہاری دو چار ہڈیاں تڑوا کر باہر پھنکوا دیتا۔''

''تو بلاؤ ہڈیاں توڑنے والوں کو..... بلاؤ اپنے.... بدمعاشوں کو۔''

''میں کہتا ہوں، میرا گریبان چھوڑ دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''جو جو بُرا تم نے کرنا ہے، آج کر گزرو۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ اپنی کمینگی میں تم کہاں تک جاتے ہو۔''

''میں کمینہ ہوں تو تم بھی کمینگی اور حرامزدگی میں کچھ کم نہیں ہو۔'' وہ ایک جھٹکا دے کر اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے گرجا۔ ''تم سے بھی جو کچھ ہو سکا، تم نے کیا ہے میرے ساتھ۔ اب سمجھ چکا ہوں میں۔ تم نے ہی اس کمینی نازو کی وجہ سے مجھے شاہد بابڑا کے ساتھ لڑایا۔ اب اسی کمینی کو اپنے گھر میں ڈالا ہوا ہے تم نے..... اور..... اور اگر میں قاتل بنا تو اس میں بھی تمہارا ہاتھ ہے۔ ڈھیرو پنڈ میں جب شاہد سے میری لڑائی ہوئی تو تم جان بوجھ کر موقع پر نہ پہنچے اور اس وقت پہنچے جب بندہ میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ اب اسی شاہد بابڑا سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں تمہاری۔ کچھ چھپا ہوا نہیں ہے مجھ سے..... کچھ چھپا ہوا نہیں۔'' اس نے

www.pklibrary.com

ہاتھ ہوا میں نچایا۔

صالح نے ایک بار پھر جھپٹ کر اس کا گریبان دبوچ لیا اور گھما کر دیوار کے ساتھ دے مارا۔ شور سن کر صورتِ حال کی نزاکت جانتے ہوئے وکی کا ایک مسلح گارڈ اندر گھس آیا۔ وکی کا گریبان بدستور صالح کی گرفت میں تھا۔ تنومند گارڈ نے زور لگا کر اپنے مالک کو چھڑایا اور دھکا دے کر صالح کو صوفے پر پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی ریپیٹر گن صالح کی طرف سیدھی کرلی۔ انداز دھمکانے والا ہی تھا۔ جواباً مشتعل صالح نے بھی تاخیر نہیں کی اور واسکٹ کی اندرونی جیب سے ٹی ٹی پسٹل نکال کر تان لیا۔

''چلاؤ گولی..... چلاؤ گولی۔'' صالح غضب ناک ہوکر چلایا۔

اسی دوران میں قریبی کمرے میں بیٹھا اختر ابھی دروازے کو ٹھوکر مارتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ اندر کی سچویشن دیکھتے ہی اس نے بھی ماؤزر نکال لیا۔ چند سیکنڈ کے لیے یہی لگا کہ گولی چل جائے گی..... پھر سوسائٹی کے سیکیورٹی گارڈز کی گاڑی کا بلند ''ہوٹر'' سنائی دینے لگا۔ غالباً گھر کے کسی ملازم نے اندر کی دھما کا خیز صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے سیکیورٹی کو بلا لیا تھا۔

اختر نے بھی چونکہ ماؤزر تانا ہوا تھا لہٰذا صالح نے اپنا پستول پھر جیکٹ میں رکھ لیا۔ وکی کی طرف انگلی اٹھا کر آتشیں لہجے میں بولا۔ ''یہ بات یہیں ختم نہیں ہوگی وکی.....! یاد رکھنا، میں تم سے اپنی بربادی کا بدلہ ضرور لوں گا۔''

''ضرور، ضرور۔ مجھے بھی دو چار حساب چکانے ہیں تم سے۔'' وکی پھنکارا۔

صالح، اختر کے کولیتا ہوا تیزی سے باہر آگیا۔ اس کے اشارے پر اختر نے اپنا ماؤزر جیب میں چھپا لیا تھا۔ کوٹھی کے گیٹ پر ہاؤسنگ سوسائٹی کی سیکیورٹی کار موجود تھی۔ گارڈز نے ان دونوں سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر صالح نے انہیں ایک طرف دھکیل دیا اور اختر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر نکل آیا۔

ابھی وہ سڑک کے موڑ تک نہیں پہنچے تھے کہ صالح کو ایک شخص موٹر بائیک پر وکی کی رہائش گاہ کی طرف جاتا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر صالح تھوڑا سا چونکا۔ سردی کے سبب اس شخص نے اپنا منہ سر ڈھانے میں لپیٹ رکھا تھا تاہم اس کے ڈیل ڈول اور اس کی کالی موٹر بائیک کو دیکھ کر صالح کو شک ہوا کہ وہ جالانوری ہے۔ وہی جالا جو سرخاب منزل میں مخبر کے فرائض انجام دیتا رہا تھا اور بعد ازاں صالح نے اسے جوتے رسید کر کے ڈیرے سے نکالا تھا۔ یہ شخص چند ہفتے باڑوں کے پاس رہا تھا پھر وہاں سے بھی اوجھل ہوگیا تھا۔ اب وہ یہاں وکی اور اس کے والد سیف کی رہائش گاہ کی طرف جاتا نظر آیا تھا۔

''گاڑی روکو اختر!'' صالح نے کہا۔

اختر نے حکم کی تعمیل کی۔ صالح عقب نما آئینے میں دیکھتا رہا۔ جلد ہی اسے پتا چل گیا کہ بائیک سوار وکی کے گھر میں گھسا ہے۔ آثار سے پتا چل رہا تھا کہ پوشیدہ دشمن وقار وکی اب کھلے دشمن کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔

☆☆☆

وکی کے حوالے سے صالح کے اندر جتنا غم وغصہ پیدا ہوا تھا، اس نے پیرس والے صدمے کو دوچند کر دیا تھا۔ اس کے اندر ایک آگ سی بھڑک رہی تھی۔ اگلی دو تین راتوں تک اس آگ کا رخ مکمل طور پر دراز زلف نازو کی طرف ہی رہا۔ مردوزن کا خوبصورت تعلق اب صالح کے لیے مکمل طور پر دشمنی اور وحشت کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ شراب خانہ خراب اس وحشت کو اور بڑھاوا دیتی تھی۔ جب اس کے جنون کا چڑھا ہوا دریا اترتا تھا تو نازو کی نگاہوں میں بھی اسے دیگر عورتوں کی طرح دبی دبی نفرت اور حقارت ہی نظر آتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک اسے یہ منظر دیکھ کر کچھ خفت ہوتی تھی مگر اب یہ خفت بھی ختم ہوچکی تھی۔

ایک روز شام کو جب وہ مے نوشی شروع کرنے ہی والا تھا، داجے نے اسے اپنے پاس بلایا۔ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''صالح! شاہنواز دنیا سے چلا گیا۔ اس کا دور ختم ہوا، اب تمہارا دور شروع ہو رہا ہے۔ تم یہاں سیاہ سفید کے مالک ہو اور اس کے ساتھ ساتھ تم پر بہت سی ذمے داریاں بھی آرہی ہیں۔ اب تمہیں اپنا آپ بدلنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے داجے!'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ اب مجھے بدلنا چاہیے۔ میں کل سے ہی کوشش شروع کرتا ہوں۔'' داجے اسے یہ نصیحت کر کے چند دن کے لیے اپنے بیمار بھائی کے پاس چلے گئے۔

اور واقعی اگلے دن سے اس نے سرخاب منزل میں تبدیلیوں کا عمل شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو اس نے وہ لنگر ختم کیا جو تیس چالیس برس سے یہاں جاری تھا اور بے شمار ضرورت مند مستفیض ہوتے تھے۔ آنے والے پانچ چھ روز میں اس نے سرخاب منزل کے وہ سارے ملازم چن

www.pklibrary.com

چن کر نکال دیے جو بابا شاہنواز کے قریب سمجھے جاتے تھے اور صالح کی شبانہ روز مصروفیات کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ حتیٰ کہ آیا ماما کی بھی صاف کہہ دیا کہ اگر انہوں نے کسی بات پر اس سے روک ٹوک کرنی ہے یا ناک بھوں چڑھانی ہے تو وہ اپنا بوریا بستر گول کر لیں۔ وہ ان کے خرچے کے لیے ہر مہینے پیسے بھجواتا رہے گا۔ ماماں بی نے اسے بچوں کی طرح پالا تھا۔ بچہ کیسا بھی ہو، ماں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔

صالح نے سرخاب منزل کے ایک بڑے ہال میں باقاعدہ ایک بار بنوایا اور بڑی تیزی کے ساتھ ایک ڈانسنگ فلور بھی ریڈی کروا دیا۔

فارغ ہو جانے والے ملازمین کی جگہ جو نئے ملازم رکھے گئے، ان میں چند شوخ و شنگ لڑکیاں بھی تھیں اور سب جانتے تھے کہ انہیں ملازمت کا پروانہ کیوں دیا گیا ہے۔

داجے فضل کریم اپنے بیمار بھائی کو دفنا کر پندرہ بیس روز بعد سرخاب منزل واپس پہنچے تو یہاں ''شاندار'' تبدیلیاں دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

انہوں نے اشک بار لہجے میں کہا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے صالح.....! اور یہ کیا ہونے والا ہے؟''

صالح نے واسکٹ کے نیچے نیکر پہن رکھی تھی اور ایک پالتو کتا اپنی گود میں بٹھا رکھا تھا۔ اس کا سر سہلاتے ہوئے بولا۔ ''جو کچھ ہو رہا ہے، آپ کے سامنے ہے لیکن جو وعدہ کیا تھا آپ سے، وہ ابھی تک برقرار ہے۔ جس عورت سے یہاں میرا تعلق ہے، وہ میری منکوحہ ہے۔ میرا مطلب نازو سے ہے۔''

داجے نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ ''ہاں، وعدہ ابھی تک تو برقرار ہے صالح! لیکن لگتا ہے وہ بھی زیادہ دیر نہیں رہے گا۔''

''حالانکہ میں چاہتا تو ایسا کر کے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ نئے نکاح کرتا اور نئی طلاقیں دیتا رہتا مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ یہ جھوٹ مجھ سے نہیں ہوگا۔'' وہ عجیب اکھڑپن سے بولا۔

داجے کی ہلکی نیلی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ انہوں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

صالح نے کہا۔ ''اور داجے..... اب میں آپ کو روکوں گا بھی نہیں حالانکہ دل تو یہی چاہتا ہے کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔''

''تمہاری نیک ماں نے تمہارا نام صالح رکھا تھا۔'' داجے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مگر افسوس تم ''صالح'' تو کیا عام انسان بھی نہیں رہے۔''

وہ گھٹنوں پر بوجھ ڈال کر اٹھے اور لڑکھڑاتے ہوئے کمرے کی طرف چلے گئے۔

صالح جانتا تھا کہ صبح سویرے ہی داجے فضل سرخاب منزل سے نکل جائیں گے۔ رات کسی وقت وہ خاموشی سے ان کے کمرے میں گیا۔ اس نے پہلے ہی سارا انتظام کر رکھا تھا۔ داجے فضل کریم کے آبائی گاؤں کے پاس کوئی پانچ مربع نہری زمین بھی مخدوم رائے فیملی کی ملکیت تھی۔ صالح نے منیجر افراسیاب سے کہہ کر اس میں سے تین مربع زمین داجے فضل کے نام منتقل کرا دی تھی۔ یہ کاغذات پولی تھین کے ایک لفافے میں ڈال کر اس نے داجے فضل کریم کے سرہانے رکھ دیے۔ ساتھ میں ایک مختصر خط بھی تھا..... ''داجے! آپ کو میرے سر کی قسم ہے، اس کو ٹھکرایئے گا نہیں۔ یہ میرے لیے آپ کی انمول محبت کا حقیر سا نذرانہ ہے۔''

صبح سویرے شاید فجر کے بعد ہی داجے فضل سرخاب منزل سے نکل گئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے صالح کو سرخاب منزل ایک دم خالی خالی نظر آئی۔ اس کا دل دیر تک جیسے کسی مٹھی میں جکڑا رہا۔ کیا واقعی وہ چلے گئے ہیں؟

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ کاغذ بدستور سرہانے کے نیچے موجود تھے۔ اس نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ اس کے خط کے نیچے دو نئی سطور لکھی تھیں۔ ''اللہ کرے میری باقی کی عمر بھی تمہیں لگ جائے..... مگر یہ سب کچھ میرے لیے حرام ہے۔''

پھر کچھ دیر بعد صالح پر انکشاف ہوا کہ وہ سرخاب منزل سے چلے تو گئے ہیں لیکن زیادہ دور بھی نہیں گئے۔ شاید بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ اپنے مختصر سامان سمیت کوئی دو کلومیٹر دور سویرا سائیں کے مزار پر منتقل ہو گئے تھے۔ شاید وہ اب بھی اس خام خیالی میں تھے کہ کسی طور کسی موقع پر صالح کو سنبھال سکیں گے۔

سرخاب منزل سے بابا شاہنواز اور داجے فضل کے جانے کے بعد سرخاب منزل مکمل طور پر نئے شب و روز میں داخل ہو گئی۔ سارے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے۔ یوں لگا کہ جیسے ساتوں شرعی عیب دھیرے دھیرے سرخاب منزل میں داخل ہوتے جا رہے ہیں۔ صالح کی سرعام شراب نوشی تو بابا کے آخری دنوں میں ہی شروع ہو چکی تھی، اب آئے

www.pklibrary.com

دن حویلی میں راگ رنگ کی محفلیں بھی سجنے لگیں۔ کل کا دوست آج کا دشمن ثابت ہوا تھا اور کل کا دشمن یعنی پرنس شاہد اب صالح کے قریبی دوستوں میں شمار ہو رہا تھا۔ پرنس کے والد بدر بابڑا کا ایک انگریز دوست بھی پاکستان آیا ہوا تھا۔ بابڑوں کی طرح وہ بھی اونٹ اور گھوڑے پالنے اور خریدنے کا زبردست شوق رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو بیٹے اور بیٹوں کے دوست بھی تھے۔ ان میں تین چار غیر ملکی لڑکیوں کی ایک ٹولی بھی تھی۔ اب یہ سب لوگ بھی سرخاب منزل کو رونق بخشنے لگے۔ مغربی اور مشرقی موسیقی کی دھنوں پر خوب ہلا گلا ہو رہا تھا۔

اپنے آتشیں جذبوں کی تسکین کے لیے مہناز عرف نازو اس کے پاس موجود تھی۔ وہ قانوناً اس کی بیوی تھی مگر صالح کے لیے وہ ایک ڈاچی ہی تھی جو ایک خوبصورت ڈاچی کے بدلے میں اس نے حاصل کی تھی۔ البتہ یہ ڈاچی بھی صحرائے وحشت کی برق رفتار جادہ پیمائی میں اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی اور بدحال ہو جاتی تھی۔ صالح کے پاؤں سے تو بگولے بندھے رہتے تھے۔ یہ ''بگولے'' اس کا خاندانی امتیاز تھے۔ ویسے بھی اب وہ اس کے دل سے اترتی جا رہی تھی۔

ایک روز وہ نہ جانے کس موڈ میں تھا۔ اس نے نازو کے غیر معمولی لمبے بال کھینچی لے کر اپنے ہاتھوں سے کاٹ کر بالکل مختصر کر دیے۔ عجیب سا ڈیزائن بنا دیا۔ وہ بہت روئی بلکی۔ اس کی اشک شوئی کے لیے اس نے پانچ ہزار والے نئے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی جھولی میں ڈال دی۔

''تمہارے بالوں کی قیمت۔'' صالح نے کہا۔

نازو کا غم آدھا رہ گیا اور جب ایسی ہی ایک اور گڈی دھپ سے اس کی جھولی میں گری تو وہ ہولے سے مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ نے بتا دیا کہ اس کے جسم کا ہر حصہ برائے فروخت ہے۔

نازو کے مشہورِ زمانہ بال قینچ کر کے صالح کو ایسے ہی لگا تھا جیسے وہ ایک ڈاچی ہے، اس کی ملکیت ہے اور اس نے اپنی مرضی سے اس کی اون تراش کر اپنی پسند کا ڈیزائن بنا دیا ہے۔

☆☆☆

وہاں پیرس سے دوبارہ کسی طرح کی کوئی خبر نہیں آئی تھی اور صالح چاہتا تھا کہ کوئی خبر اسے ملے بھی نہ۔ اسے فقط اتنا پتا چلا تھا کہ پھپھو عاصمہ، بھائی کی قبر پر آنا چاہتی ہیں مگر کورونا کے سبب سفر کی سختی بڑھتی پابندیاں آڑے آ رہی ہیں۔

صالح کے بابا جانی نے جو پراپرٹی حقِ وراثت کے تحت پھپھو عاصمہ کے نام کی تھی، اس کے کاغذات مکمل کرانے کے بعد صالح نے پھپھو کو بھجوا دیے تھے۔

دوسری طرف سرگودھا کی جانب بھی ابھی تک خاموشی ہی تھی۔ چند ہفتے پہلے وہاں صالح اور وکی میں جو سنگین جھڑپ ہوئی تھی، اس کے بعد فی الحال کوئی نیا ٹینٹا سامنے نہیں آیا تھا۔

صالح نے مہناز عرف نازو سے اپنا تعلق ختم کر دیا تھا۔ اسے صرف طلاق ہی نہیں دی تھی بلکہ اور بھی بہت کچھ دیا تھا اور یہ اتنا کچھ تھا کہ آئندہ پانچ چھ سال کے لیے اسے ہر طرح کی ''محنت و مشقت'' سے آزاد کر سکتا تھا مگر ایسے لوگ نچلے کب بیٹھتے ہیں۔ انہیں پتا ہوتا ہے کہ یہی چار پانچ سال تو ہیں ''محنت و مشقت'' کے اور تھپے پہننے اتارنے کے۔

آج کل صالح کی سرمستی عروج پر تھی۔ غیر ملکیوں والے گروپ کی ایک خوشنما لڑکی جو لی اس کی نگاہوں میں چڑھی ہوئی تھی۔ وہ مادر پدر آزاد لڑکی اسے قربت کے نئے نئے ذائقوں سے آشنا کر رہی تھی اور یہ یک نہ شد دو شد والا معاملہ تھا۔ اس گروپ میں ہی موجود بوائے کٹ بالوں والی ایک روسی آفت جاں مارگریٹ بھی دو چار راتوں بعد اس کی رات کو گرما دیتی تھی۔ وہ صالح کے بالوں بھرے مضبوط جسم کی تعریف کرتی اور کہتی کہ اس کے تمکین جسم میں زندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ اسے اپنے انداز میں سپر ہاٹ کہتی.....

ان دو لڑکیوں کے علاوہ وہ جوان ملازمائیں تو موجود ہی تھیں جنہیں صالح نے اپنے پُرتعیش مقاصد کے لیے بھرتی کیا تھا۔ ان کی ملازمت تو دراصل ایک طرح کا ''کیموفلاج'' ہی تھا۔ صالح گاہے بگاہے ان کی اطاعت گزاری سے بھی اپنی تنہائیاں چمکا رہا تھا۔ کسی وقت تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ سرخاب منزل کی حاکمیت ایک وسیع دسترخوان کی طرح ہے جس پر دلکش نسوانی اجسام مختلف ڈشز کی طرح چنے ہوئے ہیں۔ وہ کھا رہا تھا اور کھا رہا تھا۔ تاہم کہا جاتا ہے کہ کھانے کی لذت بھوک سے مشروط ہوتی ہے۔ کھانے کی زیادتی سے بھوک کم ہوتی ہے اور لذت بھی وہ پہلے جیسی نہیں رہتی۔ کسی وقت صالح بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا۔ ایسے میں وہ وہی کچھ کرتا جو کھانے کی لذت بڑھانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس میں زیادہ مرچ مسالے ڈالے جاتے ہیں، انہیں زیادہ سجایا سنوارا جاتا ہے۔ پیشکش کے انداز بدلے جاتے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ کر رہا تھا اور خود کو کامیاب محسوس کرتا تھا۔ بدمست شادمانی